رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۶۸۲

ٹیلیفون:
لاہور: ۳۷۰۷۲۶ - 115/3 سرور روڈ لاہور چھاؤنی
سرگودھا: ۲۲۸۱ - ۵۸ سول لائنز سرگودھا

مولانا صلاح الدّین احمد کی یاد میں

ماہنامہ

اوراق

لاہور

انشائیہ نمبر

اپریل، مئی ۱۹۸۵ء

مدیران

وزیر آغا

سجّاد نقوی (اعزازی)

منتظم

سلیم آغا قزلباش

جلد: ۲۰

شمارہ: ۴، ۵

چندہ سالانہ: ۶۰ روپے

قیمت فی پرچہ: ۲۵ روپے

دفتر اوراق، چوک اردو بازار لاہور

ترتیبِ اوراق

مقالات

انشائیے

تجزیاتی مطالعے

گوشۂ جمیل آذر

ایک موضوع تین زاویے

غیر ملکی انشائیے

اِس کتاب میں

آپس کی باتیں

سرورق :- موجد

خطاطی :- تمکین شیرازی

ناشر	طابع	مطبع	مقامِ اشاعت
وزیر آغا	رشید احمد چوہدری	مکتبہ جدید پریس لاہور	چوک اُردو بازار لاہور

غلام جیلانی اصغر
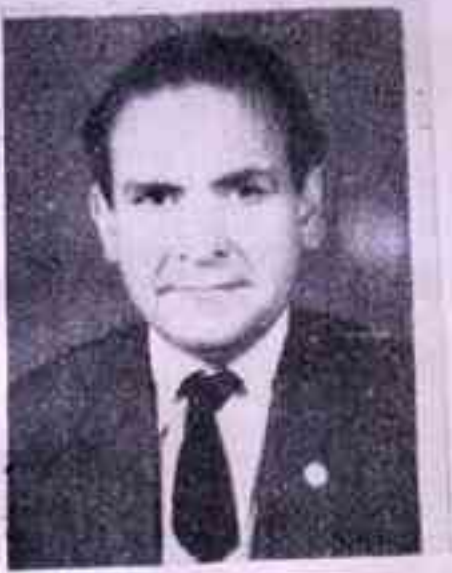
ڈاکٹر انور سدید

احمد جمال پاشا

محمد منشا یاد

غلام الثقلین نقوی

رشید امجد

رشید نثار

ارشد میر

مونتین

ایڈیسن

بیر بہوم

بیکن

سٹیل

ورجینیا وولف

غلام جیلانی اصغر

ڈاکٹر انور سدید

احمد جمال پاشا

محمد منشا یاد

غلام الثقلین نقوی

رشید امجد

رشید نثار

ارشد میر

مونتین

ایڈیسن

بیر بوہوم

بیکن

سٹیل

ورجینیا وولف

کامل القادری

رشید قیصرانی

سلیم آغا قزلباش

حیدر قریشی

سلمان بٹ

صابر لودھی

انجم نیازی

تقی حسین خسرو

بشیر سیفی

خالد اقبال

محمد یونس بٹ

راجہ محمد ریاض الرحمٰن

جان کاشمیری

بال انجم

ممتاز احمد خان

مناظر عاشق ہرگانوی
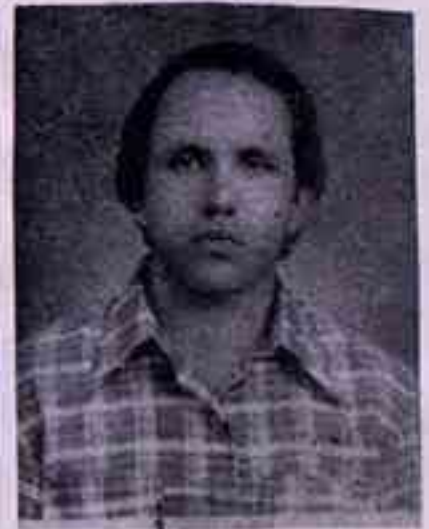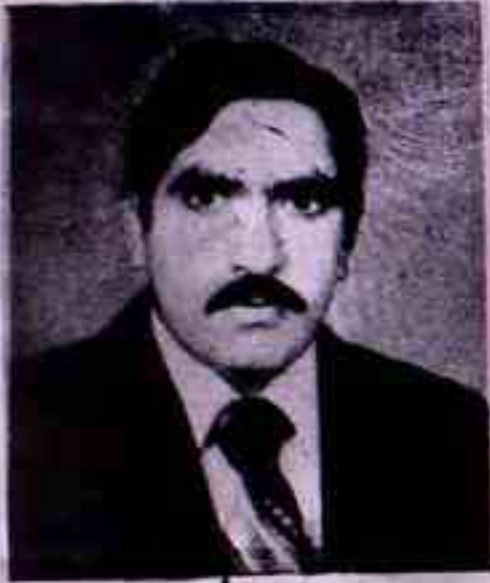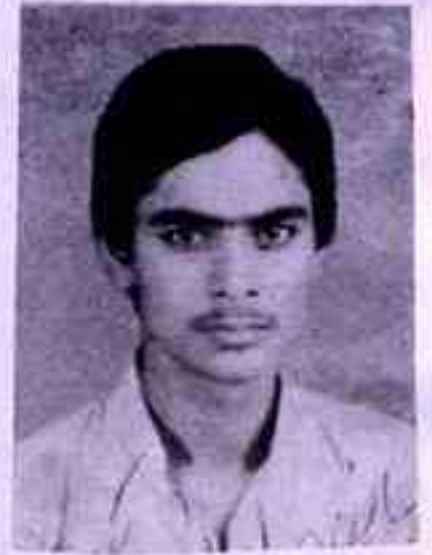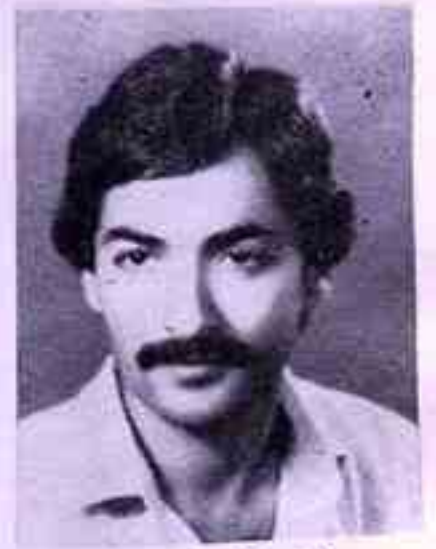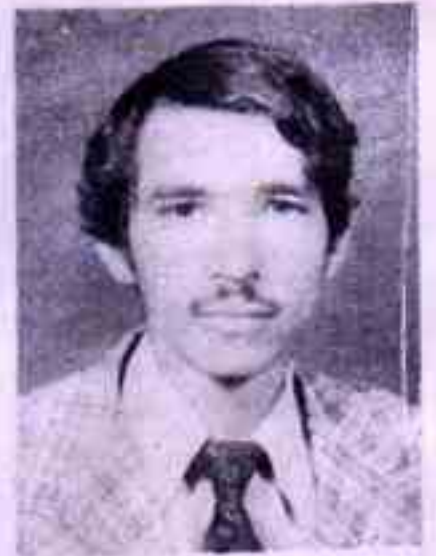
پہلا ورق

(۱)

آج سے تقریباً بارہ سال قبل ہم نے اوراق کا ایک "افسانہ اور انشائیہ نمبر" شائع کیا تھا۔ پھر آج سے چند سال پہلے ماہنامہ "اردو زبان" کا ایک نہایت متوازن مگر مختصر "انشائیہ نمبر" منصۂ شہود پر آیا۔ اسی طرح سالِ رواں کے آغاز میں سلمان بٹ مرحوم نے (انہیں مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے) اخبار "امروز" کا ایک نہایت دلچسپ انشائیہ نمبر چھاپ کر "اخباری ادبی صفحہ" کی تاریخ میں ایک نئی روایت قائم کردی مگر ان سب اقدامات سے بہت پہلے "ادیب" علی گڑھ کا انشائیہ نمبر شائع ہوا تھا لہٰذا اس سلسلے میں اولیت کا اعزاز "ادیب" علی گڑھ ہی کو حاصل ہے۔ گو اُس زمانے میں نہ تو ابھی انشائیہ کے خدوخال ہی واضح ہوئے تھے اور نہ انشائیوں کی بڑی تعداد ہی سامنے آئی تھی۔ انشائیہ کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں ان تمام نمبروں کی اہمیت مسلّم مگر ہم محسوس کر رہے تھے کہ پچھلی ایک دہائی میں انشائیہ کو جو بے پناہ فروغ ملا ہے اور انشائیہ کے موضوع پر جو تُند و تیز بحث ہوئی ہے، اس کا یہ تقاضا ہے کہ ایک مبسوط اور مفصل انشائیہ نمبر شائع کیا جائے جو نہ صرف اب تک کی بازیافت کا جائزہ لے بلکہ مستقبل کے امکانات کو روشن کرنے کی بھی کوشش کرے۔ سو ہم اوراق کا انشائیہ نمبر آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔ آپ یہ دیکھ کر یقیناً مسرّت محسوس کریں گے کہ کتنے نئے ستارے انشائیہ نگاری کے اُفق پر طلوع ہو گئے ہیں۔ یہی نہیں، آپ یہ دیکھ کر بھی حیران ہوں گے کہ ہمارے بعض منجھے ہوئے اور سینئر ادبا نے بھی امکانات کی حامل اس صنفِ ادب کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ ہم ان سب حضرات کو خوش آمدید کہتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ ہمارے دیگر ادبا بھی اس لذیذ صنفِ ادب کو چکھنے اور اس کے ذائقے سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کریں گے۔

اُردو ادب میں انشائیہ کا طلوع ایک تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ یوں کہ انشائیہ انفرادی سوچ کا محرک ہے اور اس لئے اس کی آمد سے ہمارے ادب میں فرد کی سطح پر سوچ کا وہ عمل جاری ہوگیا ہے جس کی کمی ہم ایک مدت سے محسوس کر رہے تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں یا تو دانش و حکمت کے جواہر ضرب الامثال اور کہاوتوں کی صورت ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے چلے آئے ہیں یا پھر ہم نے دوسرے ممالک سے دانش و حکمت کو بڑے پیمانے پر درآمد کیا ہے۔ اصلاً یہ خوشہ چینی کا ایک عمل ہے جس کا ہماری شخصی واردات اور تجربات نیز ہماری منفرد فکری اُپج سے کچھ زیادہ علاقہ نہیں ہے۔ ادب اُس وقت اجتہادی روش اختیار کرتا ہے جب ادب تخلیق کرنے والے اردگرد کی اشیاء اور مظاہر کو اُلٹنے پلٹنے لگتے ہیں، ان پر سے صدیوں کے جمے ہوئے زنگ کو اتارتے ہیں اور ان کے اندر چھپے ہوئے مفاہیم کو سطح پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انشائیہ اسی اُلٹ پلٹ کا بہترین ذریعہ ہے کہ ہر شے کے "دوسرے رُخ" کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور مسلّمات کے سحر سے لحظہ بھر کے لئے باہر آنے میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔ پھر اس کی زد RANGE بھی بہت وسیع ہے کہ یہ سامنے کی بظاہر معمولی اور گری پڑی چیزوں مثلاً "دیوار، کُرسی، تولیہ، گھوڑا، میم پلیٹ اور انگلی" وغیرہ سے لے کر لطیف ترین کیفیات، تعقّلات اور واردات تک کو اُلٹنے پلٹنے پر تادر ہے تاکہ عادت اور تکرار کی فضا سے نجات ملے اور اردگرد کا ماحول ایک بار پھر دھڑکتا اور سانس لیتا ہوا محسوس ہو۔ گویا انشائیہ بنے بنائے فکری پیمانوں کو قبول کرنے کے بجائے شخصی سطح کی نکتہ آفرینی کے عمل کو اُجاگر کرتا ہے جس کے

قمقمے سے مانگے کا اُجالا طلب کرنے کے بجائے خود موم بتی کی نوک پر روشنی کا ایک چھوٹا سا مینار تعمیر کرتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اکتسابِ نور کے مقابلے میں تخلیقِ نور کے عمل کا گرویدہ ہے۔ سو جب کسی معاشرے میں روشنی تخلیق کرنے کا عمل جاری ہو جائے اور روشنی اشیاء اور مظاہر کے اندر سے باہر کی طرف لپکتی ہوئی نظر آنے لگے تو سمجھئے کہ فکری اجتہاد کے لئے راستہ پوری طرح منور ہو گیا ہے۔ انشائیہ نے ہمارے ادب کے ایوان میں انفرادی سوچ کی جو موم بتی روشن کی ہے ہمیں یقین ہے کہ آگے چل کر اس سے ہمارا ادب ہی نہیں پُورا معاشرہ بھی مستنیر ہو سکے گا۔

انشائیہ انفرادی سوچ کا محرک ہونے کے علاوہ زبان کی لطافتوں اور نزاکتوں کا مظہر بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ترقی یافتہ ملک کی یونیورسٹیاں طلباء کو زبان کی باریکیوں سے آشنا کرنے کے لئے انشائیہ کو خصوصی طور پر بروئے کار لاتی ہیں یعنی اسے التزام کے ساتھ اپنے سلیبس (SYLLABUS) میں شامل کرتی ہیں لیکن کیسے افسوس کی بات ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں نے تاحال اُردو انشائیہ کے حُسنِ کارکردگی کا اعتراف نہیں کیا اور بعض نے تو انشائیہ کو "سلیبس بدر" کرنے کا بطورِ خاص اہتمام کیا ہے۔ انشائیہ نمبر پیش کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ملک کی یونیورسٹیوں کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ اُردو انشائیہ کو سلیبس میں شامل نہ کر کے وہ طلباء کے اُردو زبان کی لطافت اور قوت سے آشنا ہونے کے عمل کو معطل کر رہی ہیں اور یوں نادانستہ طور پر اُردو زبان کی نشوونما کے راستے میں روکاوٹیں کھڑی کر رہی ہیں۔ اُردو ہماری قومی زبان ہے۔ آگے چل کر اسی زبان کے سہارے قوم نے ترقی کے مدارج طے کرنے ہیں۔ اگر ہمارے طلباء اپنی قومی زبان میں اظہار و بیان کی استعداد پیدا نہ کر سکے تو پھر وہ زندگی کی دوڑ میں کیسے آگے بڑھ سکیں گے؟ ہماری یونیورسٹیوں کے لئے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے!

زیرِ نظر انشائیہ نمبر میں ہم نے انگریزی انشائیوں کے تراجم پیش کرنے کا بھی بطورِ خاص اہتمام کیا ہے۔ نیز انگریزی انشائیہ کے بارے میں ایک مبسوط مقالہ بھی شریکِ اشاعت کیا ہے تاکہ ہمارے قارئین کو نہ صرف انگریزی انشائیہ کے مزاج اور ارتقاء کا کچھ اندازہ ہو سکے بلکہ وہ یہ بھی دیکھ سکیں کہ مزاج کے اعتبار سے اُردو انشائیہ، انگریزی لائٹ ایسے سے کس حد تک مختلف مگر معیار کے اعتبار سے کس حد تک اس کا ہم پایہ ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ زیرِ نظر نمبر قارئینِ اوراق کو نہ صرف انشائیہ فہمی کے سلسلے میں مدد دے گا، نہ صرف ان پر انگریزی اور اُردو انشائیوں کے مزاج میں نمودار ہونے والے فرق کو واضح کرے گا بلکہ انہیں ڈھیر سارے تازہ انشائیوں سے لطف اندوز ہونے کے مواقع بھی فراہم کر سکے گا۔

وزیر آغا

(۲)

کسی نئی صنفِ ادب کی تفہیم و ترویج کے لئے تجزیاتی مطالعہ سے زیادہ مفید کوئی اور وسیلہ نہیں ہے۔ ہمیں وہ زمانہ اچھی طرح سے یاد ہے جب ادب کے اکثر قارئین کے لئے 'جدید نظم' بڑی اوپری اور اجنبی سی چیز تھی۔ قارئین میں سے کچھ تو سرے سے جدید نظم کو شاعری تسلیم کرنے کے لئے ہی تیار نہیں تھے۔ اس صورتِ حال میں، اس چیلنج کو سب سے پہلے ادبی دنیا۔ دَورِ پنجم کے مدیران نے قبول کیا، اور جدید نظم کی ترویج و تفہیم کے لئے 'ادبی دنیا' کے ہر شمارے میں اس کے تجزیاتی مطالعہ کا بطورِ خاص اہتمام کیا۔ پھر جب مولانا صلاح الدین احمد کی رحلت کے ساتھ 'ادبی دنیا' کا دَورِ پنجم اختتام پذیر ہوا تو 'اوراق' نے مولانا مرحوم کے اس مشن کو جاری رکھا، چنانچہ

قارئینِ اوراق کو یاد ہوگا کہ ایک عرصے تک اوراق نے نہ صرف جدید نظم کے تجزیاتی مطالعے کا سلسلہ ٹوٹنے نہ دیا بلکہ اس سے آگے ایک اور قدم بھی بڑھایا، وہ یہ کہ جدید نظم کا ایک یادگار تاریخی نمبر بھی شائع کر ڈالا۔

یہی صورتِ حال اُردو انشائیہ کو بھی پیش آئی ہے، چنانچہ جتنی مخالفت پچھلے پچیس برس میں انشائیے کی ہوئی ہے اتنی جدید نظم کی نہیں ہوئی۔ مخالفت کرنے والوں میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو روایت کے ساتھ اس درجہ چمٹے ہوئے ہیں کہ انشائیہ ایسی نئی صنف کو ذہنی طور پر قبول ہی نہیں کر پائے، دوسرے وہ جو جلاپے اور حسد کی وجہ سے کسی نئی صنفِ ادب میں اپنے معاصرین کو شہرت پاتے دیکھ ہی نہیں سکتے۔ یہ لوگ ادیب دشمنی کے ساتھ ساتھ ادب دشمنی کے بھی مرتکب ہوتے ہیں لہٰذا ان کے منفی ردِ عمل کا سدِ باب اس طور ہی ممکن ہے کہ اس صنفِ ادب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ مضامین شائع کئے جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس صنفِ ادب کے اعلیٰ نمونے بھی پیش کئے جائیں۔ رہا کسی صنفِ ادب کی تفہیم و ترویج کا مسئلہ تو تجزیاتی مطالعہ ہی اس مقصد کو کما حقہٗ ادا کر سکتا ہے۔ چنانچہ جہاں ہم نے انشائیہ نمبر میں اعلیٰ درجے کے انشائیے اور بلند پایہ مضامین شائع کئے ہیں، وہاں درجن بھر انشائیوں کے تجزیے بھی شامل کئے ہیں کہ ہمارے خیال میں انشائیہ کی تفہیم کا اس سے زیادہ اور کوئی موثر ذریعہ نہیں ہے۔

پچھلے چند ماہ میں ہمیں جن ادبا کی مفارقت کا غم اٹھانا پڑا ہے ان میں اطہر پرویز، سید جابر علی سید، پروفیسر شبیر علی کاظمی اور سلمان بٹ شامل ہیں۔ سید جابر علی سید اور پروفیسر شبیر علی کاظمی بزرگ ادیب تھے اور ایک عرصے سے اُردو ادب کو اپنی نگارشات سے مالا مال کر رہے تھے اطہر پرویز اور سلمان بٹ کی موت کا خیال آتے ہی آنکھیں اُمڈ آتی ہیں۔ اطہر پرویز دو ماہی 'الفاظ' کے جواں فکر ایڈیٹر تھے اور جوانِ رعنا سلمان بٹ روزنامہ 'امروز' کے ادبی صفحے کے مرتب تھے۔ سلمان بٹ ایک اُبھرتے ہوئے انشائیہ نگار بھی تھے۔ انشائیہ نمبر میں شامل انشائیہ 'جمعہ' ان کی یاد تازہ کرے گا۔ ادارہ اوراق مرحومین کے لئے مغفرت اور لواحقین کے لئے صبرِ جمیل کی دُعا کرتا ہے۔

سجّاد نقوی

گفتگو

اے خیام

جمیل آذر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

"انشائیہ اپنے مزاج کے اعتبار سے انفرادیت اور انانیت کا حامل ہے —"

اور

"(انشائیہ نگار) اجتماعیت کے انبوہِ کثیر میں مشعل بردار بننے کا فریضہ انجام دینے کا آرزومند ہے......"

اگر یہ سب ہے تو کیا "انانیت" یا "مشعل برداری" — لیڈر شپ اختیار کرنے یا موجد قرار پانے کے مماثل نہیں ہے —؟

آخر انشائیہ ہے کیا —؟

یہ افسانے سے مختلف کیوں ہے؟

یہ مزاح اور طنز سے علیحدہ کیوں ہے؟

عام مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری میں کیا فرق ہے؟

کیا انشائیہ افسانے سے اس لیے مختلف ہے کہ اس میں پلاٹ، کردار، واقعہ کا فقدان ہوتا ہے؟ لیکن اس طرح کے تو افسانے بھی لکھے گئے ہیں۔ پھر یہ افسانے سے مختلف کیونکر ہوا —؟ یا ہم اس طرح کے افسانوں کو انشائیہ کیوں نہیں کہہ سکتے —؟

عام مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری کا فرق جمیل آذر نے کچھ یوں واضح کیا ہے کہ انشائیہ نگاری ایک تخلیقی عمل ہے اور انشائیہ تخلیق کار کے دل کا نغمہ یا خیال کا سفرِ بیکراں ہوتا ہے جبکہ مضامین میں گہری منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ سرسید کے مضامین کو انشائیہ کہنا، سرسید کے مشن کی توہین ہے —

گویا مضمون نگاری ایک بامقصد عمل ہے اور انشائیہ اس سے کم تر درجے کی تخلیق — پھر میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ کچھ طنز و مزاح نگار اپنی تحریروں پر "انشائیہ" کا لیبل چسپاں کرنے پر مُصر ہیں — یعنی طنز و مزاح جیسے انشائیہ کے ذیل میں ہی آتا ہو، یا انشائیہ اس سے کوئی اعلیٰ درجہ کا فن ہو —

اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس کی کوئی تعریف متعین ہو جانی چاہیئے —

لیکن کوئی تعریف متعین کر کے ہم اسے محدود کر دینے کے سزاوار تو نہ ہو جائیں گے —؟ اور کیا کسی کا کوئی خاص تعریف متعین کی جا سکتی ہے؟

—— ہاں، البتہ پہچان کرائی جا سکتی ہے۔ مثلاً انشائیہ کے لیے پرسنل ایسے، لائٹ ایسے، ذہن کی ایک آزاد ترنگ، ایک خاص نوعیت کا نظم و ضبط اور موضوعات کا انتخاب وغیرہ۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے متعدد مضامین میں انشائیہ کے امتیازی اوصاف کو بیان بھی کیا ہے۔ لکھا ہے۔

"انشائیہ اُس نثری صنف کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہوتا ہے۔"

میں انشائیہ کے اس وصف سے کافی حد تک مطمئن ہوں لیکن مختلف انشائیہ نگار کسی ایک شے یا مظہر کے مخفی مفاہیم کو اپنے طور پر اپنی گرفت میں لے گا ہر انشائیہ نگار کے متاثر ہونے کا انداز مختلف ہوگا اور اسی لیے اس کا طریقۂ اظہار اور اسلوب بھی مختلف ہوگا۔

تو کیا ہر قاری ایسے ہر انشائیے سے لطف اندوز ہو سکے گا۔؟

اور کیا ہر قاری کا محظوظ ہونے کے لیے انشائیہ نگار کے WAVE LENGTH پر موجود ہونا ضروری نہیں ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہے ——؟

عام مضمون نگاری سے لے کر آج کی انشائیہ نگاری تک ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ میں اس حقیقت سے آگاہ ہوں کہ غیر ملکی ادب سے بیسویں صدی کی ابتدا میں ہمارا ادیب اس حد تک واقف نہ تھا جتنا آج کا ادیب ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں انشائیے کے صحیح خد و خال اتنے واضح نہیں تھے جتنے سن پچاس کی آخری دہائی یا سن ساٹھ کی ابتدائی دہائی میں واضح ہوئے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، جمیل آذر، ڈاکٹر انور سدید، مشتاق قمر، رام لعل نابھوی، احمد جمال پاشا اور سلیم آغا قزلباش وغیرہ کی کتابیں شائع ہوئی ہیں، رسالوں کے خصوصی نمبر بھی اشاعت پذیر ہوئے ہیں اور انشائیوں پر مضامین بھی چھپتے رہے ہیں۔ بیس پچیس سال کا عرصہ کسی بھی صنف کے خد و خال کو واضح کرنے بلکہ اس صنف کو متعین کرنے کے لیے کم نہیں ہے —— میں سمجھتا ہوں کہ انشائیہ کو ایک علیحدہ صنفِ ادب کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ اس صنف سے اختلاف رکھنے والے کسی نہ کسی تعصب کا شکار ہیں؟

اب آپ لوگ یہاں پر جمع ہیں، ادب کے حوالے سے تمام تحریکیں، رجحانات اور سرگرمیاں آپ کی نظروں میں ہیں، مجھ سے زیادہ ادب پڑھتے اور لکھتے ہیں، شاید آپ لوگوں نے اندازہ لگا لیا ہو کہ میرے ذہن میں انشائیہ کے سلسلے میں اب بھی کچھ اُلجھاؤ اور شکوک و شبہات موجود ہیں، اسے رفع کرنے میں آپ لوگ میری مدد کریں۔

علی حیدر ملک: ابھی آپ نے اے خیام کا مضمون سُنا۔ انہوں نے انشائیہ کے بارے میں کچھ سوالات کے جواب دینے کی کوشش کی ہے، اور کچھ نئے سوالات بھی اٹھائے ہیں جن پر آپ لوگ اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ میں سب سے پہلے صبا اکرام سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

صبا اکرام: ادب میں جب بھی کسی نئی صنف کو روشناس کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو بیک وقت دو طرح کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ایک وہ آواز ہوتی ہے جو اس صنف کی تعریف متعین کرنا اور اس کے خد و خال کو واضح کرنا چاہتی ہے۔ یہ آواز ان فنکاروں کی ہوتی ہے جو تحقیق، تنقید اور تخلیق کے ذریعے بڑے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اُس صنفِ ادب کو ایک پھول کی طرح جس کا اپنا مخصوص رنگ اور خوشبو ہوتی ہے، گیسوئے ادب میں سجانا چاہتے ہیں۔ دوسری آواز وہ ہوتی ہے جو اس نئی صنفِ ادب کے پھول کے رنگ میں ملاوٹ کر کے اس کی اپنی پہچان کو بدل دینا چاہتی ہے —— یہ آواز احساسِ کمتری میں مبتلا ان لوگوں کی ہوتی ہے، جن کی اپنی تخلیقات اس نئی صنفِ ادب کی تعریف پر پوری نہیں اترتیں، لہٰذا بجائے اس کے کہ وہ اپنی تخلیقات کی شکل و صورت کو سنواریں، اس صنف

کی تعریف کی کھینچا تانی میں لگ جاتے ہیں اور اسی پر اپنی ساری محنت اور سارا وقت صرف کر دیتے ہیں۔ اس طرح جہاں پہلی آواز دھندلکوں کو دور کر کے صحیح شکل وصورت کو پیش کرنے کی کوشش کرتی ہے، وہیں یہ دوسری آواز گرد اڑا کر ایک عام قاری کے ذہن میں کنفیوژن پیدا کرنے کی سعی کرتی ہے۔

شروع شروع میں یہ اعتراض ہوا تھا کہ انشائیہ خوشحال اور متموّل افراد اور قوموں کا مشغلہ ہے جو وقت گزاری کے لیے اپنا لیتی ہیں کیونکہ ان کے پاس کرنے کے لیے کچھ اور نہیں ہوتا۔ اور مثال کے لیے وہ مونتین کو دھر لائے تھے۔ مگر اب یہ حقیقت سامنے آچکی ہے کہ مونتین کے علاوہ بھی لوگوں نے انشائیے لکھے ہیں، جنہیں مالی طور پر بہت خوش نصیب نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً چارلس لیمب، رابرٹ لنڈ اور ورجینیا وولف وغیرہ۔ اُردو کے انشائیہ نگاروں میں بھی ایک آدھ کو چھوڑ کر بقیہ تمام لوگ ایسے ہیں جنہیں دو وقت کی روٹی کے لیے ہر روز صبح سے شام تک محنت کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا انشائیہ کو ذہنی عیاشی کہہ کر اسے جبلی یا مصنوعی صنف ثابت کرنے کی کوشش کرنے والے لوگ سلیم العقل ہرگز نہیں کہے جا سکتے۔

اے خیام نے جمیل آذر کے حوالے سے جو یہ بات کہی ہے کہ انشائیہ اپنے مزاج کے اعتبار سے انفرادیت اور انانیت کا حامل ہے، تو مجھے اس میں کوئی منفی پہلو نظر نہیں آتا، کیونکہ جمیل آذر نے اپنے اسی مضمون میں جس کا عنوان "انشائیہ" ہے، یہ کہہ کر اس کا جواز بھی پیش کر دیا ہے کہ آج کا انسان بالخصوص نوجوان اپنی انا اور خودی کو کسی بھی قیمت پر مجروح ہونے کی اجازت نہیں دیتا اور اپنی ذات اور تشخص کو اجتماعیت کے بے ہنگم سمندر میں ڈوبنے نہیں دیتا۔ جمیل آذر کی اس رائے سے انکار ممکن نہیں کیونکہ انشائیے میں ہر بات "میں" کے حوالے سے کہی جاتی ہے، اور جہاں "ہم" کی بجائے "میں" کے حوالے سے بات کہی جائے تو انفرادیت اور شخصی نقطۂ نظر خود بخود اس کا مزاج بن جاتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ لفظ "انشائیہ" کا اُردو میں پہلی بار استعمال ڈاکٹر اختر اورینوی نے علی اکبر قاصد کے مضامین کی کتاب "ترنگ" کے لیے کیا تھا، لیکن چونکہ اس کتاب میں شامل تمام مضامین مزاحیہ انداز کے تھے، لہٰذا یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ اختر اورینوی انشائیے کی تعریف اور اس کے مقتضیات سے تو واقف تھے، مگر اسے صحیح طور پر پہچانتے نہیں تھے، اور شاید ایسا اس لیے تھا کہ اس وقت تک اُردو میں انشائیے لکھے جانے شروع نہیں ہوئے تھے اور اس کے خدوخال واضح نہیں ہو پائے تھے۔ کچھ اسی طرح کا سہو ڈاکٹر سید محمد حسنین سے بھی ہوا ہے، جنہوں نے اپنی کتاب "صنفِ انشائیہ اور چند انشائیے" کے مقدمے میں تو انشائیے سے متعلق بھرپور اور مدلل بحث کی ہے، لیکن انتخاب میں انشائیے کے ساتھ ساتھ مضامین بھی شامل کر دیئے ہیں۔ اور بقول احمد جمال پاشا "یا تو ان کے انتخاب سے مضامین خارج کیے جائیں یا ان کا مقدمہ مضامین اور انشائیہ دونوں پر ہو، تو یہ انشائیہ کی ایک بڑی خدمت ہوگی۔"

مضامین یا ESSAYS کی بات آہی گئی ہے تو یہ کہتا چلوں کہ کچھ لوگوں کو اس پر بھی اصرار رہا ہے اور اب تک ہے کہ ESSAYS بھی انشائیے ہیں اور یہ کہ اُردو میں سرسید نے اس کی ابتدا کی تھی۔ اس سلسلے میں نیاز فتح پوری، ڈاکٹر سیدہ جعفر اور ڈاکٹر قمر رئیس وغیرہ کے نام نامی سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے تو یہ تک کیا کہ آل احمد سرور کے تنقیدی مضامین کو بھی انشائیے کہنے سے ذرا نہ شرمائیں اور ایک عام قاری کے ذہن میں کنفیوژن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر لطف کی بات یہ ہے کہ ان بزرگوں نے خود اپنے ان مضامین کو نہ کبھی انشائیہ کہا اور نہ لکھا۔ حقیقت بہرحال اپنی جگہ ہے کہ "مضمون" (ESSAY) اور "انشائیہ" ——

(PERSONAL ESSAY) کی اصطلاحات میں آپس میں کوئی رشتہ نہیں۔ کیونکہ ایک بہت ہی وسیع اور عمومی معنوں میں استعمال ہوتی ہے جبکہ دوسری یعنی انشائیے کی اصطلاح بہت ہی محدود مگر مخصوص معنوں میں برتی جاتی ہے۔

دراصل انشائیے کی یہ صنف ابھی ادب میں نووارد ہے جو اُردو میں انشائیے کے اوّلین مجموعے یعنی وزیر آغا کے "خیال پارے" کی انگلی تھام کر پہنچی تھی، اور پھر بعد میں کچھ اور لوگوں نے اپنے قلم کے ذریعے اس کی پرورش کی، اور اب یہ اپنے مضبوط پیروں سے آگے بڑھتی اور ارتقا کی منزلیں طے کرتی نظر آتی ہے۔ لہٰذا اب ایک عام قاری کو بھی مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری کا فرق سمجھ میں آنے لگا ہے۔ اور اس کا کریڈٹ صحیح طور پر عارف عبدالمتین نے مشتاق قمر کی کتاب "ہم ہیں مشتاق" کے فلیپ پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے وزیر آغا کو دیا ہے، جنہوں نے اپنی تنقید اور تخلیق کے ذریعے اس کنفیوژن کو دُور کیا اور انشائیہ کے خدوخال کو واضح کیا نیز غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل نوجوان فنکاروں کو انشائیہ نگاری کی طرف مائل کیا۔

انشائیہ کیا ہے؟ — کا جواب اے خیام نے خود ہی اپنے مضمون میں وزیر آغا کے ایک مضمون سے اقتباس پیش کرکے دے دیا ہے لہٰذا اس سلسلے میں میرے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔ البتہ انہوں نے یہ سوالات ہمارے لیے چھوڑ دیئے ہیں کہ انشائیہ افسانے سے کس طرح مختلف ہے اور یہ کہ انشائیہ مزاح اور طنز سے علیحدہ کیونکر ہے۔ جہاں تک افسانے کا سوال ہے کسی نے ابھی تک اسے انشائیہ ثابت کرنے کی سعی نہیں کی ہے۔ ہاں، اس خدشے کا اظہار کچھ لوگ وقتاً فوقتاً ضرور کرتے رہتے ہیں کہ کہیں افسانہ نگاروں کے انشائیہ نگاری کی طرف مائل ہونے سے افسانے کو نقصان تو نہیں پہنچے گا۔ مگر اس سلسلے میں جو مثالیں ہمارے سامنے ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خدشہ صحیح نہیں، کیونکہ ایسا ہوتا تو انشائیہ نگاری شروع کرنے کے بعد مشتاق قمر، تقی حسین خسرو اور سلیم آغا وغیرہ اب تک افسانہ نگاری ترک کر چکے ہوتے۔

جہاں تک انشائیے کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین سے مختلف ہونے کی بات ہے تو اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید نے صرف چند جملوں میں بڑی اچھی بات کہہ دی ہے۔ انہوں نے "ہم ہیں مشتاق" کے مقدمے میں انشائیے پر بحث کرتے ہوئے مزاح کو ایک مضحک عمل کہا ہے اور طنز کو ایک سنجیدہ عمل۔ پھر یہ کہا ہے کہ انشائیہ ان دونوں سے فائدہ تو اٹھاتا ہے، مگر انہیں اپنے اصل مزاج پر غالب نہیں آنے دیتا — انور سدید کی اس رائے سے میرا خیال ہے کوئی اختلاف نہیں کرے گا۔

طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کو انشائیہ کہلوانے پر اصرار کرنے والوں میں نظیر صدیقی اور مشکور حسین یاد کے نام نامی خاص طور سے سامنے آتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ نظیر صدیقی یہ تو مانتے ہیں کہ انشائیہ اور مضمون الگ الگ چیزیں ہیں، مگر اس کے باوجود اپنے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کو انشائیہ کہنے پر مُصر ہیں۔ دوسری طرح مشکور حسین یاد ہیں جو انشائیہ میں سنجیدگی کو صرف اس لیے فوقیت دینے پر بضد ہیں کہ ان کے اپنے طنزیہ مضامین انشائیے ثابت کیے جا سکیں۔

خیام نے ایک اور سوال یہ اٹھایا ہے کہ کیا ہر قاری کا محظوظ ہونے کے لیے انشائیہ نگار کے ہی WAVE LENGTH پر موجود ہونا ضروری ہے؟ — تو اس ضمن میں میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ ایک اچھا انشائیہ تو خود بخود قاری کو انشائیہ نگار کے WAVE LENGTH پر پہنچا دیتا ہے، اور اس کے لیے اُسے خود شعوری کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ بلکہ انشائیے کے اختتام کے بعد بھی کچھ دیر تک قاری اُسی WAVE LENGTH پر رُکا رہتا ہے اور انشائیہ میں موجود اشارات کا سہارا لے کر خیالوں کی

ایک نئی دنیا کی سیر پر نکل جاتا ہے۔

علی حیدر ملک: صبا اکرام نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور اب میں شہزاد منظر سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

شہزاد منظر: اے۔ خیام نے جو سوالات اٹھائے ہیں ان میں پہلا سوال یہ ہے کہ انشائیہ کی تعریف کیا کی جائے۔ انشائیہ کی تعریف چند جملوں میں کرنا بہت مشکل ہے، کیونکہ کسی بھی ادبی صنف کی تعریف آسان نہیں ہوتی۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ انشائیہ عام مضمون نگاری سے اس طرح مختلف ہے کہ مضمون نگاری میں مقالہ نگاری کا انداز ہوتا ہے، اس میں علمی اور فکری باتیں ہوتی ہیں، اور لب و لہجہ بھی خالص سنجیدہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے انگریزی میں ESSAY کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے، جبکہ انشائیہ سے مراد LIGHT ESSAY یعنی ایسی تحریریں ہیں جو خالص علمی نہ ہوں۔

علی حیدر ملک: شہزاد منظر کے خیالات کی روشنی میں میں چاہتا ہوں کہ محمد رضا کاظمی بات کو آگے بڑھائیں۔

محمد رضا کاظمی: میں شہزاد منظر کی اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ انشائیہ کی تعریف چند جملوں میں نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ وزیر آغا نے انشائیے کی تعریف صرف چند جملوں میں پیش کردی ہے۔ اور نظیر صدیقی کی تعریف بھی چند جملوں ہی میں ہے۔ وزیر آغا نے انشائیے کی تعریف میں تین شرائط کا ذکر کیا ہے۔ (۱) زبان تخلیقی ہو (۲) انشائیہ معمولی اور پیش پا افتادہ باتوں کے مخفی مفاہیم کو ابھار کرے اور انسانی شعور اپنے مدار سے باہر آکر ایک نئے مدار کو وجود میں لائے، (۳) وہ ذہن کو بیدار کرے۔

اس تعریف سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ یوں بھی جب وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، غلام جیلانی اصغر، مشتاق قمر، جمیل آذر، سلیم آغا قزلباش اور اکبر حمیدی وغیرہ نے اتنا عمدہ اور وافر ذخیرہ جمع کردیا ہے جو ان شرائط کو ملحوظ رکھتا ہے، تو پھر عملاً بھی اس تعریف پر اعتراض ممکن نہیں رہا۔ یہ تینوں شرائط باہم مربوط ہیں۔ مخفی مفاہیم کو اُجاگر کرنا، ذہن کو بیدار کرتا ہے اور ذہن کی یہی تخلیقی اُپج زبان کے تخلیقی ہونے کے امکان کو پیدا کرتی ہے۔ تخلیقی نثر لکھنا یا صاحبِ طرز ادیب ہونا تخلیقی ذہن کی فطرت نہ سہی عادت ضرور ہے۔

میرے ذہن میں جو تحریکات ہیں ان کا تعلق انشائیے کے حال سے نہیں، انشائیے کے مستقبل سے ہے۔ رشید امجد نے انشائیے کے مستقبل کو فکری اور فلسفیانہ ترقی میں دیکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جدید انسان کبھی اپنے حوالے سے کائنات کو اور کبھی کائنات کے حوالے سے اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں اس نکتے پر ان سے بالکل متفق ہوں اور سمجھتا ہوں کہ انشائیے میں مزاحیہ عنصر کو وزیر آغا نے غیر ضروری رعایت دی ہے۔ وزیر آغا کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ مزاح کی مقدار اتنی نہ ہو کہ مزاح مقصود بالذات ہو۔ گویا نالہ آہنگ میں نالہ رہے، نغمہ نہ بنے۔ مجھے شک ہے کہ آئندہ کے مصنف اس حد تک اپنی تہذیب کر سکیں گے۔ یوں تو بہت سی ایسی تحریریں ہیں جہاں مزاح مقصود بالذات ہوتا ہے۔ ہماری شومئی قسمت سے اس کی اصل مقدار بھی بہت کم ہوتی ہے۔ لیکن مزاح خیالات کا ہمہ میز بھی ہے اور مصنف پر حاوی ہو جانے کی خصلت رکھتا ہے۔ لہٰذا جب تک انشائیے کی روایت تسلسل کے ساتھ برقرار ہے یہ شرط پوری ہوتی رہے گی۔ اگر خدا نخواستہ کوئی تعطل پیدا ہو گیا تو مزاح کو قابو میں رکھنا اتنا آسان ثابت نہیں ہوگا، اور مزاحیہ مضامین انشائیے پر حاوی ہو جائیں گے۔ میرا دوسرا خدشہ دوسری صنف سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک دوسرے مدار کو وجود میں لانے کا عمل فکری اور فلسفیانہ مضامین کو فروغ دینے میں بھی معاون ہو سکتا ہے۔ مگر یہ خطرہ اتنا شدید نہیں، جتنا مزاح کی

جانب سے ہے۔

علی حیدر ملک : کاظمی نے بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے بعض خدشات کا اظہار کیا ہے۔ ممتاز احمد خان اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

ممتاز احمد خان : شہزاد منظر نے انشائیے کی تعریف کے سلسلے میں جو سوال اٹھایا، اس کا جواب محمد رضا کاظمی نے دیا۔ اور ان کا جواب ایسا ہے جس سے ہم سب متفق ہوں گے۔ لیکن جہاں تک اس کی تعریف کا تعلق ہے ایک عجیب اتفاق ہے کہ میں نے بہت سی تعریفیں پڑھی ہیں جو مغرب سے آئی ہیں، اور جن میں ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہڈسن ہیں اور ڈاکٹر جانسن کی تعریف جس میں انشائیہ کو "A LOOSE SALLY OF MIND" کہا ہے۔ اسی طرح سینڈر برگ کی تعریف ہے کہ یہ A WORK OF ART ہے۔ اسی طرح کی اور بھی کئی تعریفیں ہیں۔ لیکن میرا ذاتی خیال ہے وزیر آغا نے جو تعریف کی ہے کہ انشائیہ میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیاء یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آکر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، یہ بہت صحیح تعریف ہے۔

اے۔ خیام نے کہا ہے کہ "کافی حد تک" وہ اس تعریف سے متفق ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کے ذہن میں الجھاؤ ہے۔ میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے باہر کے انشائیے پڑھے ہیں وہ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ واقعی وزیر آغا نے جو تعریف پیش کی ہے اس میں الجھاؤ بہت کم ہے۔ میں چاہوں تو پانچ چھ تعریفیں جو باہر سے آئی ہیں آپ کے سامنے پیش کر دوں مگر اس سے بڑا الجھاؤ پیدا ہوگا۔ ایسا لگتا ہے کہ مغرب میں انشائیے کے بارے میں اب بھی شکوک و شبہات ہیں لیکن آغا صاحب کی تعریف کہ اشیاء یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو ظاہر کرنا اس طرح کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم آگے جست لگاتا ہے اور ایک نئے مدار کو وجود میں لاتا ہے، اس الجھاؤ کو ختم کر دیتی ہے۔ اب ہم جتنے بھی انشائیے پڑھتے ہیں، باہر کے بھی اور اپنے ملک میں لکھے ہوئے بھی تو حیرت ہوتی ہے کہ تمام انشائیے اس تعریف پر صد فی صد پورے اترتے ہیں، جبکہ باہر کی تعریفوں میں میں نے یہ بات بہت کم دیکھی ہے۔

خیام نے جو سوال اٹھایا ہے کہ کچھ لوگ اپنے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کو انشائیہ کہلوانے پر مُصر ہیں اور خود پر انشائیہ نگار کی چھاپ لگوانے کے متمنی ہیں تو اس کا جواب میرے ذہن میں یہ ہے کہ انشائیہ ایک تخلیقی فن کی حیثیت سے اتنی ناموری حاصل کر چکا ہے کہ اب ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اُسے بھی انشائیہ نگار کہا جائے۔ جس طرح کہ شروع شروع میں ناول لکھے گئے اور فیلڈنگ نے ناول لکھے تو سمالٹ اور دوسرے لوگ یعنی ڈیفو وغیرہ میدان میں آئے اور انہوں نے جو چیزیں لکھیں اس پر مُصر رہے کہ اُنہیں ناول کہا جائے اور وہ ناول نگار کہلائے۔ لیکن ہمارے یہاں حال یہ ہے کہ جو لوگ صحیح طور پر انشائیہ کے خدوخال سے واقف نہیں ہیں اُنہیں بھی اصرار ہے کہ ان کو انشائیہ نگار کہا جائے۔

ہمارے سامنے جو تعریفیں آئی ہیں ان کی روشنی میں انشائیہ بالکل الگ چیز ہے۔ جو لوگ انشائیہ لکھنے کا ذہن رکھتے ہیں وہ انشائیہ لکھیں، اور انہیں انشائیہ نگار کہا جائے گا۔ خیام نے وزیر آغا کی پیش کردہ تعریف کے تعلق سے ایک بات کہی ہے کہ ــــ مختلف طریق سے اشیاء یا مظاہر کو ہر انشائیہ نگار مختلف انداز سے دیکھتا ہے۔ یہ ایک قسم کا سوال بھی ہے ان کا، اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے اس کے اندر ہی جواب بھی دے دیا ہے۔ اور ایک اچھی تعریف بھی متعین کر دی ہے۔ اشیاء اور مظاہر کو سامنے رکھ کر ہر انشائیہ نگار مختلف ردِعمل کا اظہار کرتا ہے، تو یہ بات انشائیہ کے فروغ کے لیے بہت معاون ثابت ہوگی یعنی جس طرح ایک شخص قرض کے

موضوع پر لکھتا ہے اور اس کے بطون میں اُترتا ہے ، اور پھر دوسرا شخص قرض کے بطون میں اُترتا ہے تو وہ کچھ اور لے کر سامنے آئے گا۔ یہ دراصل انشائیہ کی RICHNESS کی دلیل ہے ۔ اور انشائیہ اسی سے کافی فروغ پائے گا۔ اور جہاں تک WAVE LENGTH والی بات ہے تو انشائیہ نگار جو WAVE LENGTH قائم کرتا ہے قاری بھی اس میں شریک ہو جاتا ہے ۔

علی حیدر ملک : راغب شکیب صاحب ! آپ تو خود بھی انشائیہ نگار ہیں ۔ آپ فرمائیں کہ اے خیام کے اُٹھائے ہوئے نکات کے بارے میں آپ کس حد تک متفق ہیں ۔

راغب شکیب : اے ۔ خیام نے انشائیہ کے بارے میں بیک وقت کئی اہم سوال اُٹھائے ہیں ۔ مثلاً یہ کہ انشائیہ کیا ہے ؟ عام مضمون اور انشائیہ میں کیا فرق ہے ؟ انشائیہ ، طنز و مزاح سے علیحدہ کیوں ہے ؟

ہمارے لیے یہ سوال بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ انشائیہ کیا ہے ؟ کیونکہ یہ سوال بذاتِ خود کئی سوالوں کا احاطہ کرتا ہے ۔ مثلاً انشائیہ کی پہچان کیسے ممکن ہے اور اس کی تعریف کی حدود میں کون کون سے عوامل کارفرما ہیں ؟ ان سوالوں کے جواب کے لیے ہمیں ماضی سے رشتہ استوار کرنا پڑتا ہے ۔ بات اختر اورینوی سے بھی شروع کی جا سکتی ہے کیونکہ انشائیہ کی اصطلاح کے سلسلے میں انہیں کا نام لیا جاتا ہے اور اس کے لیے ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہو گا کہ انشائیہ کے بارے میں خود ان کے کیا خیالات اور رجحانات ہیں ؟ ۱۹۴۴ء میں شائع ہونے والے علی اکبر قاصد کے مجموعۂ مضامین "ترنگ" کے مقدمے میں اختر اورینوی نے نہ صرف علی اکبر قاصد کے مضامین کو انشائیہ سے تعبیر کیا بلکہ انشائیہ کی مقتضیات پر بھی اظہارِ خیال کیا اور یوں انشائیہ میں فلسفیت پر زور دینے کے علاوہ یہ اعلان بھی کیا کہ "انشائیہ نگاری مضمون نویسی ہی کی ایک خاص صنعت ہے اور یہ پھلجھڑی مشرق میں چھوٹتی نظر نہیں آتی ، جبکہ مغرب میں اس کا بڑا چرچا ہے ۔" اختر اورینوی صاحب کے اس مقدمے سے یہ گمان گزرتا ہے کہ جیسے وہ انشائیہ کی مقتضیات سے تو واقف تھے ، مگر انہیں انشائیہ کی پہچان نہیں تھی ، اور اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اُردو میں ابھی باقاعدہ انشائیہ نگاری کا آغاز نہیں ہوا تھا اور اختر اورینوی کے سامنے صرف انگریزی ایسے تھے لہٰذا انشائیہ کی فنی محاسن کو بیان کرتے ہوئے انہیں انگریزی ایسے پر ہی انحصار کرنا پڑا ۔

ہمارے ہاں اُردو میں بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے پہلے اگرچہ مکمل انشائیہ نہیں لکھا گیا ، لیکن انشائیہ کے نقوش ہمارے انشاء پردازوں کی تحریروں میں جا بجا نظر آتے ہیں ۔ سر سید احمد خان ، مولوی نذیر احمد ، الطاف حسین حالی ، شبلی نعمانی اور عبدالحلیم شرر کی تحریروں میں انشائیہ کے پیوند لگے ہوئے ہیں ۔ چونکہ ان ادباء کے پیشِ نظر اصلاحی مقصد تھا ، اس لیے انہوں نے اصلاحی اور تبلیغی قسم کے مضامین سپردِ قلم کیے ۔ وحید الدین سلیم ، ناصر نذیر فراق دہلوی ، آغا شاعر قزلباش ، میر ناصر علی دہلوی ، سر عبدالقادر کے علاوہ مولوی عزیز مرزا ، سید احمد دہلوی ، نیاز فتح پوری اور اس دور کے دیگر ادباء کے انشائی اسلوب میں تازگی اور شگفتگی کا عنصر تو موجود ہے مگر ان سب کی جہت خارج کی طرف ہے اور خود انکشافی کے رویّے کا فقدان بھی ہے ، جبکہ انشائیہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات کی غوّاصی کر کے اس کی تہہ سے مختلف اشیاء کے نادر اور انوکھے پہلوؤں کو منظرِ عام پر لائے ۔ اُردو انشاء پردازی کی اس روشن و تاباں کہکشاں میں فرحت اللہ بیگ ، رشید احمد صدیقی ، خواجہ حسن نظامی ، سجاد انصاری ، ابوالکلام آزاد اور فلک پیما وغیرہ روشن ستاروں کی طرح چمکتے دمکتے نظر آتے ہیں ۔ لیکن صحیح معنوں میں بنیادی طور پر یہ بھی انشائیہ نگار نہیں ہیں ، کیونکہ زندگی کے غیر اہم موضوعات کو ان کے ہاں "اہمیت" دینے کی کوشش کی گئی ہے ، مگر تخلیقی تازگی کا وہ جوہر ان کے ہاں نہیں ہے ، جو انشائیہ

کے بنیادی اوصاف میں سے ہے۔

ان معروضات کی بنا پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انشائیہ برسوں مٹی تلے دبا نہیں رہا بلکہ اس کے کچھ نہ کچھ نقوش سطح پر ہمیشہ موجود رہے ہیں، خواہ وہ انگریزی ایسے ہو یا اُردو انشاء پردازی۔ یہ سب اُردو کے نامور اور مقبول انشا پرداز تو ہیں مگر انشائیہ نگار نہیں، کیونکہ انشائیہ محض انشاء پردازی کا نام نہیں ہے۔

اے۔ خیام نے جمیل آذر کی تحریر کے ایک فقرہ کے حوالے سے اس بات کی وضاحت چاہی ہے کہ سرسید کے مضامین کو انشائیہ کہنا ان کے مشن کی توہین ہے۔ میرے ناقص خیال میں جمیل آذر کی بات بالکل درست ہے کیونکہ انشائیہ سرسید اور اُن کے رفقاء کے مضامین سے قطعاً الگ چیز ہے۔ انشائیہ کے سلسلے میں وزیر آغا کی بیان کردہ تعریف کی روشنی میں سرسید اور ان کے رفقاء کے مضامین کو پرکھا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ سرسید اور ان کے رفقاء ہی کیا بلکہ ان کے بعد بھی جتنے انشاء پرداز آئے ہیں ان میں سے کسی کی کوئی تحریر بھی انشائیہ کے معیار پر پوری نہیں اُترتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انشائیہ نگاری کا فن تو سراسر تخلیقی عمل اور خود انکشافی کا میٹھا پھل ہے۔ انشائیہ نگاری کا مقصد کسی کی اصلاح نہیں ہوتا بلکہ اس کا کام تو قاری کو اپنی ذات کے مدار سے نکال کر ایک نئے مدار میں داخل کرنا ہے تاکہ وہ اکتساب مسرت کر سکے۔ سرسید کے ہاں واضح طور پر قوم کی بگڑی ہوئی حالت کی اصلاح مقصود تھی تاکہ اُنیسویں صدی کے شکست خوردہ اذہان میں اعتماد کا جذبہ بیدار کیا جا سکے۔ چنانچہ سرسید نے ٹیٹلر اور سپیکٹیٹر کی طرز پر تہذیب الاخلاق کا اجراء کیا۔ انہوں نے اصلاحی مضامین لکھے اور قوم کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو منجدھار سے نکال کر زندگی کی نئی شاہراہ پر ڈالنے کی سعی پیہم کی۔ سرسید کے ان مضامین کو مضمون کی اوّلین صورت تو قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن انشائیے نہیں۔

ان معنوں میں سرسید کے نیک اور ارفع و اعلیٰ مقاصد کو دیکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ سرسید کے مضامین کو انشائیہ کہنا ان کے مشن کی توہین ہے تو یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر حیرت یا اچنبھے کا اظہار کیا جائے۔

ایک اہم اور آخری بات انشائیہ اور مزاحیہ و طنزیہ مضمون کے مابین فرق کی ہے۔ انشائیہ ان دونوں اقسام کے مضامین سے قطعاً الگ ہے۔ لیکن بدقسمتی سے کچھ تو ہمارے درسی نقادوں نے اور کچھ مشکور حسین یاد اور نظیر صدیقی جیسے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین لکھنے والے قلمکاروں نے انشائیہ کو طنزیہ اور مزاحیہ مضمون سے خلط ملط کر دیا ہے۔ نظیر صدیقی نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے مجموعہ "شہرت کی خاطر" میں لکھا ہے کہ "ایسے کو اُردو میں مزاحیہ و طنزیہ مضمون، انشائے لطیف، مضمون، لطیف پارہ اور انشائیہ کہا گیا ہے۔"

مجھے نظیر صدیقی کا یہ بیان درست معلوم نہیں ہوتا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ایسے کو اُردو میں مضمون وغیرہ کہہ سکتے ہیں، لیکن انشائیہ ہرگز نہیں۔ پرسنل ایسے ہی اُردو میں انشائیہ کہلاتا ہے۔ یہ بات تو ادب کا عام قاری بھی جانتا ہے کہ جس مضمون میں مزاح کی فراوانی ہو اور وہ قاری کو قہقہہ لگانے کی دعوت دے تو اُسے ہم مزاحیہ مضمون کہتے ہیں۔ اسی طرح جس مضمون میں طنز کے نشتر چبھوئے جائیں وہ طنزیہ مضمون کہلاتا ہے۔ انشائیہ میں بعض ادباء کے ہاں طنز جب مقصود بالذات بن کر ابھرتا ہے تو انشائیہ کی روح ختم ہو جاتی ہے۔ اور طنز و مزاح کے غلبہ کی وجہ سے موضوع کی مضحکہ خیز صورت سامنے آتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ انشائیہ، طنزیہ مزاحیہ مضمون سے ہٹ کر اپنی راہ الگ بناتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض احباب

یہ سمجھتے ہیں کہ انشائیہ صرف اکتسابِ مسرت کا وسیلہ ہے اور یہ کہ اس میں طنز و مزاح پر قدغن ہے لیکن حقیقت میں ایسی بات نہیں۔ ہمارے سامنے بہت سے انشائیہ نگاروں کے کئی انشائیے ہیں جن میں طنز و مزاح تو موجود ہے، لیکن وہ باندازِ دیگر اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ ایسے کامیاب انشائیے بھی ہیں جو بہترین انشائیوں کے سخت سے سخت انتخاب میں بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں فوری طور پر میرے ذہن میں غلام جیلانی اصغر کا نام آتا ہے، جن کے کئی انشائیوں میں طنز و مزاح کی کیفیت موجود ہے۔ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ طنز و مزاح کی لہریں زیریں سطح پر ہوں تو بھی وہ انشائیہ ہو سکتا ہے۔ بس یہ خیال رہے کہ طنز و مزاح موضوع پر غالب نہ آجائے۔

علی حیدر ملک : عالمی ادب میں سب سے پہلے فرانس کے مونتین نے انشائیہ نگاری شروع کی۔ یہ ۱۵۸۰ء کے لگ بھگ کا زمانہ تھا۔ ۱۵۸۰ء میں اس کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ ایسی تحریروں کو اس نے قلم برداشتہ تحریروں کا نام دیا تھا۔ انگریزی میں بیکن نے انشائیہ نگاری شروع کی اور اس نے اسے افکارِ پریشاں کا نام دیا۔ اب جہاں تک انشائیہ کی تعریفوں کا تعلق ہے، تو ممتاز احمد خاں نے جانسن کی تعریف کا حوالہ دیا ہے کہ یہ ایک ذہنی ترنگ ہے جس میں بے ترتیب، غیر منضبط اور ناپختہ خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح بیکن نے یہ تعریف کی کہ ایسی تحریریں جس میں بغیر کسی تجسس اور کھوج کے کسی حقیقت کا اظہار ہو جائے میری نظر میں انشائیے ہیں۔ اسی طرح جے بی مارٹن نے کہا کہ انشائیہ نثر کا ایک ایسا ٹکڑا ہے جس میں مصنف دنیا کے کسی بھی موضوع کے باب میں اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے۔ یہ تو گویا عالمی ادب یعنی فرانسیسی اور انگریزی میں انشائیے کا حال تھا۔ اردو میں یہ کہا گیا کہ اختر اورینوی نے اس کی ابتدا کی یعنی اصطلاح وضع کی انشائیے کی۔ اور انہوں نے پہلی بار علی اکبر قاصد کی تحریروں کو انشائیہ کہا۔ اختر اورینوی نے جو انگریزی ادب کے طالب علم رہے تھے، "ترنگ" کے مقدمے میں لکھا تھا کہ (میں ان کے مضمون کا اقتباس پڑھتا ہوں)

"دراصل انشائیہ فلسفیت اور رنگینی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایسی فلسفیت جس میں دل جلاپن، خشونت یا وحشت خیز سنجیدگی نہ ہو۔ یہاں فلسفہ ہوتا ہے مگر بغیر رندھے ہوئے چہرے کے، رنگینی ہوتی ہے، مگر ذمہ داری کے ساتھ۔ رندی اور احتساب کا عجیب و غریب مجموعہ، مضحکہ خیز نہیں ہوتا بلکہ امتزاج کامل کے نتیجے میں ایک جزئی نواز شخصیت پیدا کر دیتا ہے۔ ایک ایسی صوفیت جس میں مزاح کا نمک ملا دیا جائے۔ انشائیے میں واقعات تو ہو سکتے ہیں، مگر ان کا استعمال اور برتاؤ انشائیے کے خاص رنگ میں ہونا چاہیئے۔ انشائیے میں مختصر افسانوں کی تیکنک برت دی جائے تو پھر انشائیہ نہیں رہے گا۔ بعض ادباء انشائیہ لکھنے بیٹھتے ہیں، مگر اس میں ماجرا اتنا بالیدہ ہو جاتا ہے، اور مختصر افسانوں کی تیکنک اتنی چھا جاتی ہے کہ نتیجے میں جو چیز پیدا ہوتی ہے، وہ کم از کم انشائیہ نہیں ہوتی۔"

(اختر اورینوی۔ مقدمہ "ترنگ" علی اکبر قاصد۔ ۱۹۴۴ء)

اُردو میں اس سے پہلے اس کا واضح طور پر تصوّر نہیں تھا۔ انگریزی میں جو انشائیہ کی تعریفیں کی گئی ہیں، اختر اورینوی کی تعریف ان سے ملتی جلتی ہے۔ یعنی انہوں نے اس کی تعریف کے سلسلے میں تمام پہلوؤں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی اور اس کا اعتراف وزیر آغا صاحب نے بھی کیا ہے کہ یہ اصطلاح پہلی بار اختر اورینوی نے استعمال کی۔ اب جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ اس صنف

کی ابتدا کب ہوئی، تو اس کے کچھ ابتدائی نقوش سرسید یا محمد حسین آزاد یا میر ناصر علی کے یہاں ملتے ہیں، مگر انہیں باقاعدہ انشائیہ نگار نہیں کہا جا سکتا، جیسا کہ خیام نے بھی اپنے مضمون میں کہا ہے۔

اب اس سے متعلق کچھ دوسری باتیں —— اے خیام جمیل آذر کا حوالہ دیتے ہوئے سرسید سے متعلق لکھتے ہیں کہ مضمون نگاری ایک بامقصد عمل ہے اور انشائیہ اس سے کم تر درجے کی تخلیق۔ پھر میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ کچھ طنز و مزاح نگار اپنی تحریروں پر انشائیہ کا لیبل چسپاں کرنے پر مُصر ہیں یعنی طنز و مزاح جیسے انشائیہ کے ذیل میں آتا ہو۔ یا انشائیہ اس سے کوئی اعلیٰ درجہ کا فن ہو۔ یہاں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ انشائیہ کو کسی اور صنف سے کم تر یا برتر سمجھنے کا رویّہ غلط ہے۔ ہر صنف کی اپنی ایک انفرادیت اور ادب میں اس کی اپنی ایک جگہ ہوتی ہے۔ مگر خیام کا اس میں کوئی قصور نہیں کیونکہ جس طرح اس بحث کو بعض لوگوں نے لیا ہے اور جس طرح وہ اپنے آپ کو منوانے کی کوشش کر رہے ہیں، اس کی وجہ سے خیام کو یہ سوال اٹھانا پڑا۔ درحقیقت طنز و مزاح کو انشائیہ قرار دینے والوں کا حال ان افسانہ نگاروں جیسا ہے جو پرانی طرز کے افسانے لکھتے ہیں اور جدید افسانے کو اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے کوستے رہتے ہیں، مگر اُس کے ساتھ ہی وہ جدید افسانہ نگار کہلوانے کے متمنی بھی ہیں۔ ان کا المیہ یہ ہے کہ نہ تو وہ کلاسیکی افسانہ نگاروں میں جگہ بنا سکتے ہیں اور نہ جدید افسانہ نگاروں میں، لہٰذا ان کے یہاں ایک عجیب مضحکہ خیز صورت حال نظر آتی ہے۔ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین لکھ کر انشائیہ نگار کہلوانے کے خواہش مند افراد کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ وہ نہ تو طنز و مزاح نگاروں میں جگہ بنا سکتے ہیں اور نہ انشائیہ نگاروں میں۔ انشائیہ نگاروں میں شمولیت پر انہیں شاید اس لیے اصرار ہے کہ یہ نئی صنف ہے ان دنوں اس کا چرچا عام ہے۔ اگر بغور دیکھئے تو یہ طنز و مزاح کے اچھے لکھنے والے بھی نہیں ہیں۔ ورنہ جو طنز و مزاح نگار کامیاب ہیں انہیں انشائیہ نگار کہلوانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ مثلاً شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خان، مشتاق احمد یوسفی، ابن انشا اور اسی طرح کے کئی اور لوگ —— احمد جمال پاشا طنز و مزاح بھی لکھتے ہیں اور انشائیہ بھی اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی کون سی تحریر کس زمرے میں آتی ہے۔ یعنی وہ اس فرق کو جانتے ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔

اب ایک اور بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے جو رشید امجد نے کہی ہے۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مستقبل میں صرف انشائیہ باقی رہ جائے گا، اور دوسری اصناف شاید ختم ہو جائیں گی۔ رشید امجد نے یہ بات شاید اس لیے کہی ہے کہ یہ عہد FORMLESSNESS کا عہد ہے، یعنی ہر چیز کا FORM ٹوٹ رہا ہے، ہیئت بگڑ رہی ہے۔ انشائیہ ایک ایسی صنف ہے جس کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں اور FORMLESSNESS ہی کا ایک نام انشائیہ ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اس پر بھی بحث ہو سکتی ہے کہ FORMLESSNESS بھی آگے چل کر ایک FORM کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مگر بہر حال انشائیہ کا دوسری اصناف کے مقابلے میں اپنا کوئی FORM نہیں ہے۔ شاید اسی بنا پر رشید امجد نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مستقبل میں صرف انشائیے کی صنف زندہ رہے گی بقیہ اصنافِ ادب ختم ہو جائیں گی یعنی ان پر عمل کرنا ممکن نہیں رہے گا، کیونکہ جو افراتفری کا، شکست و ریخت کا اور ہیئت کو توڑنے کا عمل معاشرے میں ہے اس کا اثر ادب پر بھی ہونا ہی ہے۔ تو گویا یہ مستقبل کی واحد صنف رہ جائے گی۔ رشید امجد کا یہ خیال بجائے خود غور طلب ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک اور سوال بھی میرے ذہن میں آتا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ وزیر آغا نے خود انشائیے لکھے ہیں اور ان کے بہت سے رفقاء نے بالخصوص اوراق کے لکھنے والوں نے اس کے خدوخال نمایاں کر دیئے ہیں کہ اب انشائیہ کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ لیکن اب جو

ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ آغا صاحب کے بعد کے جو لوگ ہیں وہ مختلف انشائیہ نگاروں کی جو امتیازی خصوصیات ہیں ان کو واضح کریں کہ کہیں سارے انشائیہ نگار ایک ہی طرح تو نہیں لکھ رہے ہیں۔ ان کی امتیازی پہچان کیا ہے؟۔ یعنی جس طرح آپ دوسری اصناف میں کرتے ہیں۔ مثلاً افسانے ہیں کہ افسانے کی ایک تعریف تو ہے لیکن اس کے باوجود ہر افسانہ نگار کی، کم از کم جو اہم ہے، اس کی اپنی ایک پہچان ہوتی ہے، اس کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں، STYLE ہوتا ہے۔ تو یہ جو ساری خصوصیات ہیں مختلف لوگوں کی بالخصوص ان کی جنہوں نے کافی انشائیے لکھے ہیں، مثلاً انور سدید نے لکھے ہیں، مشتاق قمر نے لکھے ہیں، غلام جیلانی اصغر نے لکھے ہیں، جمیل آذر اور سلیم آغا نے لکھے ہیں تو ان کے درمیان فرق کیا ہے۔ مثلاً سلیم آغا کا مجموعہ "سرگوشیاں" پڑھتے ہوئے میں نے یہ محسوس کیا تھا اور اپنے تبصرے میں لکھا بھی تھا کہ ان کے یہاں دو چیزیں نظر آتی ہیں ایک تو یہ کہ عام طور پر جو عنوانات رکھے جا رہے وہ انگریزی طرز کے ہیں، مثلاً جیسے رابرٹ لنڈ کے یہاں ہے کہ "SERMONS ON SHAVING" یا IN PRAISE OF MISTAKES وغیرہ۔ ہمارے یہاں بھی کچھ اسی انداز کے عنوانات رکھے گئے اور ان پر طبع آزمائی کی گئی۔ سلیم آغا نے تھے مگر انہوں نے یہ کہا کہ اس ڈھب کے انشائیے نہیں لکھے۔ بلکہ انہوں نے یک لفظی عنوانات منتخب کیے اور دوسری خاص بات یہ تھی کہ سلیم آغا نے اشیاء کو موضوع بنایا، کیفیات کو نہیں۔ اور یہ ایک امتیازی پہچان ہے جو سلیم آغا کے انشائیوں مثلاً جال، کرسی، مقناطیس دوربین وغیرہ میں نظر آتی ہے۔ دوسرے لوگوں کے یہاں ان کی امتیازی پہچان کیا بنتی ہے؟ اس پر اب نقادوں کو توجہ کرنی ہوگی۔ اس سلسلے میں خوش آئند بات یہ ہے کہ احمد جمال پاشا نے مکمل ایک کتاب لکھی ہے انشائیے پر اور ڈاکٹر انور سدید کی کتاب بھی شائع ہو گئی ہے۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ اس طرح کے جو مسائل ہیں انہیں حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ لیکن ابھی جو میں نے ایک بات رشید امجد کے حوالے سے کہی کہ مستقبل میں انشائیہ ہی ادبی صنف کے طور پر باقی رہ جائے گا، تو اس سلسلے میں میں چاہوں گا کہ آپ لوگ بھی اپنی رائے کا اظہار کریں۔ اور سب سے پہلے میں شہزاد منظر سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

شہزاد منظر : رشید امجد کے حوالے سے اٹھائے گئے سوال کے بارے میں یعنی انشائیہ کے امکانات کیا ہیں۔ تو میں یہی کہوں گا کہ انشائیہ کی تعریف متعین کرنے میں ہمیں انتہا پسندی یا تنگ نظری سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ اور نظریہ سازوں نے انشائیہ کے بارے میں جو اصول وضع کیے ہیں ان پر اتنی سختی سے عمل پیرا نہیں ہونا چاہیئے کہ انشائیہ کی اہمیت ہی کم ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انشائیہ کی اہمیت میں بصیرت اور خیال افروزی سے اضافہ ہوگا۔ اختر اورینوی صاحب نے جو "فلسفیت" کی اصطلاح استعمال کی ہے تو میں اس کی جگہ "خیال افروزی" اور "بصیرت" کا لفظ استعمال کروں گا۔ اس لیے کہ ہر ادیب زندگی کے بارے میں سوچتا ہے اور افسانہ، شاعری میں اس کا اظہار کرتا ہے تو انشائیے میں بھی وہ اس کا اظہار کر سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ شگفتہ انداز میں کرے اور وہ فلسفیانہ و منطقی نہ ہو۔ انشائیے کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کا مقصد صرف حصولِ مسرت ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح اس کے رتبے کو کم کرنا ہے۔ اگر انشائیہ کو واقعی کوئی رتبہ دینا ہے تو اس میں فلسفیانہ افکار کو بھی جگہ دینے کی اجازت ہونی چاہیئے اور سماجی تنقید کو بھی۔ شرط صرف اتنی ہے کہ لہجہ شگفتہ اور غیر علمی ہو کیونکہ اصل اہمیت اندازِ بیان کی ہے۔

علی حیدر ملک : شہزاد منظر نے رشید امجد کے خیال سے بحث کرنے کی بجائے انشائیے کے کچھ اور پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اب میں محمد رضا کاظمی سے درخواست کروں گا کہ اس ضمن میں وہ اپنا ردِ عمل پیش کریں۔

محمد رضا کاظمی : جناب میں پھر کہوں گا کہ انشائیے کی تعریف متعین ہو چکی ہے ، لیکن شہزاد منظر کا یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ یہ عام طور سے مروج نہیں ہے اور لوگ اس کی شناخت نہیں کر پائے ہیں ۔ لیکن شہزاد منظر نے کہا کہ اس کی تعریف پر سختی سے عمل نہیں کرنا چاہیئے تو یہ انشائیے کی شناخت کا وقت ہے ، کیوں کہ انشائیہ ابھی نو وارد صنف ہے ۔ اگر خط فاصل کو مبہم یا کچھ رکھا گیا تو پھر اس کی شناخت کا یا اس کو ممیز کرنے کا کوئی طریقہ ہمارے پاس نہیں رہے گا ۔ ہاں ، اس سے لوگ کس قدر نا واقف ہیں اس کا اندازہ ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے ۔ ایک ادبی نشست میں دیکھنے میں آیا کہ نشست کے بزرگ ترین رکن جو اردو کے پروفیسر بھی ہیں وہ انشائیے کے بانی اور سب سے پہلے حامل مولانا محمد حسین آزاد کو قرار دے رہے تھے اور وہ بھی "آب حیات" کی بنیاد پر ۔ بزم کے سب سے کم سن رکن نے جب اعتراض کیا تو بزرگ اپنا سر تھامے نشست سے برخاست ہونے لگے ۔ میں نہ ان بزرگ کو روک سکتا تھا اور نہ اس نوجوان ادیب کو ۔ میری بے بسی کی یوں تو کئی وجوہات تھیں ، مگر سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں اس نشست کا صدر تھا ۔

اب جو سوال علی حیدر ملک نے رشید امجد کے حوالے سے اٹھایا ہے وہ انشائیہ کے مستقبل کے بارے میں ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر انشائیہ واحد صنف رہ جائے گا ، جیسا کہ اندازہ ہے رشید امجد صاحب کا ، تو میں سمجھتا کہ انشائیہ کی تعریف متاثر ہو نہ ہو اس کا مزاج متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا ۔ اور خیال انگیزی اور فکر کی گہرائی اس میں آجائے گی ۔ اور جو ایک آزاد ذہن اور بیکن کی اصطلاح میں " افکارِ پریشاں " والی بات ہے وہ دب جائے گی اور اپنی اس شناخت میں انشائیہ باقی نہ رہ سکے گا کیونکہ اس کو کئی ادبی اور ذہنی مطالبات کو پورا کرنا ہوگا ۔ میں انشائیے کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں ، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کو آئندہ زندہ رہنے والی واحد صنف کے طور پر برتا گیا تو اس کی شناخت متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی اور انشائیے کی افادیت بھی کچھ کم ہو جائے گی ۔

علی حیدر ملک : محمد رضا کاظمی نے ان سوالات پر بحث کرنے کی کوشش کی جو میں نے اور شہزاد منظر نے اٹھائے تھے ۔ اور اب میں صبا اکرام سے جاننا چاہوں گا کہ ان کے کیا تاثرات ہیں ؟

صبا اکرام : رشید امجد کے حوالے سے علی حیدر ملک نے جو یہ بات کہی کہ آگے چل کر یعنی مستقبل میں انشائیہ ہی ادبی صنف کے طور پر باقی رہ جائے گا اور بقیہ اصنافِ ادب افراتفری کے حالات کے باعث رفتہ رفتہ ختم ہو جائیں گی ، تو اس پر مجھے آغا صاحب کی ایک بات یاد آ رہی ہے جو انہوں نے اپنے ایک مضمون میں کہی ہے اور انشائیے کے خالق کو اس شخص کی طرح بتایا ہے جو دفتر سے گھر آکر تنگ لباس اتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے زیبِ تن کر لیتا ہے اور آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر شگفتہ موڈ میں دوستوں سے گفتگو میں مصروف ہو جاتا ہے ، تو میرا یہ خیال ہے کہ جب افراتفری کی ایسی صورت ہوگی تو کیا بھلا ایسے میں سکون اور اطمینان کے یہ لمحات اور بے فکری کی یہ گھڑیاں میسر آسکیں گی ؟ اور جب ساری اصنافِ ادب ہی افراتفری کی نذر ہو جائیں گی تو انشائیہ لکھنے کے لیے وہ خاص موڈ اور اطمینان اور فرصت کی وہ گھڑیاں ہمیں نصیب ہوں گی ؟ ۔ میں تو یہی کہوں گا کہ ہمیں اتنی بڑی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیئے ۔

ممتاز احمد خان : میں نے رشید امجد کا وہ مضمون نہیں پڑھا جس میں انہوں نے کہا ہے کہ مستقبل میں صرف انشائیہ ہی زندہ رہ جائے گا ۔ مگر یہ سن کر مجھے بے پایاں مسرت ہوئی ہے ، کیونکہ میں اسے بہت ENJOY کرتا ہوں ۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ اگر خدانخواستہ ہم کبھی FORMLESSNESS کی کیفیت سے دوچار ہوئے تو کوئی تو صنفِ ادب ہوگی جو زندہ رہ جائے گی ۔ یہ در اصل انشائیے کا ایک مثبت پہلو ہے ، اور اس کا PLUS-POINT ہے ۔ یہ تو واقعی بڑی اچھی بات ہے ورنہ ہوتا یہ ہے کہ آنے والے وقتوں میں کوئی صنف کیا صورت اختیار

کرے گی یہ بتایا نہیں جا سکتا جیسے افسانہ نے پریم چند کا دَور دیکھا، ترقی پسند دَور دیکھا اور پھر جدید دَور دیکھا اور ہر دَور میں اس کی ہیئت میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ انشائیے میں بھی تبدیلیاں آئیں گی۔ لیکن اگر ہم ابھی سے پیش گوئی کر دیں کہ صنفِ انشائیہ زندہ رہ جائے گی تو یہ بات انشائیے کی مضبوطی اور اس کی اہمیت کے کھاتے میں جاتی ہے۔

علی حیدر ملک : انشائیہ پر کافی گفتگو ہو گئی اور کافی باتیں طے پا گئیں۔ اب میں شہزاد منظر سے یہ جاننا چاہوں گا کہ کیا اس گفتگو میں کوئی پہلو تشنہ رہ گیا ہے، یا کوئی ایسی بات جس پر وہ مزید بحث کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔

شہزاد منظر : صاحب، اس بارے میں میری رائے یہ ہے کہ انشائیہ ہو یا ادب کی کوئی اور صنف، وہ ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر افسانے ہی کو لیجئے، کہ افسانہ پہلے کیا تھا اور آج کیا ہے۔ اسی طرح ناول ہے کہ اس کی جب ابتدا ہوئی تو اس وقت کیا کیا خصوصیات تھیں، مگر آج جو ناول لکھے جا رہے ہیں وہ کلاسیکی ناول سے یکسر مختلف ہیں۔ انشائیہ کے بارے میں بھی میرا خیال ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں آتی جائیں گی۔ کیونکہ ادب کے بارے میں ہر دَور خود اپنا ایک نظریہ لے کر آتا ہے، اور از سرِ نو اس کی تعریف متعین کرتا ہے۔ ادب کی تاریخ دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ ہمیشہ نئی نئی تعریفیں سامنے آئی ہیں۔ انشائیہ کے بارے میں بھی میری یہی رائے ہے کہ آج جس موضوع پر ہم لوگ گفتگو کر رہے ہیں وہ آج انشائیے کی جو صورتِ حال ہے اور جو انشائیے آج لکھے جا رہے ہیں یا ماضی میں لکھے گئے ہیں اسی کو پیشِ نظر رکھ کر ہو رہی ہے۔ لیکن آگے چل کر انشائیہ کیا صورت اختیار کرے گا اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا ذرا مشکل ہے۔ اس لیے کہ جو تخلیقی فنکار ہوتا ہے وہ ہمیشہ مقررہ فارم کو توڑتا ہے، اور اپنا ایک الگ فارم سامنے لاتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ انشائیہ کی شکل بھی آگے چل کر بدلے گی۔ ابھی سے آپ حتمی طور پر کچھ نہیں طے کر سکتے۔ جیسا کہ ابھی خیام نے کہا تھا کہ آپ اس کے اوصاف تو بیان کر سکتے ہیں، لیکن اس کی تعریف کے سلسلے میں میں چاہتا ہوں کہ احتیاط سے ....

علی حیدر ملک : شہزاد منظر کا خیال صحیح ہے، اور خیام نے اس کی پہلے ہی وضاحت کر دی تھی کہ کسی چیز یا صنف کی تعریف متعین کرنا بہت مشکل ہے۔ تعریف اس حد تک ہوتی ہے کہ ہم اس کی پہچان کر سکیں۔ بالکل قطعی تعریف تو کسی بھی صنف کی ممکن ہی نہیں ہے۔ اور ہر زندہ چیز اور ہر زندہ صنف اپنی صورتیں بدلتی رہتی ہے۔ اس میں توسیع ہوتی رہتی ہے اور اس میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ اور وہ انشائیے میں بھی آئیں گی، لیکن اس کی وجہ سے یہ نہیں ہوگا کہ وہ کوئی اور چیز بن جائے۔ آج بھی انشائیہ کے جو مختلف لکھنے والے ہیں ان کے انداز مختلف ہیں — افتادِ طبع کا فرق ہوتا ہے، STYLE کا فرق ہوتا ہے۔

شہزاد منظر : اصل میں میں اس پر زیادہ زور دینا چاہتا تھا کہ انشائیہ میں جتنے تخلیقی ذہن کے لوگ سامنے آئیں گے، اس کے امکانات اتنے ہی روشن ہوں گے۔ لیکن اگر ایسے لوگ آ جاتے ہیں جنہیں انشائیے کا مزاج معلوم نہیں تو پھر کچھ کہنا مشکل ہے کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا۔ کیونکہ کچھ ایسے انشائیہ لکھنے والے بھی سامنے آئے ہیں جن کے انشائیے پڑھ کر اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔

علی حیدر ملک : شہزاد منظر! آپ کا یہ خیال بھی بالکل بجا ہے لیکن یہ کسی صنف کے بارے میں نہیں کہہ سکتے۔ جدید افسانے پر جو الزام ہے، تو آپ الزام کس پر رکھتے ہیں، اُسی پر نا کہ جو بُری مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔ اعتراضات جو ہیں نقادوں کے، جن میں آپ بھی شامل ہیں، وہ بُری مثالوں کو ہی سامنے رکھ کر کیے گئے ہیں۔ مگر تنقید تو ہمیشہ اچھے نمونوں سے بحث کرتی ہے۔ غزلیں بہت لکھی جا رہی ہیں اور ہزاروں خراب غزلیں روزانہ لکھی جا رہی ہیں، تو اچھے شعراء کو تو آپ موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے اس کے لیے — اسی طرح انشائیے میں بھی ہوگا کہ

جب درجنوں آدمی لکھ رہے ہیں تو ان میں کچھ اوسط درجے کے لکھنے والے بھی یقیناً ہوں گے، تو یہ تو ہوگا ہی۔ آپ اس پر کیوں اصرار کرتے ہیں کہ ہر چیز بہت پائے کی، قدرِ اوّل کی اور بہت معیاری ہو۔ یہ تو کبھی ممکن ہی نہیں ہے۔ قدغن کیسے لگائیں گے، آپ۔ لکھنے والا خود بھی نہیں جانتا کہ کس پائے کی تخلیق پیش کر رہا ہے۔ وہ جب پیش کر چکے گا، تو بعد میں آپ کا کام ہوگا نقاد کی حیثیت سے کہ اس کا ASSESSMENT کریں کہ کس نے کس پائے کی چیز پیش کی ہے۔

راغب شکیب: دیکھئے نا شہزاد صاحب! ہر کوئی آپ کی طرح معیاری افسانے تو نہیں لکھ سکتا، نا!

شہزاد منظر: ہا، ہا، ہا (بلا بلا قہقہہ) ــــ بھئی، میرا خیال ہے بہت باتیں ہو گئیں انشائیے پر!

علی حیدر ملک: جی ہاں! کافی گفتگو ہو چکی ہے۔ میں آج کی اس محفل میں شریک تمام احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اردو ادب کی ایک ابھرتی اور مقبول ہوتی ہوئی صنف کے بارے میں معروضیت کے ساتھ گفتگو میں حصّہ لیا ــــ انشائیہ زندہ، گفتگو باقی!

اُردو ادب کی تحریکیں

ڈاکٹر انور سدید کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ

انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی

(کتاب چھپ چکی ہے)

اُٹھنا بیٹھنا

غلام جیلانی اصغر

اُٹھنا بیٹھنا دراصل زندگی کے روزمرہ کے معمولات ہیں۔ اس لیے کسی مفکر نے اس عمل کی اہمیت یا افادیت پر غور نہیں کیا۔ میں خود اک عمر اُٹھتا بیٹھتا رہا ہوں لیکن کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا کہ یہ عمل اتنا سادہ و خودکار نہیں جیسے ہم اسے سمجھتے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک بڑا منصوبہ ہے جس میں بیک وقت عمل اور سوچ مصروفِ کار ہوتے ہیں۔ اگر کبھی آپ فرصت کے لمحات میں اپنی ٹانگوں کی حرکت اور دماغ کے تعاون پر غور کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہماری زندگی عمل اور سوچ کے متضاد راستوں سے ہو کر گذرتی ہے۔ اس لئے جب کوئی عمل اپنی پوری سرگرمی سے وقوع پذیر ہو رہا ہوتا ہے تو سوچ خوابیدگی میں چلی جاتی ہے اور جب سوچ تپتے ہوئے لوہے کی طرح کود رہی ہوتی ہے تو عمل خارج از بحث ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذہن خود ہی سوچتا ہے اور خود ہی عمل کو قوتِ عمل بھی فراہم کرتا ہے۔ وہی کوزہ و کوزہ گر و خود گلِ کوزہ والی بات۔ اس لئے آپ کسی معقول شاعر سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ خود ہی شعر بھی لکھے اور خود ہی اس پر عمل بھی کرے۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہوا کہ آدمی شادی بھی کرے اور اس کے فوائد پر مضمون بھی لکھے۔ خرابی دراصل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب صاحبِ فکر صاحبِ عمل بننے کی بیہودہ کوشش کرتا ہے۔ اور بالآخر دونوں میں ناکام رہتا ہے۔ میرے نزدیک ایک اچھے شاعر کا یہی کمال ہے کہ وہ شعر کو بیدار کر کے خود سو جائے۔ بالکل ایسے ہی جیسے تجربہ کار والدین صبح سویرے بچے کو بیدار کر کے خود سو جاتے ہیں اگر کوئی مفکر، شاعر یا عارف ہمہ تن مین آف ایکشن بنا رہے تو وہ غالباً اچھا پہلوان تو بن جائے گا لیکن اُس سے کسی اچھے خیال، یا کسی معقول حد تک اچھے شعر کی توقع رکھنا عبث ہے۔ صاحبِ عمل تو اس خرگوش کی طرح ہے جو اپنے اندر کے خوف یا اضطراب سے ڈر کر سارا دن بھاگتا ہے۔ اس کی ساری کاوش اس بیکار امر میں مضمر ہے کہ وہ ہمہ وقت حرکت میں رہے۔ اور جب وہ اپنی بے مقصد دوڑ سے تھک کر ذرا رکتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو عمر بھر سراب کا تعاقب کرتا رہا ہے۔ مین آف ایکشن ایک عجیب سی غلط فہمی میں مبتلا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ چیزوں کو درہم برہم کر کے ان کا مزاج بدل دے گا۔ لیکن جونہی وہ اس بیکار حرکت سے فارغ ہوتا ہے تو شاید اپنی عادت کے مطابق پھر اپنی اصل حالت میں آجاتی ہیں۔ ایسا ہی حادثہ اٹیلا ATTILA کے ساتھ ہوا۔ جب وہ اونچے اونچے پہاڑوں کو عبور کر کے اپنے ہاتھیوں سمیت روم پہنچا تو وہ سینٹ SENATE میں بھاری بھرکم سینیٹرز کو پُرسکون بیٹھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُسے اپنا سارا سفر اکارت لگا۔ روم آنے سے پہلے اسے یقین تھا کہ سینیٹرز سراسیمگی کے حالت میں سروقد کھڑے ہو جائیں گے۔ لیکن وہ تو بالکل اسی طرح بیٹھے تھے جیسے وہ سٹیج پر ہونے والا کوئی انتہائی دلچسپ ڈرامہ دیکھ رہے ہوں۔ وہ نہ برافروختہ ہوئے، نہ حیران، بلکہ کسی نے ہلکا سا پروٹسٹ بھی نہ کیا۔ کمال تو یہ ہے کہ جب اٹیلا کے انتہائی باصلاحیت لیکن احمق سپاہیوں نے ان سینیٹرز کے سر بڑی مہارت سے اتار کر میز پر رکھ دیے تو بھی کسی نے تعجب کا اظہار نہ کیا (سنا ہے خود سینیٹرز بھی خاموش رہے) اس داخلی سکون کی وجہ بڑی معقول تھی۔ بات یہ ہے کہ بیٹھنے والا اس خوف سے آزاد ہوتا ہے جو بھاگنے والے مین آف دی میچ کا مقدر ہوتا ہے۔ بھاگنے والے کو تو ہمیشہ

اس نامعلوم شخص سے خوف آتا ہے جو اُس کے پیچھے آ رہا ہے۔ حالانکہ پیچھے آنے والا اُس سے بھی زیادہ ڈرا ہوا ہوتا ہے لیکن بیٹھنے والا آگے پیچھے کی سمتوں کے خوف سے آزاد ہوتا ہے۔ مجھے باعمل آدمی سے ہمیشہ ڈر لگتا ہے کیوں کہ وہ اپنے اندر کے خوف سے بچنے کے لئے اپنے باہر خوف کی ایسی فضا پیدا کر دیتا ہے جس میں سب لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے لیڈر اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں، اگر اصلی دشمن دستیاب نہ ہو تو وہ مفروضہ دشمن تخلیق کر کے پوری قوم کو خوف کے آسیب میں گرفتار کر دیتے ہیں۔

اُٹھنا یعنی حرکت محض بیٹھنے کی نفی ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہمارے سارے فکری رویوں کو متعین کرتا ہے۔ اس معمولی سی جسمانی حرکت نے پورے مابعد الطبیعاتی نظام کو متاثر کیا ہے۔ پتھر جب تک باوقار طور پر ایک جگہ بیٹھا رہتا ہے تو لوگ اس کے بے حرکت، بھاری بھرکم وجود کا احترام کرتے ہیں۔ انہیں اس کے اندر ایک ایسی قوت یا شکتی کی روح نظر آتی ہے جو لڑھکتے ہوئے پتھر سے یکسر غائب ہو جاتی ہے۔ لڑھکتا ہوا پتھر تو ایک ایسا آوارہ سلف ہے جو مین آف ایکشن کی طرح بھاگتا پھرتا ہے۔ اس کی تلاش یا جستجو کا مرکز اس کی ذات کے اندر پوشیدہ وہ روح یا mana نہیں ہے جو اُسے دیوتا بنا سکتی تھی بلکہ اس کا سارا حاصل تو باہر کی حرکت ہے جو کچھ عرصے کے بعد بے مقصد نظر آنے لگتی ہے۔ جو پتھر اپنی جگہ بیٹھا رہا تو اُسے کسی رہگذر نے دیوتا تسلیم کر لیا اور اس کے چرنوں میں عقیدت اور محبت کے وہ سارے پھول نچھاور کر دیئے جو معصوم لوگوں نے عمر بھر کی کاوش سے اکٹھے کئے تھے بابل یا سومنات کا بُت بھی ایک ایسا ہی پُرسکون پتھر تھا۔ بلکہ اب بھی جب کہ انسان اپنے روحانی سفر کا بہت سا فاصلہ طے کر چکا ہے تو وہ ایسے ہی انسانی بتوں کو احترام کی نظر سے دیکھتا ہے جو سکون کی حالت میں ہوں۔ بھاگتا ہوا کروڑپتی تو اتنا ذلیل نظر آتا ہے کہ کروڑ کے ہندسے سے اعتماد ہی اُٹھ جاتا ہے۔ امریکہ جیسا فعال ملک جہاں زیادہ تر توجہ ٹانگوں پر دی جاتی ہے اب غالباً نسوانی ٹانگوں سے بھی بیزار ہو کر بے حرکت صوفیوں کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے پھر توجہ کا مرکز ناف بن گئی ہے۔ ناف صرف ہمارے جسم کو دو معقول حصوں میں ہی تقسیم نہیں کرتی بلکہ بیٹھنے کی علامت بھی ہے میرے نزدیک بیٹھنا دراصل ایک ایسا اعزاز ہے جو صرف دیوتاؤں اوتاروں اور ولیوں نے اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ کچھ عرصہ سے اس مخصوص حلقہ میں ہیپی حضرات بھی شامل ہو گئے ہیں لیکن ان کا سارا سکون مصنوعی اور سطحی قسم کا ہوتا ہے۔ وہ بیٹھے ہوئے بھی تمام وقت عالمِ ملکوت میں رواں دواں رہتے ہیں۔ اُن کے لئے بیٹھنا تو محض جسم کو حرکت کے سفر میں ایک نقطہ پر روک لینا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی موٹر ڈرائیور محض پانی بدلنے کے لئے موٹر کو لمحہ بھر روک لے اسے ہم بیٹھنا نہیں کہہ سکتے۔

اگر آدمی کا خارج بیٹھا ہوا ہو اور اس کا اندر سفر کی حالت میں ہو تو ایسا آدمی کرب کی جولان گاہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ اب تک جتنے ہیپی قسم کے نوجوانوں سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی ہے اُن سے مل کر یہی احساس ہوا ہے کہ یہ بیچارے تو سندباد کی طرح ایک نہ ختم ہونے والے سفر پر نکلے ہوئے ہیں۔ جب یہ کچھ دیر نشے کی ترنگ میں کہیں بیٹھ بھی جاتے ہیں۔ تو ان کے اندر کا مسافر بگٹٹ اپنے سفر پر جا رہا ہوتا ہے۔ بالکل اُس گھوڑے کی طرح جو رسّوں کی قید میں اپنے ہی تھان پر مستقل بھاگ رہا ہو۔

بیٹھنا جیسے میں نے ابھی عرض کیا ہے، ایسا اعزاز ہے جو عام لوگوں کو عطا نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ خدشہ رہتا ہے کہ کہیں احمق لوگ کم آگہی کی وجہ سے اس اعزاز کو حرکت میں ضائع نہ کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہل حرکت مزدور طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کا معاوضہ بھی اسی تناسب سے کم ہے وجہ غالباً یہ ہے کہ حرکت کو تو ماپا جا سکتا ہے۔ اور جو چیز ماپی جا سکے اس کی قیمت کا تعین کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ چنانچہ سنا گیا ہے کہ ایسے باحرکت لوگوں کو عالم بالا میں بھی حرکت میں ہی رکھا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حرکت جسم کو ایک ایسی روش پر ڈال دیتی ہے جہاں چلتے چلتے مدام چلنا ہی زندگی کا مقدر بن جاتا ہے۔ جسم ایک خودکار پرزے کی طرح حرکت کرتا رہتا ہے اور جونہی یہ حرکت رکتی ہے۔ جسم کو خدشہ ہو جاتا ہے کہ شائد مشین کا کوئی کل پرزہ

خراب ہو گیا ہے۔ سب سے بڑا انعام (اس کا صحیح اندازہ تو مجھے نہیں) اُس طبقہ کے لئے مخصوص کیا گیا ہے جو بقول ملٹن صرف انتظار کرنے کی پالیسی پر عمل کرتا ہے۔ ہماری کچہریوں میں بھی غالباً اسی سنہری اصول پر عمل کیا جاتا ہے۔ وہی لوگ آخر کار کامیابی سے سرفراز لوٹتے ہیں جو صدیوں بیٹھے انتظار کے عمل سے گزرتے رہے ہوں۔ میں جب بھی کچہری کے باہر کسی ایسے آدمی کو بیٹھے دیکھتا ہوں جو ساری دوڑ دھوپ اور شورشِ حیات سے بے نیاز ہو کر حقہ پی رہا ہو یا محض سمادھی کی حالت میں بیٹھا ہو تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ آدمی صرف اللہ تعالیٰ کے ہاں ہی محترم نہیں بلکہ جج صاحبان کے میزان میں بھی اتنا ہی گرانقدر ہے۔ جو لوگ بیٹھ کر لذت کش انتظار نہیں ہو سکتے وہ بہت جلد کچہری سے بے نیل مرام لوٹتے ہیں اور انہیں ناکام لوٹنا بھی چاہئے کیونکہ انہوں نے بیٹھنے کے عمل کا پورا احترام نہیں کیا۔ وہ اس چلّہ کش کی طرح ہیں جس نے چلّہ اپنے ابتدائی مراحل میں ہی ترک کر دیا ہو۔ چلّہ ترک کرنا اتنا معیوب نہیں جتنا چلّے کی تاثیر سے مایوس ہونا۔ ایسا آدمی جو بیٹھے بیٹھے تھک کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، یا چہل قدمی کرنے لگتا ہے دراصل کیفیتِ نشست سے ابھی پوری طرح پر شر ابور نہیں ہوا ورنہ اُٹھنا اس کے لئے کارِ مشکل اور اُسے اٹھانا کارِ محال ہوتا۔ غالب نے اس لمحہ کو بڑی فنکارانہ چابکدستی سے اپنے مصرع میں استعمال کیا ہے ؎

بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں؟ بظاہر تو یہ بات بُری لگتی ہے کہ ایک باریش آدمی خلعتِ سلطانی پہنے سڑک کے درمیان بیٹھ جائے لیکن یہ بات اور بھی شرمناک ہے کہ کوئی غیر معقول آدمی اسے اٹھائے۔ بیٹھنا دراصل عالمِ سکون کا اظہار ہے۔ اٹھانا اس سکون کو زیر و زبر کرنے کی کوشش۔ اور آپ جانتے ہیں کہ کسی کا سکون تلف کرنا محض غیر اخلاقی ہی نہیں بلکہ غیر قانونی بھی۔ ذوق نے اپنی ایک غزل کی ردیف میں "اُٹھ نہیں سکتا" پر بڑا زور دیا ہے۔ لیکن ذوق کا سارا انداز غیر ذمہ دارانہ ہے۔ اس سے بیٹھنے کا وقار مجروح ہوتا ہے۔

اٹھنے بیٹھنے کا تعلق اگر صرف نشست و برخاست سے ہوتا، تو شاید میں اسے اتنی اہمیت نہ دیتا، لیکن بدقسمتی سے ان دو لفظوں نے زندگی کے ایسے رویّوں کو جنم دیا ہے جس نے طبعیات۔ ریاضیات اور فلکیات کو بہت بُری طرح متاثر کیا ہے۔ اُڑتی ہوئی چیزوں کا مزاج متحرک چیزوں سے بنیادی طور پر مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے جب تک ہم (میرا مطلب آپ سب حضرات سے ہے) یعنی اس کرۂ خاک پر رہنے والے اجرامِ فلکی میں شریک نہیں ہوئے تھے تو بڑے شادکام تھے۔ یہ زمین اپنی تمام کوتاہیوں اور میونسپل کمیٹیوں کے باوجود ایک صاف ستھری جگہ تھی۔ اسے مرکزِ کائنات ہونے کا فخر حاصل تھا اور ہمارے آباؤ اجداد کو اشرف المخلوقات ہونے کی عزت حاصل تھی۔ یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں اس زمانے میں اتنی مضطرب نہیں تھی، بلکہ ملکہ وکٹوریہ کی طرح تخت پر پورے عزّ و احتشام کے ساتھ جم کر بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر ایک دن کسی سرپھرے سائنسدان نے یہ بتایا کہ یہ زمین تو اتنی کمتر ہے کہ اس کا شمار گھٹیا ترین چوہدرانیوں میں بھی نہیں ہوتا۔ اور یوں بھی ہمہ وقت گردش میں رہتی ہے۔ جس دن یہ بات عام ہو گئی سارے تصورات ہی درہم برہم ہو گئے۔ یوں تو زمین اب بھی ویسی ہی ہے جیسے برف کے زمانے میں تھی بلکہ نسبتاً آرام دہ لیکن گردش کے تصور نے اس کے وقار کو بُری طرح مجروح کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی میری عزتِ نفس پر بھی چوٹ پڑی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی معقول سا ادیب یا سائنسدان مجھے یقین دلا دے کہ گردش کا سارا تصور ہی احمقانہ تھا اور زمین اب بھی اپنی سہیلیوں کے درمیان آسودہ خاطر پوری شانتی سے بیٹھی ہوئی ہے تو میرا سارا نقطۂ نظر ہی بدل جائے گا۔ میرے ادبی رویّوں اور وفاداریوں میں استحکام پیدا ہو جائے گا۔ اور آپ مجھ پر اعتماد کر سکیں گے۔ جب کہ زمین ہر دم گردش میں ہو تو وفاداریوں میں استحکام کیسے ممکن ہے؟ کیا واقعی ایسا نہیں؟ جس زمانے میں دنیا کی گردش کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں تھی۔ دوستی اور دشمنی ایک پائیدار قدر تھی۔ آپ نے ایک باوقار دوستی کر لی تو پھر یہ سمجھ لیں کہ عمر بھر کا روگ پال لیا۔ اُس زمانہ میں اگر آپ کے دوست نے قرضے کے آپ کے گوشت کا ایک کلو ضمانت کے طور پر لکھوا دیا تو آپ کو ذرا بھر بھی افسوس نہیں ہوگا۔ بلکہ عین راحت، کیونکہ دوستی میں گوشت تقریباً مشترکہ اثاثہ سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے معاشرہ میں بیٹھنے والے کو مسندِ اقتدار پر بٹھایا جاتا تھا۔ گاؤں کا چودھری تکیہ کے سہارے پوری چارپائی پر پھیل کر

بیٹھتا تھا۔ اُس کی ذات پر کوہ ہمالیہ کا گمان ہوتا تھا۔ اس کا سارا سراپا ایک جما ہوا تودہ سنگ نظر آتا۔ اس لئے جب وہ کوئی بات کہہ دیتا تو اُسے سند سمجھ لیا جاتا۔ آج کا بھاگتا ہوا انسان اس اعتماد سے محروم ہو گیا ہے۔ کیونکہ اُس نے بیٹھنا ہی ترک نہیں کر دیا۔ بلکہ ان تمام شرافتوں، پائیدار قدروں اور وفاداریوں کو بھی ترک کر دیا ہے۔ جن کا تعلق بیٹھنے سے تھا۔

آپ مجھے ہی دیکھیں۔ میں پچھلی دو دہائیوں سے ایک ہی جگہ بیٹھا ہوں۔ اس لئے جب بھی 'ڈ' میر اکسی سے تعارف کراتا ہے تو وہ یہ کہنا ضروری سمجھتا ہے۔ "یہ ہیں پروفیسر گل محمد جو پچھلے کئی سالوں سے ذہنی اور جسمانی طور پر ایک ہی مقام پر رُکے کھڑے ہیں"۔ یہ تعارف بظاہر تو نیم سنجیدہ اور نیم طنزیہ ہوتا ہے لیکن اس سے ایک خاص قسم کی محبت اور یگانگت کا اظہار ہوتا ہے یہ دراصل دو انسانوں کے درمیان ایک ایسے اعتماد کا اظہار ہے جو اس مفروضہ پر استوار کیا گیا ہے کہ انسان سیلِ رواں کی طرح نہیں بلکہ کوہ گراں کی طرح ہے۔ وقت اُس کے اندر نقب تو لگا سکتا ہے لیکن اس کی وفاداریوں کے خد و خال کو نہیں بدل سکتا۔ زندہ رہنے کے لئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آدمی کی بنیادی خاصیت بیٹھنا یعنی استقرار ہے نہ کہ چلنا یعنی فرار۔ اگر کسی بیوی کو یہ یقین ہو جائے کہ اس کا خاوند ہر وقت چلتا رہتا ہے تو ہر گھر نا آسودہ قبیلہ کا مبل بن جائے اور شادیاں مستقل غیر آبادیوں میں بدل جائیں۔ دوستی کی وادیوں میں دراڑیں پڑنے لگیں اور عقیدے اس طرح پگھل جائیں جس طرح پولکا ۱۲۰ سینٹی گریڈ پر پگھل جاتی ہے۔ اس لئے میں بقول حفیظ جونپوری بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے۔ سردیوں میں چھاؤں کو دھوپ سے بدل لیتا ہوں لیکن اس سے بیٹھنے کے عمل پر تو کوئی حرف نہیں آتا۔ اٹھنا میرے نزدیک کیونکہ حرکت کی علامت ہے اس لئے میں حرکت کو نقطۂ انجماد پر لے آیا ہوں۔ نتیجہ وہی جس کا غالب نے ذکر کیا ہے۔ اِک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے۔

غلام جیلانی اصغر کے شگفتہ انشائیوں کا مجموعہ

نرم دمِ گفتگو

جلد چھپ رہا ہے

وراثت

غلام جیلانی اصغر

اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ کچھ تو شاید اس وجہ سے کہ موضوع ہی غیر دلچسپ ہے، اور کچھ اس لیے کہ جو ادیب خداداد صلاحیتوں کے مالک ہیں وہ وراثت سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اور جو رکھتے نہیں وہ ادیبوں میں شمار ہی نہیں ہوتے اس لیے ان کی وراثت اتنی اہم نہیں کہ اسے موضوع بحث بنایا جائے۔ میر اردو کا پہلا شاعر تھا جس نے وراثت کو اپنے شعر کی بُنت میں شامل کیا۔ اسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ عالی نسب سید ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے نام کے دونوں پہروں پر اس امر کا اعلان کیا ہے۔ اور عمر بھر (محض سیادت کی وجہ سے) اپنے کاروبار عشق پر تاسف کرتا رہا۔ کیونکہ اس سے جسمانی نظام کے علاوہ عزتِ سادات کو بھی نقصان پہنچا۔ اگر آپ کو میر کی کلیات پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے، اور یقیناً ہوا ہوگا، تو آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ میر کا سارا دکھ اس کے خون کی عطا ہے۔ اگر وہ روزمرہ قسم کے خاندان سے تعلق رکھتا، روزمرہ زندگی کو عام سطح پر گزارتا، بیوی بچوں کے علاوہ محض عطار کے لونڈے سے صرف دوا مانگنے تک اپنی ضروریات کو محدود رکھتا تو بڑی مطمئن موت مرتا۔ لیکن یہ بے اطمینانی جیسے میں نے عرض کیا ہے، میر کی وراثت کی دین تھی۔ یہ تو میر کی وریدوں میں تھی۔ اگر وہ نہ بھی روتا تو بھی اس کے کلام پر ہمہ وقتی سوگواری کا رنگ غالب رہتا۔

وراثت ایک چابک دست نقب زن ہے۔ یہ سیم کی طرح آدمی کے اندر اس وقت داخل ہو جاتی ہے، جب اس کی بنیاد رکھی جا رہی ہوتی ہے۔ اب بدقسمتی سے سیم اگر مکان کی بنیادوں میں داخل ہو جائے اور آہستہ آہستہ اس کے در و دیوار سے نمودار ہونے لگے تو آپ کیا کر سکتے ہیں؟ آپ سو بار پلستر اکھاڑیں اور نیا لگائیں، لیکن برسات کی پہلی بارش کے ساتھ ہی وہ پوشیدہ سیم مکان کے پیکر خاکی سے باہر آ جائے گی۔ اور آپ کی تعمیراتی سوجھ بوجھ کا مذاق اڑائے گی۔ سیم تو دیواروں کے بطون میں بیٹھی اس لمحہ کا انتظار کر رہی ہوتی ہے جب دیواروں کی خارجی ترتیب میں ذرا سا بھی رخنہ پیدا ہو۔ جونہی یہ لمحہ نایاب نمودار ہوتا ہے، چھپی ہوئی سیم اپنی پوری برہنگی اور جارحیت کے ساتھ دیواروں کے نہاں خانے سے باہر نکل آتی ہے۔ غالب نے اسے تعمیر میں مضمر خرابی کا نام دیا ہے۔ ہمارے اندر جبلت کا طرز عمل بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے۔ جونہی اسے ہماری شخصیت کا کوئی کمزور گوشہ نظر آتا ہے، وہ پوری بیدردی سے باہر نکل آتی ہے۔ اس لیے عام طور پر شرفا آنکھوں پر کالا چشمہ لگانے کی ہدایت کرتے ہیں تاکہ جبلت کے راستہ میں تھوڑی سی رکاوٹ تو موجود رہے۔ اقبال نے جبلت کی توانائی کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں تعلیم و تعلم کے اثر کو غیر موثر سمجھا ہے۔ ملاحظہ ہو سے نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے۔ یعنی اچھی تعلیم کے لیے موزوں وراثت کا ہونا ضروری ہے۔ طبیعت جس کا تعلق خون کے عمودی بہاؤ سے ہے، اب اتنی معروف حیثیت اختیار کر گئی ہے کہ عقلمند والدین نے تربیت یعنی تعلیم سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ یوں تو مغرب میں بھی موزوں وراثت نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم بیکار ہوتی جاتی ہے لیکن ہمارے ہاں اہل علم پہلے ہی یہ امر تسلیم کر چکے ہیں کہ تعلیم صرف وراثت کے عطا کردہ جوہر کو ہی نکھار سکتی ہے۔ اور اگر یہ جوہر سرے سے ہی ناپید ہو، تعلیم و تدریس کا سارا عمل بیکار سمجھنا چاہیئے۔ ابھی پچھلے دنوں ہی جب مجھے اپنے ایک عزیز کی تعلیمی رپورٹ میں ہر مضمون کے آگے صفر کا نشان نمایاں نظر آیا تو

میں موزوں وراثت کی ضرورت کا قائل ہوگیا، اور اقبالیات کا مطالعہ از سر نو شروع کر دیا۔ کیونکہ اردو شاعری میں اقبال وراثت کے کمالات کا سب سے بڑا داعی ہے۔

ممکن ہے آپ کو اس تجزیہ سے کچھ اختلاف ہو۔ اختلاف برحق ہے، لیکن آپ میری دلیل کی بنیادی صداقت سے انکار نہیں کر سکتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ تعلیمی ادارے بند کر دیں، (کیونکہ وہ پہلے بھی بقول میر کم کم کھلتے ہیں) نہ ہی میرا یہ اصرار ہے کہ تعلیمی اداروں میں داخلے کے وقت موجودہ ٹسٹوں میں وراثت پر بھی ایک باقاعدہ ٹیسٹ کا اضافہ کر دیا جائے۔ اس طرح تو تعلیمی اداروں میں داخلہ اور بھی مشکل ہو جائے گا۔ لیکن اگر وراثت پر باقاعدہ ٹیسٹ ممکن نہیں تو کم از کم یہ تو ہو سکتا ہے کہ طالب علم اور ولدیت کے علاوہ اس کے ماں باپ کے رائج الوقت خون کا گروپ بھی لکھ دیا جائے۔ ایسا کرنے میں آخر حرج ہی کیا ہے؟ اب تو مغرب میں بھی یہ عام رواج ہوگیا ہے کہ طالب علم کے ذاتی کوائف میں خون کا گروپ اور باپ کا نام بھی شامل کر دیا گیا ہے تاکہ انتقال یا انتقالِ خون کے وقت آدمی کے شجرہ نسب کا پورا پتہ چل سکے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک شریف آدمی محض غیر شریف خون کے غیر ضروری دباؤ کی وجہ سے فوت ہوگیا۔

انسان کی بیالوجی اس لحاظ سے بڑی دلچسپ ہے کہ وہ غیر متجانس یعنی FOREIGN BODIES کو قطعاً قبول نہیں کرتی۔ مثلاً اگر آپ کسی مہمانِ عزیز کو کوکا کولا کی جگہ سٹرک ایسڈ (CITRIC ACID) پلا دیں تو اس کی حالت غیر بلکہ غیر تسلی بخش ہو جائے گی۔ حالانکہ CITRUS سٹرس فروٹ کھانے میں کوئی قباحت نہیں۔ اسی طرح اگر خون کے ایک گروپ کی جگہ دوسرے گروپ کے چند قطرے بھی شریانوں میں چلے جائیں تو اندر کا سارا نظام بغاوت کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ایک خون کا رنگ یا گاڑھا پن دوسرے سے مختلف ہے۔ فرق تو صرف خون کے ذرات یا خلیوں کی داخلی ساخت کا ہے۔ اور یہی فرق دراصل نظامِ وراثت اور نظامِ تعلیم کا ہے۔ آپ نے اکثر محسوس کیا ہوگا (دیکھنا اس لیے ممکن نہیں کہ عام طور پر شرفا کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوتا) کہ تمام شرفا کے خون کا رنگ اور مزاج ایک جیسا ہوتا ہے۔ رنگ عام طور پر سفید یا نیلا ہوتا ہے۔ اسی لیے انگریزی زبان میں بلیو بلڈ کی ترکیب مستعمل ہے۔

خاندانی شرفا کی طرح تخلیقی فن کاروں کے خون کے ذرات بھی ایک ہی ساخت کے ہوتے ہیں۔ بیشتر شعرا (دوسری اصنافِ ادب کو فی الحال خارج از بحث سمجھیں) مختلف خاندانوں سے وابستگی کے باوجود تخلیقی سطح پر ایک ہی نظامِ وراثت سے وابستہ ہوتے ہیں۔ نظیری نے تو نہایت واضح انداز میں اس نسلی قرابت داری کا ذکر بھی کیا ہے ــــ گے کہ گشتہ نہ شُد از قبیلۂ ما نیست۔ لیکن اس حقیقت کا سب سے عمدہ مظاہرہ مشاعروں میں ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کوئی مشاعرہ سننے یا کم از کم دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ کوئی ثقہ یا معروف شاعر دوسرے شاعر کے شعر کی داد نہیں دیتا۔ البتہ جہاں ہم سخنی کا رشتہ ذرا گہرا ہو وہاں شاعر اپنے سر کو اس انداز سے جھٹکا دیتا ہے جیسے اس کے اندر کے برقیاتی نظام میں کوئی خرابی واقع ہوگئی ہو۔ اس داد میں داد سے زیادہ مظلوم پر ترس کھانے کا انداز غالب ہوتا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب سی لگتی ہے، لیکن دراصل یہ سارا عمل بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ کی نمایاں کامیابی پر آپ کا چچا اور خصوصاً آپ کی چچی کبھی خوش نہیں ہوتے۔ جب آپ مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں تو سماجی حلقوں میں سب سے زیادہ دکھ آپ کے قریبی رشتہ داروں کو ہوتا ہے۔ حالانکہ اصولاً سب سے زیادہ خوشی انہیں ہی ہونی چاہیئے تھی۔ شعرا میں داد کا مسئلہ بھی اسی قسم کی نسبی دشمنی یا رقابت کے ذیل میں آتا ہے۔

اس شعری رقابت یا وراثتی ہم آہنگی کی سب سے عمدہ مثال غالب اور ذوق کی ہم عصرانہ چشمک ہے۔ دونوں ایک ہی شہر میں بستے تھے۔ دونوں لال قلعہ سے وابستہ تھے۔ اور دونوں شہنشاہ گردوں وقار سے تقریباً ۳۰ سے ۳۵ روپے تک ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ لیکن اس موانست کے باوجود ایک دوسرے پر چوٹ کرنے کا موقع ضائع نہ کرتے۔ حالانکہ دوسرے شرفا جو دربار سے متعلق تھے اور شعر سے واجبی سی دلچسپی رکھتے تھے دونوں کو بیک وقت داد دیتے۔

اس رقابت کی وجہ تو آپ سمجھ گئے ہوں گے، کہ وراثت خواہ خون کی ہو یا مزاج کی اپنے اندر اپنا تضاد یعنی ANTITHESIS بھی رکھتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ مَیں تنقید میں مارکس کا ہم نوا ہوں، حاشا و کلّا (یہ دونوں ہم زلف ہیں) مَیں نے صرف مارکس کا نام ہی پڑھا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کی سرسید مارکہ داڑھی دیکھی ہے۔ اس سے زیادہ اُس کی تعلیمات سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ مَیں اس کے نظامِ فکر کو یوں بھی پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ وراثت کی نفی کرتا ہے۔ بہر صورت مزاج کی وراثت سے آپ کو شعری رقابت کا اندازہ تو ہو گیا ہوگا؟ مَیں خود بفضلِ تعالیٰ شاعر ہوں، اس لیے مزاج کی اس افتاد کو خوب سمجھتا ہوں۔ مجھے عام طور پر وہ خواتین و حضرات زیادہ داد دیتے ہیں جو شعر تو کم سمجھتے ہیں لیکن میرے چال چلن کی توانائی کے معترف ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ شریف آدمی اپنی چال سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ خیر۔

بات دراصل سکول میں داخلے سے شروع ہوئی تھی۔ اور میری دلیل کی بنیاد انتہائی قابلِ اعتماد یعنی اقبالؔ کا نظریۂ وراثت تھا۔ اقبالؔ اور غالبؔ کے فکر میں مجھے یہی اہم مماثلت نظر آئی ہے۔ اقبالؔ طبیعت یعنی وراثت کو تعلیم و تدریس پر فوقیت دیتا ہے (دیکھیں حوالہ کے لیے 'سرِ وکنارِ جُو'، 'دالاشعر') غالبؔ بھی اپنے آباء کے پیشۂ سپاہ گری کو اپنے لیے وجہِ افتخار سمجھتا ہے۔ شعر کو تو وہ محض وجہِ شہرت سمجھتا ہے، نہ کہ وجہِ عزت۔ (اب بھی شعرا اور شرفا میں یہی تمیز کا پیمانہ ہے) یہی بات آپ کو یاسؔ یگانہ کے ہاں ملے گی۔ مَیں جب بھی اُس کا کوئی شعر پڑھتا ہوں، تو اپنے سامنے خانِ اعظم کو بنفسِ نفیس کھڑا پاتا ہوں۔ یاسؔ کے ہاں جو آواز و انداز کی انفرادیت ہے، وہی چیز آپ کو چنگیز خان کے ہاں بھی ملے گی۔ وہ اپنے دَور کا واحد شخص تھا جس نے قتل و غارت میں جدیدیت کا آغاز کیا۔ اگر وہ ہماری صدی میں پیدا ہوتا تو اُردو شاعری میں جدیدیت کا بانی ہوتا۔ یاسؔ اور غالبؔ کا ادبی جھگڑا محض اتفاقی نہیں بلکہ یہ دونوں کے شجرۂ نسب کا منطقی نتیجہ ہے۔ اور تعلیم اس اختلاف کو دُور نہیں کر سکی۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ دونوں شعرا پر تعلیم کا بہت کم اثر پڑا ہے۔ اسی لیے یاسؔ زود رنج تھا اور غالبؔ زود فراموش خصوصاً قرضے کے معاملہ میں۔ دونوں کی وراثت نے دونوں کے ذہنی ارتقا کو مختلف انداز میں متاثر کیا۔ اگر غالبؔ کا شجرۂ نسب خانِ اعظم سے ملتا تو اس کی شاعری کا مزاج بالکل مختلف ہوتا۔ واللہ اعلم

تعلیم اور تربیت میں بہت گہرا اختلاف ہے۔ تعلیم کا کام صرف آگاہی ہی نہیں دینا بلکہ اُن نسبی ناہمواریوں کو رفع کرنا ہے جو وراثت کے طویل سفر میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ تعلیم تمام وراثتوں کی نفی کر کے محمود و ایاز کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنا چاہتی ہے۔ (بیماری کی سطح پر پلیگ بھی تقریباً یہی فریضہ سرانجام دیتی ہے) اس لیے سکولوں اور کالجوں میں مختلف خاندانوں کے انتہائی مختلف اور متفرق بچوں کو ایک ہی کمرہ میں بٹھایا جاتا ہے۔ ان کا نصابِ تعلیم بھی ایک جیسا ہوتا ہے، اور تقریباً استاد بھی۔ اس طریقۂ تعلیم سے شرفا کو جو نقصان پہنچا ہے، اس کا اندازہ اسمبلیوں کے انتخابات سے لگایا جا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض شرفا نے سرِ عام ہار کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ عام لکھے پڑھے لوگوں سے مختلف نہیں۔ اگر تعلیم کا مقصد کچھ اقدار کو برقرار رکھنا ہے تو پھر ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ تعلیم کے سارے زیریں اور بالائی درجوں کو بلڈ گروپ کی طرح الگ الگ خانوں میں بانٹا جاتا، اور بچوں کی تعلیمی صلاحیت سے زیادہ اُن کی خونی درجہ بندی کو مدِ نظر رکھا جاتا تاکہ کبوتر با کبوتر، باز با باز والی پالیسی پر عمل ہو سکتا۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ماہرینِ تعلیم، تعلیم کے علاوہ انسانی شرافت کے بنیادی گُتھیوں سے بھی ناآشنا ہیں۔ انگریز کے زمانے میں وراثت کے تحفظ کے لیے چیفس کالج موجود تھے۔ اور غیر وراثتی طلبا کے لیے کمیٹی کے اسکول۔ چنانچہ ابتدا ہی سے والدین کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی کہ بچہ پڑھے گا۔ یا آگے بڑھے گا! مَیں خود (جس کے خون میں پانی اور گھی کی آمیزش بہت کم ہے) اس ابتدائی تقسیم کو صرف جائز نہیں سمجھتا بلکہ بزعمِ خود یہ تنزّلِ شرافت کے احیا کے لیے ضروری بھی سمجھتا ہوں۔ میرے کچھ عزیز جو میرے نظریۂ وراثت کو درست تسلیم کرتے ہیں، وہ اپنے بچوں کو بحفاظت تمام تعلیم کے جملہ نقصانات سے بچا لائے ہیں۔ اس کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ ہمارے محلّہ میں وہی رونق ہے جو ڈزنی لینڈ میں مہنگے داموں میسر آتی ہے۔

زندگی کا بلا واسطہ تعلق تو وراثت سے ہی ہے۔ اگر آپ کو وراثت میں عام لوگوں سے زیادہ خلیے ملے ہیں تو آپ روشن دماغ، روشن ضمیر اور روشن مزاج ہوں گے۔ محض خون کی سرخی کی وجہ سے آپ اگر الیکشن یا کسی ایسی ہی مہم میں حصہ لیں گے۔ تو آپ کی کامیابی یقینی ہے، وجہ؟ آپ خلیوں کے زور پر زیادہ دلیروں، زیادہ فاتحوں، اور دوسری ایسی ہی تقریبات میں بھرپور کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اور اگر آپ کا مخالف حسنِ اتفاق سے محض تعلیم یافتہ ہوا تو وہ پہلی ہی دعوت میں سوئے ہضم کا شکار ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندگی اور الیکشن سے دستبردار ہو جائے گا۔ وراثت آدمی کو خود اعتمادی خود شناسی اور یقین کے جملہ اوصاف عطا کرتی ہے۔ تعلیم اس کے برعکس اپنی ذات سے باہر حقائق پر زیادہ زور دیتی ہے۔ وراثت اور تعلیم کا بنیادی فرق دو جہتوں کا اختلاف ہے۔ وراثت کا مزاج عمودی ہے۔ لیکن تعلیم ایک افقی کاوش ہے چنانچہ وراثت کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنا صرف غیر ضروری ہی نہیں بلکہ نقصان دہ بھی ہے لیکن تحصیل علم کے لیے ایک اُفق سے دوسرے نامعلوم افق تک سفر کرنا ضروری ہے۔ اس سفر کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ بقول اقبالؔ ایسے افراد لغت کے قارون بن جاتے ہیں لیکن علم کی اصلی اساس سے محروم رہتے ہیں۔ اسی لیے ادب ایسے آدمیوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ کیونکہ وہ ادب کو چند پیش پا افتادہ موضوعات اور فرسودہ الفاظ کے سوا کچھ نہیں دے سکتے۔ لیکن جب کوئی برنز BURNS جیسا اَن پڑھ شاعر ادبی منظر نامے میں داخل ہوتا ہے تو وہ ایسے اثرات چھوڑ جاتا ہے جنہیں ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اردو ادب میں بھی وہی شاعر زیادہ معروف ہوئے جن کی وراثت میں ادب کے جرثومے موجود تھے۔ جن حضرات نے غیاث اللغات کے سہارے زندہ رہنا چاہا وہ بہت دیر تک زندہ نہ رہ سکے۔ اسی لیے میں جب کبھی کسی معروف ادیب یا شاعر کو پڑھنے کا ارادہ کرتا ہوں تو اس کی تعلیم کو نظر انداز کر کے اس کی وراثت پر زیادہ توجہ دیتا ہوں کیونکہ یہی وہ سرچشمہ ہے جس سے سارے دریا پھوٹتے ہیں۔

ماہنامہ

قومی زبان کراچی

ہر ماہ تازہ مضامین کے ساتھ شائع ہوتا ہے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ کراچی ۱

تولیہ

ارشد میر

تولیہ زمانۂ حال کی ایجاد ہے۔ پون صدی قبل تک اس کا کوئی ایک آدھ ہی نام لیوا تھا۔ برِّصغیر کی تقسیم تک بھی چند گنے چنے گھرانوں کے علاوہ اس کے بارے میں کبھی تردّد نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہماری تہذیبی، سماجی اور معاشرتی زندگی پر اتنا حاوی اور اثر انداز ہو چکا ہے کہ مرد و زن اس پر دل و جان سے فریفتہ ہیں۔ اس کی غیر موجودگی سے تلملا اُٹھتے ہیں، بپھر جاتے ہیں اور جلی کٹی سنانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ایسا کرنے میں وہ کسی حد تک حق بجانب بھی ہیں کیونکہ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ تولیہ نسلِ انسانی کا مربّی ہے۔ اور اس کا مقصود اور منتہائے نظر سوائے خدمتِ انسانی کے اور کچھ نہیں۔ چنانچہ روز مرّہ کے معمولات میں بھی یہ انسان کے جسم کی جملہ میل کچیل کو خوش دلی سے اپنے اندر جذب کر کے اسے بلّور کی مانند صاف اور شفّاف بنا دیتا ہے۔ اور یوں ایک مثالی اسفنج یا با اعتماد خاکروب کا رول ادا کرنے میں کوئی ذلّت یا توہین محسوس نہیں کرتا۔ ایک اور خوبی قابلِ ستائش ہے کہ آپ خواہ اسے پیار بھرے ہاتھوں سے جسم پر پھیریں یا بے رحمی سے رگڑنے کا طریقہ برتیں یہ ہر حال میں غلام بے دام ہے۔ بلکہ بعض حالتوں میں چیتھڑوں کی شکل اختیار کرنے پر گھر کے استعمال شدہ برتنوں اور فرشوں کی صفائی پر بھی سیخ پا نہیں ہوتا۔ شاید اس لیے کہ اس کے مقدر کا ستارہ ہر نہج کی صفائی میں ہی دمکتا اور چمکتا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ بھنگ کے چند رسیا نشہ کے عالم میں بکرے کی "اوجڑی" کی بجائے تولیہ پکا کر چٹخارے لیتے ہوئے چٹ کر گئے۔ لیکن اس کے باوجود تولیے نے کوئی احتجاج نہ کیا۔ حالانکہ عہدِ حاضر میں معمولی سی بدسلوکی پر بھی ایسا ہو جانا خلافِ معمول نہیں ہے۔

تولیہ جمہوری اقدار کا پاسبان اور مساوات کا علمبردار ہے خواہ کوئی مسلّمہ دیوانہ ہو، یا ڈگری یافتہ دیوالیہ، مالیخولیا کا شکار ہو، یا خیالی پلاؤ پکانے کا دلدادہ، وہ ان سب میں خطِ امتیاز نہیں کھینچتا بلکہ اس کا برتاؤ ان سے ہمدردانہ، مصالحانہ، اور مشفقانہ ہوتا ہے۔ یہی نہیں خسروانہ ماحول میں بھی جا کر اپنی قلندرانہ خو بُو سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی کسی طبقاتی سرشت کا خوگر ہے۔ یہ وطیرہ تو انسانی جبلّت کا ہے کیونکہ انسان فطرتاً خود غرض اور مفاد پرست ہے جس نے اپنی انا اور برتری کے تسلّط کے لیے اپنے ہی بھائیوں کے خون سے ہولی کھیلی، طبقاتی کشمکش کے ناٹک رچائے اور اسی کوشش میں سرگرداں رہا، کہ اس کی ذات مرکزِ نگاہ ہو۔ اس کے برعکس تولیہ کا مطمعِ نظر ہی ذات کی نفی میں مضمر رہا ہے۔ اور یہ وہ نکتہ ہے جسے تصوّف کے گہرے اسرار و رموز کے بغیر جاننا شاید ممکن نہ ہو۔

مَیں ذاتی طور پر تولیہ کے بارے میں اکثر فکر مند رہتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ غسل خانے میں کبھی ڈھونڈنے پر نہیں ملتا، یا ان حضرات کی محرومی کا سوچ کر کیفیت طاری ہوتی ہے جن کے قبضۂ قدرت میں تولیہ جیسی نعمتِ غیر مترقبہ نہیں ہوتی یا ہونے کی صورت میں ایک تولیے کو ہی پورا کنبہ یا جماعت یا علیحدہ علیحدہ استعمال کرنے پر مجبور ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی جِلد پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ آئے دن معمولی سے معمولی شے کے موجد کا نام تو پڑھنے سننے میں آتا رہتا ہے لیکن انسانیت کے اتنے عظیم محسن تولیہ کے خالق کو کیوں پردۂ راز میں رکھا جا رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کوئی اہلِ شرق کا

فرزند دلبند تھا جو ابھی تک اہلِ مغرب کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح مسلسل کھٹک رہا ہے اور وہ خاموشی سے کسی موزوں موقع کی تلاش میں ہیں کہ کسی طرح اس کا نام بھی ڈھاکے کی ململ کے کاریگروں کی طرح تاریخ کے اوراق سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جائے۔ حالانکہ سرسری نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو اس کا مزاج اہلِ مغرب سے لگا ہی نہیں کھاتا۔ اگر زبردستی اس کا سہرا اپنے سر باندھ لیں تو پھر اس کا کیا تدارک کریں گے کہ تولیے نے آج تک گورے، کالے، رنگ و نسل یا بندہ و آقا میں کوئی تمیز روا نہیں رکھی۔ جبکہ اہلِ مغرب طبعاً افراط و تفریط کو ہر بات میں روا رکھتے ہیں۔ بلکہ دیکھا جائے تو اہلِ مغرب نے تولیے سے اُس کی مساوات پسندی اور جمہوری اندازِ نظر چھین کر اسے اپنا مزاج تفویض کر دیا ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں تولیہ بھائی چارے کی فضا قائم کرنے کے بجائے انسانوں میں تفریق اور نفرت پیدا کرنے کا موجب ہے۔ مغرب کا ہر شخص نہ صرف اپنا ایک الگ تولیہ رکھتا ہے بلکہ کسی دوسرے کو اس کے استعمال کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ اسے مغرب کے بورژوائی مزاج ہی کا شاخسانہ قرار دینا چاہیے جب کہ مشرق والوں کا تولیہ نہ صرف وراثت میں دست بدست سفر کرتا ہے بلکہ اس نے ہمیشہ برادرانہ اخوت اور بھائی چارے کے جذبے کے تحت تمام افرادِ خانہ بلکہ پوری قوم کے لیے مرکزی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ مغرب میں تنہائی اور اکلاپے کی جو وبا آئی ہے وہ تولیے کی تقسیم ہی کے باعث ہے۔ دوسری طرف مشرق میں اگر سماج پوری طرح جڑا ہوا ہے اور تنہائی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا تولیہ تا حال مشترک ہے بلکہ ایک قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔

تولیہ جو بظاہر ادنیٰ اور حقیر سی چیز دکھائی دیتا ہے، بے پناہ خوبیوں سے مالا مال ہے۔ اس کی مانگ انسانی زندگی میں پنگھوڑے سے لے کر آخری غسل تک برابر جاری و ساری ہے۔ ہر کس و ناکس دن میں کئی کئی مرتبہ اس سے رابطے استوار کرتا ہے۔ اور نہیں تو مصافحہ کی نوبت تو ایک آدھ مرتبہ ضرور آ جاتی ہے۔ پھر کمال یہ ہے کہ تولیہ بھی صبح کاذب سے لے کر شب بخیر تک اپنے مزاج کو برہم کیے بغیر پوری ذمہ داری اور تن دہی سے اپنی ڈیوٹی سر انجام دیتا ہے۔ انفرادی سطح پر ہی نہیں بلکہ نائی کی دوکان سے لے کر فضائی پروازوں تک میں اپنے فرائضِ منصبی میں کوتاہی کا مرتکب نہیں ہوتا۔ نائی کی دوکان میں تو ہو سکتا ہے، ہزاروں گاہکوں کی گردنوں سے لپٹنے اور ہاتھوں سے چھوئے جانے کے باوجود دھوبی کی بھٹی چڑھے بغیر ہی عمرِ طبیعی گزار جائے۔ البتہ فضا اور خلا میں مغربی اثرات کے تحت اسے دوبارہ استعمال کرنا جراثیم کو دعوت دینے اور پھیلانے کے مترادف سمجھا جانے لگا ہے۔ جراثیم کے خلاف تو ویسے ہی اہلِ مغرب کی مہم زوروں پر چل رہی ہے جن میں سرِ فہرست وہ نازک اندام اور نازک مزاج خواتین و حضرات ہیں جو کہیں مجبوراً کسی اور کا تولیہ استعمال کر لیں تو انہیں کھجلی ہونے لگتی ہے۔ بالخصوص فائیو سٹارز ہوٹلوں (FIVE STARS HOTELS) میں تشریف لے جانے والوں کے تولیوں کو تو دن میں کئی کئی بار تبدیل کیا جاتا ہے۔ اگر کہیں معمولی سی لغزش ہو جائے تو پھر ہوٹلوں کے اربابِ بست و کشاد کی جان پر بن آتی ہے۔ اسی طرح ملکی سطح کے ہسپتالوں میں ڈاکٹر صاحبان دُھلے دُھلائے تولیوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ اور جب وہ کسی مایوس مریض کو "تولیائی غسل" (TOWEL BATH) کا مژدہ دیتے ہیں تو اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ البتہ صنفِ نازک کا معاملہ جدا ہے۔ بعض دلربا نازنین اور فلمی ہیروئنیں تو بلا جھجک پردۂ سکرین پر تولیے کے جلو میں "شو بزنس" کی خاطر اپنے ناز و نخروں سے تماش بینوں کو نوازنا فرضِ کفایہ سمجھتی ہیں۔ یہی نہیں تولیہ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس سے ثقہ اور پارسا حضرات تک بھی کوئی حجاب روا نہیں رکھتے۔ اس سے یہ نتیجہ بہ آسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تولیے اور بنی نوعِ انسان میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بلکہ اب تو یوں لگتا ہے جیسے اس کے بغیر انسان ہی مکمل نہیں رہ جاتا۔

تولیہ کی اس خوبی سے تو ہر ہمہ شما واقف ہے کہ یہ نہ صرف پانی (کھارا، میٹھا اور سرد و گرم بلا تخصیص) بلکہ خجالت سے لے کر تمازت تک کے پسینوں کو سمونے کی استعداد رکھتا ہے۔ بلکہ اناڑی سے لے کر کھلاڑی تک کے پسینوں سے یکساں برتاؤ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ خدا جانے دوزخ کی دہکتی آگ کس نوع کے پسینے لاتی ہوگی، لیکن اگر کوئی اللہ کا بندہ وہاں کے حالات کا خصوصی جائزہ لے کر خاص الخاص تولیوں کی سپلائی کا سلسلہ جاری کرنے میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکے تو شاید اس سے جہنمیوں کو قدرے آسودگی مل جائے۔ کیونکہ تولیہ ہر انداز کے عرقِ انفعال کو اسی طرح جذب کر لیتا ہے جیسے بلاٹنگ پیپر

ہر رنگ کی روشنائی کر جنت میں تولیہ کا گزر تو ویسے ہی ناممکنات میں سے ہوگا کیونکہ نہ ہی وہاں نہانے دھونے کا دھندہ ہوگا اور نہ ہی کوئی فرد پسینے کی لعنت سے آشنا ہوگا۔ البتہ کسی مذہب یا فرقہ کو تولیے کے کفن پر قدغن نہیں لگانی چاہیئے بلکہ اسے اپنانے سے قبروں میں مُردوں کو گرمیوں میں ائرکنڈیشن جیسا سرور اور سردیوں میں ہیٹر جیسی حرارت نصیب ہو سکے گی۔

تولیہ بغیر کسی لالچ یا ذاتی منفعت کے انسان کو شائستہ بنانے اور مہذب کہلوانے کے لیے اپنی بساط کے مطابق شب و روز خدمات سر انجام دیتا رہا ہے جبکہ انسان اپنے خصائل اور عادات کے ہاتھوں مجبور ہے۔ جونہی اسے آرام کی سہولتیں اور آسائش کی نعمتیں میسّر آئیں وہ تن آسان پسندی اور آرام کوشی کا دلدادہ ہو جاتا ہے اور خوب سے خوب تر کی تلاش کی لگن میں مگن ہو کر اپنے دیرینہ قدر دانوں سے بھی کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے کوئی خفت یا ندامت محسوس نہیں کرتا۔ چنانچہ انسان کی اسی روش کا اظہار تولیہ کی ہمہ وقت خدمت گزاری کے صلے میں یوں دیکھنے میں آ رہا ہے کہ انسان (بالخصوص مغرب کا انسان) جو ایک وقت میں کوہ ایورسٹ سر کرنے کے لیے جان کی بازی لگانے سے بھی باز نہیں آتا، مریخ تک پہنچنے کے لیے شب و روز ہاتھ پاؤں مارتا ہے وہی اب تولیہ کے استعمال کے لیے ڈائننگ ٹیبل سے غسل خانے تک جانا بارِ گراں سمجھتا ہے چنانچہ اس نے اس مقصد کے لیے کھانے کی میز پر ٹشو پیپرز فراہم کر لیے ہیں۔ اور اپنی دانست میں تولیے سے بے نیاز ہونے کی کوشش میں ہے ایک طرف احسان فراموشی کا یہ عالم ہے۔ دوسری جانب تولیے کا کردار دیکھئے کہ جس نے "تاجرانِ تولیہ" کی بسیار کوشش کے باوجود بچگانہ، زنانہ اور مردانہ سطح پر بھی اپنا نام تبدیل نہیں ہونے دیا۔ حالانکہ لباس اور جوتوں تک کے آئے دن نام بدلتے رہتے ہیں۔ ویسے دیکھا جائے تو تولیہ اگر اپنا نام تبدیل کرنا چاہتا تو وہ حق بجانب بھی تھا۔ کیونکہ چاندی سے لے کر سونے تک، لکڑی سے چل کر لوہے تک حتیٰ کہ مختلف النوع کی خوردنی اشیاء ہمیشہ میزان میں تلتی ہیں لیکن ان میں سے کسی کا بھی تول کی مناسبت سے نام نہ رکھا گیا ہے۔ جبکہ تولیے کا تکلنے تلانے سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ لیکن ان کی بجائے "برعکس نہند نام زنگی کافور" کے مصداق اسے یہ نام تفویض کیا گیا ہے اور وہ ثابت قدمی، وفاداری بشرطِ استواری اور عزم راسخ سے اسے حرزِ جاں بنائے ہوئے ہے اس لیے اگر کبھی دنیا کی مختلف قومیں اسلحہ کی بےہنگم دوڑ دھوپ سے توبہ استغفار کر کے بین الاقوامی حکومت بنانے کے منصوبہ میں کامیاب و کامران ہو جائیں تو پھر تولیہ کی خدمات کے پیشِ نظر ان کا فرضِ اوّلین ہے کہ اسے انسان دوستی کے سمبل اور مشترکہ جھنڈے کی صورت میں اپنا لیں۔ مؤخر الذکر پوزیشن میں زیادہ سے زیادہ اہم ممالک کے جھنڈوں سے ایک ایک رنگ منتخب کر لیا جائے جو تولیے پر زیبرا کراسنگ کی مانند مزیّن کر دیا جائے۔ لیکن اس کی اوّلین شرط یہ ہو کہ جس طرح زیبرا کراسنگ پر قدم رکھتے ہی سڑک کی دو طرفہ ٹریفک فوری طور پر رُک جاتی ہے بعینہٖ زیبرا کراسنگ تولیہ کی برکت سے اسلحہ اور ایٹمی دَوڑ کو بھی یکسر ختم کرنے کا اعلان کر دیا جائے۔ یقین جانیے اس میں انسانیت کی فلاح مضمر ہے کیونکہ بین الاقوامی سطح پر کامل اتحاد اور جان پہچان کا یہی واحد ذریعہ ہے جس کی مخالفت میں کسی ملک کا کوئی نمائندہ بھی ایک لفظ ادا کرنے سے قاصر ہوگا بلکہ یقینِ کامل ہے کہ اس کی خدماتِ جلیلہ کے اعتراف میں آمدہ مندوبین اسے ہدیۂ تہنیت پیش کریں گے۔

زُبان

سلیم آغا قزلباش

زُبان دانتوں کے مستعد چوبداروں کی کڑی حفاظت میں ایک لاابالی ملکہ کی طرح رہتی ہے مگر یہ زمانے کے رنگ ڈھنگ سے بھی بخوبی آشنا ہے۔ شروع شروع میں اس کا دائرہ کار فقط جسم کو اشیائے خورد و نوش کی کڑواہٹ یا مٹھاس سے باخبر رکھنے تک محدود تھا تاکہ وہ کہیں غلطی سے کوئی زہریلی چیز نہ کھا مرے، پھر اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور جسم کے اندر بسنے والے کی خواہشوں کی تکمیل میں دیکھتے ہی دیکھتے ہر ذائقے کو چکھنے لگی۔ مانا کہ یہ "اندر والے" کے معمولی اشارے پر زبان دانی کا مظاہرہ بیچ چوراہے کر سکتی ہے، مگر اس سب کے باوجود اس کی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ منہ کی پٹاری میں یہ کسی ناگن کی طرح پھنکارتی ہے، سو سو بل کھاتی ہے، اس کا ڈسا ہوا پانی بھی نہیں مانگ سکتا، البتہ یہ کرم فرمائی پر مائل ہو جائے تو خود اپنے ہی زہر کا تریاق بن کر حیات نو کا پروانہ بھی ہاتھوں میں تھما دیتی ہے۔ مجھے بعض اوقات یقین ہی نہیں آتا کہ انسان نے ایک تڑپتی مچلتی ہستی کو کیونکر اپنے گھٹے دہن میں گھیر رکھا ہے، شاید ہونٹوں کے بند بھی زبان کی تلملاہٹ ہی کو روکنے کے لیے باندھے گئے تھے لیکن یہ نوکِ زبان سے چند لمحوں میں ہی انہیں موم کر لیتی ہے اور وہ فی الفور اس کے اشاروں پر ناچنے لگتے ہیں۔ یوں بھی اگر یہ منہ میں زیادہ دیر تک چُپ چاپ بیٹھی رہے تو اس کا دم رُکنے لگتا ہے، لہٰذا یہ ہر آن بولتی ہے، ترکی بہ ترکی جواب دیتی ہے، راز و نیاز کی باتیں کرتی ہے اور پیار محبت کی پینگ کے ہلارے لیتی ہے، بلکہ یہ تو نازک سے نازک ذائقے کی تلخی ترشی اور شیرینی کو یوں جان جاتی ہے جیسے کوئی ماہر صراف سونے کی ڈلی میں کھوٹ کی معمولی سی آمیزش کو بھی چٹکیوں میں پہچان لیتا ہے۔ ایک مرتبہ میں زبان کی بدمزگی کا علاج کروانے اپنے ڈاکٹر کے پاس گیا تو ڈاکٹر صاحب نے میری شکایت سنتے ہی کہا۔ "ذرا اپنی زبان تو دکھایئے" اور پھر زبان کو ملاحظہ کرتے ہی ارشاد فرمایا "میٹھی چیزوں کا استعمال ذرا کم کیا کریں"۔ میں جو اس سے پہلے زبان کو جسم کا محض ایک "باتونی" عضو سمجھتا آیا تھا، یک بیک اس کی خاموش زبانی کا قائل ہو گیا اور شاید پہلی بار مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ یہ جسم کے اندر کی بھی ہمراز ہے اور جب اس کے جی میں آئے جسم کے رازِ نہاں کو نوکِ زبان پر لا کر طشت ازبام کر سکتی ہے، چنانچہ میں اس نتیجہ پر بھی پہنچا کہ زبان کو حتی المقدور منہ میں بند ہی رکھنا چاہیئے۔

موجودہ دور کے ہر شریف آدمی کے پاس تین زبانیں (لغوی اعتبار سے) ہر وقت موجود ہیں یعنی دکھانے والی، دھمکانے والی اور کھا پی کر مکر جانے والی، مگر ظاہری ساخت کے اعتبار سے سب زبانیں "یک زبان" ہیں فرق صرف ان کے طریق استعمال کا ہے اور اسی بات سے زبان داں اور بے زبان کا فرق بھی عیاں ہو جاتا ہے، ورنہ خوبصورت ریپر میں لپٹی لپٹائی کسی چیز کے کھرا کھوٹا ہونے کی قلعی کیونکر کھل سکتی ہے۔ بعض زبانیں قینچی کی طرح ہر وقت کتر کتر چلتی رہتی ہیں اور پل بھر میں سب کچھ کاٹ ڈالتی ہیں۔ اس قسم کی زبانیں دم لے کر بات کرنے کے انداز کو سخت ناپسند کرتی ہیں۔ ایسی نوع کی زبانیں بیویوں کو بکثرت الاٹ ہوئی ہیں۔ دوسری بڑی تعداد اُن زبانوں کی ہے جو ہاں میں ہاں ملانے ہی میں اپنی عافیت دیکھتی ہیں، یہ صرف شوہروں کے نصیب میں لکھی گئی ہیں، پھر کچھ زبانیں بڑی تحمل مزاج ہوتی ہیں، چاہے ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑیں مگر یہ اُف تک نہیں کرتیں، ایسی زبانیں اللہ کے

خاص خاص بندوں کو ہی عطا ہوتی ہیں اور اگر کبھی یہ رضائے الٰہی سے مائل بہ حرکت ہو جائیں تو وقت کی زمام ان کے ہاتھوں میں آجاتی ہے اور انقلابات تسبیح کے دانوں کی طرح ان کی انگلیوں میں گردش کرنے لگتے ہیں۔ بعض لوگوں کی زبان شیطان کی آنت ہوتی ہے، ایسی زبان کو من مانیاں کرنے کا سودا ہوتا ہے بلکہ یہ خونخوار درندے کی سی خو بُو بھی رکھتی ہے۔ چنانچہ اس کو پٹہ ڈالنے کے لیے سارے قانون قاعدے گھڑے گئے ہیں مگر یہ پھر بھی غراتی رہتی ہے اور اگر خدا نخواستہ کوئی خاص بھید یہ اپنے اندر چھپائے تو راج کرنے والی زبان ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ایسے میں بیچارے جسم کی تو گویا شامت ہی آ جاتی ہے، اکثر اوقات یہ جسم کی حالت پر رحم کھا کر راز اگل دیتی ہے لیکن کبھی کبھی یہ جسم کی ایک نہیں سنتی اور خود کو مرتے دم تک بتیس دانتوں میں بند رکھتی ہے۔ دیکھنے میں تو یہ "مِن کنگلٹ" سے مشابہ ہے مگر عملی طور پر ساری ہلچل، جنگ و جدال اور جرأت پیزار اسی آفت کی پرکالہ کے نت نئے پھندوں اور کرتوتوں کا شاخسانہ ہے۔ یہ بیک وقت کئی قسموں کی میٹھی میٹھی اور کڑوی بولیاں بولتی ہے، لیکن ان بولیوں کا لُب لباب فقط یہ ہے کہ اس کے زیادہ سے زیادہ چونچلے اٹھائے جائیں۔ مگر کتنے افسوس کا مقام ہے کہ دہن کے چند مربع انچ بالاخانے میں بیٹھنے والی اس مغنیہ کے لیے صدہا اقسام کے الوانِ نعمت کیا ماکولات کیا مشروبات، شب و روز باورچی خانوں، کارخانوں، بھٹیوں اور تنوروں میں سینکڑوں ہاتھوں کی مدد سے تیار کیے جاتے ہیں تاکہ سستے داموں زیادہ سے زیادہ لذتِ کام و دہن اس زبان دراز مخلوق کو مہیا کی جا سکے۔ اس لحاظ سے زبان مجھے مُغلِ اعظم سے کسی طور کم مرتبہ نظر نہیں آتی جسے سیاہ و سفید پر مکمل اختیار حاصل تھا اور جس کی خوشنودی کی ہر کسی کو ضرورت تھی۔

سُننے میں آیا ہے کہ روح جسم کے زندان میں اسیر ہے، اگر یہ بات سچ ہے تو پھر روح کی گرمی کو محسوس کرنے کے لیے زبان کے مقیاس الحرارت کو بروئے کار لائے بغیر چارہ نہیں۔ گنگ زبان دراصل کسی نقص کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اظہار کی شدت کا غیر معمولی اظہار ہے، جس سے اس کا پورا سرکٹ خراب ہو جاتا ہے اور یہ گراموفون کی سوئی کی طرح ایک جگہ پر اٹک کر رہ جاتی ہے۔ وہ زبان جو لکنت کا مظاہرہ کرتی ہے درحقیقت شخصیت کی احتیاط پسندی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ ایسی زبان کے مالک و مختار ہر بات بڑے سوچ بچار کے بعد منہ سے نکالتے ہیں اور تکلم کے ہر صیغے کو مناسب "وقفوں" اور "فل سٹاپوں" میں انجام دینے کے قائل ہیں، لیکن وہ جو ایک ایک لفظ کو چبا چبا کر گفتگو کرتے ہیں، افادیت پسندی کے پکے پیروکار مانے جاتے ہیں، جبکہ وہ لوگ جو فر فر بولتے ہیں، زندگی میں کسی اصول ضابطے کو خاطر میں نہیں لاتے۔ انجام کار زبان کی باگ ڈور پر اختیار نہ ہونے کے سبب منہ کی کھاتے ہیں اور پھر ایک دن ذہنی توازن کھو کر پاگل خانے کا در کھٹکھٹانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایک زبان پھولوں کی چھڑی ایسی بھی ہوتی ہے، جب یہ گل باری پر آتی ہے تو یوں لگتا ہے کہ ٹوکروں کے حساب سے گل و لالہ جھڑ رہے ہیں، اس زبان کے پروردہ جیتے جی اپنی من کی مرادیں پالیتے ہیں، البتہ ایک زبان ایسے گُنوں والی بھی ہے جو کسی وقت بھی خار دار جھاڑی میں تبدیل ہو سکتی ہے اور کوئی چاہے اس سے ہزار دامن بچا کر گزرے یہ اس سے اُلجھ پڑتی ہے اور بالآخر اس کا کوئی نہ کوئی بخیہ ادھیڑ کر ہی دم لیتی ہے۔ ایسا مزاج رکھنے والی زبان کا چلن روز افزوں ہے، جس کے نتیجے میں دامن کے چاک کو گریباں کے چاک میں منتقل کرنے کے وافر مواقع پیدا ہونے لگے ہیں، پھر ایک زبان ایسی بھی ہے جو دوسروں کو قائل کرنے کے لیے ہٹ دھرمی سے کام لیتی ہے اور اکثر نازک موقعوں پر اپنے مادری لہجے میں باوزن گالی دے کر معترض کی ہر معقول بات کو فرش کر دیتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو "کھری بولی" میں ایسی کھری سناتی ہے کہ سامعین کی طبیعتیں صاف ہو جاتی ہیں۔ میں نے اس سے زیادہ عجیب بات آج تک نہیں سنی کہ جسم کے گھاؤ تو مندمل ہو جاتے ہیں مگر زبان کے گھاؤ کبھی نہیں بھرتے۔ حالانکہ جسم پر لگے گھاؤ کی مناسب طبی دیکھ بھال نہ کی جائے تو ان کے بگڑ جانے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ اصل میں زبان کی کارکردگی کا سارا دارومدار اس کی حاضر جوابی میں ہے۔ وہ صاحبان جن کی زبان اور خیالات میں تال میل برقرار رہتا ہے اکثر و بیشتر مناقشے کی بازی جیت جاتے ہیں اور اللہ کے وہ نیک بندے جن کے خیالات ذہن کی رسد زبان کی احتیاج سے میل نہیں کھاتی عموماً بھری محفل میں اپنی سُبکی کروا کر اُٹھتے ہیں البتہ گھر پہنچ کر انہیں وہ تمام جوابات دھڑا دھڑ یاد آنے

لگتے ہیں جن کا عین موقعہ پر کال پڑ گیا تھا۔ لہٰذا زبان کی ورزش اور صفائی و صلائی کا کام انتہائی ضروری ہے تاکہ اس کی صحت اور پھرتی میں کسی طور کمی نہ آنے پائے۔ ایسی زبان جو غضب ناک حالت میں کف اڑاتی ہے مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس قسم کی زبان آداب و دشنام طرازی سے یکسر نابلد ہوتی ہے بھلا محض کف اڑانے کا فائدہ! یہ تو ناتجربہ کاروں کا وطیرہ ہے۔ منجھا ہوا بدکلام تو اپنی زبان میں ایسی تہ دار گھمبیرتا اور کھنک پیدا کرتا ہے کہ حزبِ مخالف سات پشتوں تک لرزہ بر اندام ہو جاتی ہے۔

غالب نے کہا تھا

؎ ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے!

اس شعر کا مفہوم فقط یہ ہے کہ مرزا صاحب مہذب طریقے سے محبوب کے حضور احتجاج کرنے کا درس دینا چاہتے تھے۔ غالب کا یہ مہذب احتجاج سر آنکھوں پر لیکن میرے خیال میں مرزا صاحب محبوب کی چہکتی بولتی زبان کو پنجرے میں بند کرنے کا گر نہیں جانتے تھے ورنہ وہ معذرتی پیرایہ ہرگز اختیار نہ کرتے۔ یہ معاملہ صرف غالب کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ تمام سخن وران اردو زبان اپنے اپنے محبوب کے آگے جس بے زبانی اور بے سروسامانی کا رونا روتے آئے ہیں وہ محض ان کی عاقبت نا اندیشی کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ محبوب سے اجازت طلب کیے بغیر زبان کے جوہر دکھا کر اسے شرمسار کرنے کی زحمت فرماتے تو پھر شاید محبوب بھی بے چون و چرا ان سے غیر مشروط ناطہ جوڑنے پر راضی ہو ہی جاتا۔ صاف بات تو یہ ہے کہ حالات کی گرمی سردی، تلخی اور شیرینی بلا واسطہ زبان کے "درجۂ حرارت" پر اثر انداز ہوتی ہے۔ گویا ہر شخص کی زبان کے استعمال سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زمانے نے اس کی زندگی پر کون سا رنگ کتنی مقدار میں چڑھایا ہے۔ لہٰذا دوسروں کی اصلیت کو جاننا از بس ضروری ہو تو پھر ان کی زبان کے استعمال پر کڑی نظر رکھیے۔ خاموشی کی بھی اپنی ایک جداگانہ زبان ہوتی ہے۔ لیکن اسے کوئی قسمت والا ہی جان سکتا ہے اور جو کوئی ایک مرتبہ اس کو پڑھنا سیکھ جائے اس پر گویا چھپے بھیدوں کی حقیقت آشکار ہونے لگتی ہے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے سلوک کی تمام منزلوں سے باحفاظت گزر جاتا ہے۔ مگر وہ "بی بی زبان" جو دعائیں دینے کی عادت میں مبتلا ہے فی زمانہ تیزی سے غائب ہو رہی ہے اور وہ وقت شاید زیادہ دور نہیں جب ایسی زبان کو قومی عجائب گھر میں بڑے وقتوں کی ایک اچھی یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا جائے گا۔ اور تو اور خون کے رشتوں کی ساری جان اسی گوشت پوست کے لوتھڑے میں بند ہے اس لیے زبان کو توڑ مروڑ کر استعمال کرنے سے رابطوں میں گہری دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور ایک غیر معین مدت کے لیے اس کا اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ یقین کیجیے! زبان تو ایک ایسا گورکھ دھندا ہے کہ جس کی جڑوں کو کھود نکالنے کے جنون میں کتنی ماہرینِ لسانیات اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مگر اس گرگٹ مزاج پر کوئی مستقل قسم کی روک ٹوک نہ لگا سکے۔ ہر چند کہ سو پچاس میل کی مسافت طے کرنے کے بعد اس کے لب و لہجے کے تیور کچھ کچھ بدلنے لگتے ہیں لیکن اس کی "اوقات" میں رتی بھر فرق نمودار نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے یہ اپنی ہٹ کی پکی ثابت ہوئی ہے۔ پھر یہ کہ چند صدیاں بتانے کے بعد زبان ققنس کی طرح اپنی ہی راکھ سے نیا جنم لیتی ہے۔ اسی طرح تاریخ کے نشیب و فراز بھی اسی کی زبانی ہم تک پہنچے ہیں۔ مانا کہ اس نے اس سلسلے میں گفتار کے بے شمار جوہر دکھائے ہیں مگر اس سے حقائق میں سدھار پیدا نہیں ہو سکا۔ اس دور میں ہر کوئی زبان کی کمائی کھا رہا ہے۔ امیر، غریب، شریف، بدمعاش سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں اور ایک دوسرے کی زبان کے جھول پر جی کھول کر اعتراضات وا۔ کر رہے ہیں۔ لیکن زبان کے اصلی منتہا کو سمجھنے سے ہر کوئی قاصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سب کی زبانیں اب اپنے اپنے تالو سے چپکنے لگی ہیں۔

موسمی تغیرات براہِ راست کسی زبان کی زرخیزی اور بنجر پن کا موجب بنتے ہیں۔ چنانچہ ایسے علاقے جہاں کے باسی خشک سالی اور مفلوک الحالی کا سامنا اکثر کرتے ہیں، ان کی زبان بھی سنگلاخ اور بدحال ہو جاتی ہے، جبکہ ایسے جغرافیائی ماحول میں بسنے والے جہاں پر ہر سُو پہاڑی چشمے پھوٹ

رہے ہوں، ندی نالے چھل چھل گیت گا رہے ہوں، وہاں کی زبان میں بھی رنگین کی ساری اُچھل کود رچ بس جاتی ہے۔ اسی طرح دریاؤں کے علاقے میں رہنے والوں کی زبان میں دریا کی روانی اور فصلوں کی لہلہاہٹ کا پیدا ہو جانا ایک فطری عمل ہے۔ اس کے مقابلے میں ساحلِ سمندر پر آباد لوگوں کی زبان میں جوش و خروش اور طنطنہ پایا جاتا ہے، البتہ کبھی کبھی اُن کی زبان میں نمکینی کی ماترا بڑھ جاتی ہے۔

پرندوں میں طوطے یا افریقی مینا کی زبان، انسانی زبان کی تقلید میں چند شبد تو بول سکتی ہے گر یہ بول بھی اُسے عموماً رٹائے جاتے ہیں۔ اس کے پیچھے مفہوم عنقا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے مجھے انسانوں کا جمِ غفیر بھی ایسے ہی طوطوں اور میناؤں کا جھنڈ نظر آتا ہے جس کی اپنی کوئی زبان نہیں ہے، وہ محض کسی دوسرے کی تیار کردہ لفظیات پر آنکھیں بند کر کے عمل پیرا رہتا ہے۔ غالباً اسی لیے بیسویں صدی میں سیاسی زبان کا بول بالا ہے اور گونگے کی ماں کی طرح محض سیاست دان ہی اس زبان کو سمجھ سکتے ہیں۔ دراصل قوتِ گویائی صرف انسان کے نصیب میں نہیں لکھی گئی ہے۔ دوسرے تمام پرندوں اور درندوں کو بھی زبان کی اس نعمت سے نوازا گیا ہے۔ البتہ اُن سب کی زبانیں ارتقار کی ابتدائی منازل سے آگے کا فاصلہ طے نہ کر سکیں۔ وہ اس لیے کہ انہیں پیچیدہ ذہنی اور نفسیاتی مسائل درپیش نہیں تھے۔ اُن کی زبان محض چند جائز مطالبوں تک محدود رہی۔ انہیں اگر پورا کیا جاتا رہے تو وہ چہچہانا، ممیانا اور دھاڑنا غیر مشروط طور پر بند کر دیں گے۔ اس کے مقابلے میں حیوانِ ناطق کے مطالبات بنیادی مطالبات سے کہیں زیادہ ہیں اور بالفرض اسے شدّاد کی تعمیر کردہ جنت جتنی سہولیات میسر آجائیں تو بھی وہ "ہَل مِن مزید" کا تقاضا جاری رکھے گا، جس کی وجہ سے اس کی زبان میں آئے دن بے شمار لفظوں کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ پھر یہ کہ زبان کی ایک حیثیت ٹکسال کی بھی ہے کہ وہ دن رات لفظوں کے سکے گھڑنے پر مامور ہے۔ سو اگر زبان کو کھلی چھٹی مل جائے تو جگہ جگہ لفظوں کے انبار قطب کی لاٹھ ایسے مناظر دکھانے لگ جائیں۔ شاید زبان کی اسی کارکردگی سے گھبرا کر بعض لوگ لفظوں کے ہجوم میں ایک لمبی چپ سادھ کر دل ہی دل میں "اِکو حرف تیرے درکار" کا ورد کرتے رہتے ہیں اور یوں وہ اُن منازل کو چھونے میں کامیاب ہوتے ہیں جہاں آج کے دور کا باسی اُسی صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ وہ اشاروں کنایوں کی زبان کو اپنا کر ان لاکھوں میٹرک ٹن الفاظ کی "لوڈ شیڈنگ" کرے جو ہر لمحہ زبان کی ٹکسال سے چھلکتے دمکتے سکّوں کی صورت باہر ڈھلکتے چلے آرہے ہیں اور جن کے چراغوں کو اگر بروقت گل نہ کیا گیا تو عین ممکن ہے کہ دنیا "افراطِ لفظ" کا شکار ہو جائے۔

پھرتے ہیں شیر خوار......!

طارق جامی

بنیادی طور پر ہر انسان شیر خوار ہوتا ہے اور زندگی بھر شیر خوارگی ہی کی حالت میں رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی جوانی کے گھمنڈ اور بڑھاپے کے تجربوں کے غرور سے سرشار اپنے آپ کو بالغ نظر، پختہ ذہن اور عمر رسیدہ سمجھتا ہو۔ مگر زندگی کے بہت سے مواقع ایسے ہیں جہاں اُس پر اچانک انکشاف ہوتا ہے کہ ابھی اُس کے دودھ کے دانت سلامت ہیں اور اُس کے ذہن و جسم پر کھولت اور پختگی کی جو لمبی چوڑی تہیں منڈھی ہوئی ہیں، وہ ایک مصنوعی خول کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اُنگلی تھام کر چلنے والے بچے سے لے کر پچپن سالہ سرکاری ملازم تک، ہر شخص زندگی کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے دوسروں کی رہنمائی، ہدایت اور قیادت کا محتاج ہوتا ہے۔ سائیکل چلانے سے ٹائی باندھنے تک ہم ہر مرحلہ دوسروں کی مدد سے طے کرتے ہیں۔ یہ اُنگلی تھامنے والا مرحلہ انسان کے لیے شیر خوارگی کے احساسِ گراں بار کا باعث بنتا ہے۔ لڑکیاں بڑی ہو کر گڑیوں پٹولوں کی جگہ اصل سلائی کڑھائی سیکھتی ہیں، سینا پرونا اور کھانا پروسنا، سب معاملات دوسروں کی نگرانی میں طے ہوتے ہیں۔ ان سب مدارج میں کہیں نہ کہیں انسان کی انا کو ایک زبردست دھچکے سے ضرور دوچار ہونا پڑتا ہے، جہاں اُس کے لگائے ہوئے بخیے کے بخیے اُدھیڑ دیئے جاتے ہیں یا اس کی لگائی ہوئی گانٹھ کو ایک جھٹکے سے کھول کر سب کے سامنے اُس کی پول کھول دی جاتی ہے۔ یہ مرحلہ انسانی انا پر ایک طویل تہذیبی گھٹن کے دور کی طرح گزرتا ہے۔ انسان اپنے کام میں پختہ ہو جانے کے باوجود ان مراحل سے بار بار بلکہ بارہا گزرتا ہے اور اُسے اپنی زندگی میں ایک انجماد کی کیفیت کا احساس ہوتا ہی رہتا ہے کہ وہ ابھی دودھ کے زمانے سے نہیں نکل سکا۔ انسانی ارتقاء میں یہ پتھر کا زمانہ کہلاتا ہے۔

شیر خوار ہونے کا یہ احساس انسان کے بلڈ پریشر پر شدید طور پر اثر انداز ہوتا ہے اور یوں فرمانبردار شوہر، سعادت مند افسر اور اطاعت شعار والدین ہمیشہ "لو بلڈ پریشر" کا شکار رہتے ہیں۔ لیکن اگر شوہروں، افسروں اور بزرگوں میں سے فرمانبرداری، سعادت مندی اور اطاعت شعاری کی ساری ہوا نکل جائے تو "ہائی بلڈ پریشر" کا اچھا نتیجہ نکلتا ہے۔ اور شیر خوارگی کا خول ایک ہی جھٹکے میں ٹوٹ کر انڈے کے چھلکے کی طرح الگ ہو جاتا ہے۔ دراصل اسی نکتے سے انسانی ارتقاء میں جدت کی کیفیت جنم لیتی ہے۔ انہی لوگوں کے سبب انسان غاروں سے نکل کر میدان میں آیا۔ میدانوں سے چل کر پہاڑوں تک پہنچا اور انہی ہائی بلڈ پریشر کے شکار لوگوں ہی کا جذبہ تھا کہ انسان آج فضاؤں سے آگے خلاؤں کو پاٹ رہا ہے۔ یہی لوگ دنیا کی اعلیٰ ترین مخلوق بلکہ صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات کہلانے کے مستحق ہیں۔

شیر خوار مزاج لوگ زندگی بھر سر اوپر سے نیچے ہلانے کے عادی ہوتے ہیں۔ "یس سر" اُن کا تکیۂ کلام ہوتا ہے۔ زندگی کی بیسیوں بہاریں فائلوں کی نذر کر کے بھی اُن کی زندگی خزاؤں کے دوش پر رہتی ہے۔ اُن کا نوجوان افسر ایک دن اچانک اُن کے بارے میں انکشاف کرتا ہے کہ زندگی کے گزشتہ بیس برس انھوں نے دفتر میں گھاس کھودی ہے تو وہ بے ساختہ بلکہ عقیدتاً یس سر ہی کہتے ہیں اور نہایت تابعداری سے اپنے کردار کا تجزیہ کرتے ہیں اور حسبِ معمول افسر کے حق

ہی نتیجہ نکالتے ہیں۔ ان کے دودھ کے دانت عمر بھر نہیں ٹوٹتے اور دودھ بلڈ پریشر کے ہائی ہونے کے تمام تر امکانات کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔

یہاں اس مسئلے کو ذرا پھیلا کر سمجھنے کے لیے مشکل یہ ہے کہ ڈارون کی تصیوری آوارد ہوتی ہے کہ دنیا میں وہی رہے گا جو اپنے اندر زندگی کی صلاحیت رکھتا ہے یا زندہ رہنے کے گُر سے واقف ہے۔ بات ذرا واضح ہو گئی ہے۔ اس کو ہم بلڈ پریشر کے ہائی ہونے سے اور بھی آئینہ کر سکتے ہیں کہ حصّہ بقدرِ جُثّہ۔

فرض کیجیے آپ ایک طول طویل قطار کے آخری سرے پر شرافتِ طبعی، حُسنِ کردار، گرانباری اخلاق اور بارِ وضعداری سے دبے کھڑے ہیں۔ قطار حسبِ معمول کسی ٹرین کی طرح جامد و ساکت ہے کہ اچانک ایک مرد بلند مزاج آگے بڑھتا ہے اور قطار کی تمام رواداریوں کو تہ و بالا کرتا ہوا، پہلے سرے پر پہنچتا ہے اور کھڑکی سے اپنا حق (یا ناحق) پہلے وصول کر لیتا ہے۔ اب اگر وہ شخص دلیہ اور فرد فرید بھی آپ کی طرح شیر خوارگی کے عارضے میں مبتلا ہوتا تو یقیناً انتظار کی جانکاہ مدت سے گزرتا ہوا گزر جاتا مگر ظاہر ہے کہ اُس کا بلڈ پریشر اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا وہ حصارِ وقت کی سب طنابیں توڑتا ہوا زندگی میں یہ کارنامہ کر گزرتا ہے۔ اب اگر اسے روکنے والا کوئی شخص بلند آہنگ میدان میں اُترتا ہے تو یقیناً اس کا بلڈ پریشر پہلے شخص سے بھی زیادہ ہائی ہونا چاہیے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ایک نیام میں دو تلواریں نہ سما سکنے کے اسباب سامنے آتے ہیں اور ایک سلطنت میں دو حکمرانوں میں سے کسی ایک کی بیعت کا فیصلہ ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن اُس کا فیصلہ ہمیشہ بلڈ پریشر کا درجۂ اولیٰ ہی کرتا ہے۔ شیر خوار بیعت کے حق میں دستبردار ہو جاتے ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ بلڈ پریشر کے بغیر آدمی رسک لے ہی نہیں سکتا۔ ایسے لوگ جو کسی بھی نئے کام میں ہاتھ ڈالنے سے گھبراتے ہیں یا بے خطر کود پڑنے سے اجتناب کرتے ہیں اور تامّل و تردّد سے کام لیتے ہیں، ان کے بارے میں یہ طے ہے کہ ان کا بلڈ پریشر کافی حد تک سست ہو گا۔ دنیا کے بڑے بڑے معرکتہ الآرا ہیرو، میدانِ جنگ و جدل کے ابطالِ عظیم، اسی بلڈ پریشر کے ہاتھوں شہرت و ناموری کے مقاموں کو پہنچے۔ وہ کلچر ہیرو ہوں یا فلمی ہیرو، جب تک اُن کا مزاج شیر خوارگی سے آشنا رہا، انہیں کسی نے ایکسٹرا آرٹسٹ سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ انہوں نے جسے ذرا سا راستہ دیا وہ انہیں دھکا دیتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ آگے بڑھنے والوں کا بلڈ پریشر ان سے نسبتاً زیادہ تیز و تُند تھا۔ جونہی ان کے اپنے حواس ٹھکانے لگے اور بلڈ پریشر بڑھا، شہرت و عزت نے ان پر بھی اپنے دروازے کھول دیے۔ یہ الگ بات ہے کہ پھر یہ لوگ کافی عرصے تک دوسروں سے پوچھتے رہے کہ انہیں دھکا کس نے دیا تھا۔

شیر خوارگی نئی تہذیب کی دین ہے، جس نے انسان کو ملائمت کے پردوں میں چھپا کر رکھ دیا ہے۔ نفاست، شُستہ گوئی، وضعداری اور اخلاق جیسی اعلیٰ صفات دراصل انسانی جوہر کو دبا کر رکھنے کی سازشیں ہیں۔ انسان کے اوپر جو مصنوعی خول اور خود ساختہ پردہ ہے، اُس نے انسانیت کے اصل خمیر کو ڈھانپ لیا ہے جس سے منافقت اور دوغلے پن نے جنم لیا ہے۔ انسان اپنے اصل مزاج کو دبا کر اپنی کرداری صلاحیتوں سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے مگر جب کبھی حالات، موسم اور مناسب درجۂ حرارت انسان کو اجازت دیتے ہیں، یہ سب پردے اور دیواریں ایک ایک کر کے خود بخود راہ سے ہٹ جاتی ہیں اور یوں انسان اپنی پوری جون میں سامنے آجاتا ہے۔ ایسے رفیع الشان مناظر ٹکٹ گھروں کے آگے، ریل میں سوار ہوتے وقت پلیٹ فارم پر، راشن ڈپو کی قطاروں، میونسپلٹی کے نل کے حضور اور پرنالوں کے نیچے صحیح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان مناظر میں انسان کا جوہرِ اصلی کھل کر سامنے آتا ہے۔ اور انسان اپنے بلڈ پریشر کا پورے طور پر استعمال بھی انہی موقعوں پر کر پاتا ہے۔ لیکن حالات سدا ایک سے نہیں رہتے۔ دوسرے دن علی الصبح شبنم اور بادِ صبا دفتر جانے سے پہلے ہر شخص کو دوبارہ اِن پردوں اور دیواروں کے درمیان لے آتے ہیں اور دفتروں اور دکانوں پر جانے سے پہلے پہلے سبھی انسان دوبارہ شیر خوارگی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

میں نے عرض کیا نا کہ بنیادی طور پر ہر انسان شیر خوار ہوتا ہے اور زندگی بھر شیر خوارگی ہی کی حالت میں رہتا ہے ؎

پھرتے ہیں شیر خوار کوئی پوچھتا نہیں

پتنگ

اکبر حمیدی

پتنگ تو میری زندگی ہے۔

اگر کوئی پوچھے کہ اس کاغذی پیرہن سے میرا تعلق کب سے ہے تو شاید میں ٹھیک طور پر بتا نہ سکوں۔ بس یوں سمجھیے جب میں نے ہوش سنبھالا اس کی ڈور میرے ہاتھ میں تھی۔ پہلے پہلے تو اس قدر وابستگی کا مجھے احساس بھی نہیں تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مجھے اس کا احساس ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ مجھے اندازہ ہوا کہ میرا شوق کتنا نازک ہے! بانس کی نرم اور لچکدار تیلی جو اس میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، کمان کی طرح بل کھاتی موٹی بانس کی ایک اور نرم و نازک تیلی جس کے کنارے پھونک سے اُڑ جانے والے کاغذ میں لپٹے ہوئے۔ یہ اس کی کل کائنات ہے۔

سب سے پہلے میں اسے ڈور سے باندھتا ہوں۔ پھر دیکھتا ہوں کہ دونوں حصے متوازن ہیں یا نہیں۔ کیونکہ پتنگ اگر خود متوازن نہ ہو تو ہوا میں اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتی۔ اگر اس کے دونوں حصے متوازن ہیں۔ ہوا مناسب ہے۔ ڈور مضبوط ہے۔ پتنگ باز پتنگ بازی کی کم سے کم ابتدائی باتیں جانتا ہے تب تو پتنگ ہوا میں اُڑنے لگے گی ورنہ سیدھی زمین پر آ رہے گی۔

پتنگ کئی شکلوں اور کئی رنگوں میں ہے۔ اس کی شکلوں اور رنگوں سے پتنگ بازوں کی پسند و ناپسند، حیثیت اور مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ پتنگ بازی کی دنیا میں چار بڑی طاقتیں ہیں۔ پتنگ، ڈور، ہوا اور پتنگ باز۔ پتنگ کے بعد سب سے زیادہ اہمیت ڈور کو حاصل ہے۔ اچھی، مضبوط، تیز اور کاٹ دار ڈور حاصل کرنے کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کی جاتی ہے۔ کیونکہ جب کہیں پیچ پڑتا ہے تو اچھی ڈور ہی کام آتی ہے لیکن جب دل شوق سے بھرا ہو اور اچھی ڈور تک رسائی ممکن نہ ہو تو پیوند لگی ہوئی ڈوروں سے بھی منچلے پیچ لڑانے سے باز نہیں رہتے۔ پتنگ کو تو کٹنا ہی ہوتا ہے لیکن جی داری کی ایک مثال تو قائم ہو جاتی ہے اور اگر ایسے میں کہیں مخالف کی پتنگ کٹ جائے تو وہ دھمالیں پڑتی ہیں کہ فضائیں ناچ ناچ اٹھتی ہیں۔

پتنگ بازی میں ہوا کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہوا مناسب ہو تو پتنگوں کے رقص دیکھنے کے لائق ہوتے ہیں۔ اگر ہوا تیز اور شریر ہو تو پتنگوں کے گھونگھٹ کھل کھل جاتے ہیں۔ ایسے میں پتنگ اُس شرمیلی لڑکی کی طرح دکھائی دیتی ہے جسے اوباشوں کے جھمگٹ میں سے گزرنا پڑ رہا ہو۔ ہوا کے تیز جھونکے آنچلوں کو لہراتے بھی ہیں اور اُلٹتے بھی ہیں۔

ہوا تیز ہو تو وہ اپنے ہی رُخ پر اُڑاتی ہے۔ نرم و سُبک ہوا تو ایک نعمت ہے جو اپنی سمت پر زیادہ زور نہیں دیتی۔ شوریدہ سر ہوائیں فضا کے امن و سکون کو تہہ و بالا کر دیتی ہیں۔ ایسے میں کسی اور سمت کا تصور کرنا بھی محال دکھائی دیتا ہے۔ یوں ہر روشن دن جب ہوا ایک ادائے دلبری کے ساتھ فضا میں محوِ خرام ہو پتنگوں کے لیے مبارک ہے تاہم بہار کا موسم کچھ اور ہی لذت رکھتا ہے۔ نہ گرمی نہ سردی۔ یا یوں سمجھیے جتنی گرمی اتنی ہی سردی یا توازن ——— بلکہ حسین توازن۔ زمین سبز بلکہ سرسبز ——— آسمان نیلا۔ بلکہ نیلا شفاف۔ شریانوں میں تازہ خون کی گردش۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ موسم

تو بنایا ہی پتنگ بازی کے لیے گیا ہے۔ پھر سارا سال بھی آپ پتنگ اڑاتے رہیں مگر جو لطف اس موسم میں ملے گا وہ پھر نصیب نہیں ہوگا۔ اس موسم کے معرکے سارا سال یاد آتے رہتے ہیں۔ کہانیاں اسی موسم میں بنتی ہیں۔ افسانے انہی دنوں میں جنم لیتے ہیں۔

پتنگ بازی کی حیثیت سب سے آخری ہے جسے پتنگ اڑانے کا شوق تو ہوتا ہے مگر جو شاید ہی کبھی اپنے رُخ پر پتنگ کو اُڑا سکے۔ میں بھی انہی پُرشوق پتنگ اُڑانے والوں میں شامل ہوں۔ میری بھی یہ خواہش ہے کہ میری پتنگ سورج سے آنکھ لڑائے۔ اُدھو آسمان جا کر ناچے۔ ہواؤں سے اٹھکیلیاں کرے۔ اس کے شر لاٹوں سے زمین آسمان گونجیں۔ پیچ پر پیچ کاٹے۔ فضاؤں میں راج کرے ——— مگر ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے۔

درختوں پر اٹکی ہوتیں۔ گاٹیوں کی زد میں آکر گلی کے لڑکوں میں لیر لیر پتنگیں، بانسوں کا شکار ہوتیں، ہواؤں کے زور سے پھٹ کر اکھڑے خیمے کی طرح زمین بوس ہوتی پتنگیں کہاں دکھائی نہیں دیتیں۔ مگر یہ سب المیے پتنگ بازی کا حصہ ہیں۔ ایک اچھا پتنگ باز ان کے بارے میں سوچ سوچ کر دل میلا نہیں کرتا ——— خواب ٹوٹتے بھی تو رہتے ہیں۔ لیکن کیا خواب دیکھنے بند کر دیئے جائیں؟ یہ کیسے ممکن ہے!!

پتنگ۔ میری زندگی ہے! میری ذات ہے! میں خود ہوں! پتنگ پتنگ کرتے کرتے میں خود بھی پتنگ بن چکا ہوں۔ پتنگ کے رُوپ میں میں خود زمین سے بلند ہوتا ہوں۔ میں خود اپنے ہاتھ سے ڈور کھینچتا ہوں۔ چھتوں پر لہراتا ہوں۔ آنگنوں میں اترتا ہوں۔ آسمانوں کو چومتا ہوں۔ ہواؤں سے لپٹتا ہوں۔ پتنگ کو دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں خود ڈور کی رسّی پر چلتا ہوا نیلے آکاش میں رقص کرنے لگا ہوں۔ اس وقت میں بلندی سے اپنے آپ کو نیچے کھڑے ہوئے دیکھ سکتا ہوں۔ اپنے آپ پر ہنس سکتا ہوں۔ اپنے آپ کو اپنا غیر جان سکتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے پتنگ ایک چاند گاڑی کی طرح خلائی سٹیشن پر کھڑی ہے ——— اور میں ایک خلا نورد کی طرح اس میں سے باہر نکل کر کسی دوسری سرزمین پر چل پھر رہا ہوں۔ یہی تو وہ لمحے ہیں جب میں پتنگ سے بھی علیحدہ ہو جاتا ہوں۔

انسان کے ذہنی ارتقا کو اگر پتنگ بازی سے تشبیہہ دی جائے تو میرا خیال ہے یہ تشبیہہ بہت موزوں ہوگی۔ آخر انسان نے کیا کیا ہے؟ یہی تو کیا ہے کہ اپنے ذہن کی پرواز کو وسعت دیتا چلا گیا ہے جس طرح پتنگ باز پتنگ کو ڈور دیتا چلا جاتا ہے ——— اور وہ آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ انسان کے ارتقائے ذہنی کو پتنگ بازی سے بڑی مماثلت ہے۔ جس طرح پتنگ بازی کے لیے اچھا موسم، صاف شفاف فضا، مناسب ہوا، اچھی ڈور جیسی چیزیں مطلوب ہیں ارتقائے ذہنی کے لیے بھی کچھ ایسا ہی ماحول موزوں ہے۔

وہ تو درمیان سے کچھ لٹیرے گانٹیاں مار دیتے ہیں ورنہ پتنگ آج سے صدیوں آگے ہوتی۔ جس طرح پتنگ بازی کی ایک تاریخ ہے اسی طرح گانٹی مارنے کی بھی ایک تاریخ ہے۔ کچھ لوگوں نے گانٹی مار کر بھی پتنگیں حاصل کی ہیں اور پھر پتنگ بازی کی تاریخ میں اپنا نام بحیثیت ایک پتنگ باز کے لکھوایا ہے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ پتنگ پتنگ باز کے اشاروں پر ناچتی ہے مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

اونچی ہوا میں جا کر تو جیسے اس کی ایک اپنی منفرد شخصیت اُبھر آتی ہے فرینکنسٹی کی طرح یہ بھی باغی ہو جاتی ہے۔ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر آگے ہی آگے اور بلند سے بلند تر ہونا چاہتی ہے۔ میرے ہاتھوں سے ڈور کھینچتی چلی جاتی ہے ——— میں روکنا چاہتا ہوں ——— مگر یہ کہاں رُکتی ہے ——— میں بے بس ہو کر ڈور پر ڈور دیئے جاتا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے اگر ذرا بھی ڈور کو روکا تو میرا ہاتھ کاٹ دے گی۔ پلٹ کر پیچھے زمین کی طرف دیکھتا ہوں تو ڈور ختم ہوتی جا رہی ہے ——— میں کیا کروں اس چھنال کی آنکھیں سیر ہی نہیں ہوتیں۔ لحظہ بلحظہ ڈور میرے ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے ——— نکلتی جا رہی ہے!!

خدایا! میں کیا کروں ——— اگر ڈور روکتا ہوں تو میرا ہاتھ کٹتا ہے ——— اور اگر پھر بھی روکتا ہوں ——— تو پتنگ کٹتی ہے!!!

بڑھاپا

حامد برگی

یوں تو ہماری ہلکی پھلکی مونچھوں میں ستیش کی تاریں کب سے جھلملانے لگی تھیں اور اگر ہم اپنی ڈاڑھی کو سر اٹھانے دیتے اور سیون اُکلاک بلیڈ کی تیز دھار سے پابندیٔ وقت کے ساتھ ہر بُنِ مُو کو جڑ سے اکھیڑ پھینکنے کی روزانہ سعی نہ کرتے تو یہ جھلملاتی روپہلی تاریں ہمارے چہرے بشرے کا احاطہ کرتی بھی نظر آتیں اگر ایسا ہوتا تو ہمیں بڑے انہماک سے اپنے سفید ہوتے ہوئے بالوں کو سیاہ کرنے کے نسخے استعمال کر کر کے اپنے آگے بڑھتے ہوئے بڑھاپے کو جوانی کی سرحدوں میں دھکیلنے کی مسلسل کوشش کرنا پڑتی۔ وجہ یہ ہے کہ ہم بادشاہ آزاد بخت نہیں کہ اپنی ڈاڑھی یا مونچھ کی اوّلین روپہلی تار کو دیکھ کر ہی مصلّٰی بچھا لیتے اور یادِ الٰہی میں مصروف ہو جاتے۔ اُن کے تو اولاد نہیں تھی اور ہم بفضلِ خدا صاحبِ اولاد ہیں، ہمیں تو اپنی جوانی کا بھرم رکھنا ہے۔ آزاد بخت بیچارہ تو پیدا ہی بوڑھا ہوا تھا چونکہ اولاد کی نعمت سے محروم تھا اور زندگی بھر ایک چوہا پیدا کرنے کی سعادت بھی نہ پا سکا۔

سُنا ہے بہت سے نصیبوں کے مارے اولاد کی نعمت سے محروم لوگ مزار شاہ دولا شاہ پر حاضری دیتے ہیں اور چوہا پیدا کرنے کی سعادت پا لیتے ہیں۔ شاہ آزاد بخت کی طرح محروم الارث نہیں رہتے۔ یہ اور بات کہ یہ لوگ مسخ صورت ایسے پیدا کر کے صحت مند کلکاریاں مارتے ہنستے کھیلتے بچوں کی خوشیاں تو نہیں پا سکتے مگر اپنے جواں مرد ہونے کا احساس ضرور پا لیتے ہیں جو بڑی چیز ہے۔

ہمیں اپنے بوڑھا ہونے کا احساس اس وقت پہلی مرتبہ ہوا جب ایک سفر کے دوران میں اپنی ڈاڑھی مونچھ کو جوان رکھنے کا خاطر خواہ اہتمام نہ کر سکے تھے اور ہمارے سیاہ بالوں کے ساتھ سفید بال دال چاول ہو رہے تھے۔ اس عالم میں ایک خاتون نے ہماری صورت دیکھے بغیر مسافروں کی بھیڑ بھاڑ میں محض ہماری چستی دیکھ کر ہمیں 'کاکا' کہہ کر مخاطب کیا اور جب ہم اس کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ اس وجہ سے جھینپ گئی کہ ہمارے حساب سے وہ خود ابھی 'کاکی' تھی ہری بھری گود والی۔ اس نے دیر تک دورانِ سفر جھینپ جھینپ کر ہمیں ہمارے بوڑھا ہونے کا احساس دلایا۔

ایک موقع اور بھی ہے جس میں ہمیں اپنے بوڑھا ہونے کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ اکثر سودا سلف لیتے ہوئے یا دورانِ سفر بھیڑ بھاڑ میں ہم ادھیڑ عمر دوکاندار یا مسافر کو اپنی سابقہ عادت کے مطابق 'چاچا' کہہ کر مخاطب کر دیتے ہیں لیکن جلد ہی ہمیں احساس ہو جاتا ہے کہ ہماری اور اس کی عمر میں انیس بیس کا فرق ہو گا۔ چاچا بھتیجے کا رشتہ کیسے ہوا! اور ہم خود ہی شرمندہ ہو جاتے ہیں۔

ہمیں گھر میں چچا ماموں کہنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں مگر وہ سب ابھی بچے ہیں، سکولوں کالجوں میں پڑھنے والے بچے، یہ اور بات ہے کہ ہمارے ایک بھتیجے کی شادی نوعمری میں ہی ہو گئی اور ہمیں لوگوں نے اس کے بچوں کے ساتھ ہمارا رشتہ بتا کے چونکا دیا۔ ان بچوں کے مُنہ میں زبان آئی تو یہ ہمیں 'دادا' 'دادا' کہہ کر پکاریں گے۔ خیر کوئی بات نہیں ہم نے سوچ رکھا ہے کہ ہم بھی کسی ایسے علاقہ کی تلاش کریں گے جہاں دادا جوانمرد کو کہا جاتا ہے۔

بعض اوقات عمر اتنی بزرگ نہیں ہوتی جتنا رشتہ بزرگ ہو جاتا ہے۔ ہماری بعض رشتہ کی خوشدامنیں ایسی بھی ہیں جو ہماری بیگم کی ہمجولیاں ہیں۔

ان کا سلوک ہم سے بزرگانہ اور مشفقانہ کی بجائے خواہرانہ ہے لہذا جوانی میں دادا نانا ہو جانا بھی جوانی پہ کوئی داغ نہیں۔

جوان رہنے کی خواہش بھی کتنی بنیادی خواہش ہے۔ شاید بچہ رہنے کی خواہش سے بھی زیادہ، بچپن معصومیت بے فکری اور بے نیازی کا دور ہوتا ہے دنیا کے غم و آلام سے آزاد، عقبیٰ کے خوف سے بے نیاز، پھر بھی سارا لڑکپن جوان ہونے کی تمنا میں گزرتا ہے۔ ماں باپ بھی بچے کو جوان دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں، اس کے سر پر سہرا باندھنے کے، اسے بڑا افسر دیکھنے کے خواہش مند، وہ بھی بڑا ہو کر ہوائی جہاز اڑانے اور ڈاکٹر بننے کے منصوبے بناتا ہے، جوانی کا

میرے ایک بزرگ انسانی زندگی کے متعلق کہا کرتے تھے کہ ایک زندگی ناکافی ہے انسان کو دو زندگیاں عطا ہونی چاہییں۔ ایک تو تجربوں میں گزارنے کے لیے اور دوسری ان تجربوں کی روشنی میں بسر کرنے کے لیے۔ میں سوچتا ہوں بڑھاپا بھی دوسری زندگی ہے اگر نصیب ہو جائے تو

بڑھاپے میں انسان کو پہلی مرتبہ صحیح معنوں میں اپنی توانائی کا احساس ہوتا ہے چونکہ جہد البقاء میں اس نے زندہ رہنے کا ثبوت فراہم کر دیا ہے جبکہ ہزارہا لوگ کم عمری اور نوجوانی میں ہی زندگی کی صعوبتوں کے آگے ہتھیار ڈال کر پسپا ہو جاتے ہیں۔ بوڑھا آدمی زندگی کی تمام تر صعوبتوں، مشقتوں، آزمائشوں اور بیماریوں کی یلغار کا مقابلہ کر کے یہاں تک پہنچتا ہے۔ میں جب کسی بوڑھے شخص کو دیکھتا ہوں تو اسے ایک چلتا پھرتا معجزہ خیال کرتا ہوں جو نظامِ جسمانی کی گوناں گوں پیچیدگیوں، باریکیوں، نازکیوں اور زمانہ کی دستبرد کے باوجود جیئے جا رہا ہے۔ اس کی مثال ان ہزاروں امیدواروں میں سے ان چند خوش نصیبوں کی سی ہے جو مقابلے کے امتحانوں سے گزر کر اور کڑے معیاروں پر پورا اتر کر اعلیٰ مناصب کے لیے موزوں قرار دیئے جاتے ہیں۔

کہتے ہیں حشر کے دن بعض راندۂ درگاہ داورِ محشر کے سامنے عرض کریں گے کہ انہیں دوبارہ دنیا میں بھیجا جائے تاکہ وہ نیکی اور اطاعت کی زندگی گزار کر اور سرخرو ہو کر درگاہِ خداوندی میں حاضر ہوں۔ میرے خیال میں دوبارہ ساری زندگی کی تمنا کرنا اتنا ضروری نہیں، بچپن تو گنا ہوں اور غلطیوں کے دور کی خواہش میں ہی گزر جاتا ہے اور بڑھاپا کی ہوئی غلطیوں اور گناہوں پر پشیمان ہونے میں۔ خواہش اور پشیمانی دونوں ہی صحت مند جذبے ہیں لہذا عمر کے جس حصے کے اعادہ کی ضرورت ہے وہ صرف دورِ شباب ہے۔

ققنس ایک روایتی پرندہ ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہر سال اپنی راکھ سے دوبارہ جنم لیتا ہے اور ہر سال جل کر راکھ ہوتا ہے، جوانی کے دور کا انسان بھی ققنس ہوتا ہے، جوانی گزرنے کے بعد خواہش کرتا ہے کاش وہ اپنی راکھ سے دوبارہ زندہ ہو سکے۔

بات بڑھاپے کی ہو رہی تھی یہ ذکرِ قیامت کہاں سے چھڑ گیا؟ بڑھاپے کی بھی اپنی قدر ہے۔ ٹرائے کی دس سالہ جنگ اور بیس سال کھلے سمندروں میں بھٹکنے کے بعد جب یولیسیز سفید ڈاڑھی لہراتا تھکن سے چور گھر واپس لوٹتا ہے تو جذبے کے لحاظ سے پہلے سے زیادہ جوان ہے، گھر بار، چولہا چوکا، بیوی بچے اسے سب بے عملی کی علامت نظر آتے ہیں اور وہ یہ کہتا ہوا پھر طوفانی موجوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے لپکتا ہے کہ ــــ بڑھاپے کے بھی اپنے تقاضے ہیں یہ محض بیٹھ کر بے عملی میں گزارنے کا دور نہیں۔ ــــ یقینی بات ہے اگر وہ جوانی کے ناپختہ تجربوں کے بغیر لوٹ آتا تو پھر بیکراں بپھرتی ہوئی موجوں کی طرف لوٹ جانے کی نہ سوچتا۔

دیکھا جائے تو بڑھاپا عزم و آرزو کی تکمیل اور منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا دور ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ بڑھاپا میدانِ عمل سے ہٹ جانے (ریٹائر ہو جانے) اور آرام کرنے کا زمانہ ہے، یہ درست نہیں۔ بڑھاپے کی نظر سے دیکھا جائے تو جوانی ایک تربیتی دور ہے، ایک عبوری دور جس میں انسان بوڑھا ہونے کی تیاری کرتا ہے۔ یہی وہ وقت ہے جب انسان زندگی بھر خواب و خیال کے ہوائی محل تعمیر کرنے کے بعد خوابوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے، اپنی زندگی بھر کی کاوشوں کا اجر مٹھی میں لیے اپنے ذہن کے تاج محلوں کو گارے مٹی کی صورت اسارتا ہے۔ اپنے لگائے

ہونے کی بوٹوں کو پھلتا پھولتا دیکھتا ہے۔

یہ خیال درست نہیں کہ جوانی انسانی زندگی کی موسمِ بہار اور بڑھاپا پت جھڑ کا دَور ہے۔ جوانی اس بہار کا آغاز ہو تو ہو کونپلیں پھوٹنے اور شگوفے نکلنے کا دَور، مگر بڑھاپا اس بہار کا عروج ہے، پھلوں اور پھولوں سے لَد جانے کا دَور، رس اور مٹھاس سے بھر جانے کا دور۔ زندگی بھر کی مشقتوں اور کوششوں کے بارور ہونے کا دَور، بوئی ہوئی فصل کے پک جانے کا دور اور پکی ہوئی فصل کے کاٹنے کا دَور اور کٹائی کے موسم کا نشہ تو پنجاب کے کسی کسان سے پوچھیے یہ وقت اس کی شبانہ روز جانفشانی کا ثمر ہے۔ لوگ جوانی کے نشے کی بات کرتے ہیں، مَیں کہتا ہوں نشہ تو بڑھاپے کا ہوتا ہے۔

بدلتے وقت کے ساتھ پرانی اقدار بھی بدلتی ہیں کبھی ایک نوزائیدہ بچے کو یہ کہہ کر دعا دی جاتی تھی کہ دُودھوں نہائے پُوتوں پھلے، اور اب یہ زمانہ ہے کہ دُودھوں نہانا تو کجا دُودھ پینے کو مل جائے تو غنیمت ہے اور پُوتوں کی خواہش کچھ تو زندہ رہنے کا مول دیکھ کر دم توڑ گئی ہے اور کچھ حالاتِ زمانہ نے اس پر قدغنیں لگا دی ہیں البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ ہر نوزائیدہ کے بڑھاپے تک پھلنے پھُولنے کی خواہش ایک بنیادی خواہش ہے۔

بڑھاپا زندگی کے طویل سفر کی صعوبتوں اور اعصابی تناؤ کے بعد منزل پر بخیر و خوبی پہنچنے کی آسودگی اپنے ساتھ لاتا ہے تاکہ اس آسودگی اور ذہنی طمانیت کے بعد انسان اپنی زندگی کا بارِ گراں سر سے اتار کر اپنا ہلکا پھلکا وجود لیے نئی اور لامتناہی منزلوں کے پُرکیف سفر پر چُپ چاپ روانہ ہو جائے۔

ماہنامہ **تخلیق**

مرتبین: عذرا اصغر ۔ اظہر جاوید

تازہ شمارہ چھپ گیا ہے

نسیم بک ڈپو انبار مارکیٹ لاہور سے طلب کریں

انڈا

محمد اسد اللہ

آج صبح بیگم کی عدم موجودگی میں کچن پر میرا ہی راج تھا۔ ایک گوشے میں رکھا ہوا چولہا کسی پژمردہ، اداس اور بجھے بجھے سے آدمی کی طرح اپنی جان سے بیزار جل رہا تھا۔ اس پر چڑھے برتن میں پانی کے اندر ایک سفید براق انڈا شاہانہ جاہ و جلال سے متمکن تھا جیسے سارا برتن اسی کی ملکیت ہو۔ ابلتے ہوئے پانی کی برہم اور متلاطم لہروں کے درمیان انڈا اس طرح تھا جیسے سمندر کے بیچ چھوٹا سا ایک جزیرہ! اپنے خول میں بند خود مرکزیت کے شکار آدمی کی طرح!

۱

میں نے موصوف کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ چولہے کی دھیمی دھیمی آنچ میں اس کے زوال کے اسباب ابھی پوری طرح یکجا نہیں ہوئے تھے البتہ اس کی مملکت میں برپا ہونے والی طوائف الملوکی میرے پیٹ میں سر ابھار رہی تھی۔ مخالف طاقتیں میرے بتیس دانتوں میں مرتکز ہو کر جنگ کی تیاریوں میں مصروف تلواریں تیز کر رہی تھیں۔ یہ طوائف الملوکی جو بھوک کے چوہوں نے میرے اندر برپا کر رکھی تھی، مجھے پوری کائنات سے ہم رشتہ دکھائی دی۔ مجھے محسوس ہوا کہ بھوک ایک عالمگیر تحریک ہے۔ جس کا دفتر تو آدمی کے شکم میں ہے مگر جس کی ساری کارکردگی آدمی سے باہر پھیلی ہوئی ہے۔

ہوسِ جاہ، محبت کی تلاش، شہرت کی خواہش، اپنائیت کی بھوک، احساسِ برتری یہ سب اس کے چہرے ہیں، راون کے چہروں کی طرح!۔ ان میں سے چند ایک کو بوقتِ ضرورت قومی یا ذاتی تشخص کا نام بھی دیا جا سکتا ہے جس کے پیدا کردہ انتشار کے درمیان حکومتیں وجود میں آتی ہیں اور بعض اوقات بڑی بڑی سلطنتیں شیشے کی طرح "چھن" سے ٹوٹ کر بکھر جاتی ہیں۔ خاص طور پر اس وقت جب مختلف ریاستوں کے سربراہ ملک کے "کُل" سے اپنی ریاست کے "جُزو" کو علیحدہ کر کے خود مختاری کا اعلان کر دیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا انڈے کی تخلیق بھی اسی قسم کا واقعہ ہے؟ چونکہ نہ تو مرغی یا مرغے کی قسمت کے زوال آمادہ ہونے کا اندیشہ ہے اور نہ ان دونوں کو ہتکِ عزت کا خطرہ ہے لہٰذا میرا جواب نفی میں ہے۔ مرغ یا اسی قسم کے کسی اور پرندے کے انڈے دراصل لہروں کے ان دائروں کے مانند ہیں جو کسی پتھر کے گرنے سے تالاب کی سطح پر ابھر آتے ہیں۔ ہر دائرے کے بطن سے ایک نیا دائرہ جنم لیتا ہے اور پھیلتے پھیلتے اپنے وجود کی حدوں سے پرے نکل جاتا ہے۔ عورت اسی وقت مکمل ہوتی ہے جب وہ ایک آدھ بچے کو جنم دینے میں کامیابی حاصل کرتی ہے۔ بھلا خاندانی منصوبہ بندی والوں کو یہ نکتہ کون سمجھائے کہ انسانی یا حیوانی سطح پر تخلیق کا ہر نشان پوری کائنات کی تکمیل کی طرف اٹھتا ہوا قدم ہے۔ ہر انڈا اپنے چکنے بشرے سے تکمیلیت کی اک عجیب سی آسودگی سے سرشار نظر آتا ہے تو اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ اس کے خاندان کا چراغ اس کی ذات میں روشن ہے بلکہ آئندہ نسلوں کی پوری فوج اس کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ وہ وقت کی طویل زنجیر میں ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک اہم کڑی ہے۔

چاہے بچوں کی تخلیق ہو یا نظموں کی اس سے پہلے تخلیق کار کی زندگی میں اک ایسا پُر اضطراب لمحہ ضرور آتا ہے جب ذوقِ آئینہ داری تخلیق کار

کے ہاتھوں میں اک آئینہ تھما دیتا ہے۔ تب تنگیٔ عرصۂ حیات سے باہر بہت دُور تک پھیل جانے کی آرزو زمان و مکاں کی حدیں پھلانگ کر "وجودِ خاکی" سے ماورا اِک جادوئی دنیا ڈھونڈ نکالتی ہے۔ جب بھی کوئی بچہ ایک زبردست چیخ کے ساتھ للکارتا ہوا اس دنیا میں داخل ہوا یا کسی پرندے کے ننھے مُنّے چوزے نے انڈے کا خول توڑ کر سر باہر نکالا تو مجھے محسوس ہوا کہ زندگی کی تجدید ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی لگا جیسے وہ اپنی نسل کی چلتی ہوئی ٹرین میں سوار ہے اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھ رہا ہے کہ اس زنجیر کا تسلسل کہیں حوادثِ زمانہ کے ہاتھوں بکھر کر ختم تو نہیں ہو گیا۔ اُن لمحوں میں اسے نہ بچہ سمجھیے نہ چوزہ! وہ تو سینوں میں موجزن "امر" ہو جانے کی اک توانا خواہش کا جیتا جاگتا سراپا ہے جو رہتی دنیا تک بکھرتی رعنائیاں دامنِ نگاہ میں سمیٹنے کے لیے چوزے کی شکل میں ڈھلتا رہے گا۔ کیا عجب کہ ہماری دونوں آنکھیں بھی اُس "پہلے آدمی" ہی کی امانت ہوں، جس نے فرشِ خاک پر گزر بسر کے لیے اوّل اوّل ساز و سامان سجایا اور پھر زندگی کو بڑی محبت سے گلے لگا کر روئے زمین پر اس کے پھولنے پھلنے کا سہانا خواب دیکھا۔ وہ آنکھ جو زندگی کو تا ابد بنتے سنورتے دیکھنے کی مشتاق تھی خاندانی نشانی کے طور پر دست بدست ہم تک پہنچی ہے۔ یہ سلسلہ تا ابد جاری رہے گا۔

بھوک کی گرہ در گرہ زنجیر کا سلسلہ صدائے بازگشت کی طرح کائنات کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا ہے۔ ہر ذی روح اس کائنات کا ایک گوشہ ہے جہاں بھوک گونج رہی ہے۔ اب یہی دیکھیے کہ موسمِ سرما کے اوائل میں زمین نے جو بیج نگل لیے تھے، انہیں اُسی نے آغازِ گرما میں خوشۂ گندم بنا کر پیش کر دیا۔ مرغی نے وہی دانے چٹ کر کے انڈا دیا، یہ انڈا میں چبا جاؤں گا اور زمین ایک دن میرے بدن کو لقمہ بنا کر ایک دائرہ مکمل کرے گی کہ بہرحال وہ ہم سب سے بڑی مچھلی ہے۔ کائنات کے اس طویل و عریض سمندر میں کتنی بڑی بڑی مچھلیاں سیّاروں کی صورت تیرتی پھر رہی ہیں۔ میں جب بھی کھیتوں میں لہلہاتے ہوئے گیہوں کے خوشے دیکھتا ہوں، میرے ذہن میں یہ خیال سرسراتا ہے کہ دھرتی ایک شکاری کی طرح اپنے کاندھے پر چھڑی (FISHING ROD) لٹکائے انسان نما مچھلیوں کے شکار پر نکلی ہے۔ دھیرے دھیرے لوگ اس کے پیٹ کے تھیلے میں جمع ہوتے جا رہے ہیں۔ یہی دانۂ گندم کل ابلیس کے ہاتھوں میں کانٹا بن گیا تھا، آج زمین ہمیں اس میں پھنسا کر دھیرے دھیرے اپنے حلق تک کھینچ رہی ہے۔ نظر اٹھا کر دیکھیں اور غور کریں تو اس دھرتی پر لذائذِ ارضی کے سینکڑوں کانٹے ہماری گھات میں نصب، ہمارے اندر چھپے ہوئے بھوک اور اشتہا کے نئے نئے چہرے تلاش کر رہے ہیں۔

درمیان میں جب میں نے انڈے کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو وہ زرد مائع اور اُبلی ہوئی ٹھوس شکل کے بیچ BUFFER STATE بنا ہوا تھا یوں تو انڈا بذاتِ خود ایک BUFFER STATE ہے کیونکہ قدرت نے انڈا دینے کے منصبِ جلیلہ پر جس جاندار کو فائز کیا ہے اسے جزوی طور پر تخلیق کار کا منصب بھی عطا کیا ہے۔ انڈا دراصل ایک چوراہا ہے۔ اگلے راستے کے انتخاب کا حق اس شخص کو عطا کیا گیا ہے جس کے ہاتھ میں انڈا ہے۔ انڈے کے بیضوی وجود پر نظرِ ثانی کے بعد مجھے اس خیال سے خوشی ہوئی کہ بی مرغی نے انڈے کی شکل میں مجھے یہ اختیار دیا ہے کہ میں چاہوں تو اسے کچا پی جاؤں، ابالوں، آملیٹ بناؤں یا مرغی کے پروں تلے رکھ کر اس سے چوزہ برآمد کروں۔ پھر اسے پال پوس کر بڑا کرنے کے بعد اس کی گردن پر چھری پھیر کر پیش کروں۔ منزل تو بہرحال ان تمام راستوں کی میرا پیٹ ہی ہے۔ تمام راستے پیٹ ہی سے شروع ہوتے ہیں اور وہیں جا کر دم توڑ دیتے ہیں۔

انڈے کا بیضوی وجود اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ہر جاندار حیات و موت کے دائروں کا زندانی ہے۔ انڈے کے چھلکے تلے موجود چوزہ کو مژدہ ہو کہ اس سے قبل ہزاروں بیضوی دروازے اسی کی ذات پر بند تھے۔ پھر ایک ایک دروازہ کھلتا گیا اور اب رہائی کا لمحہ آخری دروازے کی چابیاں تھامے آ پہنچا ہے۔

ستم ظریفی یہ کہ چوزہ چھلکے نما دائرے کو توڑ کر ایک نئے دائرے میں قدم دھرتا ہے۔ عین اسی وقت ایک نئے دائرے میں پھنس جاتا ہے اور کسی دن بھوک کے چوہوں کی صفتی سے گونجتے ہوئے دائرے یعنی پیٹ میں پہنچ کر اپنی زندگی کا دائرہ مکمل کرتا ہے۔ اس طرح وہ ایک نئے دائرے کو تقویت پہنچاتا ہے۔ پرندے

رحم مادر سے انڈے میں منتقل ہوتے، پھر دنیا میں آکر انڈے کے چھلکے سے نجات پائی۔ ہم لوگ سیدھے رحم مادر سے دنیا میں تشریف لائے۔ اس صورت میں کیا ہماری دنیاوی زندگی اس کرۂ ارض کے انڈے میں قیام کا عرصہ ہے!

کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب آسمان کا یہ طویل و عریض چھلکا ٹوٹے گا اور کروڑہا انسانی چوزے میدانِ حشر میں کلبلاتے پھریں گے۔ ابھی تو وقت کا پرند اس کائنات کے انڈے کو اپنے گرم پروں میں چھپائے بیٹھا ہے۔

دسمبر کی دھوپ کتنی دیر سے مجھے اپنے نرم پروں میں دبوچے بیٹھی ہے۔ کیا میرا وجود بھی گول مٹول بیضہ ہے! میری سوچوں میں زرد زرد مائع بہتا ہے۔ اداسی کے زرد سیال میں اُبلی اُبلی خواہشیں کلبلاتی ہیں۔ اسی میں غلامی کے سخت پنجوں سے آزاد ہوتی ہوئی بے باک صبح کا نعرۂ مستانہ مرغ کی بانگ میں ڈھل کر گونجتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ میرے وجود کے سخت خول میں ایک خوابیدہ "زندگی" لفظ "قُم" کی منتظر ہے۔ میں اس کی آواز سننے کی کوشش میں ہوں ——— ممکن ہے میری ہی طرح ساری خلقِ خدا اس آواز پر کان لگائے بیٹھی ہو!

لہو کی صدا کے بعد

حزیں لدھیانوی کا دوسرا مجموعۂ کلام

مقتلِ آرزو

شائع ہو گیا ہے

تیسری آنکھ

جان کاشمیری

ہرجائی محبوب کی مانند بڑی مشکل سے فرصت کے لمحات دستیاب ہوئے۔ میں انہیں آغوشِ محبت میں سمیٹنے کے بارے میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ چالاک پنچھی کی طرح اُڑ کر دم زدن میں آنکھوں سے اوجھل ہو گئے اور میں ایک بھاری بھرکم لغات کے ہتھے چڑھ گیا جس نے اپنا عضو عضو اچھل اچھل کر پورے سیاق و سباق کے ساتھ دکھانا شروع کر دیا۔ میں سوچنے لگا۔ لغات تو لفظوں کی اجتماعی قبر ہوتی ہے۔ آخر ان مُردوں کو قبر سے باہر آنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔ اس حواس باختہ کشمکش میں میرا وجود عضوِ معطل ہوا ہی جاتا تھا کہ اچانک میری آنکھوں کے سامنے ایک ایسا پٹ کھل گیا جس کی ابتدا لفظ "آنکھ" سے ہوئی۔ اور محاورات، روزمرّہ اور دوسری زبانوں کے آنگنوں میں چہل قدمی کرتی ہوئی کئی ایک صفحات پر پھیل کر مجھ سے آنکھ مچولی کرنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں ایک ایسے جزیرے کی قید میں ہوں جس کے چاروں طرف آنکھوں کے دریا بہہ رہے ہیں اور ہر آنکھ مجھے دعوتِ نظارہ دے رہی ہے لیکن میری آنکھیں آنکھوں کے اس بحرِ بیکراں میں پُرسکون ہونے کی بجائے شدید اضطراب کا شکار ہو گئیں۔

میری اس غیر معمولی بیقراری کو بھانپتے ہوئے چہرے سے لفظ کا آنچل سرکاتے ہوئے ایک آنکھ گویا ہوئی کہ آپ جو کچھ ڈھونڈ رہے ہیں وہ آپ کو یہاں نہیں مل سکتا۔ میں ایک دم چونکا۔ خدایا یہ ماجرا کیا ہے۔ آج تک آنکھوں سے باتیں کرنے والے تو بہت سے انسانوں سے واسطہ پڑا ہے مگر کبھی آنکھوں کو گفتگو کرتے نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی سے سُنا ہے۔ میں نے اپنے حواس کو مجتمع کرنے کی بھرپور جد و جہد کی جس میں کوئی کامیابی نہ ہو سکی لیکن میری شدید خواہش تھی کہ بولنے والی آنکھ سے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے زندگی کے پوشیدہ گوشوں کو منظرِ عام پر لایا جائے۔ چنانچہ دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ گفتگو کو سوالات اور جوابات کی سلک میں پرو کر پیش کروں تاکہ سوال اور جواب کے درمیانی وقفہ میں حواس بحال رکھنے کا موقع میسّر آتا رہے نتیجتاً مکالمہ بازی کی ابتدا کچھ یوں ہوئی۔

س:۔ آنکھ صاحبہ آپ ابھی ابھی بتا رہی تھیں کہ جس چیز کی مجھے تلاش ہے وہ اس لغات میں نہیں ہے کیا میں پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ وہ کیا چیز تھی!

ج:۔ کیا آپ کو تیسری آنکھ کی جستجو نہیں ہے جو آپ کو الفاظ کے قطار در قطار صحراؤں میں کسی صورت میں بھی مل نہیں سکتی۔ دراصل مسئلہ یہ ہے کہ تیسری آنکھ رکھنے والے لوگ کتابوں کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔ وہ کتابوں کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ کتابیں ان کی نگاہِ التفات کو ترستی رہتی ہیں مگر اس دور کے لوگ کتابوں کی چوکھٹوں پر دریوزہ گری کرتے نظر آتے ہیں۔ آپ بھی تیسری آنکھ وا کریں۔ قدرت کے رازہائے پنہاں خود بخود آشکار ہو جائیں گے۔

س: معاف کیجئے گا مجھے اپنی کم مائیگی کا زبردست احساس ہے۔ اپنے ناقص علم میں اضافہ و تشریح کے لئے عرض ہے کہ میں آپ کی بات سمجھ نہیں پایا لہٰذا ذرا وضاحت سے بات کیجئے۔

ج:- اس میں نہ سمجھنے والی کونسی بات ہے۔ آپ نے چھٹی حس اور ضمیر یا دل کی آنکھ وغیرہم کے نام تو سن رکھے ہوں گے۔ کیا کبھی انہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور تیسری آنکھ ان کی مجملہ حیات و حرکات کا ماخذ ہے۔ یہ سب کو دیکھتی ہے مگر اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا ہے۔ یہ خوشبو کا ایک دائمی لمس ہے جس سے مشامِ دل کو معطر کیا جاتا ہے لیکن دیکھا نہیں جا سکتا ہے۔

س:- اس کا مطلب ہوا اس کے سر پر سلیمانی ٹوپی ہے۔

ج:- سلیمانی ٹوپی تو تیسری آنکھ کے بیدار ہونے کا انتہائی عمل ہے جس کے لائق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہو سکتی ہے۔ عام انسان اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ تو خدا اور رسول اللہ تعالیٰ کا براہِ راست معاملہ ہے لیکن اس حقیقت سے کسی صورت میں بھی مفر نہیں کہ خدا اور کسی صاحبِ حال کے درمیان تیسری آنکھ ہی مرکزی رابطہ کا کام دیتی ہے۔ الہام بھی تیسری آنکھ ہی کی کرشمہ سازی ہے۔

جس شخص کی آنکھوں کا نور چھن چکا ہو اس کی تیسری آنکھ ہر وقت بیدار رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کی دوڑ میں نہ صرف احسن انداز سے شریک ہوتا ہے بلکہ خلافِ قیاس بہت سے کام انجام دینا بھی جانتا ہے۔ زندگی کی اس دوڑ میں ممکن ہے کسی آنکھوں والے کو رستہ نظر نہ آئے مگر کیا مجال کہ کوئی نابینا راہ سے بھٹکے۔ دراصل اس کی ظاہری آنکھیں تو نور سے محروم ہو چکی ہوتی ہیں لیکن دل کی آنکھوں کی روشنی تیز ترین ہو جاتی ہے اور دل کی روشنی کا سارا دارومدار تیسری آنکھ کی روشنی پر ہوتا ہے۔ چرند، پرند اور دوسرے جانوروں کی تیسری آنکھ کی بیداری کا یہ عالم ہوتا ہے کہ آنے والے خطرات کو بھانپتے ہوئے ارضی و فلکی آفتوں کی آمد سے پہلے اپنے علاقے تبدیل کر جاتے ہیں۔ سائنس دانوں کی تیسری آنکھ کی بینائی بھی تیز ہوتی ہے جس کے نتیجے میں ارض و سماء کے پوشیدہ خزانوں کی بازیافت کے عمل سے گزرتے ہیں۔ آخر کار کسی ایجاد کا سبب بنتے ہیں یادداشت بھی تو تیسری آنکھ کا ہلکا سا عکس ہے اور ازمنۂ ماضیہ کی تمام مستند کتب تیسری آنکھ کی پلکوں کی جھلمل جھلمل ہیں۔ کثرتِ مطالعہ سے تیسری آنکھ کے وا ہونے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ مگر ہر کتاب بھی اپنی ایک تیسری آنکھ رکھتی ہے جو کسی ایسے قاری کی تلاش میں رہتی ہے۔ جو اس کی روحِ معانی میں اتر کر اس کے پس منظر کے نشیب و فراز پر چہل قدمی کرے۔ علامہ اقبال نے آنکھ کے حوالے سے ابدالآباد تک زندہ رہنے والا شعر کہا ہے اور یہ آنکھ ان کی تیسری آنکھ کے وا ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے جس میں تیسری آنکھ کی لامحدود وسعتوں کی نقشہ کشی کی گئی ہے ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

انسانی زندگی، بچپن، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے کی چوکور کے گرد گھومتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر ذرہ آفتاب ہے اپنے مقام پر۔ کے مترادف ہر دور کی اپنی قدر و قیمت اور انفرادیت ہے مگر بچپن میں انسان کی تیسری آنکھ زیادہ زود حس ہوتی ہے جو کچھ دیکھتی ہے وہ کسی قسم کی مصلحت کو خاطر میں لائے بغیر بیان کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل مند لوگ اکثر کام اپنے ننھے منے بچوں سے چھپا کر کرتے ہیں لڑکپن اور جوانی کی تیسری آنکھ ہر چیز کو مصلحت آمیزی سے دیکھنے کی عادی ہو جاتی ہے اور جہاں تک بڑھاپے کا تعلق ہے یہ اپنے تمام تر تجربات کے محلول سے جو عرق کشید کرتا ہے اس میں فطری طور پر تیسری آنکھ کی روشنی کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ گویا زندگی ایک ایسا دائرہ ہے جو

تیسری آنکھ کی کارگزاریوں سے شروع ہو کر بالآخر اسی سے بغلگیر ہو جاتا ہے۔ صاحبِ حال لوگ بھی اس دائرے میں شمار تو ضرور ہوتے ہیں البتہ ان کا معاملہ قدرے مختلف ہوتا ہے۔ عام حالات میں جو نقطہ انسان کی نگاہ کی آخری حد ہوتا ہے وہاں سے صاحبِ حال لوگ اپنے سفر کی ابتدا کرتے ہیں یہی سبب ہے کہ صاحبِ حال لوگ سب کچھ سمجھتے ہیں مگر ان کو سمجھنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اس سارے عمل میں صاحبِ حال لوگوں کا کچھ کمال نہیں ہوتا بلکہ ان کی تیسری آنکھ کی حساسیت کا نتیجہ ہوتا ہے اور ان کی تیسری آنکھ روحانی آنکھ کے مقام پر متمکن ہوتی ہے بنا بریں تقدیر کی اپنی آنکھ ہوتی ہے جو کبھی تو تدبیر کی حیلہ بازیوں پر مسکراتی ہے اور کبھی اس کے شانہ بشانہ چل کر تاریخ کی جبین پہ کارناموں کو کندہ کرنے کا موجب بنتی ہے۔

تدبیر کی آنکھ تیسری آنکھ کے حدودِ اربعہ تک رسائی کا زینہ ہے، تیسری آنکھ خود شناسی کا سنگِ میل ہے۔ خود شناسی کے تمام تر وسائل اور تگ و دو کے راستے اسی سنگِ میل سے معانقہ کرتے ہیں۔ تیسری آنکھ کی راہ سے گزر کر انسان فرشتوں سے افضل ہو جاتا ہے۔ تیسری آنکھ کی حیثیت پارس کے پتھر سی ہے جس کو جونہی کوئی لوہے کا ٹکڑا چھوتا ہے فوراً سونے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور سونے پر مصلحت آمیزی، اقربا پروری اور زمانہ سازی کا زنگ نہیں چڑھ سکتا۔ عام آنکھ دنیا سے اس قدر محبت پیدا کر دیتی ہے کہ انسان اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے اور اس کو چھوڑنے کے تصور سے لرزہ براندام ہو جاتا ہے جب کہ تیسری آنکھ کو بیدار رکھنے والے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور اس جہان کو چند ثانیے دم لے کر اگلی منزل کی سمت چلنے کا وقفہ قرار دیتے ہیں۔ میں یکدم خواب سے جاگا اور یوں محسوس ہوا جیسے میرا وجود تیسری آنکھ میں ڈھل رہا ہے۔

گفتار خیالی کا مجموعۂ غزلیات

مدارِ شعور

شائع ہو گیا ہے

ناشر: کاروانِ ادب ملتان صدر

معانقہ

محمد اقبال انجم

میرے ایک دوست کسی بینک کی برانچ کے مینجر تھے۔ پیشے کی مناسبت سے ہر گاہک سے مصافحہ کرنا یا اپنی سیٹ سے اُٹھ کر اس کا استقبال کرنا تو خیر اُن کی مجبوری تھی ہی، لیکن موصوف نے استقبال کی ایک انوکھی ادا اپنائی۔ اُنہوں نے اپنی محبت کا شدید اثر ڈالنے کے لیے ہر آنے والے کو والہانہ انداز سے گلے لگانا شروع کر دیا۔ ایک دن حسبِ روایت وہ بینک میں داخل ہونے والے ایک فرد سے معانقہ کر کے علیحدہ ہوئے اور پوچھا کہ جناب "آپ کتنے پیسے بینک میں جمع کروائیں گے؟" اُس نے کہا "جی میں بینک کا سویپر ہوں اور اپنی تنخواہ لینے آیا ہوں" یہ سُن کر پوری برانچ میں ایک قہقہہ پڑا اور مینجر صاحب کھسیانے ہو کر رہ گئے۔

ویسے تو تعلقات کی مختلف نوعیتیں، ملاقات کے سو طریقے تراشتی ہیں لیکن تین قسمیں معاشرے میں عمومی طور پر مروّج ہوتی ہیں۔ مختلف سمتوں میں چلتے چلتے ہیلو ہیلو کہنا۔ باقاعدہ مصافحہ کرنا اور معانقے کی صورت میں اظہارِ محبت کرنا۔ اگر ملاقات کی ان تین اقسام کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہیلو ہیلو کہنا دُور رہنے کا اشارہ ہے۔ مصافحہ ہاتھوں ہاتھ لینے کا عمل ہے اور معانقہ ایک دوسرے کے دل میں اُتر جانے کا نام یا تعلقات کے پُشتے مضبوط تر کرنے کی ادا۔ ہاں اگر معانقے کے درمیان دو موٹی توندیں حائل ہو جائیں تو معانقہ محض پُشتیں دبانے اور توندیں بھینچنے کا عمل بن کر رہ جاتا ہے۔

میں نے اپنی چشمِ تصوّر کو اپنی معلومات کی شاہراہ پر دُور تک دوڑا کر دیکھا لیکن مجھے پھر بھی معلوم نہ ہو سکا کہ معانقہ کی رسم کس قوم کی ایجاد ہے مگر وہ پہلا انسان جس نے وارفتہ ہو کر دوسرے انسان کو گلے لگایا تھا گویا اُس نے محبت کے ایوان میں تاج محل تعمیر کر دیا تھا۔ ویسے تو وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز ترمیم و اختراع کے عمل سے گزرنے پر مجبور رہی ہے مگر معانقہ ایک خاص معاشرتی اندازِ ملاقات ہے جسے مختلف قوموں نے اپنے اپنے مزاج میں ڈھال لیا ہے۔ معانقہ مغرب میں پہنچا تو اہلِ مغرب نے اُسے اپنے بازوؤں پر تھام لیا۔ عربوں نے کندھے ملانے کے بجائے گالوں پر بوسوں کو رواج دیا۔ لیکن برِ صغیر کے انتہا پسند لوگوں نے اس میں اتنی شدت پیدا کی کہ عید ملن پارٹیوں، شادیوں اور الوداعی تقریبات وغیرہ کے بعد اکثر لوگوں کو اپنے کندھوں کو سہلاتے اور پسلیوں کی مالش کرواتے دیکھا گیا ہے۔

مَیں جب بھی دو افراد کو معانقہ کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے یہ ایک فطری عمل معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ہاتھ پھیلائے مصافحے کے لیے بڑھنے والے پُر جوش انداز میں ایک دوسرے کے گلے لپٹ جاتے ہیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مصافحہ جذبات کی تشنگی کو وہ آسودگی نہیں دیتا جو گلے ملنے سے حاصل ہوتی ہے۔ سینے میں اُبلتا ہوا جذبات کا جوار بھاٹا کندھوں کے ساحل پر پہنچ کر ہی شاد کام ہو سکتا ہے۔ معانقہ محبت کی ایسی رسم کہن ہے جو کسی داستانِ پارینہ کی طرح ایک کلاسیکی روایت بن چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محلے یا خاندان کے بزرگ دو ناراض انسانوں میں صُلح کرانے کے لیے اُنہیں معانقاتی عمل سے ضرور گزارتے ہیں تاکہ دلوں سے خارج ہونے والی مقناطیسی لہریں ایک دوسرے کے سینوں میں پلنے والے دشمنی کے جراثیموں کو ہلاک کر دیں۔

مَیں نے ایک دفعہ ایک بزرگ دانشور سے پوچھا کہ حضرت پہلوان کشتی کے دوران یا بعض لوگ بوقتِ جنگ بھی تو معانقے کی کیفیت میں ہوتے ہیں۔

اُن کے ملاپ کو معانقہ کیوں نہیں کہتے۔ فرمانے لگے کہ معانقہ عربی زبان کا لفظ ہے جو عنق سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے گردن گویا معانقہ کا ترجمہ ہوا گلے ملنا۔ اب گلے ملنا اور گلے پڑنا میں بہت فرق ہے۔ کُشتی لڑنا معرکہ آرائی ہے اور گلے ملنا معانقہ آرائی ہے دونوں اپنے نتائج کے لحاظ سے بھی انتہائی مختلف ہیں۔

پیوستگی کا یہ عمل محض انسانوں تک محدود نہیں بلکہ اگر غور کیا جائے تو کائنات کی ہر جاندار اور بے جان چیز حُسنِ معانقہ سے آشنا ہوتی ہے۔ گھڑی کی سوئیاں ڈائل کی گولائی میں سفر کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن وہ وقت کے صحرائے لبسیط میں سفر کرتی ہوئیں ہر لفظ کے سنگِ میل پر ایک دفعہ ضرور گلے ملتی ہیں۔ چیونٹیاں جب کسی مکان کے گوشے میں پڑے ہوئے رزق کے ذخیرے کو اپنے اپنے سوراخوں میں منتقل کرنے کا عمل شروع کرتی ہیں تو آمد و رفت کے دوران صورتِ احوال معلوم کرنے یا اظہارِ مسرت کے طور پر معانقے کو ضروری سمجھتی ہیں۔ دُور افق پر زمین و آسمان کی معانقہ آرائی کا منظر کسی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہوگا۔ رات اور دن کے طلوع و غروب کے وقت ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جسے ڈرائیور حضرات BLIND TIME کہتے ہیں۔ اسی لمحے دن، رات کا راستہ روک کر کھڑا ہوتا ہے اور رات، دن کے چہرے پر سیاہ زلفیں پھیلانے کی کوشش میں مصروف ہوتی ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ رات اور دن کے تھکے ہارے مسافر مشرق و مغرب کے سفر کی تھکان اتارنے کے لیے وقت کے سنگم پر معانقے کا نقش ضرور چھوڑتے ہیں۔ معانقہ جدائی اور ملن کا سنگم ہے۔ معانقہ اُمڈتے ہوئے جذبات کی آسودگی کا عمل ہے۔ معانقہ جدائی کا پیش خیمہ اور ملاپ کا حرفِ آخر ہے۔ دو انسانوں کا اخلاص معانقہ محبت کی سرزمین پر کھلنے والے اسی پھُول کی طرح ہے جو تعلقات کی رگِ جاں کو مہکا دیتا ہے۔

بادل جب تیز ہواؤں کے ساتھ مل کر بارش کے انصرام میں بھاگ دوڑ کرتے ہیں تو فضاؤں میں اُن کا معانقہ دلوں کو دہلا کر رکھ دیتا ہے۔ چاند اور سُورج آسمان کی وسعتوں میں دن اور رات کی پیدائش میں مصروف رہتے ہیں۔ برسوں کے اس اُکتا دینے والے سفر میں دلکشی پیدا کرنے کے لیے وہ کبھی کبھار ایک دوسرے سے معانقے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی اظہارِ محبت کے دوران وہ کچھ وقت کے لیے روشنی پھیلانے کے فرضِ منصبی کو بھُول جاتے ہیں اور ہم لوگوں نے اسے چاند یا سُورج گرہن کا نام دے رکھا ہے۔

اگر کسی شعر کی بندش پر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ایک ایک لفظ کو زنجیر کی کڑیوں کی صورت آپس میں پیوست کرنے، مُرغِ تخیل کے پھڑپھڑاتے پَروں کو قافیہ و ردیف کے پنجرے میں جکڑ کر عروض کی پگڈنڈیوں پر چلنے کا غیر معمولی عمل ہے جہاں سے ہر قدم پر گرنے اور پھسلنے کا احتمال رہتا ہے۔ یہ تو ایک اچھے شعر کی تعریف ہے لیکن ہم آسان الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دو مصرعوں کے حسین معانقہ کا نام شعر ہے۔

دنیا میں کسی بھی انسان کے دو پہلو ہیں ایک ظاہر اور دوسرا باطن۔ دونوں شعور کی پہلی انگڑائی سے لے کر آخری ہچکی تک ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ کبھی ظاہر کی خوشحالی باطن کی تاریکی کو چھپانے کی کوشش کرتی ہے اور کبھی باطن کی صفائی منافقت کے ظاہری پردے کو چاک کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ یہی ظاہر و باطن کی یہ آویزش اکثر چہروں کے بدلتے رنگوں میں دکھائی دیتی ہے اور زبانوں کی لڑکھڑاہٹ میں سنائی دیتی ہے۔ لیکن ظاہر و باطن کی یک رنگی ایک ایسی معانقاتی کیفیت کو جنم دیتی ہے جو انسان کے چہرے پر سکون و اطمینان کا ایک ابدی تاثر قائم رکھتی ہے۔

یکسانیت

بشیر سیفی

میرے ایک دوست ہر چند ماہ بعد اپنے ڈرائنگ روم میں رکھی ہوئی چیزوں کی ترتیب بدل دیتے ہیں۔ بقول ان کے وہ یکسانیت کا شکار ہو کر بوریت محسوس کرنے لگتے ہیں اور ایک اضطراری کیفیت کے زیرِ اثر ایسا کرتے ہیں۔ میں جب بھی ان کے ڈرائنگ روم کی ترتیب میں تبدیلی محسوس کرتا ہوں مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ تبدیلی خود اُن کی ذات میں رونما ہوئی ہے۔ ان کے اندازِ گفتگو اور نشست و برخاست میں نمایاں فرق دیکھ کر اس بات پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے کہ فرنیچر کی ترتیب، کمرے کی فضا اور پردوں کے رنگ کا انسان کے مزاج کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ جس طرح معاشرے میں ہونے والی تبدیلیاں افراد پر اثر انداز ہوتی ہیں بالکل اسی طرح گھر اور کمرے کی فضا میں ہونے والی مثبت اور منفی تبدیلی بھی مکینوں کی سوچ کا زاویہ بدلنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ تاہم یہ عمل یک طرفہ نہیں ہے۔ کمرے، گھر اور معاشرے کی فضا چونکہ افراد ہی تخلیق کرتے ہیں اس لیے ان کے منظر نامے سے افراد کی ذہنی ساخت اور ان کے زاویۂ نگاہ کا سراغ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی کے ڈرائنگ روم میں قیمتی اشیا کا مینا بازار لگا ہو اور دیواریں آرٹ گیلری کا نمونہ پیش کر رہی ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس گھر کے مکین قیمتی اشیا کی نمائش سے اپنی امارت کا اظہار کر کے ملنے جلنے والوں کو مرعوب کرنے کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ایسے لوگ عموماً اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں مگر چونکہ یہ اپنے چہروں پر اطمینان اور فارغ البالی کا خول چڑھائے پھرتے ہیں اور کسی کو اپنے اندر جھانکنے کا موقع نہیں دیتے اس لیے بڑے مسرور اور مطمئن دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ڈرائنگ روم میں مناسب قیمت کا ساز و سامان قرینے سے سجا ہو تو یہ مکینوں کے اعتدال و توازن کا غماز ہوگا۔ ایسے لوگ نہ تو کسی کو متاثر کرنے کے فکر میں گھلتے ہیں اور نہ غیر ضروری نمائش سے مرعوب ہونا جانتے ہیں۔ یہ لوگ نہ تو کسی کو خود سے کمتر جان کر حقیر سمجھتے ہیں اور نہ کسی کی برتری کو خاطر میں لاتے ہیں۔

آرائش و زیبائش کی طرح عمارات کا طرزِ تعمیر بھی مکینوں کے ذہنی رویّوں کی عکاسی کرتا ہے۔ تنگ اور پیچیدہ مکان ذہنی اُلجھاووں کے غماز ہو سکتے ہیں جبکہ وسیع اور کشادہ مکان بے تکلفی اور کھُلے دل کا اظہار کرتے ہیں۔ قدیم محلات کی غلام گردشیں سازشی ذہن کی پیداوار کہی جا سکتی ہیں مگر مکانات کی تعمیر میں جغرافیائی اور موسمی حالات کا ہاتھ بھی ہوتا ہے۔ میدانی علاقوں کے مکان ویسے نہیں ہو سکتے جیسے پہاڑی علاقوں کے ہوتے ہیں۔ ایشیا کا طرزِ بود و ماند چونکہ یورپی ممالک سے مختلف ہے اس لیے ہر دو برّاعظموں کے رہائشی مکانات کی تعمیر میں زمین، آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔ قومی اور مذہبی نوعیت کی عمارات اجتماعی سوچ اور عقائد کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہندو چونکہ کثرت پرست ہیں اور بُت مرئی چیز ہے اس لیے مندروں کے در و دیوار بتوں کی کثرت ہی کا نمونہ پیش کرتے ہیں جو ظاہر ہے کہ زمین سے وابستگی کی علامت ہے۔ گرجا گھروں کی تعمیر سے عیسائیوں کا عقیدۂ تثلیث نمایاں ہوتا ہے اور صلیب تو اس پر نصب ہی ہوتی ہے۔ مسلمان چونکہ زمین کے سحر سے آزاد ہے اس لیے مساجد کے اندر افقی پھیلاؤ ہوتا ہے، جب کہ ان کے گنبد و مینار عمودی پرواز کا منظر پیش کرتے ہیں۔ ان عبادت گاہوں میں سے ہر ایک کا ایک اپنا مزاج اور انداز ہے جس میں کوئی بنیادی تبدیلی شاذ ہی نمودار ہوتی ہے۔

اپنے دوست کے ڈرائنگ روم میں ہونے والی مسلسل تبدیلیوں کو میں ان کی غیر مستقل مزاجی پر محمول کرتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ ان کی غیر مستقل مزاجی ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ زیادہ عرصہ تک کسی ایک ترتیب کو برداشت نہیں کر سکتے اور اسے اُلٹ پلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ اگر کسی دن اچانک انہوں نے مجھ سے یہ کہہ دیا کہ بھئی ہماری تمہاری دوستی بہت طویل ہو گئی ہے۔ میں اب تبدیلی چاہتا ہوں لہٰذا ہماری تمہاری دوستی ختم، تو مجھے چنداں حیرت نہ ہو گی۔ تعجب خیز بات تو یہی ہے کہ وہ اپنی تغیّر پسند طبیعت کے باوجود گزشتہ کئی برس سے مجھے برداشت کرتے چلے آ رہے ہیں حالانکہ میرے بارے میں بعض دوستوں کی رائے ہے کہ میں زیادہ عرصہ تک کیلئے قابل برداشت نہیں ہوں یہ الگ بات کہ خود میرے بھی ان کے بارے میں کچھ ایسے ہی خیالات ہیں۔

یکسانیت غیر فطری نہیں بلکہ عین تقاضائے فطرت ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ موسموں کا تغیّر و تبدّل اور گردشِ لیل و نہار فطرت کی تغیّر پسندی کے مظہر ہیں تو میں اسے تسلیم نہیں کروں گا۔ مانا کہ اقبال کہہ گئے ہیں ؏

ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

مگر اقبال تو اور بھی بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ ہم ان کی کس کس بات پر سر تسلیم خم کرتے رہیں گے۔ مزید برآں یہ فلسفیانہ فکر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے جبکہ شاعرانہ اندازِ نظر تو یہ ہے کہ ؏

بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

موسموں کا تغیّر و تبدّل اور رات دن کی گردش تو محض ظاہری پرت ہے ورنہ موسم کہاں تبدیل ہوتے ہیں۔ موسموں کا ایک خاص وقفے سے چولا بدلنا اور بار بار انہی موسموں کا پلٹ کر آنا یکسانیت نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر ایک موسم دوبارہ پلٹ کر نہ آئے تو پھر تغیّر کہا یا مان لایا جا سکتا ہے مگر ظاہر ہے ایسا نہیں ہے۔ وہی گنے چنے موسم ہیں جو آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ کم و بیش یہی حال روز و شب کے تسلسل کا ہے۔ رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات ایک طرح کی یکسانیت ہی تو ہے مگر ہم ان سے کبھی نہیں اکتاتے۔

مختلف مذاہب بھی اپنی تعلیمات سے تغیّر کی نفی اور ابدیت کی تبلیغ ہی کرتے ہیں۔ تقریباً تمام آسمانی مذاہب کی بنیادی تعلیمات میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے ——————————— پھر ان مذاہب نے اپنے ماننے والوں پر جو حدود و فرائض ایک دفعہ عائد کر دیئے ان میں تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو قوانین آسمان سے اترے وہ اٹل اور حرفِ آخر ہیں۔ قیامت تک ان میں تبدیلی ممکن نہیں۔ عبادت کے جو اوقات مقرر کر دیئے گئے ہیں بڑے سے بڑا عالمِ دین بھی ان میں ردّ و بدل کا مجاز نہیں۔ آپ نماز روزہ سے غافل رہیں تو اور بات ہے لیکن اگر آپ ان شعائر کو بجا لانا چاہیں تو آپ کو مقررہ اوقات کی پابندی کرنا ہی ہو گی خواہ آپ کتنے ہی تغیّر پسند کیوں نہ ہوں۔ فجر کی نماز طلوعِ آفتاب سے قبل ہی ادا کرنی ہے۔ اور روزہ مغرب کے وقت ہی افطار کرنا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ فجر کی نماز صبح دس بجے پڑھ لی جائے (قضا کی بات الگ ہے) اور روزہ ظہر یا عصر کے وقت افطار کر لیا جائے۔

اور تو اور آدمی خود یک رنگی کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ وہی دو آنکھیں، دو کان، دو ہاتھ اور دو پیر، وہی ناک اور منہ جو روزِ آفرینش تھا آج بھی ہے۔ رنگ اور قد کاٹھ کے فرق کا ذکر نہیں کہ یہ فروعی چیز ہے۔ بنیادی طور پر آج بھی انسان وہی ہے جو روزِ اوّل تھا۔ اگر یکسانیت کا دائرہ ٹوٹ جائے اور کوئی ایسا آدمی پیدا ہو جائے جس کی دو کے بجائے تین آنکھیں، تین ہاتھ اور تین پیر ہوں، منہ اور ناک دو دو ہوں تو کیا اس کا شمار عجائباتِ عالم میں نہ ہو گا؟ آپ کا جواب یقیناً اثبات میں ہو گا اور یہی میرے مؤقف کے درست ہونے کا ثبوت ہے۔ یہی نہیں کہ

انسان کے ظاہری قویٰ یکسانیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں بلکہ اس کا باطن بھی صدیوں پرانا ہے۔ جبلی طور پر آج کا انسان ہابیل و قابیل کے عہد سے مختلف نہیں۔ محبت و نفرت، رشک و حسد، غصہ و رحم کے جذبات آج بھی انسان کے اعصاب پر اُسی طرح سوار ہیں جیسے اربوں کھربوں سال پہلے تھے۔ یکسانیت اور یک رنگی کی شکایت کرنے والے اس ہمہ گیر یکسانیت کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

در اصل یکسانیت بذاتِ خود کوئی شے نہیں۔ یہ محض احساس کا بوجھل پن ہے جو بعض لوگوں کو نچلا نہیں بیٹھنے دیتا اور وہ عالم اضطراب میں بادشاہت چھوڑ کر جنگل میں کسی درخت تلے جا براجمان ہوتے ہیں اور سالہا سال یکسانیت کی زندگی بسر کرنے کے بعد ان پر منکشف ہوتا ہے کہ عرفانِ حقیقت کے لیے یکسانیت کی بھٹی سے گزرنا کس قدر ناگزیر تھا۔

حلقہ اربابِ ذوق سیالکوٹ

کے

ادیبوں کی زندہ تحریروں کا مجموعہ

حرفِ تازہ

شائع ہوگیا ہے

بے کار رہنا

محمد یونس بٹ

آج کل بڑا ادیب وہ ہوتا ہے جو چھوٹی سی بات پر بڑی بڑی کتابیں لکھ لے اُس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ کئی سو صفحے لکھنے کے باوجود کچھ نہیں لکھتا۔ ایسے ہی مختلف کاموں کا سہارا لے کر وقت گزارنے والے اتنے اہم نہیں جتنے بغیر کسی کام کے وقت کاٹنے والے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کام کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا بے کار رہنا۔ شاید اسی لیے تاریخ میں بڑے بڑے کام کرنے والوں کی تو کمی نہیں لیکن بے کار رہنے والوں کا نام مشکل ہی سے ملتا ہے۔

آج کل مجھے یہی کام ہے کہ میں سدا دن بے کار رہتا ہوں۔ دن ابھی رات کی گود میں لیٹا اونگھ رہا ہوتا ہے کہ میں جاگ اُٹھتا ہوں۔ سارے گھر والے دن کا آغاز کام سے کرتے ہیں۔ دن ختم ہو جاتا ہے مگر کام ختم نہیں ہوتا لیکن میں بے کار بیٹھا گھر والوں کی توجہ کا مرکز بنا رہتا ہوں کہ اس تیز رفتار دور میں کام کرنے والے کو کون پوچھتا ہے سبھی بے کار کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ پھر سورج کے خوف سے درختوں تلے دبکے سائے دھیرے دھیرے سر نکال کر باہر جھانکنے لگتے ہیں اور سورج رات گزارنے کے لیے مغرب کی راہ لیتا ہے جس کی وجہ میرا دوست یہ بتاتا ہے کہ آخر مشرق میں رات گزارنے کے لیے رکھا ہی کیا ہے؟ جونہی سورج آنکھ سے اوجھل ہوتا ہے آسمان جلدی سے اپنے ہونٹوں پر لپ اسٹک مل کر انہیں زمین کے گالوں پر رکھ دیتا ہے اور میں بستر سے ہم آغوش ہونے کا موقع ڈھونڈنے لگتا ہوں۔

میرا دوست "ف" انسان نہیں فرشتہ ہے اس کے کام بھی فرشتوں والے ہیں یعنی دوسروں کی برائیوں اور گناہوں کا حساب رکھتا ہے۔ کہتا ہے: بے کار بیٹھے شیطانی سوجھتی ہے۔ حالانکہ شیطانی اور بے کاری دونوں ایک دوسری کی ضد ہیں۔ شیطان کے پاؤں میں تو چکر ہے۔ بلکہ شیطان بے کار رہنے لگے تو شیطان ہی نہیں رہتا۔ جبکہ بے کار تو چپ چاپ رب سے لو لگانے والا ہے جو یقیناً شیطان کی بجائے رحمان کے نزدیک ہوتا ہے۔

آج کل عاشق اور بے کار دونوں کو لوگ مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن دونوں میں فرق ہوتا ہے۔ بے کار کو مسائل کا سامنا ہوتا ہے جبکہ عاشق بذاتِ خود سب سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ یوں بھی عاشق تو ہر کوئی ہو سکتا ہے اس کے لیے عمر، عقل اور شکل کی قید نہیں مگر بے کار ہونے کے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ کہتے ہیں بے کار رہنے سے بہتر ہے کہ شاعری کی جائے شاید اسی لیے شاعروں کی تعداد میرے مسائل کی طرح بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ جب سے میں بے کار ہوا ہوں میں بھی شاعروں سے ملنے لگا ہوں جس سے مجھے سکون ملتا ہے کہ اگر دو سال اور بھی بے کار رہا تب بھی حالت کم از کم ان سے تو بہتر ہو گی۔

بے کار رہنے کے سارے مزے شادی سے پہلے کے ہیں۔ شادی کے بعد آدمی بڑے "کام" کرنے لگتا ہے بلکہ بہت زیادہ مصروف ہو جاتا ہے اسی لیے جب کوئی لڑکا کام میں دلچسپی نہ لے تو سیانے ماں باپ اس کی شادی کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔

بے کار رہنا صحت بنانے کی طرف ایک قدم ہے۔ بے کار رہنے سے عورتیں پلک جھپکتے ہی مستطیل سے مربع بن جاتی ہیں اور اس تیزی سے چربی کے پہاڑوں میں چھپتی ہے کہ آپ انہیں ڈھونڈتے ہی رہ جاتے ہیں۔ لیکن سنا ہے بے کار عورت اور بد کار مرد بھروسہ کے قابل نہیں ہوتے۔ شاید اسی لیے عورتیں کم ہی بے کار

بیٹھتی ہیں بلکہ ہر وقت باتیں کرتی رہتی ہیں۔

بے کار رہنے سے وقت بھی دھیرے دھیرے گزرتا ہے، اس سے بڑھ کر بے کار رہنے کی بڑائی اور کیا ہوگی کہ اُسے وقت ضائع ہونے کا احساس نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ بے کار تو اس بچے کی طرح ہے جسے اتنے زیادہ کھلونے مل جائیں کہ وہ انہیں سمیٹ ہی نہ سکے اور بجائے خوش ہونے کے رونے لگے۔ ایسے ہی بے کار کو جب وقت کا انمول خزانہ ملتا ہے تو وہ اسے سمیٹ نہیں پاتا اور پریشان ہو جاتا ہے۔ بے کار وہ معصوم ہے جس سے کسی کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا جب کہ کام کرنے والوں کا کیا بھروسہ کب ہڑتال کی دھمکی دے دیں، کب زیادہ تنخواہ کا مطالبہ کرنے لگیں۔

کہتے ہیں بد سے بدنام بُرا۔ جس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ بد میں کچھ صلاحیتیں تو ہوتی ہیں، مگر بدنام کو تو یہ رتبہ دوسروں کی صلاحیتوں کے باعث ملتا ہے۔ پھر یقیناً بد اچھا بدنام بُرا ہوا۔ میں کہتا ہوں بے کار سے کام کرنے والا بُرا۔ کیونکہ کام کرنے والے سے غلط کام کا خدشہ ہو سکتا ہے بے کار سے نہیں۔

میرے دوست "الف" کو کوئی نہ کوئی شوق چمٹا ہی رہتا ہے۔ جوڑ توڑ کرانے کا جنون ہوا تو کہنے لگا: رقص اعضا کی شاعری ہے تو جوڑ توڑ کرانے اعضا کی نثری نظم ہے۔ علم حاصل کرنے کا شوق ہوا تو کالج سے ناغے کرنے لگا۔ بڑے لوگوں سے ملنے کا دورہ پڑا تو سارا دن کمرے میں بند رہنے لگا۔ وجہ یہ بتائی کہ آج کل میں کسی چھوٹے آدمی کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ اور کمرے سے آئینہ تک اتروا دیا۔ بھوکوں مرنے لگا تو شاعری شروع کر دی۔ فرمایا شاعری اور عشق ہی وہ کام ہیں جو آدمی بھوکا رہ کر کر سکتا ہے۔ جب کام کرنے کو دل چاہا بے کار پھرنے لگا۔ کہا بے کار ہوتا ہی وہ ہے جو کام کرنا چاہے۔

بے کار بڑا عقلمند آدمی ہوتا ہے کہ وہ اتنا تو جانتا ہے کہ وہ کچھ نہیں کر رہا جبکہ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو کسی نہ کسی بہانے خود کو مصروف رکھ کر کچھ بھی نہیں کرتے مگر یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کچھ نہیں کر رہے۔

بے کاری ترقی کا دوسرا نام ہے۔ کسی ملک کی ترقی کا اندازہ اس بات سے ہرگز نہیں لگایا جا سکتا کہ وہاں کتنے لوگ کام کرتے ہیں، کیونکہ اس لحاظ سے تو پاکستان سب سے ترقی یافتہ ملک ہوا کہ وہ کام جو ایک آدمی کے کرنے کا ہوتا ہے ہمارے ہاں اسے بھی کئی کئی آدمی مل کر کرتے ہیں۔ بلکہ کسی ملک کی ترقی کا اندازہ وہاں کے بے کاروں کی تعداد سے لگایا جاتا ہے۔ جوں جوں ترقی ہوگی انسانوں کی جگہ مشینیں لیں گی تو لوگ بے کار ہوں گے اور ملک ترقی کرے گا۔

بے کار آدمی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ لوگ اس سے قرض مانگ کر بلکہ قرض واپس مانگ کر شرمندہ نہیں ہوتے۔ لوگ اس کے قریب سے نظریں بچا کر بلکہ چرا کر گزرتے ہیں کہ ہر کسی نے اسے ملازمت دلوانے کا وعدہ کیا ہوتا ہے۔ بے کار اور ملازم میں یہ فرق ہوتا ہے کہ ملازم کام چور ہوتا ہے اور بے کار نہیں ہوتا۔ وہ کام چور ہو تو سارا دن نوکری کی تلاش میں کیوں پھرے۔

میں بے کار کی اتنی خوبیاں اس لیے بیان نہیں کر رہا کہ میں بے کار ہوں بلکہ میں اس لیے بے کار ہوں کہ بے کاری میں اتنی ڈھیر ساری خوبیاں ہیں۔

سگریٹ

اظہر ادیب

دھواں زندگی کی علامت ہے۔ کسی صحرا میں دُور سے دھواں اُٹھتا دکھائی دے تو یہ اس بات کا اشارہ ہوتا ہے کہ کوئی قافلہ خیمہ زن ہے یا پھر جہاں سے دھواں اُٹھ رہا ہو وہ صحرا کا کنارہ ہوتا ہے اور اس کنارے پر آباد بستی تھکے ہارے مسافر کو زندگی کی طرف قدم بڑھانے کا نیا ولولہ بخش رہی ہوتی ہے۔ دھواں اوپر کی طرف پرواز کرتا ہے اور دیکھنے والے کی سوچ کو اپنے ہمراہ بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ ہوا چل رہی ہو تو دھواں بادنما کا کام بھی دیتا ہے اور ہمیں ہوا کے رُخ کے بارے میں بتاتا ہے اور آج کے دَور میں ہوا کے رُخ کی پہچان اشد ضروری ہے۔ اس پہچان کے بغیر جان، مال، عزت، آبرو کسی بھی چیز کے تحفظ کی ضمانت نہیں مل سکتی۔ ایک زمانہ تھا جب گیانی دھونی رما کر بیٹھ جاتے تھے اور اپنے خیالات کا ہاتھ دھوئیں کے ہاتھ میں تھما کر ایک نہ ایک دن منزل تک پہنچ جاتے تھے۔ عہدِ نو کے انسان نے گیان دھیان کے معاملے میں بھی نئی راہ نکال لی ہے۔ چنانچہ اب ہر گیانی اپنی دھونی ایک چھوٹی سی ڈبیہ میں بند کیے جیب میں لیے پھرتا ہے اور جب جی چاہتا ہے وہ اس ڈبیہ میں سے ایک سفید براق سلائی سی نکال کر سلگا لیتا ہے اور گیان دھیان میں مصروف ہو جاتا ہے۔

ہو سکتا ہے ڈاکٹروں کی نظر میں سگریٹ نوشی مضرِ صحت ہو (اگرچہ یہ مشورہ دینے والے خود دھڑا دھڑ سگریٹ پھونکے چلے جاتے ہیں) لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سگریٹ کی وجہ سے بعض معاملات میں انسان خود کفیل ہو جاتا ہے۔ سفر کے دوران کسی ہمسفر کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ لیکن سگریٹ ہو تو یہ کمی محسوس نہیں ہوتی اور سگریٹ بہترین ہمراہی کا کردار ادا کرتا ہے۔ آدمی گھنٹوں بغیر کسی سے بات کیے سفر کرتا چلا جاتا ہے اور اُسے کسی بھی لمحے تنہائی کا احساس نہیں ہونے پاتا۔ جدید تہذیب نے ہم پر بے شمار آہنی خول چڑھا دیئے ہیں۔ اب ہم سفر کرتے ہوئے اپنے پہلو میں بیٹھے شخص سے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اگر جی چاہتا ہے تب بھی سوچتے ہیں کہ بلا سبب کیا کسی کو مخاطب کیا جائے۔ سوچا جائے تو یہ بھی ذہنی غلامی کی ایک علامت ہے۔ کیونکہ یہ سمندر پار کی روایت ہے کہ جب تک دو کے درمیان تیسرا تعارف کرانے والا نہ ہو وہ ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے۔ ایسے ماحول میں سگریٹ اُس تیسرے کا کردار ادا کرتا ہے اور ہم جیب سے سگریٹ نکال کر بلا تکلف اپنے ہمسفر سے ماچس طلب کرتے ہیں یا اُسے سگریٹ کی پیشکش کرتے ہیں اور یوں تکلف کا آہنی خول اس کاغذی پیکر کے ایک ہی وار سے پُرزے پُرزے ہو کر بکھر جاتا ہے اور ہمارے درمیان سے حجابات اُٹھتے چلے جاتے ہیں۔

حُقّہ نوشی بخیلی کی علامت ہے کیونکہ حُقّہ نوش دو پیسے کے تمباکو اور چند کوئلوں سے گھنٹوں لوگوں کو بے وقوف بناتا رہتا ہے اور ہر آنے والے کو اپنے غلیظ منہ سے نکالی ہوئی جھوٹی نے تھما دیتا ہے۔ اب چاہے کسی کو کتنی ہی کراہت محسوس ہو رہی ہو وہ اخلاق کے تقاضوں سے مجبور ہے کہ اس جھوٹی مکروہ، بدشکل اور میلی کچیلی نے کو منہ میں لے اور موصوف کے تمباکو اور حقے کی بے جا تعریف کرے۔ جبکہ سگریٹ نوشی فیاضی کا سبق دیتی ہے۔ آپ مانگنے والے کو ہمیشہ اَن چھوا، چاندی کے غلاف میں لپٹا مکمل سگریٹ دیتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ پھر واپس بھی نہیں لیتے۔

جو لوگ سگریٹ نہیں پیتے اُنہیں کوئی کام نہ ہو تو اُن کے لیے وقت کاٹنا دوبھر ہو جاتا ہے جبکہ سگریٹ نوش ایسے میں سگریٹ سُلگاتا ہے اور

دھوئیں کے مرغولے بنا بنا کر فضا میں ایک دوسرے کا تعاقب کرنے کے لیے چھوڑتا رہتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ کھیل ہے جو سگریٹ نوش کو نہ صرف بوریت سے بچاتا ہے بلکہ اداسیوں کو اس کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتا۔ دنیا کے بے شمار حسین مناظر ایسے ہیں جنھیں ہم نے ٹی۔وی پر سگریٹ کے اشتہارات کی وجہ سے دیکھا ہے۔ یوں سگریٹ نے جامِ جہاں نما کا کردار بھی ادا کیا ہے۔

سگریٹ پینے کے مختلف اسٹائل ہیں۔ کچھ لوگ شہادت کی اُنگلی اور بڑی اُنگلی کے درمیان سگریٹ پھنسا کر پیتے ہیں۔ غور سے دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان دو انگلیوں نے سگریٹ کی وجہ سے وکٹری کا نشان بنا رکھا ہے۔ اس انداز سے سگریٹ پینے والوں میں بڑا اعتماد ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ وکٹری اسٹینڈ کی طرف گامزن رہتے ہیں۔ سگریٹ پینے کا ایک اور انداز یہ ہے کہ سگریٹ کو چھنگلیا اور اس کے ساتھ والی اُنگلی کے درمیان پھنسا لیا جاتا ہے اور مُٹھی بند کرکے انگوٹھے والی طرف سے مُٹھی کو مُنہ لگا کر کش لگایا جاتا ہے۔ یہ بند مُٹھی اتحاد کی علامت ہے اور اس انداز سے سگریٹ پینے والا ہمہ وقت محبت و یگانگت کی تلقین کرتا رہتا ہے۔

ماضی قریب میں کبھی کبھار ایسا ہو جاتا تھا کہ کش لگاتے ہوئے تمباکو کی کوئی آوارہ ہوائی منہ میں آکر تلخی گھول جاتی تھی۔ لیکن اب ان ہوائیوں کو روکنے کے لیے ایک چلمن لگا دی گئی ہے جس سے کیف اور سرور تو چھن چھن کر آپ تک پہنچ سکتا ہے کڑواہٹ نہیں۔ سگریٹ منافقت کے پردے چاک بھی کرتا ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں ایک سیاسی جلسے میں جاکر ہوا۔ جلسے کی صدارت ایک معروف لیڈر کر رہے تھے۔ اُنہوں نے کھدر کا لباس پہنا ہوا تھا۔ ہم اُنہیں دیکھ کر بڑے متاثر ہوئے۔ ہمیں اس بات کی بھی خوشی ہوئی کہ وہ ہمارے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ابھی ہم پوری طرح خوش بھی نہیں ہو پائے تھے کہ اُنھوں نے جیب سے ایک غیر ملکی سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اس بدیسی سگریٹ کی ڈبیہ کی قیمت ایک غریب خاندان کے تین دن کے خرچے کے برابر تھی۔ تب ہم پر منکشف ہوا کہ اس ننھے سے کاغذی پیکر نے کتنی آسانی سے منافقت کے اُس دبیز پردے کو چاک کر دیا ہے جو ہمارے محبوب لیڈر نے اپنی شخصیت پر ڈال رکھا ہے۔

سگریٹ نوشی سے انسان کی خُفتہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ جب کوئی شاعر سگریٹ کے کش پر کش لگا رہا ہو تو وہ فکرِ سخن میں مصروف ہوتا ہے۔ سگریٹ نے اُس کا رابطہ اس دنیا سے کاٹ کر اُس اَن دیکھے جزیرے سے جوڑ دیا ہوتا ہے جہاں خوبصورت تخیلات اشعار کے روپ میں ڈھل کر تتلیوں کی طرح پرواز کرتے ہیں۔ سگریٹ کے فیوض سے صرف شاعر ہی استفادہ نہیں کرتا بلکہ فلسفی، نقاد، سیاستدان اور ہر طبقۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد اس کی نوازشات سے مستفیض ہوتے ہیں۔

انسان کو جذبوں کی وجہ سے ہی اشرف المخلوقات کا مقام حاصل ہوا ہے۔ لہو میں برف گُھل جائے تو جذبے سرد پڑ جاتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ لہو کو گرم رکھا جائے اور لہو گرم رکھنے کا سب سے آسان نسخہ سگریٹ نوشی ہے۔ علی الصبح پیش آنے والی اکثر مشکلات سگریٹ نوشی سے حل ہو جاتی ہیں۔ اس سے چونکہ ڈاکٹروں کی آمدنی متاثر ہوتی ہے لہٰذا وہ اس بے جان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں۔ خواہ مخواہ کا محاذ کھول رکھا ہے اور اس کے من گھڑت نقصانات پر مشتمل کتابوں کے انبار لگائے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن ہم ڈاکٹروں کی ان عالمانہ تحریروں کو پڑھ کر اس مجرب نسخے اور معصوم ساتھی سے دستکش ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

انسان حیوانِ ناطق ہے۔ قیدِ تنہائی کی سب سے بڑی اذیت یہی ہوتی ہے کہ آدمی کسی سے گفتگو نہیں کر سکتا۔ اس کا علاج بعض اوقات خود کلامی سے کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن خود کلامی کرنے والے کو اگر کوئی دیکھ لے تو اُس کی دماغی صحت کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ البتہ سگریٹ ایسا ساتھی ہے جس سے خاموش زبان میں آپ جب تک چاہیں گفتگو کر سکتے ہیں۔ پھر سگریٹ اور عام ساتھی میں ایک فرق بھی ہے۔ عام ساتھی آپ کی بات سننے کے ساتھ ساتھ اپنی بات بھی سنائے گا جبکہ سگریٹ آپ کی گفتگو مکمل خاموشی اور بھرپور توجہ سے سُنتا ہے اور آج کے دَور میں اُس شخص سے بڑھ کر

خوش قسمت اور کون ہوگا جسے ایسا ساتھی میسر آجائے جو صرف سُننا جانتا ہو۔

سگریٹ اگرچہ آپ کے بس میں ہوتا ہے، جب آپ کا جی چاہے سُلگا لیں جب جی چاہے بُجھا دیں۔ لیکن یہ کاغذی پیکر بڑا ہی حسّاس واقع ہوا ہے۔ آپ کی بھرپور توجہ چاہتا ہے۔ آپ سے تھوڑی سی غفلت یا بے نیازی ہو جائے تو آپ کے لباس میں روشندان کُھلنے کے علاوہ آپ کے جسم پر گلکاری بھی ہو سکتی ہے۔ اور اگر آپ بستر پر لیٹ کر اس سے بے نیازی برتیں تو

ع لکڑی جل جل کوئلہ اور کوئلہ جل بھیو راکھ

کی تفسیر آپ کی سمجھ میں تو نہیں البتہ آپ کے پسماندگان اور آپ کے ہمسایوں کی سمجھ میں آسکتی ہے۔

عارف شفیق

کا

تیسرا شعری مجموعہ

"سر پھری ہوا"

شائع ہوگیا ہے

زیرِ اہتمام: مکتبۂ خاتون پاکستان I/3R شریف آباد

فیڈرل بی ایریا - کراچی۔

دسترخوان

وزیر آغا

ایک زمانہ تھا کہ اہلِ وطن فرش پر دسترخوان بچھاتے، آلتی پالتی مار کر بیٹھتے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھانا کھاتے۔ پھر جو زمانہ بدلا تو ان کے نیچے کرسیاں اور سامنے میز بچھ گئی جس پر کھانا چُن دیا جاتا۔ پہلے وہ سر جوڑ کر کھاتے تھے اب سروں کے درمیان فاصلہ نمودار ہوا اور روبرو بیٹھا ہوا شخص مدِ مقابل نظر آنے لگا۔ مگر زمانہ کبھی ایک حالت میں قیام نہیں کرتا۔ چنانچہ اب کی بار جو اس نے کروٹ لی تو سب سے پہلے پلیٹ کو ہتھیلی پر ٹکا کر اور سرو قد کھڑے ہو کر طعام سے ہمکلام ہونے کی روایت قائم ہوئی۔ پھر ٹہل ٹہل کر اس پر طبع آزمائی ہونے لگی۔ انسان اور جنگل کی مخلوق میں جو ایک واضح فرق پیدا ہو گیا تھا کہ انسان ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھانے لگا تھا جب کہ جنگلی مخلوق چراگاہوں میں چرتی پھرتی تھی اور پرندے دانے دُنکے کی تلاش میں پورے کھیت کو تختۂ مشق بناتے تھے، اب باقی نہ رہا اور مدتوں کے بچھڑے ہوئے سینہ چاکانِ چمن ایک بار پھر اپنے عزیزوں سے آملے۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کیا ہماری تہذیب کا گراف نیچے سے اوپر کی طرف گیا ہے تو میں کہوں گا کہ بے شک ایسا ہرگز نہیں ہوا ہے کیونکہ ہم نے فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھنے کی روایت کو ترک کر کے کھڑے ہو کر اور پھر چل پھر کر کھانا کھانے کے دھیرے کو اپنا لیا ہے جو چرنے یا دانہ دُنکا چگنے ہی کا ایک جدید روپ ہے۔ کسی بھی قوم کے اُوپر جانے یا نیچے آنے کا منظر دیکھنا مقصود ہو تو یہ نہ دیکھئے کہ اس کے قبضۂ قدرت میں کتنے علاقے اور خزانے آئے یا چلے گئے۔ فقط یہ دیکھئے کہ اس نے طعام اور شرکاءِ طعام کے ساتھ کیا سلوک کیا!

بچپن کی بات ہے۔ ہمارے گاؤں میں ہر سال کپڑا بیچنے والے پٹھانوں کی ایک ٹولی وارد ہوتی تھی۔ یہ لوگ سارا دن گاؤں گاؤں پھر کر ادھار پر کپڑا بیچنے کے بعد شام کو مسجد کے حجرے میں جمع ہوتے اور پھر ماحضر تناول فرماتے۔ وہ زمین پر کپڑا بچھا کر دائرے کے انداز میں بیٹھ جاتے۔ درمیان میں شوربے سے بھری ہوئی ایک پرات بھرا لکابل کا منظر دکھاتی جس میں بڑے گوشت کی بوٹیاں ننھے منے جزیروں کی طرح ابھری ہوئی دکھائی دیتیں۔ وہ ان بوٹیوں کو احتیاط سے نکال کر ایک جگہ ڈھیر کر دیتے اور شوربے میں روٹیوں کے ٹکڑے بھگو کر ان کا ملیدہ سا بنانے لگتے جب ملیدہ تیار ہو جاتا تو شرکاءِ طعام پوری دیانتداری کے ساتھ آپس میں بوٹیاں تقسیم کرتے اور پھر اللہ کا پاک نام لے کر کھانے کا آغاز کر دیتے۔ وہ کھانا رُک رُک کر، ٹھہر ٹھہر کر کھاتے مگر پشتو بغیر رُکے بے تکان بولتے۔ مجھے ان کے کھانا کھانے کا انداز بہت اچھا لگتا تھا۔ چنانچہ میں ہر شام حجرے کے دروازے میں آکھڑا ہوتا، انہیں کھانا کھاتے ہوئے دیکھتا اور خوش ہوتا۔ وہ بھی مجھے خوش دیکھ کر خوش ہوتے اور کبھی کبھی برادرانہ اخوت میں لتھڑا ہوا ایک آدھ لقمہ یا گوشت کا ٹکڑا میری طرف بھی بڑھا دیتے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ان پٹھانوں کی پیشکش کو اگر کوئی مسترد کر دے تو اس کی جان کی خیر نہیں۔ اس لیے میں بادلِ نخواستہ ان کے عطا کردہ لقمۂ تر کو گلے میں دبا کر آہستہ آہستہ جگالی کرتا اور تادیر انہیں کھانا کھاتے دیکھتا رہتا۔ عجیب منظر ہوتا۔ وہ کھانے کے دوران میں کمال سیر چشمی کا مظاہرہ کرتے۔ ان میں سے جب ایک شخص لقمہ مرتب کر لیتا تو پہلے اپنے قریبی ساتھیوں کو پیش کرتا اور ادھر سے جزاک اللہ کے الفاظ وصول کرنے کے بعد اسے اپنے منہ میں ڈالتا۔ اخوت، محبت اور بھائی چارے کا ایک ایسا لازوال منظر آنکھوں کے سامنے ابھرتا کہ میں حیرت زدہ ہو کر انہیں بس دیکھتا ہی چلا جاتا اور تب میں دسترخوان پر کھانا کھانے کے اس عمل کا اپنے گھر والوں کے طرزِ عمل سے موازنہ کرتا تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی کیونکہ ہمارے گھر میں صبح و شام ہانڈی

تقسیم کرنے والی بڑی خالہ کے گرد اگرد بچوں کا ایک ہجوم سا جمع ہو جاتا۔ مجھے یاد ہے جب بڑی خالہ کھانا تقسیم کر رہی ہوتیں تو ہماری حریص آنکھیں ہانڈی میں ڈوئی کے غوطہ لگانے اور پھر وہاں سے برآمد ہو کر ہمارے کسی سنگی ساتھی کی رکابی میں اترنے کے عمل کو ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھتیں۔ اگر کسی رکابی میں نسبتاً بڑی بوٹی چلی جاتی تو بس قیامت ہی آجاتی ایسی صورت میں خالہ کی گرجدار آواز کی پروا نہ کرتے ہوئے ہم بڑی بوٹی والے کی تکا بوٹی کرنے پر تیار ہو جاتے اور چھینا جھپٹی کی اُسی روایت کا ایک ننھا سا منظر دکھاتے جو نئے زمانے کے تحت اب عام ہونے لگی تھی۔

اُسی زمانے میں کبھی کبھار ایک انگریز افسر بھی والد صاحب سے گھوڑے خریدنے کے لیے آجاتا۔ والد صاحب اس کے لیے میز کرسی لگواتے، انگریزی کھانا تیار کرواتے اور پھر گھنٹوں اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ چونکہ ہم بچوں کو انگریز افسر کے سامنے جانے کی اجازت نہیں تھی اور ویسے بھی ہمیں اس سے بہت ڈر لگتا تھا اس لیے ہم اکثر کھڑکی کی جالی کے ساتھ چہرہ لگا کر اُسے کھانا کھاتے ہوئے دیکھتے اور حیران ہوتے کہ صاحب بہادر کھانا کھا رہا ہے یا آپریشن کر رہا ہے۔ وہ اپنی پلیٹ میں ایک اُبلا ہوا آلو لے کر بیٹھ جاتا اور پھر چھریوں اور کانٹوں سے گھنٹوں اس کے پرخچے اُڑاتا رہتا۔ یوں لگتا جیسے وہ میدان جنگ میں کھڑا ہے۔ آلو اس کا دشمن ہے جسے وہ اپنے اسلحہ کی مدد سے زیر کرنے میں مصروف ہے۔ وہ جو کھانے کے معاملے میں روا داری، مفاہمت اور لطف اندوزی کا رویّہ ہوتا ہے، اس انگریز افسر میں مجھے قطعاً نظر نہ آیا۔ بعد ازاں جب انگریز قوم کی عادات و اطوار سے آگاہی حاصل ہوئی تو معلوم ہوا کہ چونکہ ان لوگوں کو اپنی اُس سلطنت کی حفاظت کے لیے جس پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا، جنگی مشقیں کرنے کی اشد ضرورت ہے اس لیے وہ کھانے کی میز پر بھی اس سلسلے کو جاری رکھتے ہیں۔ سو ان کے لیے کھانا جسم کو برقرار رکھنے کا بہانہ نہیں بلکہ دشمن کو زیر کرنے کا شاخسانہ ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھانے کی روایت ہمارا عزیز ترین ثقافتی ورثہ تھا جس کے ساتھ ہم نے عزیزانِ مصر کا سا سلوک کیا اور اب یہ روایت اوّل تو کہیں نظر ہی نہیں آتی اور کہیں نظر آجائے تو مارے شرمندگی کے فی الفور خود میں سمٹ جاتی ہے۔ حالانکہ اس میں شرمندہ ہونے کی قطعاً کوئی بات نہیں بلکہ میں تو کہوں گا کہ دسترخوان پر بیٹھنا ایک تہذیبی اقدام ہے جب کہ کھڑے ہو کر کھانا ایک نیم وحشی عمل ہے۔ مثلاً یہی دیکھئے کہ جب آپ دسترخوان پر بیٹھتے ہیں تو دائیں بائیں یا سامنے بیٹھے ہوئے شخص سے آپ کے برادرانہ مراسم فی الفور استوار ہو جاتے ہیں۔ آپ محسوس کرتے ہیں جیسے چند ساعتوں کے لیے آپ دونوں ایک دوسرے کی خوشیوں غموں اور بوٹیوں میں شریک ہو گئے ہیں۔ چنانچہ جب آپ کے سامنے بیٹھا ہوا آپ کا کرم فرما کمال دریا دلی اور مروّت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی پلیٹ کا شامی کباب آپ کی رکابی میں رکھ دیتا ہے تو جواب آں غزل کے طور پر آپ بھی اپنی پلیٹ سے مرغ کی ٹانگ نکال کر اُسے پیش کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد کھانا کھانے کے دوران لین دین کی وہ خوشگوار فضا از خود قائم ہو جاتی ہے جو ہماری ہزار ہا برس کی تہذیبی یافت کی مظہر ہے۔ ایک لحظہ کے لیے بھی یہ خطرہ محسوس نہیں ہوتا کہ سامنے بیٹھا ہوا شخص آپ کا مدِمقابل ہے اور اگر آپ نے ذرا بھی آنکھ جھپکی تو وہ آپ کی پلیٹ پر ہاتھ صاف کر جائے گا۔ دسترخوان کی یہ خوبی ہے کہ اس پر بیٹھتے ہی اعتماد کی فضا بحال ہو جاتی ہے اور آپ کو اپنا شریکِ طعام حد درجہ معتبر، شریف اور نیک نام دکھائی دینے لگتا ہے۔ دوسری طرف کسی بھی بُوفے ضیافت کا تصور کیجئے تو آپ کو نفسا نفسی خود غرضی اور چھینا جھپٹی کی فضا کا احساس ہو گا اور ڈارون کا جہد للبقا کا نظریہ آپ کو بالکل سچا اور برحق نظر آنے لگے گا۔

دسترخوان کی ایک اور خوبی اس کی خود کفالت ہے۔ جب آپ دسترخوان پر بیٹھتے ہیں تو اس یقین کے ساتھ کہ آپ کی جملہ ضروریات کو بے طلب پورا کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ سامنے دسترخوان پر ضرورت کی ہر چیز موجود ہے حتیٰ کہ اچار، چٹنی اور پانی کے علاوہ خلال تک مہیا کر دیئے گئے ہیں۔ دسترخوان پر بیٹھنے کے بعد اگر آپ کسی کو مدد کے لیے بلانے پر مجبور ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو میزبان نے حقِ میزبانی ادا نہیں کیا یا مہمان نے اپنے منصب کو نہیں پہچانا — خود کفالت دراصل ہماری ثقافت کا ایک امتیازی وصف ہے اور اس کا ہماری قناعت پسندی بلکہ تقدیر پرستی سے بھی ایک گہرا تعلق ہے۔ اپنے دیہات ہی کو لیجئے جو ہماری ثقافت کی صحیح ترین نمائندگی کرتے رہے ہیں۔ اب تو خیر ان میں پہلی سی بات نہیں رہی ورنہ صدیوں تک انہوں نے نمک اور حملہ آور کے

علاوہ شاید ہی کبھی کوئی چیز درآمد کی ہو ——— دلچسپ بات یہ ہے کہ کسان اپنے لیے خوراک زمین سے حاصل کرتا ہے جو اس کے جسم کی ساخت اور تعمیر میں حصّہ لیتی ہے مگر پھر جب اس کا اپنا بدن زمین کا رزق بن جاتا ہے تو کچھ عرصہ کے بعد زمین اُسے دوبارہ غذا میں منتقل کرکے آئندہ نسلوں کو پیش کر دیتی ہے۔ اور یہ بات انسان تک ہی محدود نہیں۔ دیہات میں تو پرندوں، حیوانوں، پودوں اور انسانوں کی نسلیں سدا ایک دوسری میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ یک جائی اور ہم مزاجی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ انہیں محسوس ہوتا ہے جیسے گاؤں بجائے خود ایک دسترخوان ہے جو کھیتوں کے عین درمیان بچھا دیا گیا ہے جس پر وہ نسل در نسل بیٹھتے اور اٹھتے رہتے ہیں۔ ایک نسل جب کھانے سے فارغ ہو جاتی ہے تو دوسری نسل دسترخوان پر آبیٹھتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ گزر جانے والی نسل، آنے والی نسل کے لیے غذا بن کر دسترخوان پر بچھ جاتی ہے مگر آنے والی نسل کو اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کس رغبت سے اپنے ہی بزرگوں کی ہڈیاں چبا رہی ہے۔

دسترخوان کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ آپ کو زمین سے قریب کر دیتا ہے جب کہ میز کرسی پر آتے ہی آپ زمین کے لمس سے محروم ہو جاتے ہیں اور چرنے چگنے کا عمل تو آپ کو زمین سے بالکل منقطع ہی کر دیتا ہے۔ زمین ایک زندہ، دھڑکتی اور پھڑکتی ہوئی شے ہے جس کی تحویل میں ایک پُراسرار قوت بھی ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو نہ صرف اس قوت کی موجودگی کا علم تھا بلکہ وہ قدم قدم پر اس کے لمس سے بھی آشنا ہوتے تھے۔ وہ کہتے کہ یہ قوت زیرِ سطح قوسوں دائروں اور لکیروں کی صورت میں رواں دواں رہتی ہے۔ چنانچہ جب کوئی انجانے میں بھی ان میں سے کسی لکیر کو چھو لیتا ہے تو اُسے زمین کی قوت ایک برقی جھٹکے کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ تب وہ زمین کے فیوض و برکات کے حصول کے لیے ان لکیروں اور کھائیوں کی تلاش کرتے اور جس مقام پر یہ لکیریں یا کھائیاں ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی ملتیں وہیں اپنے پگوڈے یا مندر تعمیر کرتے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ مقام دراصل زمین کی پُراسرار قوت کے سرچشمے ہیں۔ مگر پھر یوں ہوا کہ انسان بتدریج زمین سے منقطع ہو کر پہلے چوباروں پھر میناروں پر چڑھ گیا اور زمین سے جو اس کی ماں بھی تھی اور اَن داتا بھی کٹتا اور دُور ہٹتا چلا گیا۔ دسترخوان کی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کو دوبارہ زمین کے سینے سے چمٹا دیتا ہے تاکہ وہ براہِ راست زمین سے اس کی پُراسرار قوت کو کشید کر سکے۔ دسترخوان دراصل زمین کا لباس ہے اور دسترخوان پر بنی ہوئی قوسیں، دائرے اور لکیریں زمینی قوت کی گزرگاہوں کے مماثل ہیں۔ چنانچہ جب آپ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں تو اس کی غذائیت ہزار گنا بڑھ جاتی ہے جب کہ میز کرسی پر یا چل پھر کر کھانا کھائیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کھانے میں وہ برقی رَو موجود نہیں جو زمین کی شریانوں سے دسترخوان کی قوسوں اور پھر وہاں سے انسان کی رگوں میں بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچتی ہے۔

دسترخوان آپ کو زمین کے لمس ہی سے آشنا نہیں کرتا بلکہ انگلیوں کے لمس سے بھی متعارف کرتا ہے۔ چھُری کانٹے یا چمچے سے کھانا کھانے میں وہ لطف کہاں جو ہاتھ سے کھانے میں ہے۔ اس میں دوہرا لطف ہے ایک تو اس چیز کا لطف جو کھائی جا رہی ہے دوسرے انگلیوں کے لمس کا لطف! ممکن ہے آپ کہیں کہ میز کرسی پر بیٹھ کر یا چل پھر کر بھی تو انگلیوں کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔ جی ہاں یہ ممکن تو ہے مگر ایسے ہوتا نہیں۔ وجہ یہ کہ ہاتھ سے کھانا کھانے کے لیے آپ کے جسم کا ایک جگہ دھیر ہونا ضروری ہے اور یہ بات دسترخوان کے بغیر ممکن نہیں۔ ڈائننگ چیئر پر بیٹھنا سرکس کی رسّی پر کھڑا ہونے کے مترادف ہے چنانچہ کرسی سے پھسل جانے کا خطرہ ہمہ وقت سوہانِ روح بنا رہتا ہے۔ ایسے میں کوئی انگلیوں کے لمس سے کیسے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ یہی حال بوفے ضیافت کا ہے۔ وہاں دو مسئلے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کس طرح ہتھیلی پر بیک وقت پلیٹ، چمچہ، روٹی اور نیپکن کو بیلنس کیا جائے۔ یہ ایک خاصا مشکل کام ہے بلکہ اسے آرٹ کہنا چاہیے جو ویسے کی سینکڑوں ضیافتوں سے گزرنے کے بعد ہی آتا ہے۔ دوسرا مسئلہ ٹریفک کا ہے جب آپ بوفے ضیافت کے جملہ مراحل سے گزر رہے ہوتے ہیں تو آپ کو ہر قسم کی ٹکروں، دھکوں اور خلاف ورزیوں سے خود کو اور اپنی رکابی کو بچانا ہوتا ہے ایسے میں اگر آپ انگلیوں کی مدد سے کچھ کھانے کی کوشش کریں بھی تو اس کا کچھ فائدہ نہیں کیونکہ اس ہنگامۂ دار و گیر میں آپ کو اپنی خوبصورت انگلی بھی ایک مُڑا ہوا بدوضع کانٹا ہی نظر آتی ہے۔

دسترخوان لامسہ ہی کو تسکین نہیں دیتا، شامہ، سامعہ اور باصرہ کو بھی سیراب کرتا ہے جب مہمان دسترخوان پر بیٹھتے ہیں تو مختلف کھانوں کی خوشبو آن واحد میں ان تک جا پہنچتی ہے اور جب پہنچتی ہے تو اس فراوانی کے ساتھ کہ وہ اسے نہ صرف ایک مشروب کی طرح پیتے ہیں بلکہ اس کی مختلف اقسام میں تمیز بھی کر لیتے ہیں مثلاً نان کی سوندھی سوندھی باس، پلاؤ کی گرم خوشبو سے مختلف شے ہے اور متنجن کی کی تیز مہکار، فرنی کی ٹھنڈی سگندھ سے ایک جُدا مزاج رکھتی ہے ـــــــ یہ انکشاف دسترخوان پر اطمینان سے بیٹھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ بوفے ضیافت میں تو کھانوں، مہمانوں، بیروں اور قناتوں کی ملی جلی خوشبو ایک ایسی بھاری بوجھل شے بن جاتی ہے کہ اسے خوشبو سے ہم رشتہ کرنا بھی بدمذاقی کی دلیل ہے۔ سامعہ کی تسکین کا پہلو بھی دسترخوان پر ہی ممکن ہے یہاں کھانے والے ایک دوسرے کے اتنے قریب ہوتے ہیں کہ ہر کھانے والے کے دہن سے ہڈیوں کے کڑکڑانے اور لقمے کے دانتوں میں پسنے کی آواز ایک شیریں نغمے کی طرح آپ کے کانوں سے ٹکراتی ہے اور آپ پر کیف و سرور کی بارش کر دیتی ہے۔ دسترخوان پر ہی آپ کو پہلی بار اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہر کھانے والے کی زبان، دانت، تالو اور ہونٹ کھانے کے دوران مل جل کر ایک ایسی مخصوص آواز نکالتے ہیں جو نہ صرف دوسری آوازوں سے مختلف ہوتی ہے بلکہ جس میں کھانے والے کی ساری شخصیت سمائی ہوتی ہے۔ کسی شخص کے اصل کردار سے آشنا ہونا ہو تو کھانے کے دوران اس کے منہ سے برآمد ہونے والی آوازوں پر کان دھریں کیونکہ ہر شخص کے اندر کی ساری شرافت یا خباثت اس کے کھانے کی آواز ہی میں مضمر ہوتی ہے۔

رہا باصرہ کا معاملہ تو اس بارے میں کچھ زیادہ کہنے سُننے کی گنجائش نہیں۔ دسترخوان پر آرام اور سکون سے بیٹھنا نصیب ہو تو کھانے کو نظر بھر کر دیکھنے کی فرصت بھی ملتی ہے۔ ورنہ دوسرے موقعوں پر کس بدبخت کو کبھی معلوم ہوا ہے کہ جس شے پر وہ دندانِ طمع تیز کیے ہوئے ہے وہ دیکھنے میں کیسی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ دسترخوان پر پوری دلجمعی سے بیٹھ کر کھانا کھانے اور بُوفے ضیافت میں انتہائی سراسیمگی کے عالم میں کھانا زہرمار کرنے میں وہی فرق ہے جو محبت اور ہوس میں ہے، خوش بُو اور بُو میں ہے، صبح کی چہل قدمی اور سوگز کی دوڑ میں ہے!!

و۔ا | سوال یہ ہے

و۔ا : جیلانی صاحب! اُردو انشائیہ کی عمر پینتیس برس سے زیادہ نہیں ہے جب کہ انگریزی انشائیہ کی تخلیق کا زمانہ کئی سو برس پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کم عمری کے باوجود اُردو انشائیہ نے جس تیزی سے ارتقا کی منازل طے کی ہیں اس نے بعض لوگوں کو یہ کہنے پر مجبور کیا ہے کہ اُردو انشائیہ نے انگریزی انشائیہ کے معیار کو چھو لیا ہے۔ بعض نے تو یہ تک بھی کہہ دیا ہے کہ اُردو انشائیہ انگریزی انشائیہ سے آگے نکل گیا ہے۔ دوسری طرف بعض ستم ظریفوں کا یہ کہنا ہے کہ اُردو انشائیہ نے انگریزی انشائیہ کی تقلید تک ہی خود کو محدود رکھا ہے اور وہ تا حال اپنی انفرادیت کا اظہار نہیں کر پایا۔ آپ انگریزی ادبیات کے استاد ہیں اور آپ نے انگریزی انشائیہ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ مَیں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی اُردو انشائیہ کو انگریزی انشائیے کے مقابلے میں پیش کرنے کی جسارت کی جا سکتی ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا آپ کے نزدیک اُردو انشائیہ اپنے مزاج، اسلوب اور مواد کے اعتبار سے انگریزی انشائیہ سے مختلف ہے؟ اگر مختلف ہے تو کس اعتبار سے؟

غلام جیلانی اصغر: یہ سوال اس لیے دلچسپ ہے کہ اس میں کئی سوال شامل ہیں، اور ہر سوال اپنی جگہ جس تاریخی شعور اور بصیرت کا مطالبہ کرتا ہے حُسنِ اتفاق سے مَیں اُن سب سے محروم ہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ انگریزی انشائیہ جس کا مولد فرانس ہے ایک طبعی ضرورت کے ماتحت اپنایا گیا۔ جب فرانسس بیکن اپنی گوناگوں مصروفیات اور بیماری کی وجہ سے طویل تحریروں کا متحمل نہ ہو سکا تو اس نے ادب کی اُس صنف کو قبول کر لیا جس میں بات اختصار سے کی جاتی ہے۔ اور ہر بات ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ بات اتنی مختصر اور مجمل ہوتی ہے کہ سُننے یا پڑھنے والا آنکھ بھی نہیں جھپک سکتا۔ بیکن کے ناقدین نے یہی بات اس کی تعریف میں کہی ہے کہ اگر قاری اسے پڑھتے وقت سرور و انبساط کے عالم میں ذرا سو جائے یا کسی جسمانی عارضے کے تحت آنکھ جھپک لے تو وہ بات کوسوں دُور نکل جائے گی۔ اس کے برعکس ایڈیسن یا اُس کا ہم عصر سٹیلؔ بات کو اتنی بار دہراتا ہے کہ آدمی (میرا مطلب قاری سے ہے) تھوڑا سا سو بھی لے تو کوئی حرج نہیں۔ انشائیہ وہیں رکا کھڑا رہے گا۔ ہیزلٹ کے انشائیوں میں انشا کا عنصر غالب آگیا ہے۔ اس لیے اُس کے انشائیے زیادہ خوشگوار ہیں۔ دراصل پرسنل ایسے PERSONAL ESSAY یا شخصی انشائیہ کا سارا مواد اور حُسن یا تو چارلس لیمب کے ہاں ملتا ہے یا انیسویں اور بیسویں صدی کے انشائیہ نگاروں میں۔ لنڈ، بنسن، چسٹرٹن اس کی بہترین مثال ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے اُردو کے انشائیہ نگاروں نے ایسے لکھنے والوں کے معیار کو چھو لیا ہے؟ یا اُن سے آگے نکل گئے ہیں؟۔ اگر معیار سے مطلب ایک مخصوص صنف کے اچھے لکھنے والوں کی عظیم تخلیقات کا مجموعی نقطۂ معیار ہے تو یہ کہنا پڑتا ہے (مَیں بلا خوفِ تردید کہوں گا) کہ

اردو کے اچھے انشائیہ نگاروں کا معیار اس معیار سے کسی صورت بھی کم نہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ ہمارا انشائیہ نگار صدیوں کا فاصلہ سالوں میں طے کر گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے سامنے انگریزی انشائی ادب کا بہترین ذخیرہ موجود تھا۔ اور وہ اس نقطے سے اپنی کاوش کا آغاز کر رہا تھا جہاں لنڈ یا اسی قبیل کے دوسرے بڑے انشائیہ نگاروں نے اپنا تخلیقی سفر ختم کیا تھا۔ یوں بھی ہم غزل کی پرورش، روایت کے امین ہونے کی حیثیت سے بات کی ایمائیت اور بات کہنے کی خوبصورتی یعنی اس کے اسلوب کی انفرادیت کے زیادہ قائل ہیں۔ انشائیہ بھی ایسے معاشروں میں زیادہ آگے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے، جہاں بات کھل کر کہنے کا رواج نہ ہو۔ اس کے اسباب کئی ہو سکتے ہیں۔ جن کا تجزیہ غیر ضروری ہے۔ انشائیہ کا مزاج دراصل شاعرانہ ہے، اور ہم بحیثیت قوم اپنی اجتماعی سائکی کے لحاظ سے تصوف اور شاعری کے زیادہ قریب ہیں۔ اس لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے سیاست دان اور دانشور بات نامکمل چھوڑ دیتے ہیں تاکہ بات کا مغز نگاہوں سے پوشیدہ رہے اور اگر لوگ چاہیں تو فارغ اوقات میں اس کی پرتیں اتارتے رہیں۔ انشائیہ کی بھی یہی خوبی ہے کہ اس میں مفہوم کی کئی پرتیں سامنے آتی ہیں۔ اس دلیل (اور یہ دلیل برہانِ قاطع میں شمار ہوتی ہے) سے تو آپ یہ نتیجہ آسانی سے نکال سکتے ہیں کہ ہمارے بزرگ انشائیہ نگار مغربی انشائیہ سے آگے نکل گئے ہیں یا نکل جائیں گے۔ امید ہے آپ مجھ سے اتفاق کریں گے اور مثالوں پر زور نہیں دیں گے ورنہ یہ جواب بہت طویل ہو جائے گا۔

رہا سوال انشائیہ کے مزاج، اسلوب اور مواد کا! جس طرح ہماری شاعری کا مواد، اور مزاج انگریزی شاعری سے مختلف ہے۔ اور مختلف ہونا بھی چاہیئے کیونکہ ہمارا موسم، ہماری تاریخ، جغرافیہ، ثقافتی روایات بلکہ لغت کا مزاج انگریزی ادب سے مختلف ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ انگریز انشائیہ نگاروں نے اپنے موضوعات جو انشائیوں کے لیے چُنے ہیں، وہ ہمارے پسندیدہ موضوعات سے بڑی حد تک مختلف ہیں۔ انشائیہ نگار اپنا مواد تو اپنے ماحول سے ہی منتخب کرتا ہے۔ اگر ہمارا انشائیہ نگار کسی ایسے موضوع پر انشائیہ لکھے جو ہمارے لیے اجنبی ہو تو ہم اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ انگریزی انشائیہ نگاروں نے اپنے موسم کی رعایت سے کچھ انشائیے لکھے ہیں جن کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے جیسے بی بی سی سے موسم کی رپورٹ سُن رہے ہوں۔ ایسے انشائیوں کو مغربی قاری یقیناً دلچسپی سے پڑھتا ہوگا۔ دراصل موضوع ایک ایسا متنازعہ فیہ مسئلہ ہے کہ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ انشائیہ کسی موضوع کا پابند نہیں ہے۔ مسئلہ تو موضوع کے پُر اسرار پہلوؤں کا احاطہ کرنا ہے۔ جس طرح ایک اچھا فوٹو گرافر کسی شے یا OBJECT کا ایک ایسا غیر معمولی زاویہ تلاش کرتا ہے جہاں سے تصویر ایک نیا رُوپ اختیار کر لیتی ہے، اسی طرح انشائیہ نگار موضوع کے ان پہلوؤں کی نشاندہی کرتا ہے جو قاری کی نگاہ سے پوشیدہ ہوں۔ یوں تو ایک DETECTIVE بھی یہی طریقہ اختیار کرتا ہے۔ لیکن اس کے اسلوب کی دلفریبی نہیں ہوتی۔ یہاں میں انشائیہ کے مزاج کا نہیں بلکہ اس کے اسلوب کا ذکر کروں گا۔ انگریزی والے کہتے ہیں کہ لکھنے والے کا اسلوب ہی سب کچھ ہے۔ اصلی الفاظ یہ ہیں (STYLE IS THE MAN) یہ بات سب سے زیادہ انشائیہ نگار پر صادق آتی ہے۔ اور اگر کسی انشائیہ نگار کے مقام کا تعین کرنا ہو تو اس کا منفرد اسلوب ہی اس کی پہچان کی ضمانت بن سکتا ہے۔ اسلوب میں ذرا سی ناپختگی یا خامی انشائیہ کو ادب کی ذیل سے نکال کر اُسے تخلیقی ادب سے یکسر خارج کر دے گی۔ آپ یہ بات دوسری اصناف کے متعلق نہیں کہہ سکتے۔ افسانہ، ناول، غزل میں اگر اسلوب میں ایک دو آنچ کی کمی بھی رہ جائے تو کوئی زیادہ فرق نہیں پڑے گا — جب تک قافیہ ردیف موجود ہے غزل تو بہرحال موجود رہے گی یعنی اس کا وجود معرضِ خطر میں نہیں پڑے گا۔ اسی طرح ایک ناول اسلوب کی

ناپختگی کی وجہ سے بڑا ناول نہ بن سکے گا۔ لیکن بطور ناول تو وہ چھپے گا بھی اور بیشتر حضرات و خواتین میں مقبول بھی ہوگا۔ لیکن جیسے میں نے عرض کیا ہے کہ محض اسلوب کے نہ ہونے سے انشائیہ ایک بیکار سی تحریر بن کر رہ جائے گا۔ اب آپ نے یہ تو تسلیم کر لیا ہوگا کہ انشائیہ کا اصلی کردار اس کا اسلوب ہی متعین کرتا ہے۔ اسی سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ اردو انشائیہ کا اسلوب انگریزی انشائیہ سے کس حد تک مختلف ہے۔ اردو زبان اپنے مزاج کے لحاظ سے انگریزی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ اسی لئے انگریزی شاعری یا انشائیہ کے کسی مجموعہ کا کامیاب ترجمہ اردو میں نہیں ہوا۔ ہونا بھی نہیں چاہیئے۔ کیونکہ کوئی زبان کسی دوسری زبان کی پُر اسراریت کو اپنے محاورہ یا لغت میں منتقل نہیں کر سکتی۔ انشائیہ کا تعلق کیونکہ بنیادی طور پر انشا سے ہے اسی لیے اردو انشائیہ انگریزی انشائیہ سے بالکل مختلف ہے۔ میں نے ایک دوبار کوشش کی ہے کہ اے۔ پی ہربرٹ یا جیروم کے کچھ انشائیے اردو میں منتقل کر دوں۔ ترجمہ تو ٹھیک ٹھاک کر لیا۔ مولوی عبدالحق کی مدد سے کچھ الفاظ کے مترادفات بھی تلاش کر لیے لیکن جب انشائیہ کو اس کے اردو روپ میں دیکھا تو محسوس ہوا کہ اصلی انشائیہ کی روح غائب ہو گئی ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ تو سائنٹیفک تنقید والے حضرات ہی بتا سکیں گے۔ لیکن میرا عرفان یہ کہتا ہے کہ اردو انشائیہ کا کمال ہی یہ ہے کہ اس کا اسلوب اور مزاج انگریزی انشائیہ کے اسلوب اور مزاج سے مختلف ہے۔ کس اعتبار اور کس حد تک؟ یہ مسائلِ تصوّف ہیں جو غور طلب ہیں۔

و۔ا : انور سدید صاحب! انشائیہ کے سلسلے میں جانسن کی اُس تعریف کا بڑا شہرہ ہے جس کے مطابق انشائیہ A LOOSE SALLY OF THE MIND ہے جس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انشائیہ آزاد تلازمۂ خیال کی ایک صورت ہے۔ یعنی آپ کسی ایک موضوع کو چھیڑتے ہیں اور پھر خیال کی ترنگ کے تحت دوسرے موضوعات کی طرف سفر کرنے لگتے ہیں۔ کیا آپ کے نزدیک انشائیہ اس قسم کے آزاد تلازمۂ خیال کا علم بردار ہے یا یہ افسانے اور نظم کی طرح کی فنی اکائی کو جنم دیتا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ظاہری بے ربطی کے باوجود اس میں ایک واضح ربط موجود ہوتا ہے جو انشائیہ کا مطالعہ کرتے ہوئے انکشاف کے ایک کوندے کی طرح قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے؟ اس پر کچھ روشنی ڈالیں!

انور سدید : میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر جانسن نے لیتے کی تعریف میں A LOOSE SALLY OF MIND الفاظ استعمال کیے تو یہ تعریف بجائے خود ڈھیلی ڈھالی تھی۔ اس کی حدود متعین نہیں تھیں۔ بعض لوگوں نے اسے ذہن کی آزاد ترنگ کہا جیسے ڈاکٹر اختر اورینوی، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ڈاکٹر محمد حسنین وغیرہ۔ کچھ لوگوں نے اسے ذہن کی آوارہ خیالی سمجھا اور انشائیے کے مرکزی موضوع سے اسے انحراف کا لائسنس سمجھ لیا چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب طنزیہ، مزاحیہ، اخلاقیہ حتیٰ کہ درسیہ مضامین پر انشائیہ کا لیبل چپاں کر دیا جاتا ہے تو ان مضامین کو IN TOTO ڈاکٹر جانسن کی اس تعریف سے شہادتِ ثبات فراہم کی جاتی ہے۔ اور میرا خیال تو یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر جانسن ہی نہیں بیکن نے جو یہ کہا تھا کہ ایسّے DISPERSED MEDITATION یعنی افکارِ پریشاں ہے تو اس سے بھی خاصہ غلط مبحث پیدا ہوا ہے۔ بیکن کے انشائیے پڑھیں تو وہ موضوع کے ساتھ اٹھکیلیاں تو کرتا ہے لیکن فکر کو پریشان نہیں ہونے دیتا اور خیال کے مرکزی نقطے کو اپنی گرفت ہی میں رکھتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ جن لوگوں نے انشائیہ کے مزاج کو نہیں سمجھا وہ "ذہن کی آزاد ترنگ" اور "افکارِ پریشاں" وغیرہ کو لغوی معانی میں ہی قبول کرتے ہیں حالانکہ ایسا تصور تو نہ بیکن نے دیا ہے اور نہ ڈاکٹر جانسن نے۔ یہ تاثر ان لوگوں کا خود ساختہ ہے جو انشائیہ کی پہچان نہیں رکھتے اور اس کا نقصان یہ ہوا ہے کہ اس سے انشائیہ کے فروغ میں رکاوٹ پڑ گئی۔ میں نے پہلے بھی متعدد مرتبہ

کہا ہے اور اب بھی برملا عرض کرتا ہوں کہ انشائیہ کی وحدت اس کے موضوع سے جنم لیتی ہے۔ اس میں خیال اپنی تمام جولانیوں کے ساتھ مرکزی نقطے کے ساتھ مربوط رہتا ہے، اسے نئے نئے زاویوں سے دائرۂ نور میں لاتا ہے، اس کے انوکھے گوشے ابھارتا ہے۔ لیکن انشائیہ بکھرتا نہیں، یہ مرکز سے تھوڑا سا گریز تو کرتا ہے لیکن پھر واپس مرکز کی طرف آجاتا ہے اور موضوع کو بکھیرنے کے بجائے سمیٹتا ہے۔ جولانی تو افکار کی جدت سے اور اظہار کی ندرت سے پیدا ہوتی ہے۔ نیا نقطہ اٹھانے اور نیا راستہ تلاش کرنے میں جو مسرت ہے وہ انسان کے داخل کی فطری جولانی کے بغیر پیدا نہیں ہوتی، لیکن اس سے مراد آزاد تلازمۂ خیال نہیں کہ آپ اپنی سوچ کو یوں آزاد چھوڑ دیں کہ جس سمت میں چاہے بڑھتی چلی جائے اور واپس موضوع کی مرکزیت کی طرف آنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرے۔ اس طرح تو ایک ایسا فن پارہ جو ذہن و خیال کی نئی کھڑکیوں سے تازہ ہوا لانے کا دعوے دار ہے بس مجذوب کی بڑ بن جائے گا اور بعض لوگوں نے تو واقعی اسے مجذوب کی بڑ بنانے کی ہی کوشش کی ہے۔ آوارہ خیالی اور آزادہ خیالی میں حدِ فاصل موجود ہے۔ آوارگی مرکز گریز صفت ہے، لیکن انشائیے میں مرکز مائل صفت کا استعمال اس کی فنی حدود کا فطری تقاضا ہے۔ چنانچہ آزادہ روی ہوگی تو وہ بھی فنی حدود کے اندر ہوگی اور یہ مرکزی نکتہ کو ابھارنے اور نکھارنے میں صرف ہوگی۔ معاف کیجئے بات ذرا لمبی ہو رہی ہے لیکن ایک بات کی وضاحت کی اجازت چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ ہر صنفِ ادب کا ایک داخلی نظام ہوتا ہے اور اسے قائم رکھنا ہر فنکار کا فرض ہے۔ اس نظام کی فنکارانہ پیروی سے ہی تو ادب پارہ پیدا ہوتا ہے، انشائیہ لکھتے ہوئے جب انشائیہ نگار مرکزی نقطے سے دُور ہٹتا ہے تو وہ موضوع کو بالائے طاق نہیں رکھتا بلکہ اس کی ڈوری کو مزید مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے اور وہ ایسا اس لیے کرتا ہے کہ موضوع کو ایک نئے تناظر میں لے آئے، وہ ایسا ایک نئے بُعد یا DIMENSION کی تلاش میں کرتا ہے۔ اگر اسے اپنے اس سفر میں گوہرِ مراد حاصل نہ ہو تو اس کا یہ سفر بالکل بے کار جائے گا اور موضوع سے پرے ہٹنے کا عمل ناکام ہو جائے گا اور وہ انشائیے میں جو کچھ لکھے گا وہ محض ٹاٹ کے پیوند کی طرح دُور سے ہی نظر آجائے گا۔ لہٰذا انشائیہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ مرکزی نقطے سے خود کو لحظہ بھر کے لیے منقطع تو کرے، آزادہ روی کا مظاہرہ بھی کرے، ذہن پر بوجھ ڈالنے کے بجائے اسے ڈھیلا چھوڑ دے لیکن جب واپس آئے تو اس شان و شکوہ کے ساتھ جیسے اس نے ماؤنٹ ایورسٹ پر پہنچ کر اپنے ملک کا جھنڈا گاڑ دیا ہو۔ اور میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ انشائیہ لکھنے کے بعد خود انشائیہ نگار پہلے سے زیادہ درخشاں محسوس کرنے لگتا ہے۔

و۔ ا : سجاد نقوی صاحب! اکثر لوگ ایمرسن کا یہ قول دہراتے ہیں کہ ادب ایک فی صد الہام اور ننانوے فی صد پسینے کا نام ہے۔ کہنا وہ یہ چاہتے ہیں کہ جب تک ادیب اپنی تحریر کی نوک پلک نہ سنوارے اور اپنے اسلوب کو نہ چمکائے، اس کی تحریر ادب کی سطح پر نہیں پہنچ پاتی۔ میں آپ سے انشائیہ کے سلسلے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ انشائیہ جو نکتہ آفرینی کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے اور خیال، شے یا مظہر کے مخفی مفہوم کو سطح پر لانے کی کوشش کرتا ہے، اسلوب کی رعنائی کا کس حد تک گرویدہ ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا انشائیہ میں اسلوب مقدم ہے یا مرکزی خیال؟

سجاد نقوی : کام تخلیقی ہو یا غیر تخلیقی خون پسینہ تو دونوں میں صرف ہوتا ہے مگر فرق مقدار کا ہے۔ غیر تخلیقی کام تو سراسر محنت کا مرہونِ منت ہے مگر تخلیق میں چیزے دیگر اوّلین عنصر ہے اور محنت ضروری ہونے کے باوجود ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ ایمرسن نے تخلیق کے لیے چیزے دیگر کی نسبت خون پسینہ ایک کرنے کو زیادہ اہم قرار دیا ہے۔ میرے خیال میں یہ بات نہیں ہے، اگر ایسا

ہوتا تو ہم غزل کے اشعار میں گنتی کے صرف ایک دو شعر حاصل غزل نہ قرار دیتے جن کی دوسرے اشعار کے مقابلے میں تاثیر ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ البتہ بعض بڑے شاعر اور ادیب اپنے اشعار اور ادب پاروں پر اس درجہ محنت کرتے ہیں کہ ان کی سطح "آورد" سے اُوپر اُٹھ کر "آمد" کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر غالب اور اقبال کے اشعار اور مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا صلاح الدین احمد کی نثر۔ ان اکابرین ادب کا ہر شعر اور جملہ ایسے تخلیقی جوہر سے مملو نظر آتا ہے کہ اس کے پیچھے ایسا خلّاق ذہن ہے جو آورد اور آمد کے فرق کو بڑی حد تک مٹانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دراصل ادب میں سارا مسئلہ تخلیقی اسلوب کا ہے اور اسلوب کا تعلق فن کار کے مخصوص فطری مزاج سے ہے۔ فن کار کی زیادہ تر محنت تو اپنے اسلوب کو سُر میں رکھنے کی ہوتی ہے کہ فن کار اپنے اسلوب ہی سے پہچانا جاتا ہے لہٰذا اس ساز کا تار جب کبھی ڈھیلا پڑ جائے تو اسے کَسنے کے لیے ‍ ‍ ‍ سے محنت کا ایک عرصہ درکار ہوتا ہے اس لیے کہ جب تک فن کار کی محنت اس مخصوص سطح تک نہ پہنچ جائے جہاں اسلوب کا تار فطری سُر سے مملو ہو جائے، فن کار کی تسلی نہیں ہوتی اور جب سیرابی کی یہ صورت پیدا ہو جائے تو اسے 'آمد' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ غالباً ایمرسن نے اس طرح کی محنت کو ننانوے فیصد فنکار کا پسینہ PERSPIRATION قرار دیا ہے۔

یوں تو تمام اصناف ادب میں اسلوب کو بڑی اہمیت حاصل ہے مگر انشائیہ کی تفہیم اور پہچان ہی اس کے اسلوب کی مرہونِ منّت ہے۔ عام اسلوب اور انشائی اسلوب میں یہ فرق ہے کہ عام اسلوب کے اجزائے ترکیبی میں مواد، زبان اور تکنیک شامل ہوتے ہیں مگر انشائی اسلوب میں ان کے علاوہ بھی بہت کچھ شامل ہوتا ہے مثلاً غیر رسمی انداز، تازگی، شگفتگی، بذلہ سنجی اور کفایتِ لفظی وغیرہ۔ انشا پردازی میں موضوع مقصود بالذّات ہوتا ہے مگر انشائیہ نگاری میں 'انشائی اسلوب' کو جادو کی چھڑی کی سی حیثیت حاصل ہے کہ اس سے موضوع، خیال اور جذبہ جو بھی مَس کرتا ہے اس کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ یہ جادو کی چھڑی کا اثر تغزّل کے علاوہ صرف اور صرف انشائی اسلوب کو حاصل ہے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ انشائیہ میں اسلوب کو برتری حاصل ہے یا خیال، شے یا منظر کے مخفی مفہوم کو سطح پر لانا زیادہ اہمیت کا حامل ہے تو اس سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ اسلوب خیال کے بغیر اور خیال اسلوب کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے۔ انشائیہ کی صنف میں تو اسلوب کی تازگی اور خیال کی تازگی ہی اس کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ جس تحریر میں ان دونوں کا خوشگوار سنجوگ معرضِ وجود میں نہ آئے وہاں انشائیہ کی جگہ جواب مضمون اُبھر کر سطح پر آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو انشائیہ کو ہمارے ادب میں داخل ہوئے ربع صدی سے اوپر کا عرصہ ہو رہا ہے مگر ایک زمانے تک لوگ بالگ مضمون اور انشائیہ میں تمیز نہیں کر پاتے تھے۔ مقامِ مسرت ہے کہ اب یہ صورت حال باقی نہیں رہی ہے۔ ایک دو 'میں نہ مانوں' قسم کے نقّادوں کے علاوہ دیگر ناقدین نے اس نو وارد صنفِ ادب کا نہ صرف کھلے بندوں استقبال کیا ہے بلکہ اس کے خدوخال متعیّن کرنے میں بھی اپنی گہری تنقیدی بصیرت کا اظہار کیا ہے۔ انہیں کی بدولت اُردو انشائیہ اب نوجوان ادبا کے ساتھ ساتھ پرانے اور مشّاق ادبا کی توجہ کا مرکز بھی بنتا جا رہا ہے۔ انشائیہ کی اس ملک گیر مقبولیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ انشائیہ اسلوب اور خیال کے امتزاج کا نام ہے اور اس کا مطالعہ کرتے ہوئے اسلوب کی چاشنی، خیال کی برجستگی اور ندرت سے ہم آہنگ ہو کر ایک ایسی مکمل شے نظر آتی ہے جسے مختلف اجزا کا مرکب کہنا کسی صورت بھی جائز نہیں۔

۹-۱ : کہا گیا ہے کہ انشائیہ لطف اندوزی کی ایک صورت ہے۔ انجم نیازی صاحب! کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ انشائیے سے جو لطف

حاصل ہوتا ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟ یعنی کیا انشائیہ جمالیاتی حظ مہیا کرتا ہے۔ یا ذہنی مسرت یا دونوں؟

انجم نیازی : انشائیہ انکشافِ ذات کا ایک ایسا صحت مند عمل ہے جو انسان کے تہہ بہ تہہ باطنی اسرار و رموز آہستہ آہستہ منکشف کرتا چلا جاتا ہے۔ انسان اپنے لاشعور سے نکل کر شعور میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور خود کلامی سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔ خود کلامی جس میں فلسفیانہ استدلال کا بوجھل پن اور منطقیانہ بحث کا لفظی اصراف نہیں ہوتا۔ خود کلامی جس کی کوئی سمت مقرر ہوتی ہے نہ پہلے سے طے شدہ کوئی ہدف۔ مگر اس کے باوجود وہ بے سمتی یا بے ہدفی کے بکھراؤ کا شکار نہیں ہوتی۔ وہ ایک اڑتی پتنگ کی طرح بلندی سے پستی کے جگہ جگہ مناظر دیکھتی چلی جاتی ہے، اور صرف ایک باریک اور نظر نہ آنے والی ڈور کے ذریعے زمین سے اپنا رشتہ قائم رکھے ہوئے ہوتی ہے۔ اپنی ذات کے تمام زاویے اور تمام رنگ ایک اکائی کی طرح اُس کے سامنے آجاتے ہیں۔ اسی خود کلامی کے دوران میں انشائیہ نگار اپنی ذات کی دریافت کا پُر لطف دائرہ مکمل کرتا ہے۔ اور اپنی ذات کا ساؤنڈ بیریئر (SOUND BARRIER) عبور کرتا ہے۔ دیکھے ہوئے جہان سے اَن دیکھے جہان میں قدم رکھتا ہے۔ خارجی مدار سے نکل کر داخلی مدار میں داخل ہوتا ہے۔ اس کامیابی پر اُس کو احساسِ مسرت بھی حاصل ہوتا ہے اور جمالیاتی حظ بھی۔ احساسِ مسرت اس لیے کہ وہ اپنی ذات کے اُونچے پہاڑ کی ناقابلِ تسخیر چوٹی کو سر کر لیتا ہے، اور جمالیاتی حظ اس لیے کہ اُس کی ذات کے اَن گنت دل فریب جمالیاتی پہلو اچانک اُسکے سامنے آجاتے ہیں، فاصلوں کی گرد بیٹھتی ہے تو اُس کا اپنا چہرہ نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ مگر اس جمالیاتی حظ کی نوعیت ذرا مختلف ہوتی ہے۔ دُور اُفق پر اُبھرنے والی سات رنگی قوسِ قزح اور مختلف رنگوں کے پھولوں کے مناظر انسان کی بصارت پر خوشگوار اثر چھوڑتے ہیں۔ مگر اپنی ذات کے نو دریافت شدہ پہلو اور اَن دیکھے رُوپ اس کی بصیرت کو مسحور کرتے چلے جاتے ہیں، اور انشائیہ نگار ایک موم بتی کی طرح قطرہ قطرہ تحلیل ہونے لگتا ہے۔ ایک انجانی خوشبو اور اَن دیکھی مہکار اُس کے شعور سے لاشعور میں جا اترتی ہے، اور انشائیہ نگار جمالیاتی حظ اور ذہنی مسرت کی ملی جلی کیفیت میں گم ہو جاتا ہے۔

جس طرح اندھیرے کمرے میں چراغ جلانے والا انسان روشنی سے تنہا اور اکیلا مستفیض نہیں ہوتا بلکہ کمرے کے اندر موجود ہر آدمی اُس کے اس عمل سے فائدہ اُٹھاتا ہے، اسی طرح انشائیہ سے حاصل ہونے والی ذہنی مسرت اور جمالیاتی حظ میں انشائیہ کے قاری بھی براہِ راست شریک ہو جاتے ہیں۔

و۔ا : سلیم آغا! آپ نوجوان ہیں۔ یقیناً آپ انشائیہ میں عصری آگہی کو اہمیت دیتے ہوں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ بعض لوگ انشائیہ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ آئیوری ٹاور میں بیٹھنے والے ان حضرات کا مشغلہ ہے جنہیں عصری مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ کیا آپ اس بات سے متفق ہیں؟ اگر نہیں تو کیا آپ اپنی مرتب کردہ کتاب 'منتخب انشائیے' سے مثالیں دے کر یہ بتا سکتے ہیں کہ اُردو انشائیہ نے کس طرح اپنے عصر کے میلانات اور مسائل اور عالمی سطح کے مظاہر سے اپنا رشتہ قائم کیا ہے؟

سلیم آغا قزلباش : یہ سوال بنیادی نوعیت کا ہے کیونکہ آج کے دَور میں ہر چیز کی ماہیت کا اندازہ اُس کی عصری اہمیت و افادیت سے لگایا جاتا ہے۔ بظاہر یہ کوئی قابلِ مذمت بات نہیں ہے لیکن مسئلہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب "عصری آگہی" کو سطحی نوعیت کی نعرہ بازی اور استحصالی رویوں کے خلاف بطور ایک ہتھیار استعمال کیا جاتا ہے، پھر یہ کہ عصری مسائل کی مروّجہ فہرست میں چونکہ سیاست، معاشی ناہمواری اور ظلم و استبداد سرِفہرست ہیں لہٰذا ہم انہیں پہلوؤں کو عصری آگہی کے مترادف سمجھنے لگتے ہیں، جس کا نتیجہ ادب میں عملی پراپیگنڈے

کی صورت میں ہم سب کے سامنے ہے، چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ عصریت کو اُس بڑی لہر کے طور پر لیا جائے جو عصری مسائل کے متواج سمندر کی بالائی سطح کے نیچے چل رہی ہے اور جس کی اوپر کی سطح کا خروش اور تلاطم اس کی "مقامیت" کی نشاندہی کرتا ہے۔ دراصل کچھ حضرات نے جان بوجھ کر "عصری مسائل" کی اصطلاح کو بھی روایت اور جدیدیت کی طرح الجھانے کی سعی کی ہے۔ جس طرح روایت کو تاریخی شعور کے بغیر اور جدیدیت کو جدید علوم کے بغیر سمجھنا مشکل ہے اسی طرح عصری مسائل کو اجتماعی مسائل کے کلی شعور کے بغیر سمجھ پانا محال ہے، چنانچہ مجھے یہ بات کہنے میں قطعاً تامل نہیں ہے کہ انشائیہ سطحی علاقائی یا ہنگامی نوعیت کے مسائل پر سے پردہ نہیں اٹھاتا بلکہ وہ تو پوری نوعِ انسانی کو درپیش مسائل کو فن کی سطح پر لا کر طشت از بام کرتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں پر سطحی نگاہ کے حامل افراد کو انشائیہ نگاری محض "آیوری ٹاور" میں بیٹھنے والے حضرات کا مشغلہ دکھائی دینے لگتی ہے۔ اس سے قطع نظر فرد کے شخصی مسائل اور اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے مسائل کو الگ الگ خانوں میں بانٹ کر دیکھنا بھی نامناسب ہے، کیونکہ یہ بات ناممکن ہے کہ کوئی شخص عصری مسائل سے خود کو منقطع کر کے فن پارہ تخلیق کر سکے۔ پھر یہ کہ عصری مسائل کو محض باہر کی دنیا میں موجود سمجھنا بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ فرد کی ذات کے آئینے میں تو عصری آگہی اپنے جملہ مسائل اور آلام کے ساتھ منعکس ہو رہی ہوتی ہے۔ سو یہ کہنا کہ انشائیہ "عصری آگہی" کے جوہر سے تہی ہے ایک لایعنی بہتان ہے، البتہ یہ سوال ضرور قابلِ غور ہے کہ انشائیہ نگاروں نے عصری مسائل کے کینوس پر کون کون سے رنگوں کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں؟ اس ضمن میں دو رویّے ہمارے سامنے ہیں، ایک کے ذریعے معروضی حوالے سے اشیا اور مسائل کو بے نقاب کرنے کی سعی کی گئی ہے جبکہ دوسرے کی وساطت سے موضوعی یا باطنی حوالے سے مسائل کی گہرائی میں اُترنے کی روش صاف نظر آتی ہے۔ یہاں میں اس بات کا اظہار کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ عصریت کے شعور کو ہم اسی وقت بطریقِ احسن سمجھنے کے اہل ہو سکیں گے جب ہم "تجربہ" کی دونوں صورتوں کو بیک وقت بروئے کار لائیں گے، یعنی ایک وہ تجربہ جو عصری مسائل کے مشاہدے سے عبارت ہے اور دوسرا وہ تجربہ جو ان کے اصلی مفہوم کو گرفت میں لینے کے بعد نمودار ہوتا ہے، اور صنفِ انشائیہ کی خوبی اسی بات میں ہے کہ اس نے تجربے کی دونوں صورتوں کو الگ الگ حصّوں میں نہیں بانٹا بلکہ انہیں ایک ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس مقصد میں اسے خاطر خواہ کامیابی بھی نصیب ہوئی ہے۔

چنانچہ یہ بات کہ "فن کار اپنی ذات کے بارے میں لکھتے ہوئے بھی اپنے زمانے کے بارے میں لکھتا ہے۔" پوری طرح سمجھ میں آنے لگتی ہے اور پھر اس بات کو تسلیم کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ بڑا فن پارہ وہی ہو سکتا ہے جو اپنے عہد کے عصری تقاضوں کی روح کو اپنے آپ میں جذب کر لینے کی پوری اہلیت رکھتا ہو۔ ہمارے ہاں جب کبھی عصری مسائل کو سامنے رکھ کر ادب تخلیق کرنے کی کاوش کی گئی ہے تو نتیجہ اکثر نعرے بازی یا پراپیگنڈے کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ وجہ یہ کہ بالواسطہ طریق سے بات کہنے کا جو تخلیقی سلیقہ درکار ہوتا ہے اس کو مقدم نہیں رکھا گیا ہے، لہٰذا شعوری عمل کی مدد سے "عصری مسائل" کی پیش کش کرنا، مجمع لگا کر سُرمہ بیچنے کے فعل سے مشابہ ہے۔ ایک دوسری بات یہ کہ عصری مسائل کے اظہار میں جذباتی غیر وابستگی بھی کسی نہ کسی حد تک ناگزیر ہے، بصورت دیگر کولہو کے بیل کی طرح ساری بات ذاتی نوعیت کے کسی الجھے یا COMPLEX کے گرد ہی گھومتی رہے گی اور اس میں وہ وسعت پیدا نہیں ہو سکے گی جو جغرافیائی حدود کو پھلانگ کر چہار دانگ میں پھیل جانے کی صلاحیت سے مالامال ہوتی ہے، سو "عصری مسائل" کی روح کو دیکھنے اور پرکھنے کے لیے تیسری آنکھ کو کھلا رکھنا از بس ضروری ہے

آخری بات یہ کہ جب ہم "عصری آگہی" کی اصطلاح کا استعمال کرتے ہیں تو متعدد قسم کے مسائل ہمارے سامنے اچانک ابھر آتے ہیں مثلاً آشوبِ آگہی، روحانی کرب اور نفسیاتی اُلجھنوں کا مسئلہ، گھر کی مرکزیت کے ٹوٹنے کا یا بے چہرگی کا مسئلہ، اخلاقی گراوٹ اور رسوم و روایات کی شکست و ریخت کا مسئلہ، سماجی ناہمواریوں اور استحصالی رویّوں کا مسئلہ اور ایسے اور بہت سے مسائل جو یوں تو دیگر اصنافِ نظم و نثر کے سٹرکچر میں بھی مرکزی مُہروں کا کام دیتے ہیں لیکن انشائیے میں اِن پہلوؤں کا استعمال جداگانہ نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں مختلف انشائیوں سے لی گئی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

مادیّت پسندی کا رجحان

"زمین بیچاری ایک مدت سے بیمار ہے۔ اس میں بڑی تیزی سے شور پھیل رہا ہے۔ علاوہ ازیں بنیے نے اب اس پر فصلوں کے بجائے شہر اُگانے شروع کر دیئے ہیں اور یہ شہر لمحہ بہ لمحہ اپنی جڑوں کو پھیلا کر زیادہ سے زیادہ جگہ گھیر رہے ہیں۔ سو کسان کا زمانہ اب محض ایک آدھ رات کا فسانہ ہے اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ دنیا اپنے لیے خوراک زمین کے بجائے سمندر سے حاصل کرے گا یا فیکٹریوں میں تیار کرے گا اور کسان بیچارہ نقلِ مکانی بلکہ نقلِ زمانی پر مجبور ہو جائے گا۔"

(چرواہا)

ایٹمی جنگ کا خطرہ

"ایک دَور میں اچھے بھلے نیک نیت لوگوں نے ستر سالہ بوڑھے کو محض اس بات پر سزائے موت دینے کا ارادہ کیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ زمین ساکن نہیں بلکہ سورج کے گرد گھومتی ہے۔ موجودہ دَور کا سب سے اہم یہ سوال ہے کہ کتنے ہائیڈروجن بم اس گردش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتے ہیں۔ یہ واقعی اہم سوال ہے آؤ ہم سب مل کر اسے اٹھائیں۔"

(سوال اُٹھانا)

تیسری دنیا کی حالتِ زار

"المیہ یہ ہے کہ فرد کی چھینک اضطرار کے کسی لمحۂ غنیمت میں خود بخود وارد ہوتی ہے مگر قوم کے داخل سے چھینک بیدار کرنے کے لیے خود احتسابی کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے جسے مشرقی اقوام نے تاحال اختیار نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ وہ عرصے سے خوابِ خرگوش میں مدہوش ہیں اور چھینکنے کے بجائے خراٹے لے رہی ہیں۔"

(چھینک)

تیز رفتار تبدیلی

"بیسویں صدی میں کتنی صدیوں کا رُوپ سمایا ہوا ہے۔ یہ صدی اتنی تیز اور تغیرات کی حامل ہے کہ ہر آن ایک تازہ جہان آنکھوں کے سامنے لاکھڑا کرتی ہے۔ الہ دین کا چراغ جینی تو جتنیلہ کا محض افسانوی کرشمہ تھا یہ حقیقت اب گمگی۔"

(الگنی)

سماجی ضرورت

"اخبار ہماری بے خبری کی تاریکی کو اپنی لَو سے روشن کرتا ہے۔ یہ ہمیں ایک ایسا مشترکہ پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے جہاں سے ہم

بغیر روک ٹوک آپس میں ہم کلامی و ہم زبانی کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ اخبار کا مطالعہ حقیقت میں ایک طرح کی سماجی و ثقافتی غوطہ خوری ہے۔"

(اخبار پڑھنا)

مشین کا غلبہ

"کال بیل کی مختلف قسمیں ہیں، بعض اپنے بٹن سے چند قدموں کے فاصلے پر ہوتی ہیں، بعض بٹن سے پیوست، لیکن ٹیلی فون کی کال بیل ہزاروں میل کا پتہ بھی لا سکتی ہے۔ انسان گھڑی کی طرح اپنی اس ایجاد کا بھی غلام بن کر رہ گیا ہے، کبھی اس کی پکار سے بے توجہ نہیں رہ سکتا۔"

(کال بیل)

معاشی و اقتصادی ناہمواری

"یہ قرض کی برکت ہی ہے کہ جس کی بنا پر معاشرے میں ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی کا امکان کم سے کم رہ جاتا ہے اور غریب ممالک متمول ممالک سے اس لیے بگاڑ پیدا نہیں کرتے کہ ان کے مقروض ہوتے ہیں۔"

(قرض)

مستقبل کا خوف

"وہ وقت آنے والا ہے جب سارے کے سارے سیارے آپس میں ٹکرا جائیں گے اور کائنات ریزہ ریزہ ہو جائے گی یا تیسری عالمگیر جنگ شروع ہو چکی ہے اور اب سارے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم چلنے ہی والے ہیں — کسی نے کہا نسل انسانی کی افزائش کا اگر یہی حال رہا تو انسانوں کو روٹی نہیں ملے گی اور اس وقت ایسی گولیاں بنانی پڑیں گی جو کھانے کے وقت افرادِ خانہ میں تقسیم کر دی جائیں اور ان کا پیٹ بھر جائے۔ کسی صاحب نے فرمایا آج سے اتنے لاکھ یا کروڑ سال بعد پانی زہر ہو جائے گا اور انسان کو اگر وہ زندہ رہنا چاہتا ہے تو کسی مصنوعی پانی کا بندوبست کرنا ہوگا۔"

(دُور اندیشی)

و۔ ا : صابر لودھی صاحب! آپ انشائیہ کے ایک خاموش قاری ہیں۔ آپ نے وہ ساری تنقید یقیناً پڑھی ہوگی جو پچھلی ایک دہائی میں صنفِ انشائیہ اور اردو انشائیہ نگاروں پر ہوئی ہے۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس تنقید کے معیار کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

صابر لودھی : متمدن ممالک میں انشائیہ ایک معتبر صنف ہے۔ انگریزی ادب میں بالخصوص معیار اور مقدار کے اعتبار سے بہت خوبصورت اور فکر انگیز انشائیے ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہیں۔ اردو ادب میں بھی اب یہ صنف 'نووارد' یا 'اجنبی' نہیں رہی۔ اس کے باوجود اردو زبان میں انشائیے پر جو تنقید لکھی گئی اس کا غالب حصہ غیر سنجیدہ باتوں پر مشتمل تھا مثلاً "انشائیہ کوئی صنف نہیں بلکہ اُم الاصناف ہے۔" "انشائیہ بے کار صنف ہے۔" "سر سید نے انشائیے لکھے البتہ ایسے نہ لکھے اور نہ ہی ویسے لکھے جیسے آج لکھے جا رہے ہیں۔" وغیرہ۔ اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ جملوں نے انشائیہ لکھنے والوں کو گمراہ کیا۔ اور انشائیے کی فکر انگیزی، خیال آرائی، شگفتگی اور غیر رسمی انداز پر طنز و مزاح کا رنگ غالب آ گیا۔

مونتین سے لے کر ورجینیا وولف تک میں نے بہت سے معروف انشائیے پڑھے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا (برٹینیکا) اور جارج ڈیشے کی مرتب کردہ "ادبی اصطلاحات کی لغت" میں انشائیے کی صنف کا مطالعہ بھی کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کہ اردو دان طبقے

نے انشائیہ کی بحث کو بے وجہ الجھایا ہے۔

انشائیہ علم دوستی کا مظہر ہے۔ خیال کی آزادہ روی کو فکر و فراست اور اسلوب کی انفرادیت کے زور پر متوازن اور معتدل بنایا جا سکتا ہے چنانچہ وہ نقاد جو علم کے بجائے تعصبات پر اپنے نظریے کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں انشائیے کی صورت کو مسخ کرنے کے درپے ہیں۔ اگر لکھنے والا مثبت سوچ کا حامل ہے اور اس میں تخلیقی صلاحیت موجود ہے تو وہ اپنے خیالات کا اظہار انشائیے میں عمدہ طریقے سے کر سکتا ہے۔ کمل انشائیہ سوچ اور اسلوب کی انفرادیت اپنے ساتھ لاتا ہے اس لیے نثر کے بہترین نمونے انشائیوں (ESSAYS) کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

ہمارے ہاں انشائیے پر تنقید موضوع کے حوالے سے زیادہ ہوئی ہے اور اسلوب کے حوالے سے کم۔ حالانکہ انشائیے کا اسلوب ہی اس کی بنیادی خوبی ہے۔ موضوع کوئی بھی ہو اگر اس کا تعلق زندگی سے ہے تو وہ انشائیے کی بنیاد بن سکتا ہے لیکن انشائیے میں حُسن قلمکار کے اسلوب اور زاویۂ نظر سے پیدا ہوگا۔

انشائیے کو وجود میں آئے چار صدیاں گزر چکی ہیں۔ ہر صدی میں تہذیب کے مختلف رویوں نے انشائیے کے اسلوب کو سنوارا اور نکھارا ہے۔ البتہ انشائیہ نگار کی شخصیت اور ذوق کی مہر اس کے انشائیے پر ضرور لگی ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار کا اپنا زاویۂ نظر انشائیے کو مضمون سے ممتاز کرتا ہے۔ بدقسمتی سے اُردو میں، انشائیہ پر تنقید کرتے ہوئے ہمارے بعض نقادوں نے ان نکات کا خیال نہیں رکھا۔ چند نقاد ابھی تک یہ بھی سمجھ نہیں پائے کہ علمی، سیاسی، اقتصادی اور فلسفیانہ مضامین اور انشائیے میں حدِ فاصل کیا ہے! یہی رویّہ ہمارے ہفت روزوں اور روزناموں کے ادبی ایڈیشنوں کا ہے کہ ہر تحریر پر انشائیہ کا عنوان جما دیا جاتا ہے۔ البتہ بعض ناقدین نے انشائیہ پر خاصی معیاری اور عالمانہ تنقید لکھی ہے۔

جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے اُردو میں اب تک ایک ہی جامع کتاب شائع ہوئی ہے جس میں انشائیے کی صنف پر سنجیدگی سے بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر انور سدید کی "انشائیہ ــ اُردو ادب میں" ہے۔ اس کتاب میں انشائیے کی صنف کے تمام ممکنہ خطوط اُجاگر کیے گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب انشائیہ پر اب تک ہونے والی منفی تنقید کا مداوا کرے گی۔

اے ہوشمند

جوگندر پال

ایک دفعہ میرا ایک دوست اور مَیں کسی شاہراہ کے فٹ پاتھ پر چلے جا رہے تھے کہ اُس نے بے اختیار ہنستے ہوئے مجھے کہنی ماری اور پہلو میں ایک راہگیر کی طرف اشارہ کیا، جو نہایت سنجیدگی سے اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی ہلا ہلا کر بائیں ہتھیلی کو کچھ سمجھائے جا رہا تھا ـــــ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ ـــ مَیں نے اپنے دوست سے کہا ـــــ اپنے اندر ہی اندر ہم سبھی یہی کچھ تو کرتے رہتے ہیں۔

تو پھر کیا ہر نارمل شخص پاگل ہے؟ ـــــ آپ کے اس سوال کا جواب دینے کے لیے مَیں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا، کیا یہ پاگل پن نہیں کہ اپنے نارمل ہونے کا بھرم بنائے رکھنے کے لیے کوئی خواہ مخواہ پاگل ہوتا پھرے؟ اور تو اور، جنہیں آپ پاگل سمجھ کر پاگل خانوں میں بند کر دیتے ہیں اُن کے روبرو بھی کوئی یہ دعوےٰ کرے کہ وہ پاگل نہیں تو اپنی نہایت زرخیز چھٹی حس کے باعث اُن کی سمجھ میں فوراً یہ بات آجاتی ہے کہ اُن سبھوں میں سے ایک صرف وہی ہے جو پاگل ہے ـــــ نہیں، اس ضمن میں آپ کا خیال کہ پاگلوں کو ہوشمند ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں، بجا نہیں۔ یہ اس لیے، کہ دونوں ایک دوسرے کو یکساں طور پہ پاگل معلوم ہوتے ہیں، پھر کون پاگل اور کون ہوشمند؟

باہوش آدمی کی شناخت کو عام طور پر اُس کی ٹھہراؤ کی مہذّب عادت سے وابستہ کیا جاتا ہے، یعنی وہ اپنے گھر کو آگ لگنے کی اطلاع پاکر پہلے تو نہایت تحمل سے آپ کا شکریہ ادا کرے اور پھر بڑی خوش خلقی سے آپ کو چائے پینے کی دعوت دے اور اتنی دیر میں آپ کی بہم پہنچائی ہوئی اطلاع کو بھول کر آپ سے پوچھے، آپ اتنے حواس باختہ کیوں نظر آتے ہیں؟ بتایئے مَیں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ ـــــ خیر یہ ذی ہوش تو آپ کی خدمت بجا لانے کے آداب کی خاطر اپنا ہی گھر پھُکنے کا منظر آنکھوں میں نہیں لا پاتے، آپ اس قماش کے لوگوں کا کیا کیجیے گا جو آپ کا گھر پھُکنے کی خبر پاکر بڑے سہج قدموں سے موقع واردات پر قدم رنجہ فرماتے ہیں اور جن کا یہیں اطمینان دیکھ کر آپ کو اپنی آگ بجھانے کی بے چینی مضحکہ خیز لگنے لگتی ہے اور پھر آپ بھی اُن کے ساتھ بڑی پُر یقین ہوشمندی سے اپنی تباہی کا تماشا کرنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے اپنی تباہی کا تماشا کیے جانے سے صرف آپ ہی تباہ ہو رہے ہوتے ہیں اور آپ کو اپنی نجی حماقتوں کے تمام تر جمہوری حقوق حاصل ہیں، لہٰذا ہم آپ کو بھی نظر انداز کیے دیتے ہیں، مگر آپ اُن ہوشمندوں کا کیا کیجیے گا جو ہمہ گیر تباہی کو بھی نہ صرف سکون سے دیکھتے چلے جاتے ہیں بلکہ اس صورتِ حال پر واقعتاً سکون محسوس بھی کرتے ہیں اور اپنے سکون کے احساس کو بنائے رکھنے کی خاطر کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔

پرانے لوگوں کی بے خبری اور سادگی کو آج ہم ان کی پس ماندگی سے تعبیر کرتے ہیں، مگر کُل عالم کی خبروں کی ٹوہ پا پاکر کیا ہم زندگی کے اِس موڑ پر نہیں آکھڑے ہوئے جہاں ہر لحظہ ہم اِس دہشت میں مبتلا ہیں کہ اگلی خبر سے نامعلوم کس نوعیت کی ہلاکت کا باب کھُل جائے؟ ـــ اس دہشت کے تدارک کے لیے ہمیں یہ ایکسپرٹ رائے فراہم کی جاتی ہے کہ جو بھی بیت جائے، یہی سمجھو، کچھ ہوا ہی نہیں، بڑی سے بڑی خبر پاکر بھی لاپروا رہو۔ بلکہ خبر جتنی زیادہ بڑی ہو اتنے ہی زیادہ خوش نظر آؤ۔ سو جب مجھے کوئی نہایت خوش معلوم ہوتا ہے تو مَیں گھبرا سا جاتا ہوں کہ بے چارہ کہیں دہشت زدہ تو نہیں۔ ہمیں خبردار کیا گیا ہے کہ

انسان کا دل اُس کا خون صاف کرنے کی نہایت نازک مشین ہے، اس مشین کو احتیاط سے نہ برتنا غیر ذمہ داری کے مترادف ہے۔ مفت ایکسپرٹ ایڈوائس کی یہ سہولتیں اگلے وقتوں میں عوام کو کہاں نصیب تھیں؟ —— مگر اپنی اس مشین کو نہایت احتیاط سے برت برت کر ہم نے اپنے جذبوں کو بے مقام کر دیا ہے —— تو کیا ہوا؟ جذبوں سے ہمیں کیا لینا ہے؟ ہمیں تو بس اپنے کام سے کام ہے۔ اپنی سائنسی تدبیر کے آلات سے لیس ہو کر ہم نے بڑے طمطراق سے جتنی منزلیں تسخیر کرنے کی ٹھان رکھی ہے —— نہیں، شیطان کی کیا ہمت، کہ ہماری سائنسی قوت کے سامنے دم مار سکے؟ اپنے بچاؤ کے لیے وہ جہنم کی سرحدیں پھلانگ کر ہماری مہذب دنیا میں ہی آچھپا ہے۔ اُس نے سوچا ہو گا کہ حالات بہتر ہوتے ہی واپس چلا جاؤں گا مگر انسانی ترغیبوں کی تاب نہ لا کر اب وہ مستقلاً یہیں بس گیا ہے۔ ہماری انٹلی جنس کی پکی خبر ہے کہ وہ یہیں ہماری دنیا میں ہے۔ ہم اُسے پکڑ تو لیں مگر ہماری اطلاع کے مطابق وہ اب اتنا جنٹلمین دکھتا ہے کہ ہمیں ڈر ہے کہیں اُس کے دھوکے میں ہم اپنے ہی معززین میں سے کسی کو نہ دھر لیں۔

ہمارے دور میں طوفانوں، بھونچالوں اور وباؤں سے کوئی خطرہ درپیش نہیں رہا۔ انسانی تدبّر اور تربیت اس طرح کے قدرتی خطرات کے اسباب پر حاوی ہو چکے ہیں۔ آج انسان کو اپنے ایک ہی دشمن سے سارے خطرے لاحق ہیں، اُس کا تدبّر، جسے کام میں لا کے وہ کیا پتہ کب چشم زدن میں قیامت بپا کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری دنیا کی دو سب سے ہوشمند قومیں ایک دوسرے کے خون سے پاگل ہیں اور اُن کے نمائندے کسی صلح جُو مہم کے دوران جب گلے ملتے ہیں تو بیک وقت اپنی اپنی پیٹھ پر خنجر کی چبھن محسوس کر رہے ہوتے ہیں، حالانکہ وہ ایسے ایسے سائنسی کرتب کر جانتے ہیں کہ اپنی بڑی میٹھی مسکراہٹوں کے راستے ہی اپنا سارا زہر ایک دوسرے کے بدن میں اتارتے چلے جائیں۔ دونوں قوموں کا دعویٰ ہے کہ جب تک وہ ہمہ وقت جنگ کے لیے تیار رہیں گے، اُن کے درمیان امن بنا رہے گا۔ اپنے اس دعوے کے جواز میں دونوں کے پاس اتنے مہلک ہتھیار جمع ہیں کہ وہ ایک ذرا بٹن دبا کر دو جہان کو تہس نہس کر کے رکھ دیں۔ ہر دو نے اپنی حفاظت کے لیے ایسے غار بنا رکھے ہیں کہ نیوکلیائی ہلاکت کے پُرزوں کے حرکت میں آ جانے سے جب سانپ اور بچھو تڑپتے ہوئے اپنے بلوں سے باہر آ جائیں تو یہ اُن کے مانند زمین دوز زندگی اختیار کر لیں اور جنگ کے سائے چھٹ جانے کے بعد مزے سے رینگ رینگ کر جئیں۔

اِن دو بڑی قوموں کی دیکھا دیکھی اقتصادی طور پر کمزور قومیں بھی اسی طرح اپنی ہوشمندی کی تدبیروں میں ہمہ تن جُٹی ہوئی ہیں۔ آپ اُن سے پوچھئے، آپ کے پاس بیماروں کی طبّی امداد کا کیا انتظام ہے؟ —— وہ بڑے فخر سے جواب دیں گے، موجودہ سال میں ہماری بری فوج میں سو فیصد، بحری میں دو سو فیصد اور فضائیہ میں ڈھائی سو فیصد اضافہ ہوا ہے۔ تیسری دنیا کے تقریباً سبھی ممالک نے اپنی اوّلین ضروریات کی نشاندہی میں اتنی مضحکہ خیز مستعدی سے کام لیا ہے گویا وہ مستعد تو ہوں مگر انہیں یاد ہی نہ رہا ہو کہ وہ کیوں مستعد ہیں —— اپنی آزادی کے لیے؟ —— آزادی کیا ہوتی ہے؟ —— بھوک، بیماری اور لاچاری کو گاڑھا کیے جانے کی آزادی؟ —— سیدھی سی بات ہے کہ کسی ملک کو باہر سے خطرہ درپیش ہو یا اندر سے، اُس خطرے کے اسباب بہرصورت خارجی ہوتے ہیں اور اُن کی مدافعت میں یکساں طور پر ہی جذبہ کار فرما ہونا چاہیئے جس کی تحریک کسی خارجی حملے پر ہوتی ہے۔ اگر ہم اس مسئلے کا قریبی مطالعہ کریں تو اتنے لوگ کسی خارجی قوت سے جنگ کرتے ہوئے کام نہیں آتے جتنے کسی باطنی بگاڑ سے۔ مجھے تو دنیا کے بیشتر لوگ اسی لیے بڑی بے چینی سے ہاتھ پیر مارتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں کہ خارجی حادثات سے دوچار ہونے کی بجائے بے چارے پیٹ کی گڑبڑ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مسئلہ تو جلاب کی گولیوں سے حل ہوتا ہے مگر وہ بدحواسی میں بندوق کی گولیاں کھانے یا کھلوانے کے لیے اپنی سرحدوں کی جانب بے تحاشہ دوڑے جا رہے ہیں۔

ہوشمند لوگ اپنی خود پارسائی سے خوش ہو ہو کر اپنے آپ کو یقین دلاتے رہتے ہیں کہ وہ بڑے گہرے غور و فکر کے عادی ہیں، حالانکہ قومی سیمیناروں پر ذرا سے بھی مشاہدے سے آپ پر یہ بھید کھل جائے گا کہ اپنے غور و فکر کے پوز میں دراصل وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہے ہوتے، بس اپنے بولنے کی باری کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ چلئے، یہ بھی برا نہیں۔ کم سے کم کچھ بھی نہ سوچنے سے وہ کسی کے نقصان کی تو نہیں سوچ رہے ہوتے۔ مگر پرابلم اتنا سیدھا بھی نہیں، ہمارے

عقلمندوں میں ایسے لوگ بھی بکثرت موجود ہیں جو اپنی بے جا طرفدار سوچوں سے عام فہم معاملات کو اس لیے انتہائی پیچیدہ بنا دیتے ہیں کہ اس سازگار کنفیوژن میں من مانی کے لیے زمین ہموار کر سکیں۔ پچھلے دنوں مجھے چند دانشوروں کی ایک سرکاری میٹنگ میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ چند سیدھے سادے امور تھے جن تک نیک نیتی سے پہنچنا درکار ہوتا تو کسی دیہات کا چوپال بھی بہ آسانی پہنچ جاتا، مگر ان نامور دانشوروں نے اپنے مطلب کے نتائج تک پہنچنے کی خاطر نہایت صناعی سے جھوٹ بول بول کر موٹی سی بات کو اس قدر الجھا دیا کہ میں بڑی پریشانی سے سوچنے لگا، اس پرابلم کا تو کوئی حل ممکن ہی نہیں۔ نہیں، ممکن کیوں نہیں؟ —— ایک دانشور نے اپنی مدبرانہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے مجھے ٹوکا —— سنیئے! —— مگر اسی اثنا میں میٹنگ کے ایک اور رکن نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو دانشوروں کے طلسمانہ داؤ پیچ سے آزاد کیا اور بڑے سپاٹ لہجے میں سچ بول دیا۔ اُس کا بیان سنتے ہی سبھی دانشور اُس پر کچھ اس طرح کھلکھلا کر ہنس پڑے کہ اور لوگ تو درکنار، وہ رکن خود آپ بھی اپنے آپ کو کوئی مسخرہ سمجھنے لگا۔

اپنے جھوٹ بولنے اور سننے کی عادت کے باعث اچانک کبھی سچی بات سن کر ہمیں یونہی لگتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا جھوٹ بولا گیا ہو، یا کسی مسخرے نے کوئی لطیفہ سنایا ہو، یا پھر سچ بولنے والا واقعی پاگل ہو گیا ہو —— خدا بے چارے کے بچوں پر ترس کھائے۔ باپ کے جیتے جی یتیم ہو کر رہ گئے ہیں —— میری ایک اور واردات سنیئے۔ کاٹیاں پنڈتوں کی باتوں میں آ کر ایک دفعہ میں نے نہ صرف سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا بلکہ واقعی ہمیشہ سچ بولنے لگا۔ نتیجہ؟ ایک ایک کر کے سب دوست اور رشتہ دار مجھ سے کنارہ کش ہو گئے۔ یہ تو ہوا مگر پھر یہ بھی ہونے لگا کہ مجھے اپنا آپ بھی کوئی غیر معلوم ہوتا، میں ایک نفسیاتی طبعہ سا ہو کر رہ گیا اور اپنی باتیں اپنے آپ سے بھی چھپانے لگا، کیا معلوم، کب میں اپنا بھانڈا بھی پھوڑ دوں؟ —— اب اس طرح کوئی کیونکر جیئے جا سکتا ہے کہ اپنے آپ کو اپنے آپ سے بھی چھپاتا پھرے؟ بالآخر میں آپ ہی دوڑا دوڑا اپنے شہر کے پاگل خانے میں آ پہنچا اور میرے پیچھے پیچھے میری بیوی کی —— مجھے بچاؤ! —— بچاؤ! ——

پاگل خانے کے مہتمم نے ہماری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور مجھ سے پوچھا، کس سے!

مجھ سے!

مہتمم میرا جواب غیر متوقع پا کر چڑ گیا، جاؤ بھائی، یہ پاگل خانہ ہے، کوئی سنیاس آشرم نہیں۔

سچ بولنے کے باعث مجھے پاگل خانے میں پناہ نہ ملی تو مجھے سچ بھی جھوٹ معلوم ہونے لگا اور یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی پر حقائق منکشف ہونے لگتے ہیں، یعنی وہ حقائق کے غیر حقیقی پن سے متعارف ہونے لگتا ہے۔

ہوشمندوں کا المیہ شاید یہی ہے کہ اُن پر حقائق کا غیر حقیقی پن وا نہیں ہوتا، اور ہو بھی جائے تو وہ اس کی تاب نہ لا کر خودکشی کر لیتے ہیں، یا پھر پاگل ہو جاتے ہیں مگر اپنے پاگل پن میں جب اُن کا ظاہری غیر حقیقی پن کے درون خانوں میں پہنچا ہوتا ہے تو وہ یہاں ابر رحمت میں نہا دھو کے، نئے نویلے ہو کر باہر نکلتے ہیں اور کل جہان کو ایک نیا درس دینے کی دھن میں اتنے سرشار ہوتے ہیں کہ مقامی لوگ اُنہیں نہایت خطرناک پاگل سمجھ کر اُن کے سامنے زہر کے پیالے رکھ دیتے ہیں، جنہیں وہ مست فقیر میٹھا پانی سمجھ کر بے تامل ہاتھوں میں لے لیتے ہیں اور یوں اپنی پیاس بجھا کر ملک عدم کی جانب ہو لیتے ہیں۔ اماوس کی راتوں میں جب چاند بھی اپنی کسی خیانت کے خیال سے منہ چھپائے ہوتا ہے تو یہی غیر ہوشمند درویش آکاش کی دور تر تاریکیوں میں جھلملا رہے ہوتے ہیں کہ کائنات کا بسا بسا منظر اوجھل نہ ہو جائے۔ یہ جیالے عمر بھر اپنے وجود کی چار دیواری میں پھڑ پھڑاتے رہتے ہیں اور زہر کے پیالے پی کر کائناتی ربط میں رچ بس جاتے ہیں تاکہ ہم ہوشمند لوگ انہیں اپنے سانسوں سے اندر اتار اتار کر وسیع تر ہوتے رہیں، وسیع تر ہو ہو کے پھیلنا سیکھ جائیں اور پھیلتے پھیلتے ان کی لامحدودیت میں شریک ہو جائیں۔

ہوشمندی کے کڑے پہروں میں بکھرا آدمی اپنی مٹی اور نام کو ہی اپنی ذات پر محمول کرنے لگتا ہے اور اپنی فطری غروں کو مصنوعی عادتوں میں گھٹاتے ہوئے

بھی سود و زیاں کا پابند ہو کر رہ جاتا ہے۔ مغرب میں تو اس قسم کی ہوشمندی پر اصرار کرکے برتر زندگی کا موقع کھویا ہی تھا، ہم بھی اُن کے تتبع میں اُن طبع زاد قدروں کا خون کرنے پر تُل گئے جن کی بدولت ذات کا کائنات پر کھلتے چلے جانا اور کائنات کا ذات میں سمٹ آنا بعید از قیاس نہ تھا۔

ہماری نئی تربیت نے ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا تو کر دیا ہے مگر اس ایستادگی میں کچھ یوں جکڑ دیا ہے کہ اک ذرا جھک کر ہمارا لیٹنا نہیں ہو پاتا، بس کھڑے کھڑے سوؤ اور سوتے میں بھی چوکس رہو، ورنہ کوئی گلا کاٹ جائے گا ___ خبردار! ___ ہوشیار! ___ ہم بڑے ہوشیار ہو گئے ہیں۔ آنکھیں ترس جاتی ہیں کہ کوئی تو ایسا ملے جو اتنا ہوشیار، اتنا عیار نہ ہو، ہم اُس پر ایک دم بھروسہ کر لیں اور اُسے بے تحفظ، بے خوف اور بے تامل گلے لگا لیں اور جاسے پھٹتے ہوئے سینوں میں قرار آ جائے ___ ارے، کوئی تو احمق ہو، کوئی دیوانہ، کوئی محبت کرنے والا ___ مفت میں محبت کون کرے گا بابا! پہلے دام نکالو۔

ماہنامہ **اُردو زبان** سرگودھا

کا

ایک ہنگامہ خیز شمارہ

جس میں "غلطی ہائے مضامین" کے زیرِ عنوان ڈاکٹر انور سدید
نے
جواز (بھارت) کے ایک مضمون کا مفصل تجزیہ کیا ہے۔
(زیرِ ترتیب)

آوارہ خیالی

غلام الثقلین نقوی

اگر پریشان خیالی ایک ذہنی بیماری ہے تو آوارہ خیالی کو ذہنی صحت کی نشانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ پریشان خیالی کا دریچہ دوزخ میں کھلتا ہے اور آوارہ خیالی قدم قدم پر جنتیں آباد کرتی چلی جاتی ہے۔ آوارہ کے لفظ کے ساتھ ہماری اخلاقیات نے کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ ہر اُس شخص یا خیال کو جو عام شاہراہ سے ہٹ کر اِدھر اُدھر کی سیر کر لیتا ہے، آوارہ کہا جاتا ہے۔ آوارگی دراصل سیدھی لیک پر نہ چلنے کا نام ہے بلکہ آوارگی کو یہ بھی پسند نہیں کہ وہ سیدھی لیک کے متوازی کسی راستے پر گامزن ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ آوارگی اپنی ٹیڑھی بینگی بل کھاتی پگڈنڈی کو ترجیح دیتی ہے اور لکیر کی فقیر نہیں بنتی۔ چنانچہ آوارہ خیال شخص کو معاشرے کا باغی اور اخلاقیات کا دشمن خیال کیا جاتا ہے۔

میں نے آوارگی اور آوارہ خیالی کو کچھ گڈمڈ کر دیا ہے۔ دونوں میں باریک سا فرق ہے۔ آوارگی میں تھوڑا سا ذم کا پہلو نکلتا ہے۔ آوارہ خیالی اس سے سراسر پاک ہے۔ آوارگی میں جسمانیت کی آلائش موجود ہے۔ 'آوارہ خیالی' کو اس آلائش سے کوئی تعلق نہیں۔ جسم آوارگی کی گلیوں سے گزر کر ضرور آلودۂ خس و خاشاک ہوتا ہوگا لیکن آوارہ خیالی کسی گلی کی محتاج نہیں، اس لیے خس و خاشاک سے اس کا دامن بھی آلودہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی گلی کی آپ تخلیق کرتی ہے اور اس میں ایک نئی دنیا آباد کرتی ہے، نہایت منزّہ اور پاک دنیا۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ اُس کی دنیا اِسی زمین پر آباد ہو، وہ اِس سے ماوراء کسی اور سرزمین تک بھی پرواز کر جاتی ہے اور وہاں بھی نئی دنیا آباد کر لیتی ہے۔ بڑے بڑے شاعروں نے ایسی دنیائیں آباد کی ہیں یا آباد کرنے کی تمنّا کا اظہار کیا ہے چنانچہ غالب کا ایک شعر ہے۔

منظر اِک بلندی پر اور ہم بنا سکتے   عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

ممکن ہے کہ اتنے بڑے شاعر کی اتنی بلند پرواز "آوارہ خیالی" نے عرش سے پرے اپنا 'منظر' قائم کر لیا ہو۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں جبریل کے بھی پر جلتے ہیں لیکن دیکھئے کہ شاعر کا خیال یہاں کس آسانی سے جا پہنچا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اِس 'منظر' کے خدوخال ہم تک نہ پہنچا سکے یا اُس نے ہمیں اس کا اہل نہ سمجھا کہ ہم اِس 'منظر' کی معرفت حاصل کر سکیں۔ یوں بھی آوارہ خیالی غالب کی منزل پر پہنچ کر 'لطافتِ تخیّل' کا نام اختیار کر لیتی ہے اور خیال کی تجرید یا لطافت تک رسائی ہر کہ و مہ کا کام نہیں۔

میری آوارہ خیالی کو غالب کی لطافتِ تخیّل سے کیا نسبت، تاہم ہیں یہ دونوں ایک ہی قبیلے کی چیزیں، فرق صرف درجے کا ہے۔ میں اپنی ذات کو بیچ میں لے آیا ہوں، کیا کروں اپنی ذات کو بیچ میں لائے بغیر میں دنیا کی کسی حقیقت کا صحیح طور پر ادراک نہیں کر سکتا۔ پتہ نہیں لاکھوں یا پتہ نہیں کروڑوں سال پہلے جب میں شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر اپنے وجود سے آگاہ ہوا تھا یا جب میری گم گشتہ جنت میری ذات کی تجریدی صورت میں میرے سامنے آگئی تھی تو میں نے طرح طرح کی جنتیں آباد کیں اور اُن میں بڑے ہی خوبصورت دیوتاؤں کو لا بٹھایا۔ کوئی جنت اولمپس کی چوٹی پر آباد ہوئی اور کوئی زمین کے پاتال میں، کسی دیوتا

نے چاند میں بسیرا کیا اور کوئی سورج کی رتھ پر سوار صبح کی شفق سے برآمد ہوا اور شام کی شفق میں جا ڈوبا۔ پھر اُن کے ساتھ دیویاں بھی تخلیق ہوئیں، نرم و نازک صبا و نسیم سے بھی زیادہ لطیف اور شبنم کے قطرے سے بھی زیادہ سبک خرام۔ کوئی سمندر کی جھاگ سے برآمد ہوئی اور کسی نے زمین کی کوکھ سے جنم لیا۔

آوارہ خیالی نے کھوئی ہوئی جنت کی تلافی کر دی اور اس کا ثمرہ یہ ہے کہ ہم آج بھی پھول کی ہر پتی پر کسی پری کو تتلی کی طرح تھرکتے دیکھتے ہیں اور سمندر کی ہر لہر پر ہمیں کوئی جل پری تیرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ دھنک کے سات تاروں پر کسی نرتکی کو ناچ کرتے ہوئے دیکھ کر، ہم آج بھی اُسے 'قوسِ قزح' کہتے ہیں۔ یہ سب آوارہ خیالی کی جنتیں ہیں۔ یہ نظر کا فریب بھی نہیں اور حقیقت سے بھی انہیں کوئی واسطہ نہیں۔

ایک عام انسان مجبور ہے کہ وہ نستعلیق قسم کی زندگی بسر کرے تاکہ دیکھنے والے کو اُس کے چلنے پھرنے، بولنے چالنے حتّٰی کہ سوچنے کے انداز میں بھی کوئی آوارگی نظر نہ آئے۔ یوں بھی عام آدمی کے اعصاب اتنے مضبوط نہیں ہوتے کہ بغاوت کی معمولی سی جدّت کے بھی متحمل ہو سکیں چنانچہ وہ عافیت اسی میں سمجھتا ہے کہ لکیر کا فقیر بنا رہے اور صاف اور سیدھی لیک پر چلتے چلتے قبر میں جا پہنچے لیکن آدمی کے اندر ایک اور آدمی بھی چھپا ہوا ہے جو بہت بڑا باغی اور گنہ گار بھی ہے۔ چنانچہ کبھی کبھی جب دل کے ساتھ پاسبانِ عقل نہیں رہتا، وہ آوارہ بھی ہو جاتا ہے لیکن یہ آوارگی صرف خیال کی آوارگی ہوتی ہے مثلاً خیال ہی خیال میں وہ اُسی بازار میں بھی نکل جاتا ہے اور اُس کی ہر لذت سے فیض یاب ہو کر لوٹتا ہے اور ہم جیسے شریف لوگ تو ایسی آوارگی سے بھی ڈرتے ہیں۔ اپنی جوانی کے زمانے میں منٹو اور عصمت کے افسانے بھی چھپ چھپا کر پڑھتے تھے۔ جب بھی موقع ملتا اُنہیں خوانِ یغما سمجھ کر ان پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ اس 'ہم' میں میں بھی شامل ہوں، آپ بھی اور کئی اور لوگ بھی جنہوں نے منٹو اور عصمت کو پڑھا ہے اور ممنوعہ جنتوں کی سیر کی ہے۔ گویا منٹو اور عصمت کی 'آوارہ خیالی' نے افسانوی سانچے میں ڈھل کر ہمیں آوارگی کے چند لمحے عطا کیے۔

ایک عام انسان کی "آوارہ خیالی" اولمپس یا آکاش پربت کی چوٹیوں تک رسائی کی قابلیت نہیں رکھتی۔ وہ پاتال کی گہرائیوں تک بھی نہیں جا سکتی۔ وہ ہومر کی طرح کسی ہیلن کی تخلیق تو بھی نہیں کر سکتی چنانچہ وہ چھوٹی چھوٹی لذتوں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے یعنی کٹیا میں بیٹھ کر کسی محل کا دریچہ کھول لیتی ہے، کلرک کی کرسی سے اُٹھتی ہے اور کسی خاص لمحے میں افسر کی کرسی پر جا کر بیٹھ جاتی ہے، کوئی فلم دیکھتے دیکھتے ہیرو کا رُوپ دھار لیتی ہے اور کسی پسندیدہ ہیروئن کو گلے سے لگا لیتی ہے۔ گویا انسانوں کی اکثریت چھوٹی چھوٹی معصوم اور بے ضرر آوارہ خیالیوں پر اکتفا کر لیتی ہے۔ شیخ چلی کی طرح کا آوارہ خیال جینئس تو کبھی کبھار پیدا ہوتا ہے کہ چینی کے برتن سر پر اُٹھا کر مسلسل خواب دیکھتا چلا جاتا ہے، مزدوری کے پیسوں سے انڈے خریدتا ہے۔ اُن سے چوزے نکلتے ہیں تو اُنہیں پروان چڑھاتا ہے۔ پھر اُسے اپنے صحن میں مرغیوں اور مرغوں کے ڈار کے ڈار کُڑکُڑاتے اور پھڑپھڑاتے نظر آتے ہیں۔ انہیں بیچ کر گائیں، بھینسیں، گھوڑے اور ہاتھی خریدتا ہے اور ازلی و ابدی کنوارپنے کی تلافی ایک نہایت خوبصورت بیوی کی صورت میں کرتا ہے۔ عورت خوبصورت ہو یا بدصورت اُس پر رُعب رکھنا بھی ضروری ہے ورنہ عورت سر چڑھ جاتی ہے۔ نانوے باتیں مانو اور سوویں پر 'ناں' ضرور کر دو۔ چنانچہ اس سوویں بات پر سر ہلتا ہے تو سر پر رکھے برتن چکنا چور ہو جاتے ہیں اور آوارہ خیالی کا سنہری تانا بانا بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

اگرچہ شیخ چلیوں کی آوارہ خیالیوں کا انجام کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہوتا۔ تاہم ان آوارہ خیالیوں کے دوران میں شیخ چلی گردن توڑ بوجھ سے تو بے نیاز رہتے ہیں یعنی وہ ایک عام مزدور کی طرح مزدوری نہیں کرتے بلکہ شاعری کرتے ہیں اور کسی بوجھ کو بارِ دوش نہیں بننے دیتے۔

میں ذاتی طور پر نہ شیخ چلی کی طرح کا جینئس ہوں اور نہ ایک عام آدمی کی طرح بہت زیادہ گھٹی قسم کا آوارہ خیال، لیکن آوارہ خیالی کی لذتوں سے بہرہ یاب ضرور ہوتا ہوں مثلاً مئی جون کی شدید گرمیوں میں سوات، چترال، ہنزہ اور کاغان کی سیر کرتا ہوں۔ آرام کرسی کی اس سیر میں لذت بھی بہت ہے۔ نہ تھکتا ہوں، نہ سانس پھولتی ہے اور پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچتا ہوں اور گھاس کا فرش بچھا کر کسی چیڑھ کے سائے تلے بیٹھ جاتا ہوں۔ چیڑھ کی جھانجھنیں سرسرا کر میرے کانوں میں موسیقی کا رس گھولتی ہیں اور پہاڑ کی بلندی سے اُچھلتی ہوئی والی ندی کا نغمہ مجھے اپنی جنت میں گم کر دیتا ہے۔ اس ندی کے کنارے پھولوں سے آتی اور خوشبو سے

لبریز ایسی حسین اور سرسبز وادیوں کی تخلیق کرتا ہوں کہ قدرت کو بھی رشک آتا ہے۔ باہر لُو چل رہی ہوتی ہے اور اندر پنکھے کی ہوا بادِ سموم کے جھونکوں کا کام کر رہی ہوتی ہے اور مَیں نسیمِ صبا کے خنک جھونکوں کی لذت لے رہا ہوتا ہوں۔ جب آوارہ خیالی کا طلسم ٹوٹتا ہے تو میرے ماحول کا جہنم مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

جب مصلّے پر بیٹھ کر بھی دنیا داری کی پریشان خیالیوں سے چھٹکارا نہیں ملتا تو مَیں سدھارتھ کی طرح بَن باس لے لیتا ہوں۔ قیام و رکوع کے مرحلوں سے گزرتا ہوا سجدے کی منزل پر پہنچتا ہوں تو میرا مصلّے خود بخود ایک جٹا دھاری برگد کے سائے تلے بچھ جاتا ہے۔ ایک لمحہ گزرتا ہے تو میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اُس وقت یوں لگتا ہے جیسے مَیں نروان کے قریب سے ہو کر پلٹ آیا ہوں۔ اس کیفیت کے اینٹی کلائمیکس پر مجھے چائے کی طلب بے چین کر دیتی ہے۔ بے چارے سدھارتھ کو برگد کے سائے تلے مرگ چھال پر بیٹھے چائے کی گرم گرم پیالی کہاں ملی ہوگی۔ اگر وہ چائے کا عادی ہوتا تو کبھی جنوں کا رُخ نہ کرتا اور میری طرح آوارہ خیالی کے لمحوں میں نروان کو ڈھونڈتا۔

غالب نے بھی اِسی قسم کے بَن باس کی تمنا کی تھی جب اُنہوں نے کہا تھا کہ رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو۔ یہ اُن کی آوارہ خیالی کی ایک جنّت تھی جسے وہ آباد نہ کر سکے۔ جو شخص ٹپکتی چھت کے نیچے 'فقدانِ راحت' سے گھبراتا ہو، وہ بے چارا 'بے دَر و دیوار گھر' میں کون سی جنّت آباد کر سکتا ہے۔ اقبال تو حقے اور گاؤ تکیے کے رسیا ہونے کے باوجود دنیا کی محفلوں سے الگ کر دامنِ کوہ میں کُٹیا آباد کرنا چاہتے ہیں حالانکہ جو آدمی حقہ پیتا ہو، وہ محفل کے بغیر کیسے زندہ رہ سکتا ہے اور جس کے پلنگ پر گاؤ تکیہ لگا رہے، وہ گھاس کے فرش پر ہاتھوں کا سرہانہ بنا کر میٹھی نیند کیسے سو سکتا ہے؟

اصل میں یہ نظمیں 'آوارہ خیالی' کی تخلیق تھیں۔ اِن کے خالق بڑے آدمی تھے، اُن کی آوارہ خیالی کو پروازِ تخیل کا نام مل گیا اور میرے جیسا آدمی شیخ چلی جیسا جینیئس بھی نہ بن سکا، تاہم یہ چند سطریں لکھ کر آوارہ خیالی کی لذت سے تو بہرہ یاب ہو گیا ہوں۔

غلام الثقلین نقوی ایک ممتاز افسانہ نگار ہیں مگر ان کے باطن میں ایک خوش فکر مزاح نگار بھی موجود ہے

اک طُرفہ تماشا ہے

غلام الثقلین نقوی

کے

مزاحیہ مضامین کا خوش نظر مجموعہ

مکتبہ فکر و خیال - ۱۷۲ - ستلج بلاک - اقبال ٹاؤن لاہور

آہٹ

شہزاد احمد

آپ نے سُنا وہ آہٹ پھر آ رہی ہے، آپ تو جانتے ہی ہیں کہ دن اور رات میں کئی بار یہی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ رات کے سناٹے میں تو یہ اور بھی بلند آہنگ ہو جاتی ہے۔ شاید کوئی اس آہٹ سے اپنے ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے مگر میرے پاس بھی تو اپنے وجود کی کوئی گواہی اس کے سوا نہیں کہ میں یہ آہٹ سُنتا ہوں، اور اس آہٹ کے درمیان وہی رشتہ موجود ہے جو منظر اور آنکھ کے درمیان ہوتا ہے۔ اگر آنکھ نہ ہو تو منظر کا وجود باقی نہ رہے۔ اگر سُننے والے کان نہ ہوں تو یہ آہٹ خلا کی وسعتوں میں ذرّے کی طرح کھو جائے، ایک ایسے ذرّے کی طرح جو محض ذرّہ ہی نہیں ایک لہر بھی ہے۔ ایک ایسا ارتعاش بھی ہے کہ اگر ساری کائنات یکایک خاموش ہو جائے تو اس کی آواز کانوں کے پردے پھاڑ دے۔

ہم شاید ازل سے آوازوں کے جنگل میں رہتے ہیں یہ جنگل بہت پُر شور ہے، اس کے پتھر، پہاڑ، وادیاں، درخت، پودے، دریا، ندیاں، نالے، پرندے درندے غرض سبھی کچھ اپنی ذات کا اظہار گلا پھاڑ پھاڑ کر کرتے ہیں۔ ہم نے دھیما پن سیکھا ہی نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد ہم اپنا ساؤنڈ بیریئر بریک کریں تاکہ ساری دنیا دہل جائے، ہم ہر گھڑی صورِ اسرافیل پھونکنے کے خواہش مند ہیں تاکہ لوگ سُنیں اور خواہ یہ سُننے والے لاکھوں برس پرانے فوسل شدہ ہڈیوں کے ڈھانچے ہی کیوں نہ ہوں۔ دھیمی آوازیں، آوازیں نہیں ہیں سرسراہٹیں ہیں جیسے کوئی شہزادی نیا لباس پہن کر غلام گردش میں گھوم رہی ہو۔

دنیا کی ہر شے اپنا اظہار آوازوں کی وساطت سے کرتی ہے، اس میں حیوانات، نباتات، جمادات سبھی شامل ہیں، سب سے بڑا دھماکہ پتھروں کے آپس میں ٹکرانے سے ہوتا ہے۔ درخت ہواؤں کے دوش پر اپنے پیغامات میلوں دُور تک لے جاتے ہیں اور ہوا کے پاس جب کہنے کو کچھ نہ بھی ہو تو وہ سائیں سائیں ضرور کرتی ہے۔ پانی جب برستا ہے یا دھرتی کی چھاتیوں میں سے دودھ کی طرح باہر نکلتا ہے تو بے حد شوریدہ سر ہوتا ہے اور جب بلندی سے گرتا ہے تو آسمان سر پر اُٹھا لیتا ہے۔ مگر پرندے بہت سبک رفتار ہیں، ان کی آوازیں دھیمی بھی ہیں اور سریلی بھی ہیں۔ مگر یہ سب ایک فریب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم بہت اونچا سُنتے ہیں ورنہ یہی آوازیں ہمارے دلوں کو دہلا دینے کے لیے کافی ہوں، جب ہم پیدا ہوتے ہیں تو ہمارے کانوں کے پردوں پر روئی کی ایک دبیز تہہ موجود ہوتی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہم نے اس تہہ کو ہٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی اور یہی قرینِ مصلحت بھی ہے۔ روئی کی یہ دبیز تہہ سب آوازیں ہمارے دل تک لے کر نہیں جاتی۔ ہم اپنی مرضی سے پسندیدہ اور ناپسندیدہ آوازوں میں امتیاز کرتے ہیں۔ ہمارے دل تک عام طور پر وہی آواز رسائی حاصل کرتی ہے جو پسندیدہ ہو مگر کبھی کبھی کوئی ناپسندیدہ گستاخ آواز بھی دلوں تک پہنچ ہی جاتی ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو گویا زلزلہ سا آ جاتا ہے۔ مدتوں سے خاموشی کا جوالا مکھی پھٹ پڑتا ہے اور آنسوؤں کی صورت میں موتیوں جیسا لاوا بہہ نکلتا ہے۔

ہم شاید ازل سے خاموشی کے متلاشی ہیں اور اسی لیے جنگلوں، صحراؤں یا دریاؤں کا رُخ کرتے ہیں۔ مگر ان میں خاموشی کہاں؟ جنگلوں میں بڑے بڑے

درخت، جھاڑیاں، پرندے، درندے غرض ہر ایک ہم سے ہمکلام ہونا شروع کر دیتا ہے۔ صحراؤں میں ہر ذرہ بولتا ہے کبھی آگ کی زبان میں اور کبھی سرد کر دینے والی نرماہٹ کے لہجے میں، رہے دریا تو وہ تو شہروں سے بھی گزرتے ہیں، ان میں نام نہاد خاموشی نام کی کوئی شے موجود ہونے کا سوال ہی کیا ہے؟ وہ تو ہر شے کے ساتھ گفتگو کرنے کے عادی ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ انہیں قیام نہیں اور جو شے بھاگ رہی ہو وہ خاموش کیسے ہو سکتی ہے؟ دوسری مشکل یہ بھی ہے کہ ہماری اور دریاؤں کی سمت ایک نہیں، ہم ایک دوسرے کے اُلٹے رُخ میں سفر کرتے ہیں۔ لہٰذا آوازوں کا تصادم شدید تر ہو جاتا ہے لیکن اگر دریا — کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ چلنے کی صورت نکل بھی آئے تو بھی لہروں سے ٹکراؤ تو قائم رہے گا۔ ہم روشنی تو نہیں ہیں کہ لہریں ہم میں سے اور ہم لہروں میں سے بغیر کوئی تبدیلی پیدا کئے گزر جائیں۔

شہروں میں البتہ خاموشی ہے، ازل سے ابد تک تنہائی ہے۔ یہ صرف شہر ہی میں ممکن ہے کہ ہم تنہائی اور خاموشی تلاش کر سکیں کیونکہ شہر میں کوئی شے ہم سے مخاطب نہیں ہوتی۔ کوئی اڑتا ہوا پتا، گزرتا ہوا ہوا کا جھونکا یا گرد کا کوئی گرم بادل ہمارا راستہ نہیں روکتا۔ کوئی ہم سے تعارف حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی ہم کو یہ بتانا پسند کرتا ہے کہ وہ کون ہے؟ مجھے حیرت ہے ان راہبوں پر جو سکون کی تلاش میں جنگلوں، پہاڑوں یا صحراؤں کا رُخ کرتے ہیں۔ ممکن ہے انہیں کسی سے مکالمہ کرنے کی خواہش ہو، کیونکہ شہر جتنا بڑا ہوتا ہے اتنا ہی گونگا ہوتا ہے۔ آپ کراچی سے لاہور آجائیں تو آپ کو ہر شے میں تھوڑی بہت زندگی کی رمق نظر آنے لگتی ہے۔ لاہور سے شیخوپورہ ہی چلے جائیں تو آپ کا تعلق بولنے والی چیزوں سے پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے مگر یہ سارا سفر تو حال سے ماضی کی طرف کا سفر ہے، ہمیں تو مستقبل کی طرف جانا ہے، جہاں بڑے بڑے شہر ہیں، آسمانوں کو چھوتی ہوئی عمارات ہیں، خود بخود چلنے والی مشینیں ہیں، غرض وہ سبھی کچھ موجود ہے جو شور تو بہت مچاتا ہے مگر گفتگو کبھی نہیں کرتا۔ وہ ایسی زبان بولتا ہے جو سیکھی نہیں جا سکتی ہے۔ ہم نے مشینیں تو بنا لیں مگر مشینوں کی زبان نہ سمجھ پائے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ خالق مخلوق کو پیدا تو کرے مگر اس سے مکالمہ نہ کر سکے۔ اقبال نے کہا تھا "نقش ہوں اپنے مصور سے گلہ رکھتا ہوں میں" اس کا احساس تو اسی صورت میں ممکن تھا کہ خالق اپنے نقش کی زبان سمجھتا ہو یا نقش خالق سے مکالمہ کرنا چاہے۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ ہم جس عہد میں موجود ہیں وہاں سب کچھ ہوتا ہے مگر مکالمہ نہیں ہوتا۔ سبب یہ ہے کہ کوئی کسی کی زبان نہ سمجھتا ہے نہ سمجھنا چاہتا ہے۔

لیجئے وہ آہٹ پھر ہوئی، یہ کون ہے جو دن اور رات میں کئی بار آتا ہے اور بغیر دستک دیئے چلا جاتا ہے۔ آخر وہ دستک کیوں نہیں دیتا؟ میں نے کئی بار اس آہٹ پر دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ شاید میں ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں! مگر کچھ ذمے داری تو آنے والے پر بھی عائد ہوتی ہے، کسی دن اسے بھی تو دستک دے کر میرے آنے کا انتظار کرنا چاہیئے۔ وہ آہٹ جو ابھی ابھی آئی ہے مجھے کہہ رہی ہے تو کون ہے؟ یہ سوال میری زندگی میں پہلی بار اٹھایا گیا ہے۔ آج تک تو مجھے یقین تھا کہ اس کائنات میں کوئی شے ایسی نہیں جو مجھے نہ جانتی ہو! مگر اب معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک دھوکا تھا۔ دن میں کئی بار سُنی جانے والی آہٹ بھی مجھے نہیں جانتی، نہ جاننا چاہتی ہے۔ میں بھی شاید اسے جاننا نہیں چاہتا، اس لیے کہ میں اسے جانتا ہوں۔ میرے دل کے کسی گوشے میں کوئی آواز مجھے کہتی ہے کہ تم سب کو جانتے ہو کیونکہ پیدائش کے وقت تمہیں سب چیزوں کے نام بتا دیئے گئے تھے۔ میں تمام اشیا اور مظاہر کو حرفوں اور آوازوں کی وساطت سے جانتا ہوں۔ تمام حرف بھی تو آوازیں ہیں مگر کوئی آواز بھی حرف نہیں ہے۔ انسان نے آوازیں لکھنے کا فن ابھی تک نہیں سیکھا، وہ آوازوں کے گنبد میں قید ہے۔ اگر اسے آوازوں کو لکھنے یا سمجھنے کا فن آتا ہوتا تو وہ تہذیب کے اس چھلکے کو توڑ کر تازہ ہوا میں سانس لینے کے قابل تو ہو سکتا مگر یہ حصار ٹوٹے گا نہیں، آوازوں کے منظر بدلتے رہیں گے، دیواروں کے رنگ ضرور متغیر ہوں گے مگر دیواریں رہیں گی، آہٹیں آتی رہیں گی مگر دستک کبھی نہیں ہوگی، کوئی اگر یہ نہیں کہے گا کہ "میں ہوں!"

گھوڑا اور میں

شہزاد احمد

نہ جانے کیوں گھوڑا ایک مدت سے میرے سر پر سوار ہے۔ حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ گھوڑا بوجھ اٹھانے کے لئے ہوتا ہے۔ بوجھ بننے کے لئے نہیں! حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ زندگی میں کبھی میرا سابقہ گھوڑے سے نہیں پڑا اور نہ ہی میرے اور اس کے کوئی بلاواسطہ مراسم ہیں۔ مَیں نے گھوڑے کو ہمیشہ دور ہی سے دیکھا ہے، اکثر کسی گاڑی میں جُتے ہوئے گاہے گاہے کسی گھڑ سوار سمیت سڑک کی کچی پٹڑی پر بھاگتے ہوئے اور کبھی کبھار سرکس میں کرتب دکھاتے ہوئے، مجھے سرکس دیکھنے کا اتفاق ہی بہت کم ہوا ہے۔

مگر گھوڑے سے میرا تعارف بہت پرانا ہے۔ اپنی پیدائش سے لاکھوں برس پہلے مَیں اور گھوڑا کسی جنگل یا کھلے میدان میں ایک دوسرے سے ملے تھے، تب ہماری شکل و صورت بھی اب جیسی نہ تھی اگر وہ ملاقات مجھے ضرور یاد رہی۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ایسی یادداشتیں نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہیں اور ہم ہزاروں برس گذر جانے کے بعد بھی یہ دعوےٰ نہیں کر سکتے کہ ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے، اگر گھوڑے کا لاشعور ہو گا تو وہاں انسان کی حیثیت بھی ایک آرکی ٹائپ کی ہو گی مگر جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے مَیں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے خوابوں ہی میں نہیں ان کی تہذیب میں بھی گھوڑا اپنی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے۔ اس کے پاس وہ تمام قوتیں تو موجود رہی ہیں جو قدرت نے اس کو ودیعت کی تھیں مگر کچھ اضافہ حضرتِ انسان نے بھی کر دیا ہے۔ ہوائی گھوڑے کا ذکر تو آپ نے سُنا ہو گا، اساطیر میں ایسے گھوڑے بھی موجود ہیں جو باتیں کرتے ہیں اور انسان سے کہیں بہتر ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔

اب جبکہ گھوڑے کی اہمیت ہماری زندگی میں کم ہوتی جا رہی ہے، ہمارے خوابوں اور تخیلات میں گھوڑا اسی شان و شوکت سے موجود ہے بلکہ جہاں تک میرا معاملہ ہے گھوڑا میرے لئے کہیں زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ذاتی زندگی میں میرا گھوڑے سے تعلق صرف بچپن میں رہا جب میں اس پر تھوڑی بہت سواری کر لیتا تھا مگر اس کے بعد مَیں اسے ملنے کبھی ریس کورس تک بھی نہیں گیا۔ سنا ہے وہاں گھوڑا قسمتوں کا فیصلہ کرتا ہے، اس نے لاکھوں گھر اجاڑے اور سینکڑوں بنائے ہیں۔ مغربی ممالک میں گھوڑوں سے زیادہ تر بازی لگانے ہی کا کام لیا جاتا ہے مگر ہم اس سے بھی بے نیاز ہیں گھوڑا ہمارے لئے صرف تانگے یا گاڑی میں جوتنے کی چیز ہے یعنی اب ہم نے گھوڑے، خچر اور گدھے میں امتیاز کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اگر آج کی جوان نسل کے سامنے تینوں کو کھڑا کر دیا جائے اور یہ پوچھا جائے کہ ان میں سے گھوڑا کون سا ہے تو ممکن ہے تین نوجوان تین مختلف سمتوں میں اشارہ کر دیں۔

کسی نے سچ کہا تھا، انسان بے حد ناشکرا ہے۔ لاکھوں برس کی رفاقت کا صلہ اکثر سرد مہری کی صورت میں ادا کرتا ہے۔ اب تک وہ کئی جانوروں کی مکمل اور بعض کی جزوی نسل کشی کا مرتکب ہو چکا ہے اور گھوڑا ابھی کوئی استثنےٰ نہیں ہے۔ انسان کے لئے سب سے زیادہ اہمیت خود اسی کی

ذات کو حاصل ہے ایسے مقصودِ کائنات وہی ہو اچلئے اگر ایک لمحے کو یہ بھی فرض کر لیں کہ سب تخلیقات کا مقصد انسان ہی کی خدمت کرنا تھا تو بھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے جانداروں کو زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں۔ انسان ٹڈی دل کی طرح سارے کرۂ ارض پر پھیل گیا اور حتی المقدور اس نے کسی دوسرے کے لئے کچھ چھوڑا نہیں —— خدا کا شکر ہے ہم تیسری دنیا کے پس ماندہ ممالک ابھی تک گھوڑے سے تھوڑی بہت دوستی نبھا رہے ہیں دوستی بھی کیا ضرورت ہے جو رفاقت بنی ہوئی ہے ورنہ ترقی یافتہ ممالک میں تو گھوڑا محض قوت کی پیمائش کے کام آتا ہے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے اس موٹر کار کی قوت بیس گھوڑوں کے برابر ہے۔ یہ موٹر گھوڑے کی آدھی یا چوتھائی قوت کے برابر کام کرتی ہے۔

مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی قوت کا یہ پیمانہ بنایا گیا ہے۔ ماہرین کی رائے ہے کہ کوئی سے بھی دو گھوڑوں میں ایک جتنی قوت نہیں ہوتی، پھر آخر وہ کونسا گھوڑا تھا جس کو تمام گھوڑوں کا معیار مان لیا گیا۔ اب تو شاید یہ بھی کہا جا سکے کہ ریس کورس کے اس گھوڑے کی قوت دو گھوڑوں کے برابر ہے۔ ایک طرف تو گھوڑا محض پیمائش کا پیمانہ بنا اور دوسری طرف اس کے اور گدھے کے فرائض میں تفریق کم سے کم ہونے لگی۔ پہلے گھوڑا شاہوں کی سواری تھی۔ اس پر چڑھ کر وہ شکار کرتے تھے، منزلیں مارتے تھے اور جنگیں لڑتے تھے اور کبھی کبھی ان سے گر کر جان بھی دے دیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ خاندانِ غلاماں کے پہلے بادشاہ نے گھوڑے سے گر کر مرنے کی جو عظیم روایت بنا ہی تھی بعد میں آنے والے بادشاہوں نے اس پر عمل نہ کیا ورنہ انسانوں کی جان لینا بھی گھوڑے کے فرائض میں شامل ہو جاتا۔ پرانے ہندوستان میں مرنے کے کئی ایسے انوکھے طریقے اپنائے جا چکے تھے۔ عورتوں کا اپنے خاوند کے ساتھ ستی ہونا، مذہبی فریضے کے طور پر مہو کے پیاسے رہ کر مر جانا یا کسی سردار یا بادشاہ کے اشارے پر بے موت مرنا یا بغیر احتجاج کے تمام عمر زندہ درگور رہنا!

میں نے بات اس گھوڑے سے شروع کی تھی جو میرے خوابوں میں آتا ہے۔ مگر اس کا کچھ نہ کچھ موت سے رشتہ ضرور ہے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ موت کو سفید کپڑے میں لپیٹے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے ہی کی صورت میں دیکھا جائے۔ اگر موت کو سفرِ آخرت کہا جاتا ہے تو پھر وہ سفر پیدل طے ہونے سے رہا۔ اس سفر کے لئے گھوڑا کیسا رہے گا۔ خالی گھوڑا ویسے بھی سوار کی موت کا سمبل بن سکتا ہے مثلاً جب جنگ کے میدان سے گھوڑا بغیر اپنے سوار کے واپس آئے۔ میں نے خواب میں آنے والے گھوڑے کو ہمیشہ بغیر سوار کے دیکھا ہے مگر یہ جنگ کے بعد کا منظر نہیں بلکہ جنگ شروع ہونے سے پہلے کا لمحہ ہے، جب گھوڑا سوار کو لینے آتا ہے۔ وہ اس وقت رات بھر کی استراحت کے بعد بے حد تازہ دم ہے۔ اس لئے اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے، وہ بھاگنا نہیں اڑنا چاہتا ہے۔

ایک دن چند لمحوں کے لئے میں نے اس پر سواری کی تھی مگر اس وقت بہت اندھیرا تھا، ایسا اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے —— مجھے یہ تو لگا کہ وہ مجھے لے کر ایک غار نما راستے میں بہت دور تک نکل گیا۔ اتنی دور کہ میدان، صحرا، دریا اور آسمان سبھی ختم ہو گئے مگر میں ابھی پوری طرح سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اچانک سورج میرے سامنے آ گیا اور میری آنکھیں بری طرح چندھیا گئیں۔ پھر جب میں نے آہستہ آہستہ دیکھنا شروع کیا تو میں وہیں کھڑا تھا جہاں سے تاریکی کا سفر شروع ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید مجھے دھوکا ہوا ہے۔ میں نے خواب میں خواب دیکھ لیا ہے مگر میرا گھوڑا بری طرح ہانپ رہا تھا اور پسینے میں شرابور تھا۔ خود میرا انگ انگ تھکن سے چور چور تھا مگر سامنے لگے ہوئے کلاک کی سوئی بمشکل چند سیکنڈ آگے چلی تھی اور مجھ پر کئی جگ بیت گئے، کئی زمانے گزر گئے تھے۔

پھر میں اس خواب کو بھول گیا مگر مدتوں تک گھوڑے کی ٹاپ میرے کانوں میں آتی رہی۔ اس کا پسینے میں نہایا ہوا جسم میرے روئیں

دوبیش کو چھو کر تیزی سے گذرتا رہا۔ میں نے بیداری کے عالم میں گھوڑے کو قتل کرنے کی کئی کوششیں کی اور چند ایک میں کامیاب بھی ہوا مگر گھوڑا قتل کے بعد نیا سر اُگا لینے پر قادر تھا۔ وہ بار بار زندہ ہو جاتا اور مجھے دیکھ کر اتنی اپنایئت سے ہنہناتا کہ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا۔ میں اس کا قاتل ہوں اور وہ ہر قتل کے بعد مجھے زیادہ شدت سے چاہنے لگا۔ کیا گھوڑے کو وہ شعور نہیں دیا جا سکتا جو دوست دشمن میں امتیاز کرتا ہے؟ اگر ایسا ممکن نہیں تو کیا انسان اپنے اس شعور کو واپس نہیں کر سکتا جس نے اسے اوروں کا تو کیا اپنا بھی دوست نہیں رہنے دیا؟

اوراق کے اداریوں کا مجموعہ

پہلا ورق

مرتب

حیدر قریشی

جلد شائع ہو رہا ہے

منشا یاد | اُداسی

مَیں تنہائی اور یاسیت پسند نہیں ہوں۔ گھر کے لوگوں کے شور، رشتہ داروں کے [illegible] دوستوں کی پُر رونق محفلوں کو پسند کرتا ہوں اور ہنگاموں میں خوش رہتا ہوں لیکن جب مجھے کوئی تخلیقی کام کرنا ہو، لکھنے کے لیے ذہن میں [illegible] ح ہو گیا ہو، تب مجھے انڈا دینے والی مرغی کی طرح کسی تنہا گوشے کی تلاش ہوتی ہے۔

تنہائی کے علاوہ مجھے ایک خاص قسم کی اُداسی کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس میں مبتلا ہوئے بغیر میرا قلم اور ذہن رواں نہیں ہوتے البتہ کوئی چلتا سا مضمون، کوئی فرمائشی تقریر یا روایتی قسم کا سکرپٹ لکھنا ہو تو مجھے تنہائی اور اُداسی کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ مَیں بچوں کے شور اور دوسروں کی موجودگی میں بھی یوں قلم برداشتہ لکھ لیتا ہوں، جیسے دکاندار اپنے گاہک کو اس کی مطلوبہ چیز بغیر کسی دقت اور تاخیر کے تلاش کر دیتا بلکہ پڑیا میں باندھ کر دے دیتا ہے۔ لیکن تخلیقی کام کی ایک سطر لکھنے کے لیے بھی مجھے تنہائی کا انتظام اور اُداسی کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ اوّل تو اُداسی اس موضوع، خیال یا مواد میں پہلے سے موجود ہوتی ہے جو مجھے لکھنا ہوتا ہے کیونکہ کوئی خیال کسی زہریلے سانپ کی طرح کئی روز سے مجھے اندر ہی اندر ڈس رہا ہوتا ہے اور آخر کار تنہائی کے بستر پر لا ڈالتا ہے ورنہ پھر مَیں اُداسی میں مبتلا ہونے کی شعوری کوشش کرتا ہوں اور کتابوں خصوصاً شعری مجموعوں سے مدد لیتا ہوں یا پھر موسیقی سنتا ہوں کیونکہ موسیقی میں متاثر کرنے، تحریک پیدا کرنے اور اُداسی کی کیفیت پیدا کرنے کی بے حد صلاحیت ہوتی ہے۔

بعض سنگدل لوگ موسیقی کو ناپسند کرتے ہیں اور اُسے جذبات بھڑکانے کا الزام دیتے ہیں۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا گیا ہے کہ ؎
پیار نہیں ہے جس کو سُر سے وہ مُورکھ انسان نہیں۔ (ویسے اس مصرعے کا ایک دوسرا مطلب یہ بھی نکل سکتا ہے کہ جسے سُر سے پیار نہیں وہ انسان مورکھ نہیں ہوتا) لیکن میرا خیال ہے موسیقی جذبات کی تطہیر کرتی اور روح کو بالیدگی بخشتی ہے۔ اعلیٰ درجے کی موسیقی سُن کر آدمی کے اندر کا سارا میل دُھل سکتا ہے۔ البتہ روح حزن و ملال سے لتھڑ جاتی ہے جو تخلیق کاروں کو تخلیق پر مائل کرتی ہے۔ بعض گیتوں اور غزلوں کے الفاظ اور مفاہیم میں ملال چھپا ہوتا ہے۔ بعض طرزیں اور آوازیں ایسی ہوتی ہیں کہ سُن کر اندر تنور سا تپ جاتا ہے۔ شاید اُداسی میں نشاط کا کوئی پہلو چھپا ہوتا ہے کہ آدمی حزنیہ گیت سننے کی طرف مائل رہتا ہے۔ مَیں بعض اُداس گیتوں کو بار بار سنتا ہوں اور مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے سوئی ہوئی حسیات آہستہ آہستہ بیدار ہو رہی ہیں، دھندلے خیالات واضح ہوتے لگتے ہیں، اُداسی کے اندھیرے میں ذہن اَن دیکھی اور ان دیکھی چیزوں کی تصویروں کے پرنٹس بنانے لگتا ہے۔

موسیقی کے بعض آلات بھی اُداسی پیدا کرنے کی خاص صلاحیت رکھتے ہیں۔ مثلاً کون صاحبِ دل اور صاحبِ اولاد ایسا ہوگا جو شہنائی سُن کر

رخصتی کا دیکھا یا اَن دیکھا منظر دکھائی نہ دینے لگے اور اس کی روح پر اُداسی کا تنبو نہ تن جاتا ہو۔ اسی طرح سارنگی کی آوازیں آدمی کے اندر دھنس جاتی ہے جیسے سردیوں کی ہلکی بارش زمین میں۔ سارنگی سُن کر مجھے اکثر سلائی مشین میں کپڑے کی جگہ سلیقے چلے جانے کا احساس ہوتا ہے اس کے مقابلے میں وائلن سُن کر چیرے جانے کا — جیسے کوئی تیز اور لوچدار چیز جسم کے آرپار ہو رہی ہو بانسری کی آواز اُداسی کا مانجھا لگی وہ ڈور ہوتی ہے جو دل کی پتنگ کو دور کے ٹھمکے لگاتی ہے اور پیانو — مالنو۔ ملال کی گھنگھور گھٹا اُمنڈ آتی ہے، درد سرہانے آبیٹھتا ہے اور ہوکے بھرنے لگتا ہے — موسیقی کی کمپوزیشنوں میں بعض ساز اس سلیقے اور طریقے سے مناسب وقفوں کے ساتھ بجائے جاتے ہیں کہ سُننے والے کلیجہ مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ ستار دل پر پچھنے لگاتی اور طبلہ گُجھی چوٹوں کا احساس دلاتا ہے۔ بیچ بیچ میں کسی دوسرے ساز کی لے یا تان چاقو سا گھونپ جاتی ہے۔

موسیقی اور آلاتِ موسیقی کے علاوہ بھی بہت سی آوازیں ہیں جو اُداسی کا پیغام لاتی ہیں۔ مثلاً رہٹ کی رُوں رُوں، کولہو کے بیل کی گھنٹی، رات کو روتے کتوں کی آوازیں اور آپس میں لڑتی بلیو[illegible]ز۔ ٹھمری کی ٹھہر ٹھہر — سنسان دوپہروں میں جھینگروں کا شور اور فاختاؤں کی گُھگھو گُھو۔ کوئل کی آواز تو سرتا پا اُداسی کا گیت ہے۔ [illegible] کسی بچھڑے ہوئے کا انتظار نہ بھی ہو تب بھی کوئل کی پکار سُن کر اوروں کے بچھڑے ہوؤں کا خیال ہمیں اُداس کر دیتا ہے۔ جہاں تک م[illegible] بولنے والے کوّے یا کاگ کی آواز کا تعلق ہے اسے مہمان کی آمد کا سندیسہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں یہ کوّا نہیں بول رہا ہوتا ہماری اُداسی متشکل ہو کر منڈیر پر آبیٹھتی ہے۔ ہم اندر سے کسی مہمان کے لیے اُداس ہو چکے ہوتے ہیں اور کوّے کی صورت خود منڈیر پر بیٹھ کر اس کی یاد اور انتظار میں کائیں کائیں کر رہے ہوتے ہیں۔ مجھے تخلیقی کام کے لیے جس اُداسی کی ضرورت ہوتی ہے وہ بعض اوقات محض فراغت ہی سے میسر آجاتی ہے۔ فراغت کے لمحوں میں اُداسی مجھے خود بخود آگھیرتی ہے۔ کیونکہ اُداسی کو فرصت اور فراغت بہت عزیز ہیں۔ اس کے علاوہ اسے تنہائی سے بہت محبت ہے ضروری نہیں کہ یہ تنہائی جسمانی یا خارجی ہو اور نظر بھی آئے۔ آدمی ہجوم میں رہتے ہوئے بھی تو تنہا اور اکیلا ہو سکتا ہے اور آوازوں کے شور میں بھی تو سناٹا محسوس کر سکتا ہے۔ اور عزیزوں اور دوستوں کے درمیان بھی تو غیریت اور اجنبیت کا شکار ہو سکتا ہے۔

اُداسی دراصل اس وقفے کا نام ہے جب ہمیں کسی شخص، جگہ، چیز یا جذبے کی کمی محسوس کرنے کی فرصت ملتی ہے۔ اُداسی ہمیں اس سے ملاقات پر اُکساتی ہے۔ لیکن اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ضد کبھی نہیں کرتی۔ مطلوبہ شخص، جگہ، چیز یا جذبے کے نعم البدل پر اکتفا کر لیتی ہے خواہ اس کی نوعیت اصل سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو۔ درحقیقت اُداسی کا مقصد ہمیں پریشانی میں مبتلا کرنا نہیں ہوتا وہ ہمیں مصروف رکھنا چاہتی ہے یہی وجہ ہے کہ محض تلاش کے عمل ہی سے مل جاتی ہے۔ ہمیں الف آدمی کی کمی محسوس ہو رہی ہو اور ہمیں ب یا ج مل جائے اور ہم اس سے گپ شپ میں لگ جائیں یا اس کے ساتھ سینما دیکھنے یا تاش کی بازی لگانے پر مجبور ہو جائیں تو وہ بُرا نہیں مناتی بلکہ نہایت حوصلہ مندی اور خندہ جبینی سے موصوف کو برداشت کرتی رہتی ہے۔ بعض اوقات شخص کی جگہ چیز اور چیز کی جگہ کسی جذبے سے بہل جاتی ہے مثلاً الف کی بجائے ب یا ج سے ملاقات نہ ہو محض ہمیں اپنی کسی پسندیدہ کتاب یا کیسٹ کے خریدنے کا خیال آجائے یا کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے کہ ہم غصے، رنج یا خوشی سے دوچار ہو جائیں تو وہ دُور کھڑی تماشہ دیکھتی رہتی ہے اور جونہی ہمارا دل ان جذبوں سے خالی ہونے لگتا ہے وہ خلا کو پُر کرنے کے لیے فوراً آجاتی ہے۔ اُداسی سُونے پن اور خالی ہونے کے احساس کا نام ہے۔ اس کے مقابلے میں خوشی بھرے ہوئے ہونے کا احساس ہے۔ جب آدمی میلہ دیکھنے جا رہا ہوتا ہے تو اُس کی جیب روپوں سے اور دل امنگوں سے بھرا ہوتا ہے اسی لیے وہ خوش ہوتا ہے مگر جب وہ میلہ دیکھ کر لوٹتا ہے اُداسی اس کا گھر تک پیچھا کرتی ہے۔

خوشی کا تعاقب کرنا اُداسی کی پُرانی عادت ہے جونہی کوئی آدمی چند کلیاں نشاط کی چُن لیتا ہے وہ اسے محوِ یاس کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہنسنے، قہقہے لگانے اور خوشی منا لینے کے بعد جب ہمارا اندر ویران ہونے لگتا ہے تو وہ کسی کونے میں اپنی دھونی رَما دیتی اور ساری خالی جگہوں

کو کسیلے دھوئیں سے بھر دیتی ہے۔

بیزاری، بیکاری اور بیماری، اداسی کی ہم جولیاں ہیں لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کی ہم جولیاں ایک ایک کر کے چلی جاتی ہیں مگر وہ کسی اداس دل کے آنگن میں اکیلی دیر تک کھیلتی رہتی ہے۔

یاد اور یکسانیت سے اُداسی کا گہرا رشتہ ہے ایک جیسی صورت حال اور روٹین، اوّل اوّل اکتاہٹ اور آخر کار اُداسی پیدا کرتی ہیں۔ عام آدمی اس یکسانیت سے بچنے کے لیے کسی سے لڑ پڑتا ہے جس سے لڑائی ہو اس سے صلح کر لیتا ہے۔ عورتیں اُداس ہو جائیں تو عام طور پر ان کو چپ لگ جاتی ہے بچے تواتر اور یکسانیت سے اُکتا کر اُداس ہو جائیں تو رونے لگتے ہیں۔ گلوکار ریاض میں معروف ہو جاتا ہے۔ فنکار تخلیق میں اور پنجرے میں بند تیتر زور زور سے بولنے لگتا ہے۔

بعض لوگ طبعاً اُداسی پسند ہوتے ہیں بعض لوگ خصوصاً خوبصورت لڑکیاں اتنی حساس ہوتی ہیں کہ محض اُداسی کا خیال کر کے اُداس ہو سکتی ہیں۔ ویسے بھی اُداسی اُداس کر دینے والا لفظ ہے۔ بعض چیزوں اور جگہوں سے اُداسی کو خاص نسبت ہوتی ہے۔ سمندر کو دیکھ کر میں فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس میں پانی زیادہ ہے یا اُداسی —— اُداسی کو مجرّ خراب دیکھنا ہو تو اندھیری رات میں پہاڑ کی ڈھلوانوں پر دیکھا جا سکتا ہے۔

بگولے، ویرانوں، صحراؤں اور کلّر زمینوں کی اُداسی کا اظہار ہوتے ہیں۔ قبرستان اُداسی کا جنرل بس اسٹینڈ ہوتے ہیں۔ جہاں سے ہر سمت کو اُداسی کی لاریاں چلتی ہیں۔ چھوٹی بڑی قبریں اُداسی کے ڈھیر ہوتے ہیں، اُداسی یہاں کتبوں پر لکھی ہوتی ہے، گھاس کی صورت اگی ہوتی ہے، دیئوں کی صورت جلتی اور اگربتیوں کی صورت سلگتی ہے۔ خوبصورتی کو دیکھ کر بدصورتی کا احساس اُداسی پیدا کرتا ہے۔ کرایہ نہ ہو تو قریب سے گزرنے والی بسوں اور ویگنوں کا نام اُداسی ہے، جیب خالی ہو اور آدمی میلے یا بازار میں گھوم رہا ہو تو اُداسی بوند بوند اس کے اندر ٹپکتی رہتی ہے۔

اُداسی غربت اور افلاس کا نام ہے، محرومی اور بے بسی کا نام ہے، ہاتھ نہ پہنچنے کا نام ہے۔ بیمار آدمی کے لیے اُداسی لمحہ لمحہ آسمان سے اُترتی رات کا نام ہے۔ شبِ وصل میں سحر کے گجر کا نام اُداسی ہے۔ اُداسی بیوہ عورت کی مانگ اور کلائی ہے۔ رنج بیماری ہے، غم مصیبت ہے، اُداسی ہلکے درجے کا بخار ہے۔ اُداسی کا بیماری سے قریبی تعلق ہے۔ جب آدمی گھر سے دُور ہو اور اُسے گھر کی یاد ستانے لگے تو اُسے ہوم سکنس کہتے ہیں لیکن جب گھر میں رہتے ہوئے اُداس ہو تو اسے سکنس ایٹ ہوم کہنا چاہیے۔

اگر خوشی کو چاندنی، غم کو بارش، صدمے کو ژالہ باری اور پریشانی کو آندھی قرار دیا جائے تو اُداسی کو وہ حبس قرار دینا ہوگا جو گرمیوں میں بارش کے بعد پیدا ہو جاتا ہے۔ اُداسی دراصل روح کا حبس ہی تو ہے جو یادوں کے جھونکوں سے اور بڑھ جاتا ہے۔

مجھے احساسِ حسن اُداس کر دیتا ہے کبھی نارسائی اور کبھی ناپائیداری کے خیال سے۔ شام کو بسیروں کی تلاش میں اڑتے پرندوں کو دیکھ کر میں اُداس ہونے لگتا ہوں۔

چلتی چکی کو دیکھ کر کبیر رو پڑے تھے میں چلتی ریل گاڑی دیکھ کر اُداس ہو جاتا ہوں۔

اُداسی مرجھائے ہوئے پھولوں کا نام ہے۔ اُداسی قوا کے اضمحلال کا نام ہے۔ اُداسی باسی پن کا نام ہے۔ زرد پتوں اور ٹنڈ منڈ درختوں کا نام اُداسی ہے۔ اُداسی آکاس بیل ہے، موسم سرما کی دھوپ ہے، ڈار سے بچھڑی کونج ہے۔ اُداسی دوستوں کی بے وفائیوں اور سرد مہریوں کا نام ہے۔ اپنوں کے رنج اور غیروں کی خوشی کا نام اُداسی ہے۔ جب دل اُداس ہو شہر سائیں سائیں کرتا ہے اور جب دل سائیں سائیں کرتا ہو تو شہر اداس لگتا ہے۔ اُداسی میری روح کو برتا کر مجھے تخلیق پر اُبھارتی ہے۔ اُداسی وہ ہری بھری شاخ ہے جس پر فن کا پھول کھلتا ہے۔

جب مجھے تخلیقی کام کرنا ہو مجھے تنہائی کے علاوہ ایک خاص قسم کی اُداسی کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور میں کہ محفلوں اور ہنگاموں کا دلدادہ ہوں تنہا گوشے تلاش کرتا ہوں، جب میں لکھنے میں مصروف ہوتا ہوں تب میں اور اُداسی ایک ہی پنجرے میں بند ہوتے ہیں۔

اُداسی تخلیقی عمل کی روح ہے۔

کائنات ایک عظیم تخلیق کار کی اُداسی کا اظہار ہے جو لامتناہی تسلسل اور یکسانیت سے پیدا ہوئی ہوگی۔ اور جب تک سب سے بڑا تخلیق کار آنکھوں سے اوجھل ہے تخلیق کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

ایک مجلّہ ——— ایک رجحان

تحریریں

نئی اور پرانی آوازوں کا امتزاج
زندہ تحریروں کا امین
جاندار ادیبوں کا نقیب

مدیران

حفیظ صدیقی
زاہدہ صدیقی

زرِ سالانہ	قیمت عام شمارہ
۱۵۰ روپیہ	۱۰ روپے

ماہنامہ "تحریریں" چوک اُردو بازار، لاہور

انتظار کا موسم

صابر لودھی

انتظار کی کیفیت عجیب ہے۔ انسان کو پتا نہیں چلتا اور اس کی زندگی کا بڑا حصہ اسی کیفیت میں کھوئے کھوئے ختم ہو جاتا ہے۔ مجھے شاید اس کا احساس نہ ہوتا لیکن ایک دن میری ملاقات ملتان کے ایک دیوانے سے ہو گئی۔ یہ دیوانہ اب اس دنیا میں نہیں ہے لیکن جب تک وہ زندہ رہا اُس نے اپنے گھر کے کواڑ کبھی بند نہ ہونے دیئے۔ کوئی ملنے آتا تو کہتا "دروازہ بند نہ کرنا۔ وہ ابھی آئے گی۔" مجھ سے بھی اس نے یہی کہا "میں ایک کام سے باہر جا رہا ہوں، دروازہ کھلا رکھنا۔" اُس کے عزیزوں نے بتایا کہ قیامِ پاکستان کے وقت اسے کسی کا انتظار تھا۔ اُس نے آنے کا وعدہ کیا تھا اور اس نے اپنا دروازہ کھلا رکھا تھا۔ بہت سے دروازے بند ہوئے۔ بہت سے طوفان اُٹھے مگر اس نے انتظار کے اس لمحے کو اپنی ذات میں اتار کر ہر چیز سے بے نیازی اختیار کر لی۔ اس کے لئے یہ لمحہ زندان کا لمحہ ثابت ہوا۔

دانائی کی بہت سی باتیں ہم نادانوں سے سیکھتے ہیں۔ مَیں نے بھی اس دیوانے سے انتظار کے معنی سیکھے۔ دروازہ کھلا رکھنے کی تمنا ابنِ انشاء نے بھی کی تھی لیکن یہ دروازہ محبوب کا تھا۔ دیوانے نے یہ نکتہ سمجھایا کہ دروازہ اپنے دل کا کھلا رکھو۔ ہم اپنے کواڑ بند کر کے دوسروں کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں اور پھر اُن کے کھلنے کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔

ہم اہلِ انتظار کے آہٹ پہ کان تھے
ٹھنڈی ہوا تھی، غم تھا ترا، ڈھل چکی تھی رات

یہ اندازِ فکر مشرقی مزاج کا خاصا ہے۔

ہر قوم اپنے مزاج سے پہچانی جاتی ہے۔ بہت سی متمدن اقوام انتظار کے مزے نہیں لیتیں۔ ایسی قوموں کے افراد نہ ٹھنڈی ہوا کا لطف حاصل کر سکتے ہیں نہ انہیں رات کے ڈھلنے اور آہٹ کے ترنم کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تو چاند کو مسخر کرنے اور زہرہ پر کمند پھینکنے کی تدابیر کرتے نظر آتے ہیں۔ میرا خیال ہے اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ ساری خرابی اُن کی علم دوستی اور موسمی حالات کی ہے۔ موسموں کی یکسانیت ان میں یکسوئی پیدا کرتی ہے اور علم کی لگن انہیں آگے بڑھنے کی تحریک دیتی ہے لیکن ہمارا اوڑھنا بچھونا انتظار ہے۔ گرمیاں آتی ہیں تو تپش اور گھٹن سے گھبرا کر ہم سردیوں کی آمد کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ سردیاں آتی ہیں تو حرارت کی تلاش میں ہم اِدھر اُدھر بھاگنے لگتے ہیں یا بدلتے موسم کا انتظار حاصلِ حیات ٹھہرتا ہے۔ کام نہ موسمِ گرما میں ہوتا ہے نہ سرما میں۔

ہمارے اس مزاج نے ہمیں زندگی کے ہر مرحلے پر انتظار کا عادی بنا دیا ہے۔ مہد سے لحد تک ہم انتظار کی آغوش میں ہی سمٹے رہنا چاہتے ہیں۔ کسی بچے کی پیدائش پر خوشی کا جو اظہار کیا جاتا ہے وہ دراصل اس بچے کو انتظار کی دنیا میں داخل کرنے کی بسم اللہ ہوتی ہے۔ پانچ سال کی عمر

تک وہ کسی اچھے سکول میں داخلے کا انتظار کرتا ہے۔ داخلہ ملتا ہے تو وہ اس انتظار میں کھو جاتا ہے کہ علم کا کوئی جملہ اُس کے کانوں تک بھی پہنچے سکول سے فارغ التحصیل ہونے سے پہلے وہ دیر تک اپنے نتیجے کا انتظار کرتا ہے اور اب تک جو پڑھا ہوتا ہے اُسے بھلانے کی کوشش کرتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی انتظار اس کا دامن نہیں چھوڑتا۔ اچھی ملازمت کے انتظار میں کتابوں سے زیادہ اشتہاروں کی زبان دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ ملازمت ملتی ہے تو اچھی اور دولت مند بیوی کا انتظار شروع ہو جاتا ہے اور پھر اپنی کیفیت اپنے بچوں کی جھولی میں ڈال کر وہ اُن کے روشن مستقبل کا انتظار کرنے لگتا ہے۔

انتظار کے یہ طویل سلسلے ہمیں قومی سطح پر ہر وقت مضطرب رکھتے ہیں۔ کام کرنے کے لئے یک سوئی اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔ یکسوئی تو ہمارے معاشرے میں ناپید ہے اور لگن اُس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک ہم کچھ عرصے کے لئے طلائی ویزی سے بے نیاز نہ ہو جائیں۔ انتظار کی کیفیت سے شاعروں کے طبقے کو خاص فائدہ پہنچا ہے۔ شاعر "انتظار کے موسم" میں بہاروں کے سپنے دیکھتے اور اپنی ناآسودہ تمناؤں کی تکمیل خیالوں میں کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک انتظار کی صورت صبحِ بنارس یا شامِ اودھ سے کسی طور کم نہیں لیکن معاشرہ کا ہر فرد تو اتنا توانا نہیں ہوتا کہ محض قوتِ متخیلہ سے کام لے کر زندگی کے کوہِ گراں سے دودھ کی نہریں نکال سکے۔

انتظار کا موسم تو عام لوگوں کے گرد بے عملی کا حصار کھینچ دیتا ہے۔ ہمارے ہاں دانش وروں اور اچھے لوگوں کی اسی لئے کمی ہے کہ ہم اپنی اچھائیوں سے کام لینے کے بجائے اچھے لوگوں کے سامنے آنے کا انتظار کرتے ہیں۔ الیکشن ہوتے ہیں یا قیادت کا بحران پیدا ہوتا ہے تو وہی لوگ سربلند ہوتے ہیں جو انتظار کی کشمکش میں مبتلا نہیں ہوتے۔ آگے بڑھ کر خود ہی مینا اٹھا لیتے ہیں۔ ہواؤں میں، فضاؤں میں اور سمندروں میں انہیں کی حکمرانی ہوتی ہے۔ یہ لوگ مثبت و منفی قدروں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ ان کی حرکت ہی ان کی قدر ہے۔ انتظار کرنے والے انہیں اپنا پیشوا تسلیم کر لیتے ہیں اور پیشوا اپنے عوام کی کلاس بدلنے کے بجائے اپنی کلاس بدلتے رہتے ہیں کہ فرد کی تبدیلی میں زیادہ محنت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پوری قوم کا مزاج تو کسی انقلابی رویے ہی سے بدل سکتا ہے اور انتظار کرنے والے اپنے اندر انقلاب لاتے ہیں نہ باہر نہیں۔ حالی نے اسی نکتے کو اپنے انداز میں سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

بہت سے کھو دیئے غلمان بے نوائی نے
ضرورت ایک کے بعد ایک طلق جاتی ہے

انتظار کی کیفیت نے تاریخ کے اوراق کو بھی رنگین بنایا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے موقعہ پر ابو ظفر بہادر شاہ کسی غیبی فیصلے کے انتظار میں تھے۔ انقلاب تو عظیم کے دروازہ پر دستک دے رہا تھا۔ ایک انقلابی جرنل بخت خان کے روپ میں ایک اہم فیصلے کا منتظر تھا۔ دروازہ کھول دیا جائے یا بند کر دیا جائے، بس یہی طے کرنا تھا لیکن انتظار کے لمحے طویل ہو گئے۔ انقلاب کا دروازہ بند ہو گیا۔ غلامی کی چور دروازے والی سرنگ کھل گئی اور شہنشاہ نے زندوں کی بستی چھوڑ کر شہرِ خموشاں کے ایک مزار میں پناہ لی۔ وہاں کیا فیصلہ ہوتا۔ شہرِ خموشاں کی مخلوق نے تو اپنے سارے فیصلے قیامت کے انتظار میں اُٹھا رکھے تھے۔

زندہ قومیں انتظار کی کیفیت کو کرب سمجھتی ہیں کیوں کہ انتظار سے دفاع تو شاید ہو سکے تسخیر ممکن نہیں۔ تسخیر کے لئے تو آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ رزم گہِ حیات میں جد و جہد کرنا پڑتی ہے۔ ایسے معرکوں میں انتظار کو ایک چال سمجھ کر قبول کیا جاتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں چرچل نے بعض فیصلوں میں اس لئے تاخیر کی کہ اُسے خبر تھی کہ کچھ دن انتظار کرنے سے جرمن قوم کی معاشی حالت بگڑ جائے گی۔ اور معاشی طور پر پسماندہ

قوم کو زیر کرنے میں دیر نہیں لگتی اور ایسا ہی ہوا۔ انتظار کا موسم اتحاریوں کے لئے فتح کی خوشبو لایا لیکن ہمیں کیا؟ ہم تو تاریخ کے نتائج کا بار بار انتظار کرتے ہیں۔ شاید اس بار تاریخ کا عمل کچھ مختلف نتائج نکالے۔

ہم شاید ازل ہی سے انتظار گاہ میں مقیم ہیں مگر ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے بڑی بڑی خوشیوں کے انتظار میں چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا انتظار کرنا چھوڑ دیا ہے۔ بڑے بڑے خوابوں میں مبتلا ہو کر چھوٹے چھوٹے خواب دیکھنے ترک کر دیئے ہیں۔ حالانکہ سارا مزہ چھوٹے چھوٹے خوابوں میں ننھی منی کامیابیوں میں ہے۔

بہر حال میں مطمئن ہوں کہ ہم لوگوں کو LOTUS EATERS کی طرح کھوئے رہنے یا سوئے رہنے کی عادت پڑ چکی ہے۔ کبھی کبھی تو میں یوں بھی سوچتا ہوں کہ کھونے اور سونے اور نہ آنے والے کا انتظار کرنے میں جو سکون اور شانتی ہے وہ نبرد آزما ہونے میں کہاں؟ زندگی کے طوفان میں ڈٹ کر کھڑا ہونے سے ٹوٹنے کا خطرہ ہوتا ہے اس لئے نرم ٹہنی کی طرح جھک جانے اور سمٹ جانے اور اچھے دنوں کا انتظار کرنے میں سلامتی ہے۔ وقت کا سیلاب خود بخود ہمیں کنارے پر پھینک دے گا۔ ہمارے لئے تو شاعر کا وہ ہی انقلاب کا رویہ ہے کہ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے۔ اس نفسا نفسی کی دنیا میں کوئی تو ہو جو انتظار کا لطف لے، ننھے منے خواب دیکھے، معصوم آرزوؤں سے کھیلے، پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹ کر رکھ دے۔

معروف شاعر رام ریاض کا پہلا شعری مجموعہ

"پیڑ اور پتے"

(زیرِ طبع)

اینٹی میٹر

تقی حسین خسرو

یہ ایک خالص سیاسی اصطلاح معلوم ہوتی ہے۔ بالکل اُسی طرح شعریت سے عاری، بے رحم حقیقت کی حامل اور اپنے تاثر میں بے انتہا شدید! بلکہ سچ پوچھیے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ کوئی سیاسی اعتبار سے سخت ناراض لوگوں کا ایسا گروہ ہو جو اپنے حریف سے اُس کو نیست و نابود کر دینے کی شرط سے کم پر مصالحت کرنے کو بالکل تیار نہیں۔ چنانچہ اس اصطلاح کے کان میں پڑتے ہی ناک میں بارود کی بُو در آتی ہے اور آنکھیں سینما کے اسکرین پر ـــــ نہیں اب وہ آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے۔ گھر کے کسی پُرتکلف کمرے میں بڑی احتیاط سے میز پر رکھے خود کار رنگین ٹیلی ویژن کے منی اسکرین پر جنگ کا ہولناک منظر دیکھنے لگتی ہیں ـــــ رنگین ٹیلی ویژن پر خون زیادہ رنگین نظر آتا ہے ـــــ دوسری جنگِ عظیم کی قلم ! ـــــ یہ انٹی اور پرو کی اصطلاحیں دوسری جنگِ عظیم کے نتیجے کی ہی پیداوار ہیں۔ اور آپ اور میں اُس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو خوش قسمتی سے (یہ خوش قسمتی آپ کے ساتھ نہ سہی میرے ساتھ تو ہمیشہ ہی سے رہی ہے) اس عظیم جنگ کے بعد پروان چڑھی ہے۔ خوش قسمتی اس لیے کہ بصورتِ دیگر آپ نہ سہی میں ضرور اس جنگ میں کام آ چکا ہوتا۔ ویسے جنگ میں کام آنا ناکام ہونے کو کہتے ہیں۔ بالکل اُسی طرح جیسے زبنے دودھ کو کھویا کہتے ہیں! ـــــ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ پرو اور اَنٹی کی اصطلاحیں دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہمارے ساتھ ساتھ اُسی طرح پروان چڑھی ہیں جیسے چنبیلی کی بیل منڈوے کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی ہے اور پھر وہ اُس پر چھا جاتی ہے۔ چنانچہ دیکھیے ہم کسی بھی مسئلے کے بارے میں اَنٹی یا پرو ہوئے بغیر سوچ ہی نہیں سکتے۔ اور یہ اَنٹی میٹر کی اصطلاح ہماری اسی سوچ کی انتہا کو ظاہر کرتی ہے کہ کبھی وہ ہم ہی تھے جو میٹر کی ہمیشگی کے قائل تھے اور اس طرح اپنے آپ کو فانی اور اُسے غیر فانی سمجھتے تھے۔

سیاست ہی کے حوالے سے یہ کائنات اپنی تمام لامحدودیت کے باوجود ایک ایسے محدود اسمبلی ہال سے مشابہہ لگتی ہے جس پر گو جمہوری اصولوں کے مطابق مگر ایک عرصے سے ایک ہی اکثریتی پارٹی یعنی میٹر کی حکومت ہے جس نے اپنی اسٹیم رولر اکثریت کے بل بوتے پر اقلیتی پارٹی یعنی اَنٹی میٹر کو آج تک سر اُٹھانے تک کا موقع نہیں دیا ہے۔ اب ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس اکثریتی پارٹی نے اپنی اکثریت کو برقرار رکھنے کے لیے غیر جمہوری طریقے استعمال نہیں کیے۔ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ جہاں واٹر ہوتا ہے وہاں واٹر گیٹ بھی ہوتا ہے۔ ایسا ہونا ناگزیر بھی ہے کہ اقتدار کسے پیارا نہیں ہوتا۔ اپنا وطن تو پیارا ہوتا ہی ہے۔ مگر ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ ایک پارٹی کی حکومت ہمیشہ قائم رہے گی۔ چالیس برس میں تو گُورا گھر کے دن بھی پھر جاتے ہیں۔ اور اگر ایسا ہوا تو موجودہ اکثریتی پارٹی کے ارکان کس بلیک ہول میں اپنے منہ چھپاتے پھریں گے؟

اَنٹی میٹر کی اصطلاح ذہن میں اپنے ساتھ، اس لڑکے کی یاد تازہ کر دیتی ہے جو باقی لڑکوں سے قطعی مختلف تھا اور اسکول کے مروجہ اصولوں اور قواعد سے اس حد تک بے زار کہ محض اس کی موجودگی اسکول کی اخلاقی بنیادوں کے لیے خطرہ سمجھی جاتی تھی۔ مگر وہ لڑکا ہر کلاس میں اپنے اساتذہ کی توجہ کا مرکز ہوتا جب کہ باقی لڑکے فرائض کے غیر ملکی محنت کشوں کی طرح یا خدائے ذوالجلال کے فرماں بردار فرشتوں کی طرح بے چہرگی کا شکار نظر آتے تھے۔ یہی اصطلاح کبھی

ذہن میں دیوار پر لکھی اُس تحریر کی طرح اُبھر آتی ہے جس میں میٹر (مواد) کچھ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس کے پڑھنے سے ذہن سے اگلی پچھلی تمام تحریریں یک لخت مٹ جاتی ہیں۔ اور کبھی یہی اصطلاح ایک ایسی کتاب کے دلکش ٹائیٹل اور قیمتی کاغذ کی یاد دلاتی ہے جس میں میٹر نہیں ہوتا۔ یہی اصطلاح اُس وقت بھی ذہن میں گونجنے لگتی ہے جب کوئی آگے ہی سمت کی دولت سے مالا مال صنفِ نازک کار پر بیٹھی، صوفے پر لدی یا کسی چاٹ والے کے ٹھیلے کے ساتھ پوری ڈھٹائی سے کھڑی، دونوں کلّوں سے پوری یکسوئی کے ساتھ اُلا بلا کھانے میں مصروف نظر آتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں غالب کا "لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی" والا مصرعہ اس صنفِ نازک کے بارے میں اپنے کسی اسی قسم کے تجربے کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ لگتا ہے غالب صنفِ نازک ہی کے حوالے سے اینٹی میٹر کی ایک موہوم سی آرزو رکھتا تھا۔

ذرا غور کیجئے تو ادب میں بھی اینٹی میٹر کا کوئی تصور شروع ہی سے موجود رہا ہے۔ ہمارے بعض جغادری قسم کے ادیبوں نے اس کا تصور بہت سوچ سمجھ کر قائم کیا تھا۔ وہ اپنی بات 'انکار' (اخبار کی سُرخی کی طرح ممکنہ جلی حروف میں) سے شروع کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے 'اقرار' کرنے والوں کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ آخر میں وہ بھی بہت دھیمے لہجے میں 'اقرار' کر لیا کرتے تھے۔ لیکن اُن کی اس 'انکار' کا انہیں وہی صلہ ملا جو عام طور پر ایک عاقبت نا اندیش کو اپنے اعمال کا ملا کرتا ہے۔ اُن کی اس 'انکار' نے گونج پیدا کی۔ ویسی ہی گونج جیسی ہائیڈروجن کے ایٹم کے ٹوٹنے سے پیدا ہوتی ہوگی۔ چنانچہ اس گونج نے ہر صاحبِ سماعت کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ اور پھر اُس وقت تک متوجہ کیے رہی جب تک کسی اور گونج نے بیچ میں مداخلت نہ کی۔

کبھی آدمی اپنے ساتھ اپنا ایک ہمزاد لے کر پیدا ہوتا تھا۔ ہر ایک کا ہمزاد علیحدہ ہوتا۔ جتنے آدمی اتنے ہی ہمزاد! شکر ہے کہ اب ان ہمزادوں نے پیدا ہونا بند کر دیا ہے۔ یا شاید یوں ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے پیشِ نظر خود ہم نے اپنا ہمزاد اپنے ساتھ لے آنا بند کر دیا ہے۔ ورنہ غور کیجئے ہمارے مُلک کی آبادی اس وقت تقریباً نو کروڑ نفوس پر نہیں بلکہ اٹھارہ کروڑ نفوس پر مشتمل ہوتی۔ اور ہمارے دوست مُلک چین کی آبادی سو کروڑ نہیں بلکہ دو سو کروڑ نفوس پر مشتمل ہوتی۔ اسی طرح وہ ممالک جو اپنے وسیع رقبے اور کم آبادی کی بنا پر کسی لق و دق حویلی کی طرح لگتے ہیں اور جن کے مکین تنہائی کا شکار دور افتادہ پیڑوں کی طرح ہیں وہ چھوٹے چھوٹے مکانوں کی طرح بھرے پُرے نہ سہی تو آباد ضرور لگتے۔ مگر آبادی بڑھانے کا یہ نہایت آسان طریقہ اب بھلا دیا گیا ہے۔ کیونکہ اب دنیا نے خوش حالی کے اس مخفی راز کو پا لیا ہے کہ جتنی کسی مُلک یا کسی گھر کی آبادی کم ہوگی اتنی ہی خوش حالی زیادہ ہوگی۔ چنانچہ خوش حالی کے حصول کی بڑھتی ہوئی تمنا ہی نے انسان کو اینٹی میٹر کا تصور عطا کیا ہے۔ اور انسان اس دن کے خواب دیکھا کرتا ہے جب اینٹی میٹر، میٹر کے مقابل آ جائے گا۔ اور پھر —— چہار طرف خوش حالی ہی خوش حالی ہوگی!

سچ پوچھئے تو جس دن سے اینٹی میٹر کے بارے میں پڑھا ہے، ایک عجیب اُلجھن میں گرفتار ہوں۔ کیونکہ میٹر اور میٹر کا فرق تو سمجھ میں آتا ہے کہ میٹر چاہے کسی شکل میں ہو جگہ گھیرتا ہے، وزن رکھتا ہے، بڑھتا ہے، گھٹتا ہے، خوبصورت بھی ہوتا ہے اور بدصورت بھی! کرخت بھی ہوتا ہے اور نازک بھی! حد یہ کہ پھول بھی ہوتا ہے اور پتھر بھی! مگر میٹر اور اینٹی میٹر کا فرق باوجود کوشش کے سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا اینٹی میٹر بھی اپنے حریف میٹر کی طرح جگہ گھیرتا ہے اور وزن رکھتا ہے۔ اور اگر نہیں تو اینٹی میٹر میں پھول اور پتھر کا اور کرخت اور نازک کا فرق کیسے ہوتا ہوگا! پھر خیال آتا ہے کہ یہ اینٹی میٹر اور میٹر دراصل خیر و شر کے خارجی مظاہر ہیں۔ ان کا تعلق تو انسان کے داخل سے ہے۔ ہر انسان اپنی جگہ ایک کائنات ہے۔ بالکل اُسی طرح بے نہایت وسعتوں کا حامل! جب تک اس کائنات میں خیر اور شر، میٹر اور اینٹی میٹر کی طرح ایک دوسرے سے الگ ہیں تو امن و امان قائم رہے گا۔ مگر —— اُس دن کیا ہوگا جب دونوں ہی طاقتیں ہم پلّہ ہو کر ہیوی ویٹ باکسرز کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گی! شاید اس دن پوری کائنات ہی بھک سے اُڑ جائے۔

صفر

انجم نیازی

جب کسی خط کا ایک سرا قوس سی بناتے ہوئے اس کے دوسرے سرے سے جا ملے تو عرفِ عام میں اُسے صفر کہا جاتا ہے۔ یہ دائرہ بیج جتنا چھوٹا ہو خواہ پورے کرۂ ارض سے بڑا، اس کی صفریت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گنتی کا کوئی مسئلہ اس کے بغیر حل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بغیر نہ گنتی شروع ہو سکتی ہے نہ ختم۔ ایک کے عدد سے پہلے بھی صفر آتا ہے، اور ایک سو کھرب کے آخر میں بھی صفر ہی آتا ہے۔ گنتی کی کوئی حد صفر سے آگے جا کر ختم نہیں ہوتی اور نہ کوئی حد اس سے پہلے شروع ہوتی ہے۔ کوئی طالبِ علم کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو، کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں صفر سے اُس کی بالمشافہ ملاقات ہو کر ہی رہتی ہے۔ کبھی احساسِ برتری کے ساتھ اور کبھی احساسِ کمتری کے ساتھ! صفر کے ساتھ میری ذات کا تعلق بلکہ بے تکلفی بہت پرانی ہے۔ اسی دیرینہ قرابت کی بنا پر میں علامہ مشرقی بنتے بنتے رہ گیا۔ میں زندگی کی ہر سطح پر کبھی شعوری طور پر اور کبھی لاشعوری طور پر صفر کے ارد گرد گھومتا رہا ہوں۔ اور صفر بھی میرے احترام میں میری ذات کا طواف کرتا رہا ہے۔ میری ذات صفر سے اور صفر مری ذات سے کئی ظاہری اور کئی باطنی مماثلتیں رکھتا ہے۔ مری ذات کا دائرہ صفر کی طرح میرے داخل کو گھیرے ہوئے ہے۔ جس نے مجھے دو حصّوں میں بانٹ رکھا ہے۔ ذات کے دائرہ کے اندر میرا داخل اور اس کے باہر میرا خارج ہے۔ میری ذات کے یہ دونوں ٹکڑے ناقابلِ تقسیم ہیں جو پہلے سے طے شدہ فاصلے برقرار رکھتے ہیں۔ صفر میرے فلسفۂ حیات کی معنوی شکل ہے۔ یہ میرا ہم راز بھی ہے اور ہم زاد بھی۔ میں نے پہلا سانس بھی اس کی رفاقت میں لیا تھا اور آخری سانس بھی اس کی رفاقت ہی میں لوں گا۔ جس دن میرا داخل صفر کا حصار توڑ کر میرے خارج سے ہمکنار ہو گیا اُس دن میری اور اس کی رفاقت کا سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔ یہ محدود اور میں لامحدود ہو جاؤں گا۔

جس طرح عقاب پرندوں کی دنیا میں درویش تسلیم کیا جاتا ہے اسی طرح ریاضی کی دنیا میں صفر کو بھی صوفی اور مجذوب کی حیثیت حاصل ہے جو ہر وقت جذب کی کیفیت میں ڈوبا رہتا ہے، اور اکثر دوسرے ہندسوں کی عددی حیثیت میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ مگر اپنی شخصیت کو صفر تک ہی محدود رکھتا ہے۔ صفر کو صفر سے ضرب دیں، صفر کو صفر پر تقسیم کریں، صفر کو صفر میں جمع کریں، صفر سے صفر کو منفی کریں، آپ کو صفر ہی حاصل ہو گا۔ اسے انسانوں کے جھوٹے وقار، جھوٹی شہرت اور چھوٹے مقام سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمہ وقت دوسروں کے کام آتا ہے، دوسروں کی مشکلیں آسان کرتا ہے، اور اپنی کوئی مشکل کسی کے پاس لے کر نہیں جاتا۔ یہ اگرچہ مذکر ہے مگر کچھ لوگ اسے مؤنث بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو تذکیر و تانیث کے جھگڑوں میں ملوث نہیں کرتا۔ پھول کی طرح اسے جس نام سے بھی پکارا جائے، اس کی انفرادیت ختم نہیں ہوتی۔ ایک سے نو تک ہر ہندسے کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مگر اسے کسی کی نہ ضرورت ہے، نہ خواہش۔ جس وقت چاہیں جہاں چاہیں جیسے چاہیں اٹھا کر رکھ دیں، اس کے گول مٹول چہرے پر ملال یا ناگواری کی باریک سے باریک لہر یا لکیر تک نہیں اُبھرتی۔ شاعروں کی طرح نہ پہلے پکارے جانے پر ناراض ہوتا ہے

نہ آخر میں بلائے جانے پر فخر محسوس کرتا ہے۔ اس کی حیثیت مسلّم اور شخصیت ہر لحاظ سے مربوط اور مکمل ہے۔ روز مرہ زندگی میں ہر وقت اور ہر جگہ مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ صبح سویرے آنکھ کھلتی ہے تو طلوعِ آفتاب کی صورت میں اس کا اور میرا آمنا سامنا ہوتا ہے، اُس وقت میرا دل اور دماغ صاف اور پاک ہوتے ہیں۔ اس لیے شناخت آسان ہوتی ہے۔ میری آنکھیں مشرقی اُفق پر زرد زرد گول گول صاف اور شفاف بڑے صفر کو ابھرتے اور بلند ہوتے دیکھتی ہیں جس کی روشنی لمحہ بہ لمحہ چاروں طرف پھیلتی چلی جاتی ہے۔ یہ صفر اپنی روشنی بانٹتا چلا جاتا ہے، اور کسی سے کوئی معاوضہ قبول نہیں کرتا۔ بظاہر یہ ایک بڑے ریاضی دان کا بڑا صفر ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفر بڑا ضرور ہے مگر سب سے بڑا نہیں۔ اس کائنات میں یہ آخری بڑا صفر نہیں بلکہ اس کے علاوہ اَن گنت صفر ایسے ہیں جن کے سامنے اس کی کوئی جغرافیائی حیثیت ہی نہیں۔ رات کو آسمان پر نظر دوڑائیں اعداد و شمار کا صدیوں پُرانا نظام درہم برہم ہوتا نظر آتا ہے۔ یہ سارے ستارے اپنی اپنی جگہ صفر ہیں۔ جو اس صفر سے اگر بڑے نہیں تو کسی صورت میں کسی مفہوم میں اس سے چھوٹے بھی نہیں۔ صفر کے اس تصور کو میں پھیلا کر دیکھوں، اپنی بصارت اور بصیرت کے سارے در کھول کر غور کروں تو سارا آسمان ایک بڑے صفر میں سمٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ آسمان کیا پوری کائنات بھی تو ایک حقیقت میں ایک صفر ہی ہے۔ غور کرتے چلے جایئے اور صفر کے کئی کئی دیکھے اَن دیکھے رُوپ دیکھتے چلے جایئے۔ ریت کا سب سے چھوٹا ذرہ کائنات کا سب سے چھوٹا صفر ہے۔ اس قسم کے کئی چھوٹے چھوٹے صفر یکجا اور یک جان ہو کر ایک بہت بڑے صفر کو جنم دیتے ہیں۔ جسے عرفِ عام میں کرۂ ارض کہا جاتا ہے۔ اس طرح سنگریزے سے لے کر کوہِ ہمالیہ تک اپنی اپنی جگہ سب صفر ہی ہیں۔ صفر کے اوپر صفر رکھتے جائیں تو آسمان کی بلندی تک پہنچا جا سکتا ہے۔ صفر جب پھیلتا ہے۔ تو ہر شے کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ اور سکڑتا ہے تو ریت کے ذرے میں سما جاتا ہے، جب بھوکے کے سامنے آتا ہے تو چپاتی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ سالن کی پلیٹ میں آلو اور بوٹی کی طرح نظر آتا ہے۔ مزدور کی جیب میں ہو تو چونی امیر کے بریف کیس میں ہو تو چیک بک۔ امریکہ میں اس کا نام کیپٹل ازم اور روس میں سوشلزم ہے۔ بذاتِ خود یہ نہ دائیں بازو سے تعلق رکھتا ہے نہ بائیں بازو سے، یہ کسی سسٹم اور کسی نظام کا حامی یا مخالف نہیں۔ مگر ہر نظام اور ہر سسٹم اس کو اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے۔ ہر فرد، ہر جماعت اور ہر فرقہ چاہتا ہے کہ اُس کے پاس صفر زیادہ سے زیادہ تعداد میں موجود ہوں۔ ماہرینِ اقتصادیات اس کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے سو سو فارمولے اور سو سو بہانے ایجاد کرتے ہیں۔ مگر یہ آزاد منش، درویش صفت جدھر بھی جاتا ہے، اپنی مرضی سے جاتا ہے۔ کسی کا حکم نہ قبول کرتا ہے نہ کسی کو حکم دیتا ہے۔ یہ امن اور آشتی کا پیامبر ہے، مگر انسان اس کو فساد اور کشت و خون کی بنیاد بنا لیتے ہیں۔ کبھی اسے توپ کے گولے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، کبھی پستول کی گولی کی طرح۔ کبھی خلائی شٹل بنا کر اسے اڑاتے ہیں۔ کبھی ایٹمی میزائل کا نام دیتے ہیں۔ ڈاکٹر اور حکیم میٹھی اور کڑوی گولیوں کی شکل میں مریضوں کو کھلاتے ہیں تو اُن میں سے اکثر کی جان بچ جاتی ہے۔ خالقِ کائنات نے میری طرح ہر انسان کے ماتھے سے نیچے دو چھوٹے چھوٹے چمکدار صفر چسپاں کر دیئے ہیں۔ جنہیں میں آنکھیں کہتا ہوں۔ جو دیکھنے میں بہت چھوٹی ہیں مگر ساری کائنات کو اٹھا کر ان کے اندر رکھ دوں تو ان کی وسعت میں ذرہ برابر کمی واقع نہ ہو۔ ان کو کھُلا رکھوں تو اپنی ذات کے سوا ساری کائنات نظر آنے لگے۔ انہیں ڈھانپ دوں تو اپنی ذات کے علاوہ باقی ہر شے صفر ہو جائے۔

خاموشی

حیدر قریشی

ہنگامہ اور شور زندگی کے صحیح عکاس نہیں۔ اسی طرح سناٹا اور ویرانی بھی زندگی کے ترجمان نہیں۔ ان کے برعکس خاموشی زندگی کی حقیقی عکاسی کرتی ہے۔ جو لوگ سناٹے اور خاموشی میں فرق نہیں کر پاتے وہ خاموشی کی اہمیت نہیں جان سکتے۔ سناٹا بے روح اور بے آواز ہوتا ہے، جبکہ خاموشی زندگی کی عکاس ہی نہیں زندگی کو جنم بھی دیتی ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ دل کی دھڑکن کا ہر بار ایک وقفے کے ساتھ خاموشی اختیار کرنا اور پھر خاموشی کے اسی وقفے سے اگلی دھڑکن کا جنم لینا زندگی کو جنم دینا نہیں تو اور کیا ہے۔ پھر خاموشی سناٹے کی طرح بے آواز بھی نہیں بلکہ خاموشی کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔ جب مکمل خاموشی ہو، ہونٹ بھی خاموش ہوں تب دو دھڑکتے دلوں کی جو گفتگو ہوتی ہے اسے اہلِ دل بخوبی جانتے ہیں۔ کوئی صوفی جب تک گوشۂ خاموشی میں نہ جائے تب تک اس کے دل کے تار حقیقتِ عظمیٰ سے نہیں مل پاتے۔ کسی ہنگامہ خیز، پُرشور ماحول نے نہ کبھی دو سچے دلوں کو ملنے دیا ہے اور نہ کبھی کوئی سچا صوفی پیدا کیا ہے۔ عبادت گاہوں میں جب تک خاموشی نہ ہو عبادت کا لطف ہی نہیں آ سکتا، یوں بھی خاموشی بجائے خود عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے لاؤڈ اسپیکر کا استعمال عام ہوا ہے عبادت گاہوں میں بھی شور سنائی دینے لگا ہے اور عبادتوں کا تقدس ختم ہوتا جا رہا ہے۔

عبادت کی حیثیت سے خاموشی وظیفۂ ردِّ بلا بھی ہے۔ ایسا قرض خواہ جو دو سال سے پھیرے لگانے کے بعد یہ ارادہ بدلے کر آئے کہ آج حتمی فیصلہ کر کے جاؤں گا یا ایسا مالک مکان جو گزشتہ چھ سات ماہ کا کرایہ یکمشت لینے کی شر انگیزی پر تُلا بیٹھا ہو۔ ایسے لوگ جب ایسے بد ارادوں سے آتے ہیں تو گالی گلوچ سے بھی دریغ نہیں کرتے لیکن ان کے ہر شر سے بچنے کے لیے خاموشی سے بہتر کوئی وظیفہ نہیں ہو سکتا۔ ایسے ابتلا کے موقع پر آپ دل ہی دل میں "جوابِ جاہلاں باشد خموشی" کا ورد بھی کر سکتے ہیں، اگر غلطی سے آپ یہ ورد با آوازِ بلند کر بیٹھتے ہیں تو اسی وقت آپ کو خود احساس ہو جائے گا کہ خاموشی کتنی بڑی نعمت تھی اور یہ حقیقت بھی آپ پر کھلی صورت میں منکشف ہو گی کہ جاہلانہ کلام سے خاموشی بہتر ہے۔

آواز کی دلکشی بھی خاموشی کے پس منظر کی محتاج ہے۔ ہوٹلوں اور بازاروں میں پوری آواز سے نشر ہونے والے گیت سر میں درد پیدا کر دیتے ہیں جبکہ وہی گیت آپ رات کو مکمل خاموشی کے پس منظر میں مدھم آواز سے سنیں تو آپ خود بھی ان گیتوں کے ساتھ بہتے چلے جائیں گے۔ سرگوشی اور دھیمی گفتگو آواز کے خاموشی کی طرف جھکاؤ کے مظہر ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں کہ آوازوں میں جو لطف سرگوشی اور دھیمی گفتگو میں ہے وہ بلند لہجے کی آوازوں میں نہیں ہے۔ میرے ایک کرم فرما "ش۔ ن" بے حد دھیمی گفتگو کے عادی ہیں اس حد تک کہ عام لوگوں کو ان کی آواز سننے اور سمجھنے کے لیے کان اس طرح کھڑے کرنے پڑتے ہیں جیسے وہ ہمسائے کے گھر کی آوازیں سننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ لیکن میرا اور ان کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ اور میں اکیلے ہیں اور وہ اپنے مخصوص صوفیانہ لہجے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ مجھے صرف ان کے ہونٹ ہلتے نظر آتے ہیں یا کبھی کبھار ایک آدھ لفظ کانوں تک پہنچ جاتا ہے لیکن میرے نزدیک اس لفظ کی کوئی اہمیت نہیں ہیں تو ان کی بولتی ہوئی خموش گفتگو نہ صرف پوری طرح سنتا ہوں بلکہ ساتھ ساتھ خود بھی شریکِ گفتگو رہتا ہوں۔ ہمارے درمیان ابلاغ کا کبھی کوئی مسئلہ پیدا

نہیں ہوا۔

بعض لوگ خاموشی کو شکست کی آواز سمجھتے ہیں، ایسے لوگ مستقبل سے بے خبر حال مست ہوتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ خاموشی تو فتح کی پیش خبری ہوتی ہے۔ جب سمندر خاموش ہو یا فضا میں ہوا خاموش ہو تب خاموشی طوفان اور آندھی کی صورت اپنا جلالی روپ دکھاتی ہے۔ سقراط نے زہر پی کر حسین نے شہید ہو کر اور منصور نے سُولی قبول کر کے خاموشی سے جبر کے جو عظیم نمونے دکھائے تھے بظاہر وہ اُس عہد کے جھوٹوں اور جابروں کے سامنے شکست ہی تھی لیکن درحقیقت ان مظلوموں اور سچوں کی خاموشی ان کی فتح کی پیش خبری تھی جسے آنے والے وقت نے سچ ثابت کیا۔ مظلوموں کی خاموشی کی یہ سچائی ہمیشہ سے قائم ہے۔

خاموشی اپنے اندر معنویت کے بے پناہ امکانات رکھتی ہے جبکہ آواز کی قید میں آنے والے لفظ مخصوص اور محدود معنویت کے حصار میں آجاتے ہیں۔ آپ دیکھیں کہ موجودہ دَور کی مار دھاڑ سے بھر پور بے معنی فلموں کے مقابلہ میں پرانے زمانے کی خاموش فلموں میں کتنی معنویت ہے۔ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق جو معنی چاہے اخذ کر لے۔ ہمارے تجریدی افسانہ نگار اگر تجرید کے ہنگاموں کی بجائے خاموش اور بے لفظ کہانیوں کی طرف توجہ کریں تو انہیں پسند کرنے والے نقاد سادہ کاغذوں میں اس سے بھی زیادہ معنویت ڈھونڈ نکالیں گے جتنی وہ ان کی تجریدی کہانیوں سے نکالتے ہیں۔

انسان خاموشی کو توڑتی ایک چیخ کے ساتھ اس دنیا میں آتا ہے۔ نتیجتہً ساری زندگی ہنگامہ بازی میں گزار دیتا ہے۔ ہر وقت بے اطمینانی، مسئلے، پریشانی، اضطراب۔ لیکن موت کی خاموشی آتے ہی وہی پریشان حال انسان کتنا شانت اور کتنا پُر سکون ہو جاتا ہے۔

اتحاد اور امن کے نام پر قائم ہونے والے مقامی، قومی اور بین الاقوامی ہر سطح کے ادارے خاموشی کی قدر و قیمت سے نا آشنا ہیں، اسی لیے انتشار اور بد امنی کا شکار ہیں، کہیں کسی اسمبلی کے ممبران میں ہاتھا پائی، کہیں ہاتھوں ٹانگوں سے پکڑ کر باہر پھنکوانے کے منظر، کہیں گالی گلوچ۔ اگر ایسے تمام ادارے اپنے ہر اجلاس میں خاموشی کو حرزِ جان بنا لیں تو ساری دنیا اتحاد اور امن کا گہوارہ بن جائے۔ نہ کوئی تقریر ہو نہ تکرار، نہ کوئی قرارداد نہ بحث۔ اجلاس چار گھنٹے کا ہو تو بے شک آٹھ گھنٹے تک بیٹھے رہیں بلکہ سوتے رہیں یوں الاؤنسز کے ساتھ اوور ٹائم بھی مل سکتا ہے۔ اس طرح خاموشی عالمی اتحاد و امن کے ساتھ معاشی لحاظ سے بھی نعمت بن سکتی ہے۔

نئی تہذیب شور اور ہنگامے سے عبارت ہے۔ اب لڑکیاں برملا رشتے پسند یا ناپسند کرتی ہیں۔ اگلے وقتوں میں جب نئی تہذیب ابھی نہیں آئی تھی کیا حیا داری تھی۔ لڑکی کے بزرگ اور قاضی صاحب لڑکی کے پاس جاتے اور اس سے دریافت کرتے۔ یہ رشتہ منظور ہے؟ پھر اس کی خاموشی کو نیم رضا ہی نہیں پوری رضامندی سمجھ کر اس کا انگوٹھا لگوا لیتے۔ یہ سب خاموشی کا فیض تھا جس سے ہمارا معاشرہ اب تقریباً محروم ہو چکا ہے۔

خاموشی خیر کی علامت ہے جبکہ شور شر کا مظہر ہے۔ شور پسند لوگ شورش پسند ہوتے ہیں انہیں ہمیشہ فتنہ فساد کی سوجھتی ہے جبکہ خاموشی پسند کرنے والے فطرتاً امن پسند ہوتے ہیں۔ اُس شوہر کی ازدواجی زندگی کبھی ناکام نہیں ہو سکتی جو مزاجاً خاموشی پسند ہو، چاہے اُس کی بیوی کتنی ہی جھگڑالو کیوں نہ ہو کیونکہ خیر کی قوت شر کی قوت پر بالآخر غالب ہی آتی ہے اسی لیے تو غالب نے کہا تھا ؎

ایک خاموشی پہ موقوف ہے گھر کی رونق

ادب میں جو لوگ ڈھول تاشوں، اخباری کالموں، تصویروں، مشاعروں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پروگراموں کے پُر شور بیک گراؤنڈ میوزک کے ساتھ سامنے آتے ہیں وہ داد و تحسین کی سطحی تالیاں سمیٹ کر جلد ہی مطلع ادب سے رخصت ہو جاتے ہیں مگر خاموشی سے کام کرنے والے آخری دم تک کام کرتے رہتے ہیں بلکہ آنے والی صدیوں میں بھی کاغذ پر چلتے ہوئے ان کے کلکِ گوہریں کی سرگوشی برابر سنائی دیتی رہتی ہے۔ گریرسن نے ہندوستان کی زبانوں پر عمر بھر کام کیا اور آخری وقت تک کام کرتا رہا جب اس کی ۸۰ ویں سالگرہ کے موقعہ پر لوگ اسے مبارکباد دینے کے لیے اس کے گھر گئے تو دیکھا کہ وہ خاموشی سے میز کے قریب بیٹھا تھا۔ چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں اور وہ اپنے کام میں کھویا ہوا تھا۔ جب اسے مبارکباد دی گئی تو اس نے حیران ہو کر کہا: "ارے اسّی برس گزر گئے اور مجھے پتا ہی نہ چلا۔"

گول کیپر

اظہر ادیب

میرے احتجاج کے باوجود جب مجھے اس جہانِ فتنہ و فساد میں بھیجا گیا تو میرا سب سے پہلا رفیق نرم و گداز بستر تھا۔ مَیں کیونکہ پیدائشی وضعدار تھا لہٰذا بچپن کا بیشتر حصّہ بستر سے یاری نبھانے میں کٹا (میرے کچھ حاسد قرابت دار اسے میری بیماری کا نام دیتے ہیں) نتیجتہً جسم کے ساتھ ساتھ خیالات میں بھی نزاکت آتی چلی گئی اور عملی اچھل کود ہمیشہ غیر مہذب حرکت لگتی رہی البتہ ذہنی جمناسٹک میرا پسندیدہ مشغلہ رہا۔ چنانچہ کالج لائف میں بھی جب دوسرے لڑکے کھیلوں میں حصّہ لیتے یا کم از کم تماشائی کی حیثیت سے شرکت کرتے مَیں اپنے کمرے میں لیٹا سنبل کی روئی سے بھرے سرہانے پر سر رکھے مستقبل کے سہانے خواب بُنتا رہتا۔

ایک بار کالج میں سالانہ کھیل ہو رہے تھے کہ میرے ایک دوست آئے اور پورا ایک گھنٹہ کھیل کود کے موضوع پر لیکچر دینے کے بعد مجھے ہاکی میچ دیکھنے کےلیے کالج چلنے کو کہا۔ میری سماعت کے آلات نے کیونکہ اب مزید کام کرنے سے انکار کر دیا تھا لہٰذا مَیں نے جھٹ اُن کی پیش کش قبول کر لی۔ اور یوں زندگی میں پہلی بار کسی کھیل میں شریک (تماشائی کی حیثیت سے) ہونے کا موقع مل گیا۔ جب ہم پہنچے تو دونوں ٹیمیں میدان میں اتر چکی تھیں۔ ریفری کے وسل دینے کی دیر تھی کہ چھینا جھپٹی کا ایک عجیب غیر مہذب کام شروع ہو گیا۔ ہر کھلاڑی اُس خود غرض بنئے کی طرح لگا جو ہر گاہک کو اپنی دکان پر اور اُس کی کمائی کو اپنی جیب میں دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ میری نظریں اگرچہ کھلاڑیوں کے ساتھ ساتھ گردش کر رہی تھیں مگر مَیں دل میں اُس لمحے کو کوس رہا تھا جب اپنے دوست کی باتوں میں آ کر یہاں چلا آیا تھا۔ چھینا جھپٹی کا یہ منظر دیکھنے کے لیے اتنی دُور چل کر آنا، اتنی دیر بیٹھے رہنا اور ایک دوسرے کے اُوپر مسلسل سر اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے کی اذیت برداشت کرنا میری سمجھ میں نہ آسکا کیونکہ ہمارے گھروں میں کھانے کے اوقات میں بچے اکثر یہ منظر پیش کرتے رہتے ہیں۔ میرا درجۂ حرارت ابھی اُس نقطے تک نہیں پہنچا تھا جہاں خون جلنے لگتا ہے کہ اچانک ایک عرفانی لمحے نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا اور مجھ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور وہ جو ایک تیسری آنکھ ہوتی ہے اُس کے پٹ کھُل گئے اور اُس سے نکلنے والی غیر مرئی لہروں نے تمام منظر کو اپنی لپیٹ میں لے کر میرے ذہن کی اسکرین پر ایک نئے زاویے سے منعکس کرنا شروع کر دیا۔ چند لمحے پہلے جو کھلاڑی مجھے فضول اُچھل کود کرتے دکھائی دے رہے تھے اب ایک ایسی منظم فوج کے رُوپ میں ڈھل گئے جو بہترین ہتھیاروں سے لیس اپنے حریف کو نیچا دکھانے کے لیے مسلسل حملے کرتی ہے۔ ان مستعد فوجیوں کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ آخر ان کے کوئی کمانڈر بھی تو ہوں گے۔ سو مَیں نے پورے میدان پر متلاشی نگاہ ڈالی تو دونوں طرف میدان کے آخری سروں پر دو باوقار شخصیتیں شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ ٹہلتی دکھائی دیں۔ تب میرے وجدان نے مجھے فوراً بتا دیا کہ ان افواج کے حقیقی سپہ سالار یہی پُر وقار اصحاب ہیں اگرچہ عرفِ عام میں اس منصب پر فائز شخص کو گول کیپر کہا جاتا ہے۔ لیکن غیر جانبداری سے سوچیں تو یہ نام اس منصب کے شایانِ شان نہیں ہے۔

گول کیپر میں وہ تمام صفات پائی جاتی ہیں جو کسی بھی سپہ سالار میں ہوتی ہیں۔ مثلاً سپہ سالار کی وردی عام فوج سے مختلف ہوتی ہے اور وہ تمام حفاظتی

تلواریں اُس کی حفاظت کرتی ہیں ۔ گول کیپر کی وردی بھی باقی ٹیم کے کھلاڑیوں کی وردی سے مختلف ہوتی ہے اور پوری ٹیم میں صرف وہی ہوتا ہے جس کے بدن کی حفاظت کے لیے بہت کچھ جتن کیے جاتے ہیں ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پوری ٹیم میں سب سے قیمتی وجود گول کیپر کا ہوتا ہے ۔ سپہ سالار جنگ کے دوران ہمیشہ اُس جگہ رہتا ہے جہاں تک پہنچنا دشمن کے لیے تقریباً ناممکن ہوتا ہے ۔ گول کیپر بھی میدان کے آخری سرے پر ہوتا ہے اور اُس تک پہنچنے کے لیے مخالف ٹیم کو بھی انہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو کسی بھی فوج کو دشمن کے سپہ سالار تک پہنچنے کے لیے پیش آسکتی ہیں ۔ جیسے پوری فوج سپہ سالار کی حفاظت کے لیے جان لڑا دیتی ہے اسی طرح پوری ٹیم گول کیپر کی حفاظت کے لیے خون پسینہ ایک کر دیتی ہے ۔ کسی فوج کا سپہ سالار مارا جائے یا بھاگ جائے تو فوج بددل ہو کر ہتھیار ڈال دیتی ہے اسی طرح گول کیپر کی شکست پوری ٹیم کی شکست ثابت ہوتی ہے ۔ اُس گیند کو جسے ٹیم کے باقی دس کھلاڑی نہیں روک سکتے گول کیپر اپنی مہارت سے اکثر روک لیتا ہے اور انتہائی حقارت سے مخالف ٹیم کے منہ پر دے مارتا ہے ۔

عام طور پر گول کیپر کو ٹیم کا سربراہ نہیں بنایا جاتا ۔ شاید اس لیے کہ پوری ٹیم اُس سے حسد کرتی ہے ۔ آج کل جمہوریت کا دَور ہے اور جمہوریت نام ہے اکثریت کی حکومت کا (چاہے وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو) اس لیے حاسدوں کی اکثریت کی وجہ سے گول کیپر ظاہری اقتدار حاصل نہیں کر سکتا ۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ حقیقی سربراہی اُسی کے پاس رہتی ہے ۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ٹیم کا ظاہری کپتان بھی عام کھلاڑیوں کی طرح گول کیپر کی حفاظت کے لیے مخالف ٹیم سے برسرِ پیکار رہتا ہے ۔

گول کیپر عام کھلاڑیوں کی طرح حریص نہیں ہوتا بلکہ اُس میں ایک طرح کی درویشانہ بے نیازی پائی جاتی ہے ۔ چنانچہ وہ انمول شے جس کے لیے بیس آدمی گھنٹوں وحشیوں کی طرح ایک دوسرے پر حملے کرتے رہتے ہیں جب اُس کے پاس آتی ہے تو یہ کسی صوفی کی طرح اُسے پائے حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے ۔ کبھی کبھار مخالف ٹیم کی محنت سے متاثر ہو کر شاہانہ فیاضی سے کام لیتے ہوئے گیند کو لکڑی کے دو بدوضع ستونوں کے درمیان سے گزارنے کی اجازت بھی دے دیتا ہے جسے کوتاہ بین لوگ اُس کی نااہلی پر محمول کرتے ہیں ۔ البتہ کچھ اہلِ نظر ایسے بھی ہوتے ہیں جو سیٹیوں ، تالیوں اور نعروں سے اُسے ہدیۂ تحسین پیش کرتے ہیں ۔

عام زندگی میں بہت سے گول کیپروں سے واسطہ پڑتا ہے ۔ صاحب کا چپراسی بھی گول کیپر کے فرائض سرانجام دیتا ہے ۔ جب سائل اپنے مسائل کے مسلسل دباؤ سے گھبرا کر صاحب کے دفتر کا رُخ کرتا ہے تو چپراسی کسی ماہر گول کیپر کی طرح اُسے واپس میدان میں پہنچا دیتا ہے جہاں وہ پھر مستعد ٹیم کا تختۂ مشق بن جاتا ہے ۔ کبھی کبھی خود صاحب بھی گول کیپر کی مسند سنبھال لیتا ہے اور ہزار جتنوں سے اُس کی میز تک پہنچنے والی فائل اُس کے قلم کی ایک ہی ہٹ سے سائل کی ڈی میں پہنچ جاتی ہے ۔ ہماری یہ زمین بھی تو ایک مٹیالے رنگ کی گیند ہے جسے ہم اپنی ذہانت کی ٹھوکروں سے دھکیلتے ہوئے مسلسل گول کی طرف بڑھ رہے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ گول کیپر بہت مشّاق ہے ۔ اب تو ہم ڈی کے اندر پہنچ گئے ہیں اور کسی بھی لمحے مہربان گول کیپر کی ٹھوکر اس گیند کو واپسی کے سفر پر روانہ کر سکتی ہے ۔

ہر گیم میں کھلاڑیوں کے لیے مختلف قوانین اور ضابطے ہوتے ہیں ۔ لیکن گول کیپر ہر صاحبِ اقتدار کی طرح ان تمام سے آزاد ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے اختیارات کی حدود کا تعین بھی خود ہی کرتا ہے ۔ وہ پوری آزادی سے اپنا سر ، اپنے ہاتھ اور اپنے پاؤں استعمال کرتا ہے اور اُس کی یہ ساری اچھل کود اُس کے منصب کی وجہ سے جائز قرار پاتی ہے ۔ عالمی سطح پر ایسے گول کیپر موجود ہیں جو پسماندہ ممالک کی برسہا برس کی کوششوں کو ایک ہلکی سی ٹھوکر سے لاحاصلی کے خلا میں معلق کر دیتے ہیں ۔

گول کیپری طاقت اور ذہانت کی علامت ہے ۔ خاوند جوانی میں گول کیپر ہوتا ہے ۔ بیوی کمزور اور ناقص العقل ہونے کی وجہ سے اُس کے اشاروں

پر چلتی رہتی ہے۔ لیکن جیسے ہی بیوی کی ٹیم تیار ہو جاتی ہے اور خاوند کے دماغ کے اکثر سیل ناکارہ ہو جاتے ہیں وہ خاوند کو اس منصب سے معزول کر کے اُس کی جگہ خود سنبھال لیتی ہے۔ اب خاوند صرف گیند کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے جسے ساری ٹیم دھکیلتی ہوئی گول تک لاتی ہے لیکن گول کیپر اُسے ٹھوکر سے دوبارہ ٹیم کی طرف اچھال دیتا ہے اور یوں ہر مرد کی زندگی کا آخری حصہ ٹیم اور گول کیپر کی پریکٹس کا نشانہ بنتے گزر جاتا ہے۔ بعض اوقات جب شوہر دفتر اور باہر کے دیگر مسائل کی تھکن کے ہاتھوں لڑھکتا ہوا اپنے دروازے (جو گول کی علامت ہے) کو عبور کر کے آنگن میں داخل ہونا چاہتا ہے تو گول کیپر کے ماتھے پر پڑے ہوئے بل اُسے دوبارہ مسائل کی ٹھوکروں کا نشانہ بننے کے لیے باہر کی طرف اچھال دیتے ہیں۔

آج کل میں بہت خوش ہوں کیونکہ جب سے میری شادی ہوئی ہے میں گول کیپر کے منصب جلیلہ پر فائز ہو گیا ہوں اور ابھی کیونکہ مدمقابل صرف ایک کمزور کھلاڑی ہے اس لیے خطرے کی کوئی بات نہیں ہے البتہ جب میں آنے والے اُس وقت کا تصور کرتا ہوں جب مخالف ٹیم تیار ہو جائے گی اور مجھ سے میرا یہ منصب چھن جائے گا تو کبھی کبھی پریشان بھی ہو جاتا ہوں۔

اُردو کے البیلے شاعر رشید قیصرانی

کا

دوسرا شعری مجموعہ

"کنارِ چشم"

زیرِ اشاعت ہے

فٹ بال

راجہ محمد ریاض الرحمٰن

میرا پسندیدہ کھیل فٹ بال ہے۔ فٹ بال کو میں اس لیے پسند کرتا ہوں کہ باقی تمام کھیل مجھے با وجوہ ناپسند ہیں۔

اس سے پہلے کہ منطق کا کوئی طالب علم مذکورہ بالا استدلال پر "مغالطے" کی کوئی قسم لاگو کرے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ بقیہ کھیلوں کی ناموزونیت کا موزوں الفاظ میں اظہار کر ڈالوں۔

سب سے پہلے ہاکی کو لیجیے۔ ہاکی سٹک کی شکل و شباہت دیکھتے ہی دماغ کی سکرین پر سب سے پہلے جو لفظ ابھرتا ہے وہ ہے "کج روی" نہ ظاہر ہے کہ کج روی سے یوں ہی نہیں ہر شریف آدمی اجتناب برتتا ہے۔ کہتے ہیں ہاکی سرزمین فارس کے گڈریوں نے ایجاد کی (گڈریوں سے کسی اچھے کام کی توقع عبث ہے) جب گڈریے اپنی بکریاں چراگاہ میں پہنچانے کے بعد فارغ ہو جاتے بلکہ نکمے ہو جاتے تو اپنی کج رو چھڑیوں سے ایک "بیچارے پتھر" کو پیٹنا شروع کر دیتے۔ قرین قیاس ہے کہ جب گڈریے ہاکی کھیلنے میں مشغول ہوتے ہوں گے تو ان کی بکریاں بیگانے کھیتوں میں گھس سرسبز فصل کا پوسٹ مارٹم کرتی ہوں گی (اگرچہ ہاکی کی تاریخ لکھنے والوں نے اس کا اظہار نہیں کیا لیکن مؤرخین کا کیا اعتبار؟ یہ عموماً ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ تاریخی کتب اٹھا کر دیکھیے اختلافات کے پہاڑ قدم قدم پر آپ کے آڑے آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کا مضمون مجھے سخت ناپسند ہے جبکہ میرا دوست 'بکر' حلقہ یاراں میں اس ناپسندیدگی کی وجہ امتحان میں ناکامیابی بتلاتا ہے لیکن آپ خود سوچیں بکریاں بھی بھلا سلف ڈسپلن کا مظاہرہ کرتی ہیں! وہ اتنی دیر کیا کرتی تھیں؟ اب یہ تو ممکن ہی نہیں کہ وہ گڈریوں کا ہاکی میچ دیکھنے میں مصروف ہو جائیں۔ پس ثابت ہوا کہ ایسی گیم جو سراسر غیر ذمہ داری کی کوکھ سے جنم لے آپ یا مجھ جیسے ذمہ دار شخص کی پسندیدگی کا باعث ہرگز نہیں ہو سکتی — ویسے بھی ہاکی سے بڑھاپے کا وحشت ناک تصور وابستہ ہے۔ غور فرمائیے ہاکی کے کھلاڑی کو ڈربلنگ کرتے ہوئے اس قدر جھکنا پڑتا ہے کہ اس کے سر اور پاؤں کے درمیان نوّے درجے کا زاویہ بن جاتا ہے۔ پھر بالکل یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اسّی پچھتّر سال کا کبڑا بڈھا ہو اور جب یہ کھلاڑی ہاتھ میں ہاکی سٹک لیے تن کر کھڑا ہوتا ہے تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی بوڑھے نے سٹھیاپن کی وجہ سے اپنی کھونٹی اُلٹی پکڑ رکھی ہے — سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ہمارے دیہات میں ہاکی سٹک سے صرف مکئی کوٹنے اور لڑائی کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ ساسانیوں کی شرافت اور شائستگی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے اپنی ایجاد کو پیٹنٹ نہیں کرایا، نہایت فراخ دلی سے اسے دوسروں کے حوالے کر دیا۔

یہ تو ہوئی ہاکی کی ناموزونیت۔ اب ذرا کرکٹ کی نامعقولیت دیکھیے جو پانچ دنوں پر پھیلی ہوئی ہے یعنی ساٹھ گھنٹے یا چھتیس سو (۳۶۰۰) منٹوں کے ضیاع کے بعد جو کھیل اختتام کو پہنچتا ہے اسے کرکٹ کہتے ہیں۔ حیرت اس امر پر ہے کہ کرکٹ کے شائقین کرکٹ کے اعداد و شمار تو بڑے چاؤ سے جمع کرتے ہیں لیکن وقت کے اعداد و شمار سے کترا کر نکل جاتے ہیں۔ ایک اننگز میں زیادہ سے زیادہ رنز، وکٹیں، کیچ، سنچریاں، کم سے کم رنز، وکٹیں، کیچ، سنچریاں، چوکے، چھکے، اور خدا جانے کیا کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اتنی مغز کھپائی شماریات (SATATISTICS) کی ماسٹر ڈگری کے لیے بھی نہیں کرنی پڑتی۔ البتہ

جب مجھے معلوم ہوا کہ کرکٹ کا آغاز برطانیہ سے ہوا تو نپولین کے اس قول پر یقین آگیا کہ "انگریز دکاندار قوم ہے"۔ پانچ دن کا طوالت کے اس کھیل کا مقصد میرے خیال میں صرف اور صرف یہ تھا کہ تمام شہر کے لوگوں کو ایک میدان میں جمع کر کے ایسی تمام اشیائے خوردنی اور ایسے تمام مشروبات جن کی بازار میں کھپت نہیں یا خراب ہونے کے باعث فروخت کے قابل نہیں ہیں کھلا اور پلا دی جائیں بہر ٹیسٹ میچ مختلف شہروں میں کھیلنے کا یہی مقصد ہے ورنہ انگریز قوم جو ایک ایک سیکنڈ کا خیال رکھتی ہے ایسے کھیل کو بھلا کیوں فروغ عطا کرتی جو سیکنڈ تو سیکنڈ، گھنٹوں کو عظیم الجثہ وہیل کی مانند ہڑپ کر جاتا ہے۔

کرکٹ کا کھیل امارت اور کاہلی کی علامت ہے اور امارات اور کاہلی یکجا ہو جائیں تو اس کا صریح نتیجہ تباہی و بربادی ہوتا ہے۔

شاید آپ کو معلوم ہو کہ کرکٹ انگریزی زبان میں جھینگر کو کہتے ہیں۔ کرکٹ سے ناپسندیدگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

کھیلوں میں سب سے بڑا کھیل باکسنگ اور ریسلنگ ہیں۔ جس طرح عاشق اور معشوق کے نام کو معتزز بنانے کے لیے گل و بلبل کا سہارا لیا جاتا ہے۔ بعینہٖ لڑائی مار کٹائی کو مہذب بنانے کے لیے باکسنگ اور ریسلنگ کا نام دے دیا گیا ہے اسی طرح انسان نام نہاد تہذیب کو بٹہ بھی نہیں لگانا چاہتا اور اندر کے وحشی کو زندہ بھی رکھنا چاہتا ہے۔ اگر ایک دوسرے کے جبڑے توڑنا، بے دردی سے اٹھا کر پٹخنا، بہترین باکسنگ اور بہترین ریسلنگ ہے تو پتھر کے دور کا انسان آج کے انسان سے یقیناً ایک اچھا باکسر اور بہترین ریسلر تھا۔ ورلڈ چیمپئن اور اولمپک چیمپئن کا حقدار بھی وہی ہے۔ تو کیا آپ پتھر کے دور میں لوٹ جانا پسند کریں گے اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو آپ کو باکسنگ اور ریسلنگ کی محبت سے دستبردار ہونا پڑے گا۔

والی بال، ٹینس اور بیڈمنٹن سے میں یوں متنفر ہوں کہ ان کھیلوں میں جال (NET) کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جال جس سے معصوم چڑیوں، خوبصورت تلیریوں اور ترنم ریز پپیہوں کی آزادی سلب کی جاتی ہے۔ نیلگوں سمندر میں کلکاریاں مارتی مچھلیاں قید کی جاتی ہیں اور ہمارے معاشرے میں کسی کو اگلے جہان روانہ کرنا ہو یا کسی کو زک پہنچانی ہو یا کاروبار میں نیچا دکھانا ہو ایسے تمام افعال بد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے فقط ایک بسیط لفظ مستعمل ہے اور وہ ہے "جال بچھانا"۔ لہٰذا ایسا کھیل جو بغیر جال بچھائے نہ کھیلا جا سکے میری حساس طبیعت کو گوارا نہیں۔

اب جب کہ میں تمام معروف کھیلوں کے معائب واضح کر چکا ہوں اس امر کی وضاحت کروں گا کہ میں نے کن محاسن کی بنا پر فٹ بال کو اپنا پسندیدہ کھیل قرار دیا ہے یا یوں کہیے کہ خود بخود قرار پا گیا ہے کیونکہ عشق "کیا" نہیں جاتا "ہو" جاتا ہے۔

ایک امریکی پروفیسر کا کہنا ہے کہ انسان کی ہر چیز کو ٹھوکر مارنے کی سرشت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے جدِ امجد بھی فٹ بال کھیلا کرتے تھے مجھے اس سے صد فیصد اتفاق ہے۔ سو اگر ہم اپنے جدِ امجد کی تقلید میں ہل جوتتے ہیں، فصل اگاتے ہیں، تن ڈھانپتے ہیں، شادی کرتے ہیں تو فٹ بال کیوں نہ کھیلیں۔ جو لوگ مذکورہ بالا توجیہہ کو تسلیم نہیں کرتے وہ بھی بہر حال اس کی قدامت کے یوں معترف ہیں کہ اس کی ایجاد کا سہرا بابلیوں اور مصریوں کے سر باندھتے ہیں یہ دلیل جان کر بھی فٹ بال کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے کیونکہ مصر اور بابل کی قدیم تہذیبیں ذہین دماغوں کی رہینِ منت ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ فٹ بال، فادر آف گیمز ہے یعنی بقیہ تمام کھیلوں کا سرچشمہ فٹ بال ہے مثلاً قدیم ترین کھیل فٹ ریس، فٹ بال کی دوڑ سے اخذ کی گئی اور جب دوڑتے دوڑتے فٹ بال کے سامنے دفاعی کھلاڑی سلب کرتا ہے تو حملہ آور کھلاڑی اس کے جسم کے اوپر سے چھلانگ لگاتا ہے۔ اس طریقے کو دیکھ کر کسی نقال نے رکاوٹی دوڑ (ہرڈلز) ایجاد کی۔ گول کیپر کی پھرتی اور تیزی سے جمناسٹک اور جمپ کے کھیل ظہور پذیر ہوئے اور اگر آپ ذرا بھر توجہ فرمائیں تو آپ تسلیم کریں گے کہ ہاکی، رگبی، بیس بال اور آئس ہاکی (کم از کم گراؤنڈ کے حوالے سے) وغیرہ سب فٹ بال کے کھیل کے خوشہ چیں ہیں گویا فٹ بال کھیلنا یا دیکھنا ایک ٹکٹ میں ایک دو نہیں پورے آٹھ مزے والی بات ہے۔

فٹ بال کرۂ ارض کی مانند ہے۔ کرۂ ارض جو کروڑوں زندگیوں کا ملجا و ماویٰ ہے۔ فٹ بال اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے جہاں ہوا بھری جاتی ہے۔" ہوا" جو زیست کا لازمی عنصر ہے۔

اس کے برعکس ہاکی، بیس بال اور کرکٹ کی گیند حاسد کی آنکھ کی مانند سنگلاخ جکڑی اور ظالم کے دل کی طرح ٹھوس اور سخت ہوتی ہے۔

جس طرح زندگی کا کھیل کھلانے والا ریفری (ایم ڈوت) کسی حالت میں ٹائم آوٹ نہیں دیتا اسی طرح فٹ بال کا کھیل واحد کھیل ہے جس میں ٹائم آؤٹ نہیں لیا جاسکتا۔ یوں فٹ بال گیم بالواسطہ زندگی سے مشابہہ ہے۔

جب میں فٹ بال کو گراؤنڈ میں ادھر اُدھر لڑھکتے دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے کسی میلے میں سُرخ سفید کپڑوں میں ملبوس گول مٹول سا بچہ اپنی ماں سے ہاتھ چھڑا کر بھاگا اور پھر ہجوم سے گھبرا کر دوبارہ ماں کے پاس لوٹ آیا اور جب یہی گیند کسی KICK کے باعث اُوپر فضا میں تیرنے لگتی ہے تو مجھے وہ فرانسیسی نوجوان یاد آجاتے ہیں جنہوں نے فٹ بال نما غبارے میں پرواز کرکے انسانی ترقی کے بند دروازے کھول ڈالے۔ یہاں میرا دوست زید جو کرکٹ کا شیدائی ہے اعتراض کرتا ہے کہ: کرکٹ کی گیند بھی تو چوکے اور چھکے کے باعث فضا میں اڑتی ہے کیا اس کے لیے تمہیں کوئی تشبیہہ نہیں سوجھتی۔ میں اس کا اعتراض رد کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ کرکٹ گیند کو فضا میں محض باؤنڈری لائن عبور کرانے کی خاطر اڑاتا ہے لیکن فٹ بالر اڑتی ہوئی گیند کو حد بندی عبور کرنے کی اجازت نہیں دیتا وہ اپنی تمام مہارت فٹ بال کو گراؤنڈ کے اندر رکھنے میں صرف کرتا ہے گویا کرکٹر کی مثال مرکز گریز قوت کی ہے جو ہر لمحہ بغاوت پر کمر بستہ رہتی ہے۔ اور چاہتی ہے کہ رسّی تڑا کر فطرت کے قائم کردہ مدار کو توڑ ڈالے حالانکہ اس کے بعد خود اس کی اپنی ذات بھی خلائی بے وزنی کا شکار ہو جائے گی جب کہ فٹ بالر کی مثال مرکز مائل قوت کی ہے جو ہمہ وقت گیند کا رشتہ جڑوں سے استوار رکھنے پر مصر ہے اور گاہے بگاہے اسے فضا میں اچھال کر اور پھر واپس بلا کر جدت کا مظاہرہ بھی کرتی ہے۔ دوسری طرف ہاکی کی گیند ہے جس کا بغیر اجازت فضا میں اُٹھنا ناجائز اور براہِ راست منزلِ مقصود (GOAL) تک جانا ممنوع ہے لیکن فٹ بال ایسی بیہودہ قیود اور بے مقصد بندھنوں کا صید نہیں جہاں سے جی چاہے شاٹ کھیل کر گول کیجئے، سکور ہوگا، اسے کہتے ہیں تخلیقی جست ـــــ

ممکن ہے یہاں کوئی سوال اٹھائے کہ جب فٹ بال اتنا ہی اچھا کھیل تھا تو شاہ ایڈورڈ ہفتم اور شاہ ہنری ہشتم نے اس پر پابندی کیوں عائد کی۔ اصل میں فٹ بال کے علاوہ باقی سب کھیل بورژوائی ہیں ـــــ کرکٹ کھیلنا ہو تو دو بیٹ اور چار وکٹوں کے لیے اتنی رقم کی ضرورت پڑتی ہے جس سے مجھ جیسا غریب شخص گھر میں ایک ماہ کا ایندھن جمع کرسکتا ہے۔ پھر دستانوں اور SOCKS کا نمبر آتا ہے۔ اِدھر میری حالت یہ ہے کہ میں سال بھر میں جرابوں کا صرف ایک جوڑا خریدنے کی استطاعت رکھتا ہوں جن کی جاڑوں کے آخر میں یہ حالت ہو جاتی ہے کہ انگوٹھا اور ایڑی چھوٹے بچوں کی طرح ایک دوسرے سے تانا کھیلنا شروع کر دیتے ہیں اور دستانوں کا حل میں نے یہ ڈھونڈ رکھا ہے کہ سردیوں میں دونوں ہاتھ بغلوں میں دبے رکھتا ہوں جیسے کڑک مرغی اپنے بچے پروں تلے چھپائے رکھتی ہے۔ جہاں تک HAT کا تعلق ہے تو میں سخت گرمیوں میں ڈیوٹی پر جاتے ہوئے مہر تاباں کے تیر براہِ راست سر کی ڈھال پر روکتا ہوں لیکن حالت یہ ہے کہ لنڈا بازار سے بھی کوئی سستی سی ٹوپی نہیں خرید سکتا۔ HAT کی عیاشی کہاں ممکن ہے۔

پچھلے ماہ میں نے کئی خواہشیں دبا کر، کئی چیزوں کی بخست کرکے، ساٹھ روپے ہاکی خریدنے کے لیے بچائے اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ہاکی کھیلنا چاہتا تھا بلکہ محلے کے ان چند اجڈ گنواروں سے بچاؤ کے لیے جو دو مرتبہ مجھے ہاکی کا ایمپائر سمجھ کر ہاکیوں سے پیٹ چکے تھے لیکن جب ساٹھ روپے جیب میں آگئے تو میں اس مخمصے میں گرفتار ہوگیا کہ اس رقم سے ہاکی سٹک خریدی جائے یا پریشر کُکر۔ یہ خیال بھی آیا کہ فقط ہاکی سٹک سے کیا بنے گا اس کے ساتھ ہلمٹ بھی لازمی ہے۔ دو دن یہ کشمکش جاری رہی۔ تیسرے دن زید نے یہ رقم مجھ سے لے لی جس کا میں مقروض تھا۔ اس واقعہ سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ کیا میں ٹیبل ٹینس کھیل سکتا

ہوں یا باسکٹ بال جس کی دس فٹی لمبی ٹانگوں والی نام نہاد باسکٹ کے لیے بارہ کھلاڑیوں کا چندہ بھی یک صد روپے فی کس سے کم نہ ہوگا۔ لیکن فٹ بال پرولتاری کھیل ہے۔ بائیس کھلاڑیوں سے پانچ پانچ روپے جمع کرکے بہترین گیند خریدیئے۔ پھر کسی میدان میں آٹھ آٹھ گز کے فاصلے پر آمنے سامنے دو پتھروں کے لات و منات کھڑے کیجئے۔ لیجئے یہ گول پوسٹ تیار۔ چلئے کھیل شروع کیجئے۔ ملاحظہ کیا آپ نے غریبوں کا کھیل۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ غریبوں کا کھیل ہو اور منعم کی آنکھ میں تنکا، دل میں کانٹے کی طرح نہ کھٹکے اور یہ تو آپ خوب جانتے ہیں کہ اچھی باتیں سب سے پہلے غریبوں نے اپنائیں اور جبر کے بکھڑے بھی انہیں نے سہے۔

مشہور مقولہ ہے ہاکی بائی ٹرائی، کرکٹ بائی چانس، فٹ بال بائی پاور۔ سوچا جائے تو اسی مقولے سے فٹ بال کی شان و شوکت کا اظہار ہوتا ہے۔

ہاکی بائی ٹرائی یعنی ساری عمر ٹرائی کرتے رہیے پھر بھی ضروری نہیں کہ آپ اچھی ہاکی کھیل سکیں اور حق تو یہ ہے کہ جو مہارت ٹرائی سے حاصل کی جائے وہ یقیناً غیر فطری ہوتی ہے۔ ستم یہ کہ TRY TRY AGAIN کے ضمن میں بروس اور چیونٹی کی جو کہانی سنائی جاتی ہے اس کے در پردہ سامع کو چیونٹی سے تشبیہہ دی جاتی ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ آپ نے کبھی یہ ہتک محسوس نہ کی ہو۔

کرکٹ بائی چانس گویا کھیل نہ ہوا لاٹری ہوگئی۔

فٹ بال بائی پاور یا بعض لوگ غلط فہمی کے باعث پاور کا مطلب کھیل نہیں دھکم پیل لیتے ہیں حالانکہ یہاں پاور سے مراد عوام ہیں۔ کیا آپ نے یہ مشہور سوشلسٹ کلیہ نہیں سنا؟ "طاقت کا سرچشمہ عوام۔" اس لحاظ سے دیکھا جائے تو فٹ بال ایک جمہوری کھیل ہے اس کے برعکس کرکٹ آمرانہ کھیل۔ کرکٹ میں ایک کھلاڑی ڈکٹیٹر کی طرح اس وقت تک کھیلنا چاہتا ہے جب تک اسے تخت (وکٹ) سے زبردستی اتار (آؤٹ) نہ دیا جائے۔ ہٹلر کو کرکٹ کا کھیل اسی لیے ناپسند تھا کہ وہ اپنی آمرانہ حکومت میں دوسرا ڈکٹیٹر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک میان میں دو تلواریں یا ایک جنگل میں دو شیر کیسے رہ سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہٹلر اس کھیل کو ڈکٹیٹرشپ کی پیروڈی تصور کرتا ہو۔

غرض یہ کہ کرکٹ، بیس بال اور ہاکی کا کھلاڑی شمشیر (یعنی سٹک اور بیٹ) پر بھروسہ کرتا ہے جب کہ فٹ بالر ایسا سپاہی ہے جو بے تیغ لڑتا ہے۔ اب فیصلہ کیجئے کہ آپ کیسا سپاہی بننا پسند فرمائیں گے۔

زیرو پوائنٹ

خالد صدیقی

ایک دن میں اپنے ایک دوست کے گھر مدعو تھا۔ باتوں باتوں میں اُس نے میرے بارے میں انکشاف کیا کہ میں چالاکی اور ہوشیاری میں بالکل زیرو ہوں۔ مجھے اس انکشاف پر ذرّہ بھر بھی حیرت نہیں ہوئی بلکہ یک گونا اطمینانِ قلب نصیب ہوا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ان معاملات میں وہی لوگ اپنے آپ کو برتر سمجھتے ہیں جن کا مشغلہ دوسروں کے جذبات و احساسات سے کھیلنا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں ان معاملات میں واقعی زیرو ہوں کیونکہ زیرو منفی رویّوں سے دُور ایمان و ایقان کی تعلیم دیتا ہے۔ آپ جب تک زیرو کے ساتھ رہیں گے آپ کو ہر دم دیہاتی ماحول کی سی اپنائیت ملتی رہے گی۔ آپ دیہاتوں میں چوپالوں کی طرف نکل جائیں حقّے کی گڑگڑ آپ کے ہر دُکھ درد میں شریک آپ کو اکیلے پن کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ برزخ سے نکل کر جنت میں آگئے ہیں۔ تازہ ہوا آپ کے شانوں کو چھوکر آپ کو نیند کی دعوت دیتی ہے جو شہروں میں افراتفری کی وجہ سے سلیپنگ پلز کھا کر بھی میسّر نہیں ہوتی۔ دیہات کے زیرو لیے دائرے میں داخل ہو کر آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ کسی حجرۂ عافیت میں داخل ہو گئے ہیں۔ زیرو سے میرا تعلقِ خاطر اسی وجہ سے ہے۔

بات جب زیرو کی چل نکلی تو عرض ہے کہ ریاضی میں زیرو ابتدائی عدد ہے جو بڑائی کے احساس سے آزاد ہے۔ جوں جوں اعداد کا شمار آگے بڑھتا جاتا ہے اُن میں بڑائی کا میلان پیدا ہوتا جاتا ہے۔ زیرو کا عدد تو بالکل ایک نوزائیدہ بچّے کی طرح ہے جو انتہائی معصوم اور تمام آلودگیوں سے پاک ہوتا ہے۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرا دوست زیرو کے اوصاف سے بالکل لاعلم ہے۔ اُسے پتہ نہیں کہ جن مظاہر میں سادگی اور انکساری ہوتی ہے وہ انہیں ہمیشہ ثابت قدم رکھتی ہیں اور اُن کی عظمت کا سمبل ہوتی ہیں۔ بڑائی کا احساس تو گھمنڈ، مطلق العنانی، غلامی اور وہم پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی خوشبو ہے جو مسخرا پن اور خیالِ باطل کو تحریک دیتی ہے۔

زیرو کا عدد میرے لیے اُستاد کا درجہ رکھتا ہے جس نے بغیر کلاس روم کے اپنی انفرادی خصوصیات کی بنا پر میرے ذہن کے الجھاؤ کو سُلجھایا اور یہ باور کرایا کہ خواہ کوئی کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو فانی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے نو جیسا ہندسہ زیرو سے ضرب کھا کر اپنا وجود اور تمکنت کھو کر زیرو کا حصّہ بن جاتا ہے اور کسی بھی عدد کو تقسیم کر کے اُسے لامتناہی بنا دیتا ہے۔ زیرو تو منڈل رُوپ ہے اور ابدیّت کی نشاندہی کرتا ہے۔ زیرو اور دائرہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ دائرہ آغاز اور انجام سے بے نیاز ابدیّت کا حامل ہے اور یہی حال زیرو کا ہے۔

زیرو نے مجھے اس چیز کی پہچان کروائی ہے کہ معمولی سے ذرّے تک کی اپنی پہچان ہے۔ آپ اس سے جتنا قریب ہوتے جائیں گے وہ اندر سے چمکے گا اور اس کی روشنی آپ کو اکیلے پن کا احساس نہیں ہونے دے گی۔ آپ کو احساس ہوگا کہ ہر چیز آپ کو چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری لائبریری میں گمنام ادیبوں کی بھی تخلیقات موجود ہیں جن سے میں وقتاً فوقتاً استفادہ کرتا رہتا ہوں۔ کیونکہ بعض موقعوں پر ایک گمنام ادیب کی تحریر بھی مجھے سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ آخر تیمور لنگ نے بھی تو ایک معمولی چیونٹی ہی سے جہدِ مسلسل کا سبق سیکھا تھا۔

زیرو بظاہر دیکھنے میں سادہ سا ہے مگر اُس کے اندر اتنی گہرائی ہے کہ آپ جتنا جھانکتے چلے جائیں آپ کی نگاہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک نقطہ پر مرکوز ہو جائے گی اور یہی نقطہ نئی نئی حقیقتیں اور راز اپنے اندر لیے ہوئے نظر آئے گا۔ اب آپ دیکھئے کہ اگر سائنس دان ذرّے کی گہرائی میں نہ جاتے تو ایٹم کی تقسیم کا راز ابھی تک مخفی نہ رہتا۔

اگر آپ غور کریں تو آپ کو زیرو کی شکل و شباہت دوسرے اعداد کے مقابلے میں سادہ اور پُر وقار نظر آئے گی۔ آپ پنسل کی نوک کو ایک نقطہ سے آگے پھیرتے چلے جائیں آپ کسی جگہ رُکیں گے نہیں یہی چیز آپ کو مسلسل سفر اور پیہم جستجو سکھاتی ہے۔ اگر آپ ایک مرتبہ رک گئے تو مخالف قوتیں آپ کو مرکز سے اتنا دُور کر دیں گی کہ آپ پرانے زمانے کے غلاموں کی طرح کشتی کھیتے ہوئے آزادی کی تلاش میں سرگرداں نظر آئیں گے۔ میں کمزور آدمی ہوں کبھی کبھی گھڑی کی سوئی کی مخالف سمت میں بھی چلنے لگتا ہوں۔ کیونکہ میرے اردگرد نمائشیں اتنی عام ہوگئی ہیں کہ لامحالہ میں بھی اُن کے اثرات میں آتے ہوئے فضول خرچی اور ظاہری دکھاوے سے بچ نہیں سکتا اور یہ چیز میری عادت بن کر رہ گئی ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اُس وقت ہوا جب میرے گھر آئی ہوئی ایک مہمان بچی نے میری فضول خرچی کی عادت کی طرف توجہ دلائی۔ مجھے اس ننھی جاسوسہ اور معلمہ کی یہ ادا اتنی بھائی کہ میرا دل خود بخود چاہا کہ میں غلامی کا یہ چھلا اُتار کر پھینک دوں جو اس عادت کی وجہ سے مجھے رلاتا ہے۔ بچے بھی بعض اوقات بڑوں کے صحیح اُستاد اور مصلح ثابت ہوتے ہیں اور معصومانہ طریقہ سے ایسے کام کر ڈالتے ہیں جو دلوں میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔

زیرو کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُسے کسی عدد کے دوچند کرنے کے لیے دائیں طرف لکھا جاتا ہے۔ سائنس دانوں اور ریاضی دانوں نے زیرو کی اس خصوصیت کی وجہ سے حیرتناک نتائج اخذ کیے ہیں۔ زیرو کا عدد میرا محسن ہے جس نے میرے قلب و نظر میں وسعت پیدا کی اور کائنات کے رازہائے سربستہ سے آشنا کیا۔ زیرو بظاہر "عدم" ہے مگر اس عدم ہی میں تخلیق کا سارا جوہر موجود ہے۔ زیرو سے رفتار میں اضافہ ہوتا ہے۔ شماریات میں زیرو کے آتے ہی انسانی ذہن میں بڑے بڑے فاصلوں کو آنِ واحد میں طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ زیرو ہی تو ہے جس کی مدد سے ہم کائنات کی وسعتوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ تصوّف میں انسانی شخصیت کو زیرو پر لانا ہی اصل بات ہے۔ مگر زیرو نفی کی علامت نہیں ہے۔ زیرو کا مطلب کثرت کے سارے مظاہر کو ختم کر کے یکتائی کے عالم کو لانا ہے۔ یہی تصوّف کا منتہا ہے۔

زیرو تو نقطۂ آغاز ہے۔ جن اقوام نے اپنے اس نکتہ کو پا لیا وہی تسخیرِ کائنات کے خوشگوار عمل سے دوچار ہوگئیں۔ میں جب جاپان اور چین جیسے ممالک کی طرف نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اُن کے عہدِ شباب میں زیرو کی تمثیل نہیں بھولتی شاید انہوں نے اس نکتے کو سمجھ لیا تھا۔

میں اپنے دوست کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے زیرو کے جمپنگ پیڈ پر لا کھڑا کیا۔

نیند

آفاق احمد

نیند کہا جاتا ہے بڑی ظالم چیز ہے، کم بخت سُولی پر بھی آجاتی ہے اور اس طرح آتی ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی اور ساتھ ہی ساتھ اتنی ہرجائی بھی کہ جب نہیں آتی تو چاہے آپ ہزاروں کروٹیں بدلیں، معاشیات سے لے کر فلسفہ تک کچھ بھی پڑھیں مگر اُردو شاعری کے روایتی محبوب کی طرح پاس آکر بھی نہیں پھٹکتی اور آپ کی آنکھوں سے اس طرح بھاگتی ہے جیسے .... اچھا جانے دیجئے میں گُم شدہ سینگوں کا ذکر نہیں کرتا۔ ؎

یہ سچ ہے کہ نیند صحیح معنوں میں ایک آزاد اور بے نیاز کیفیت کا نام ہے.. کبھی آپ چاہتے ہیں کہ ظالم آجائے مگر کہاں صاحب! اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ آپ بس، ٹرین یا ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہوں.. مناظرِ فطرت اتنے خوبصورت ہوں کہ بالکل ایسا لگے جیسے حدِ نظر تک رنگ و نُور کی بارش ہو رہی ہے اور آپ کی دانستہ خواہش ہو کہ ان دل پذیر مناظر کو آنکھوں کے زینہ سے روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اتار لیں مگر کیا کیجئے نیند کی اس شریر دیوی کو جو آپ کی پلکوں کے دروازے بند کر کے پانچ پہرے بٹھا دیتی ہے ...... پانچ پہروں کی ترکیب پر غالباً آپ چونکیں گے کیونکہ محاورہ سات پہروں کا ہے... بات دراصل یوں ہے کہ حواسِ ظاہرہ پانچ ہوتے ہیں، دیکھنا، سُننا، چکھنا، سونگھنا اور چھونا.... جب انسان کو گہری نیند آتی ہے تو یہ پانچوں حواس بھی سو جاتے ہیں اور میرے نزدیک ہر حِس ایک دروازہ ہے اور بے حسی ایک تالہ .... اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگوں کی عقل پر تالے کس طرح پڑتے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ جب انسان کو نیند آئے تو یہ پانچوں حواس بیک وقت سو جائیں اور پھر ایک ساتھ جاگیں۔ نیند کے تعلق سے ان حواس کو پانچ بچوں سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے .... اب آپ تصور کی آنکھ سے دیکھیے اور سوچیئے کہ پانچ شریر بچے ایک نیم اندھیرے کمرے میں کلبلا رہے ہیں جن کو یہ حکم ہے کہ وہ کمرے سے باہر نہ جائیں... باتیں نہ کریں، کچھ کھائیں، پئیں اور لڑیں نہیں۔ بس جلدی سے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کریں۔ ان حالات میں کچھ دیر تو بچے کروٹیں بدلتے ہیں۔ کبھی کوئی معصوم سی شرارت، تو کبھی ہلکی سی ہنسی اور پھر آہستہ آہستہ نیند کا غلبہ ہوتا ہے جس میں عام طور سے سب سے پہلے، سب سے چھوٹا بچہ سوتا ہے۔ اس مناسبت سے دیکھنے کی حِس کو سب سے چھوٹا بچہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ جب انسان خواب سے بیدار ہوتا ہے تو سب سے پہلے جو حِس اثر پذیر ہوتی ہے وہ ہے سُننا۔ کوئی بھی آہٹ سُنی آپ چونک پڑے۔ کوئی زور سے بولا آپ کی نیند کے ریشمی دھاگے ٹوٹ گئے۔ چونکہ بڑوں کو مقابلتاً کم نیند آتی ہے اس لیے بڑے اور چھوٹے کی تقسیم کے اس دَور میں سُننے کی حِس کو مقابلتاً سب سے بڑا مانا جا سکتا ہے۔ پانچ بچے ایک کمرے میں ہوں اور ایک ہی حکم کے ساتھ پانچوں سو جائیں ایسا عام طور سے نہیں ہوتا۔ یہی حال نیند کی حالت میں ہمارے حواس کا ہوتا ہے۔ کبھی پانچوں سو جاتے ہیں تو کبھی چار، کبھی تین تو کبھی صرف دو... بظاہر یہ انہونی سی بات لگتی ہے۔ مگر خیال کیجئے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ آنکھیں بند کیے سو رہے ہیں مگر اس نیند کے عالم میں بھی آپ کی بیگم اور پڑوسن کی زبانوں سے نہ رُکنے والی الفاظ کی بارش کی سیلن آپ اپنے تحت الشعور میں محسوس کر رہے ہوں؟ یا درچی خانہ میں تلی جانے والی آپ کی کسی من پسند ڈش کی خوشبو آپ کی کچی نیند میں گھُس کر آپ کو عالمِ خواب میں کھانے کی ایسی میز پر لاکر بٹھا دے جہاں آپ کی من پسند غذائیں آپ کو دعوتِ نظارہ دے رہی ہوں اور رال ہو کہ

ملکے جاتی ہو۔ ایسا بھی ضرور ہوا ہوگا کہ کسی شریر مچھر نے آپ کے گال پر محبت بھرا بوسہ لیا ہو اور اس کی تیکھی چبھن پر آپ ایک لمحے کے لیے جاگے بھی ہوں گال کو سہلایا ہو اور پھر کروٹ بدل کر کھانے کی میز کے حسرت انگیز خواب کا تانا بانا جوڑنے میں لگ گئے ہوں ... یہ سب ایسی ہی کیفیتیں ہیں جب پانچوں حواس بیک وقت نہیں سوتے ورنہ جب گہری نیند آتی ہے تو بقول شیکسپیئر

"دانت کا درد بھی محسوس نہیں ہوتا۔"

نیند دراصل کیا ہے اس پر "فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست" کے مترادف تقریباً ہر معقول شخص نے طبع آزمائی کی ہے.. اگر خادم کی معقولیت میں آپ کو کبھی کوئی شبہ رہا ہو تو میری یہ طبع آزمائی ایک اشارہ ہے جسے ہر عقلمند کے لیے یقیناً کافی ہونا چاہیے.. یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا ورنہ ذکر ہے نیند کا۔

کسی نے اس کو ایک ایسی چھلنی کہا ہے جس میں سے زندگی کی تمام کثافتیں چھن جاتی ہیں۔

کسی نے اس کو ایسی الوہی خود فراموشی کہا ہے جس کی آغوش میں انسان ہر دکھ، ہر چبھن اور ہر محرومی بھلا دیتا ہے۔

کسی نے اس کو موت اور زندگی کے درمیان ایک حدِ فاصل کہا ہے اور کسی کے نزدیک یہ ایک ایسی مجرب دوا ہے جو روح کا بخار تک اتار دیتی ہے کون اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ اگر نیند آجائے تو یہ بھوکے کے لیے غذا، پیاسے کے لیے چشمۂ آبِ حیات اور سردی سے کانپتے ہوئے جسم کے لیے حرارت بن جاتی ہے۔

کساد بازاری کے اس عہد میں ہر سکہ کی قیمت گھٹتی اور بڑھتی رہی ہے مگر نیند روزِ اول سے آج تک بلکہ ہمیشہ سے ایسا سکہ رہی ہے جو کچھ بھی خرید سکتا ہے ...... جمہور کی چھتر چھایا میں پنپتے ہوئے اقتصادی اور سماجی نابرابری کے اس دور میں بھی صرف نیند ہی ایک ایسی ترازو ہے جس میں امیر غریب، فقیر، عقلمند، بیوقوف غرض سب برابر تُلتے ہیں۔

انگریزی ادب میں نیند کو موت کا چھوٹا بھائی کہا جاتا ہے ... ہم سخن فہم نہ سہی مگر غالب کے طرفدار ضرور ہیں۔ وہ کہتے ہیں

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

ممکن ہے مغرب سے مشرق کے اس طویل سفر میں نیند کی جنس بغیر کسی آپریشن کے بدل گئی ہو... آپ سے میرے مزاج کی مشرقیت سمجھیں یا کچھ اور مگر جو بات نیند کی تانیث میں ہے تذکیر میں کہاں۔

نیند کا تصور ہی ہر سمجھدار آدمی کے لیے ایک ایسی سرمئی پری کا ہے جو اپنے ریشمی آنچل کو سرسراتی، مدھر سروں میں گنگناتی، خاموشی کا جادو جگاتی، پہاڑوں، میدانوں اور ریگزاروں کے لب سیتی چلی جاتی ہے... اُس کا جادو بھرا لمس ہر ذی روح کے انگ انگ سے زندگی کے زہر کی آخری بوند تک نچوڑ لیتا ہے ...... یہ ایک اتنی بلند منزل ہے جس کی کھلی ہوئی کھڑکیوں تک زندگی کی گرد تک نہیں پہنچتی .... یہ ایک ایسی کیفیت ہے جہاں وجود کی ہر گرہ ایک زیرِ لب مسکراہٹ میں گھل جاتی ہے۔ نیند کو مذکر سمجھنا میرے نزدیک ایک ایسی ہی بد ذوقی ہے جیسے کوئی کھردرا ہاتھ، نیند کی ایک ہچکیہ آپ کے حلق میں ٹھونس کر ایک گھونٹ پانی دیتے ہوئے کہے۔

یہ میری طرف پٹر پٹر کیوں دیکھ رہے ہو .... سوتے کیوں نہیں۔

بیسویں صدی جس میں عورت زندگی کے ہر میدان میں نہ صرف مرد سے برابری کا دعویٰ کر رہی ہے بلکہ اس کے لیے عملی جدوجہد بھی ... یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ نیند چاہے مذکر ہو یا مؤنث مگر ہے بہت خوبصورت چیز۔ ایک ایسی سنہری زنجیر جس سے انسان کی زندگی اور تندرستی دونوں بندھے

ہوتے ہیں۔

انسان جب سو کر اُٹھتا ہے تو اُس کے سامنے بس ایک دنیا ہوتی ہے۔ ہماری، آپ کی دنیا ... وہی مناظر ... وہی زندگی کا میکانکی عمل، وہی تھکے تھکے نڈھال چہرے .. جو زندگی کرنے کی جدوجہد میں ہانپتے، کانپتے ایک دائرے میں گھوم رہے ہیں۔ جہاں خوابوں کے نازک شیشے حقیقت کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر چور چور ہوتے رہتے ہیں۔ پاؤں زخمی ہیں مگر تھم نہیں سکتے۔ اس کے برعکس نیند ہر روز نئے جہانوں کی سیر کراتی ہے۔

کوئی منظر اپنے آپ کو نہیں دہراتا .... لوگ نیند کو موت سے عبارت کرتے ہیں مگر نیند ایک ایسی موت ہے جس سے انسان جینے کا حوصلہ اور قوت پاتا ہے۔ اس کے آنگن میں زندگی کی کڑواہٹیں شہد کی ندیاں بن جاتی ہیں۔ نیند کی حالت میں حسرتوں کے جنازے بہت کم اُٹھتے ہیں۔ محرومیوں کے تمام داغ دُھل جاتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ نیند میں ہمارا رشتہ زندگی سے یکسر ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ تسلیم کہ نیند کی حالت میں ہمارا شعور بڑی حد تک خاموش ہو جاتا ہے، مگر لاشعور پھر بھی بیدار رہتا ہے۔ زندگی کی کچھ الجھنیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو شعور اور تحت الشعور کی چھلنی سے گزر کر لاشعور کی بیکراں وسعتوں میں چکراتی پھرتی ہیں اور کبھی کبھی نیند کی رومان پرور وادیوں میں شب خون مارتی ہیں۔ ہماری منتشر نیند، ہمارے ڈراؤنے خواب اسی کیفیت کی دین ہیں۔

یہ مانا کہ نیند ایک ایسا عالم ہے جس میں ہمارے نروس سسٹم کا عمل یکسر بدل جاتا ہے اور جب ہم سوتے ہیں تو ایک ایسے عالم میں داخل ہوتے ہیں جس کے خدوخال عالم بیداری سے بالکل میل نہیں کھاتے۔ مگر اس کے باوجود ہماری محرومیاں، خوشیاں، احساسات اور تجربات اکثر کسی نہ کسی صورت میں نیند کی مخملی فضا میں سر اُبھارتے رہتے ہیں۔

نیند کی اتنی تعریف سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی غلط ہوگا کہ انسان جتنا سوئے اتنا اچھا! ایسا بھی نہیں ہے .. نیند ایک ایسا زہر ہے جو مناسب مقدار میں لیا جائے تو تریاق۔ اگر مقدار گھٹ یا بڑھ جائے تو موت۔ موت سے میری مراد محض طبعی موت نہیں بلکہ صلاحیتوں اور قوتِ عمل کی موت ہے۔ نیند اچھی جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے نہ صرف ضروری بلکہ اشد ضروری ہے۔ اس کی بے حد کمی یا غیر فطری زیادتی سے ہمارا اعصابی نظام بے طرح متاثر ہوتا ہے۔ اگر انسان کی نیند پوری نہ ہو تو بھی اس کا جسم ٹوٹا ٹوٹا رہتا ہے .... اگر زیادہ دیر تک سونے کے بعد اُٹھے تب بھی کم و بیش یہی حالت ہوتی ہے۔

انسان کتنا سوئے اس کا کوئی طے شدہ پیمانہ نہیں ہے۔ کیونکہ نیند کا دورانیہ بہت سے عوامل پر منحصر ہوتا ہے۔ آپ کی عمر، آپ کا پیشہ، آپ کی تندرستی۔ آپ کی قوتِ ارادی اور بہت سے جغرافیائی اور نفسیاتی عوامل۔ ہم کتنا سوئیں اس کا بہترین پیمانہ یہ ہے کہ جتنے گھنٹے کی نیند کے بعد آپ اپنے آپ کو تروتازہ محسوس کریں اور نئے دن کا استقبال ایک پُرامید سی مسکراہٹ سے کریں، وہی مناسب نیند ہے۔

بچے، بڑوں کے مقابلے میں زیادہ سوتے ہیں، کیونکہ وہ بڑوں کے مقابلے میں زیادہ تھکتے ہیں۔ بظاہر یہ بات آپ کو عجیب سی لگے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں ان میں سے زیادہ تر کام ایک مشینی عمل ہوتے ہیں، اور بہت کم ایسے کام جو ہمیں تھکاتے ہیں۔ اس کے برعکس بچے دن بھر ہر چیز کو دیکھنے، سمجھنے اور یاد رکھنے کی کوشش میں زیادہ تھک جاتے ہیں۔ اسی لیے نیند کی زیادہ ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

آپ وہ سبزۂ چمن ہوں جسے سایۂ گل میں نیند آئی ہو یا وہ زخم نصیب جو کانٹوں کے بستر پر سوتا ہے۔ نیند چاہے صلیب پر آئے یا کسی آرام دہ بستر پر، بہرکیف نیند انسانی زندگی کا ایک ایسا لازمی حصہ ہے کہ اگر اس سے ناطہ ٹوٹ جائے تو پھر زندگی سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یوں بھی نیند سے محروم انسان جب تک زندہ رہتا ہے وہ زندگی محض الزام ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو ہزاروں برسوں سے آج تک مجرموں سے اقبالِ جرم کے

لیے انہیں نیند سے محروم رکھنے کے فارمولے پر عمل نہ کیا جاتا۔

نیند کی کمی سے اُن کی قوتِ مدافعت نہ صرف کم بلکہ تقریباً ختم ہو جاتی ہے اور وہ سچائی اُگل دیتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بعض شبہ میں پکڑے گئے لوگ صرف اس لیے ناکردہ گناہوں کا اقبال کر لیتے ہیں کیونکہ انہیں نیند سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ ان میں یہ سوچنے ، سمجھنے کی صلاحیت بھی ختم ہو جاتی ہے کہ ان کا یہ اقبال انہیں پھانسی کے تختے پر لٹکا سکتا ہے۔

نیند سے محروم ایک بیمار فلسفی ایک ڈاکٹر سے ملا تھا تو اُس نے انتہائی سنجیدگی سے صرف ایک ہی مشورہ دیا تھا۔

"فلسفہ کے لیے نیند قربان کرنے کے بجائے بہتر ہے آپ نیند کا فلسفہ پڑھیں "

نیند کے کیف آور اور خوابیدہ ذکر کو پڑھتے پڑھتے اگر آپ ابھی تک نہیں سوئے ہیں تو یہ اور پڑھ لیجئے کہ اُس کے غیر مرئی وجود کو گرفت میں لینے کی اِن تھک کوشش میں میری آنکھیں بند ہوا چاہتی ہیں۔ اور اُس کے گہرے دراز ہوتے ہوئے سائے میرے وجود کو سمیٹے لے رہے ہیں۔ حضور اجازت دیجئے مجھے نیند آرہی ہے!

ناک

نذیر احمد راہی

ناک ایک اہم عضو ہی نہیں، ایک غیر معمولی معاشرتی سمبل (SYMBOL) بھی ہے۔ اگر آپ شریف آدمی ہیں اور اتفاق سے آپ کا ناک نقشہ اچھا نہیں ہے تو بھی معاشرے میں آپ کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور یہ سب کچھ آپ کی ناک کی بدولت ہے۔ اُردو میں ناک کا لفظ عزت و شرافت کے معنوں میں مستعمل ہے۔ آپ نے اکثر سُنا ہوگا کہ فلاں کام سے فلاں آدمی کی بھرے محلے میں ناک کٹ گئی یعنی اُس کی عزت جاتی رہی۔ ایک اور محاورہ ہے ناک میں دم کرنا یا ناک میں دم ہونا۔ دم تو ہوتا ہی ناک میں ہے آپ ایک منٹ کے لیے اپنی ناک کی سُرنگ کے دونوں دہانے بند کرکے دیکھ لیجئے اس محاورے کا مفہوم کلیتاً آپ پر واضح ہو جائے گا۔ لسانیات میں ناک کی اہمیت مسلّمہ ہے یہی وجہ ہے کہ انگریزی میں بھی باکسنگ کے کھیل میں ایک اصطلاح ناک آؤٹ (KNOCK OUT) مستعمل ہے یعنی پچھاڑ دینا، ضرب سے بے ہوش کر دینا وغیرہ اور ایک اصطلاح ناک آف (KNOCK OFF) ہے یعنی ناک کو بند کر دینا، کاٹ لینا (بل وغیرہ میں سے رقم کاٹ لینا) ناک (KNOCK) ضرب لگانے کو کہتے ہیں لیکن اپنی ناک یہ ناک آؤٹ قطعاً برداشت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

ناک کے نتھنے دو تاریک غاروں کے مانند ہیں، جو طویل راستے طے کرنے کے بعد حلق کی خنک وادی میں اُتر جاتے ہیں۔ ان غاروں کے نچلے دہانوں پر خود رَو جھاڑیاں اور گھاس پھونس بکثرت اُگ آتا ہے جو ان کے اندر کی فضا کو معتدل بنانے کے لیے ازحد ضروری ہوتا ہے۔ ناک کے بال مٹی کے ذرات اور دیگر غیر مرئی حشرات وغیرہ کو اپنے جسم کی صلیب پر لٹکا لیتے ہیں اور اس طرح سانس لیتے وقت ہوا اِشنان کر کے ناک کے مقدس معبد میں ہوتے ہوئے قدم رکھتی ہے اور پھر حلق کی بارہ دری کے ذریعے پھیپھڑوں کے طویل و عریض گنبد میں جا کر پناہ گزین ہوتی ہے۔

ناک کے نتھنوں کے نیچے ایک کشادہ وادی ہے جو خود رَو گھاس سے ڈھکی ہوئی ہے۔ لیکن بعض لوگ اس وادی کی ہریالی کو پسند نہیں کرتے اور انہیں بلیڈ کی تیز دھار کے سپرد کر دیتے ہیں جس کے سبب سانس کا رزق حاصل کرتے وقت ہوا کی سلطنت میں شامل جراثیم غار کی خفیہ یاترا کے لیے بغیر پاسپورٹ اندر داخل ہو جاتے ہیں اور غار کی مقدس راہداری عبور کر کے مرمریں ملائم دیواروں پر پھسلتے ہوئے سانس کی نالی سے پھیپھڑوں کی اہم تنصیبات تک پہنچ جاتے ہیں۔

ناک چہرے کا دارالحکومت ہے۔ چونکہ یہ اپنی سلطنت کے عین وسط میں سطح مرتفع پر واقع ہے اس لیے اسے ایک انتہائی اہم مقام حاصل ہے اور اس کے دائیں بائیں دو دُور بینیں لگی ہوئی ہیں ان دُور بینوں کے اُوپر سرحدی علاقے میں دو گھنے محرابی جنگل آباد ہیں۔ یہ ان دُور بینوں کی حفاظت کے لیے سائبانوں کا کام دیتے ہیں۔ اور انہیں زیادہ روشنی اور بارش وغیرہ سے محفوظ رکھتے ہیں۔ ان جنگلوں سے پرے ایک طویل چٹیل میدان ہے جو کسی وقت تو گنجان جھاڑیوں سے اٹا ہوا کرتا تھا لیکن اب اُس کی گنجانیت تقریباً معدوم ہو چکی ہے۔ دُور بینیں جراثیمی عساکر کے ممکنہ حملے سے دفاع کے لیے صورت حال کا ہمہ وقت جائزہ لیتی رہتی ہیں۔ موسمی تغیرات بھی اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب خنکی شدید ہو جائے تو ناک کے بالائی راستے سے تند و تیز رود کوہیاں بہہ نکلتی ہیں جو اپنی رَو میں آنے والی ہر شے کو تہس نہس کر ڈالتی ہیں۔ لہٰذا ان سے بچاؤ کے لیے نسوار کی چٹکی نے کر سُونگھنی پڑتی ہے جس کے باعث بعض اوقات رود کوہیاں راستے میں ہی سُوکھ جاتی ہیں۔

بعض لوگوں کے عملی زندگی گزارنے میں ناک کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے کیونکہ وہ ناک کی سیدھ میں چلتے ہیں۔ اور زمانے کی خشکی و تری کو خاطر میں نہیں لاتے۔ دراصل ایسے لوگ ہی اپنا مقصدِ حیات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ دنیا کے نشیب و فراز کی اُن کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں ہوتی۔

ناک انسانی جسم کی انتہائی اہم مشینری ہے۔ اسی سے پورے بدن کو سانس کی ترسیل ہوتی ہے۔ اور نہ صرف سانس مہیا کیا جاتا ہے بلکہ اُسے ریفائن کر کے نبضوں میں مربوط و منضبط کیا جاتا ہے۔ یہ مشینری سونگھنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتی ہے۔ آپ کسی بھی صاف ستھری جگہ پر کھڑے ہوں لیکن ناک وہاں پر موجود پوشیدہ گندگی کی معمولی سی بو آپ کے نتھنوں میں سے کر دماغ کے پلانٹ میں ارتعاش پیدا کر سکتی ہے۔

ناک ایک معاشرتی اکائی ہے کیونکہ آپ ناک کے بغیر معاشرے میں کچھ مقام حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر آپ کی عزت قائم ہے تو ناک بھی اللہ کے فضل سے سلامت رہے گا۔ اور اگر ناک ہوگا تو آپ کا معاشرتی تشخص بھی برقرار رہے گا۔ بصورتِ دیگر آپ اپنے ڈرائنگ روم کی زینت بن سکتے ہیں، یا گپھاؤں میں جا کر پناہ لے سکتے ہیں لیکن معاشرہ آپ کو قبول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اُسے اپنے اُصول و ضوابط اور رسوم و رواج عزیز ہیں نہ کہ آپ کی شخصیت!

ناک ہی کی بدولت آپ دُنیا بھر کی خوشبوؤں سے حظ اُٹھا سکتے ہیں جونہی کسی خوشبو کا ہلکا سا جھونکا آپ کے ناک کی سرحدوں میں داخل ہوتا ہے ناک کے حساس تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔ اور مشامِ جاں میں معطر عناصر کی حکمرانی قائم ہو جاتی ہے۔ آپ فرحت محسوس کرنے لگتے ہیں، اور ایک لمحے کے لیے سبھی غم و آلام کی گرفت سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔

کبھی کبھی ناک کے پلانٹ میں بھی کوئی تیکنیکی خرابی پیدا ہو جاتی ہے جس کے باعث سانس لیتے وقت مجھے اپنے ناک سے ہلکی سی سیٹی کی آواز سنائی دیتی ہے اور بچے تو اس سیٹی کی آواز سے بڑے خوش ہوتے ہیں اور تیزی سے سانس لینے لگتے ہیں جس سے سیٹی کی آواز میں شدت آجاتی ہے۔

بعض لوگ خراٹے لیتے وقت اپنی ناک کو پھلانے کے فن میں طاق ہوتے ہیں۔ جس سے اُن کی ناک دریائے سندھ کے بہاؤ کی طرح اپنا رُخ تبدیل کرنے لگتی ہے اور زِگ زیگ انداز میں عجیب و غریب نظر آنے لگتی ہے۔ چشمہ لگاتے وقت اُس کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے جب تک ناک کی یہ ترچھی چٹان نہ ہو عینک چہرے کی زینت بننے میں لیت و لعل سے کام لیتی ہے۔ اگر آپ کی نظر خدانخواستہ کمزور ہے اور ڈاکٹر نے آپ کو عینک لگانے کا مشورہ بھی دیا ہے تو ناک کی عدم موجودگی میں آپ یہ فریضہ بحُسن و خُوبی سرانجام نہیں دے سکیں گے اور آپ اس کی اہمیت و افادیت کے فوراً قائل ہو جائیں گے۔

عورتیں اپنے ناک پر جو نتھلی لگاتی ہیں تو یہ کچھ زیب نہیں دیتا۔ اس سے بلاوجہ ایک بدہیئتی کا اظہار ہوتا ہے اور یہ غلامانہ ذہنیت کی عکاس ہے کیونکہ قدیم دور میں جب عورت کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا تو اُس کے کان، ناک چھید دیئے جاتے تھے۔ جس سے اُسے اذیت دینا مقصود تھا۔ پھر ان چھیدوں میں کانسی اور لوہے کے زیورات لٹکا کر انہیں گھسیٹا جاتا تھا۔ اسی طرح مختلف اذیتیں دے کر انہیں نیلام کیا جاتا تھا۔ اور اُن کی عزت کو خاک میں ملا دیا جاتا تھا۔

جانور بھی اسی ناک کی بدولت بہت سے خطرات سے محفوظ رہتے ہیں۔ کیونکہ ناک کے حساس تار انہیں پیش آمدہ خطرے سے آگاہ کر دیتے ہیں۔ اُن کے جسموں کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں جس سے وہ خود کو آنے والی صورتِ حال کے لیے مستعد کر لیتے ہیں۔ بعض جانور اپنے شکار کی بُو پا لیتے ہیں اور ناک کو مختلف زاویوں سے چڑھاتے رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں میں نے گھر کی پالتو بلی کو دیکھا کہ بیٹھے بٹھائے اچانک اُس کے کان کھڑے ہو گئے۔ ناک عجیب انداز میں پھولنے پچکنے لگی، جسم کے تمام بال ڈیڑیاں اُٹھا اُٹھا کر اُس طرف دیکھنے لگے جدھر بلی کی نظریں جمی تھیں۔ پھر میں نے ایک موٹے سے بھورے چوہے کو دُم دبائے ایک طرف بے تحاشا دوڑتے دیکھا۔ جس کے دونوں کان سینگوں کی طرح کھڑے تھے۔ بلی اس پر جھپٹی مگر وہ اُس وقت اُس کی دسترس سے محفوظ ہو چکا تھا۔ شاید اُس کی ناک کے اندرونی راڈار پر خطرے کی لہریں جھلملانے لگی تھیں جس سے وہ بروقت شکار ہونے سے بچ گیا۔ ناک بیک وقت شکار بھی کرتی ہے اور ناک والے کو شکار

چھننے سے بھی بچاتی ہے۔ ہر چیز کی پہچان اُس کی "بُو" سے ہے اور ناک ہی وہ واحد ہتھیار ہے جس کی مدد سے "بُو" تک پہنچنا ممکن ہے۔ وہ لوگ جن کی بینائی اور سماعت چھن جاتی ہے ان کے لیے ناک ہی آنکھ ہے اور کان بھی! سو ناک محض ایک آرائشی شے نہیں، یہ تو ایک متبادل سسٹم ہے۔ ہم انسانوں کی یہ بد قسمتی ہے کہ ہم نے ناک کو اس سسٹم سے منقطع کر کے اسے محض آرائش و زیبائش کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اور یوں ایک زبردست قوت سے بتدریج محروم ہوتے چلے گئے ہیں۔

ناک اور نزلے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب تک نزلہ نہ ہو، ناک کے وجود کی طرف سے آدمی بے نیاز سا رہتا ہے۔ اور نزلہ زکام کی صورت میں جیبی رومال ہر وقت ناک کے نتھنوں پر جمائے رہتا ہے گویا ناک کے فرار کا خدشہ لاحق ہوتا ہے۔

پھیلتی سکڑتی ناک اندرونی چپقلش کو ظاہر کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے چہرے کے عضلات میں کھچاؤ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی کھچاؤ بالآخر نفسیاتی اُلجھنوں کا سبب بنتا ہے جس سے انسان ذہنی مریض بن جاتا ہے۔ گویا ناک دماغی ریاست کے معاملات میں بار بار مداخلتِ بے جا کی مرتکب ہوتی ہے جس سے اُس کی غیر جانبدارانہ حیثیت کی قلعی کھل جاتی ہے۔

ناک دونوں آنکھوں کے درمیان بفر سٹیٹ (BUFFER STATE) کی حیثیت رکھتی ہے بالفاظِ دیگر یہ ایک متنازع فیہ علاقہ ہے جس کے باعث دونوں آنکھوں کے مابین سرد جنگ ہوتی رہتی ہے لیکن ناک کی مستحکم ریاست کی وجہ سے اس پر کوئی بھی فریق قبضہ نہیں کر سکتا۔

ناک آزادی اور ثابت قدمی کی علامت ہے۔ یہ ناروا پابندیاں قطعاً قبول نہیں کرتی۔ اور اپنے تشخص کا احترام کرانا بھی جانتی ہے۔ چھینکنے کا عمل اس کی خود پسند اور متشدد طبیعت کا غماز ہے اور یہ اس بات کا اعلان ہے کہ سرکش قوتوں کو کچلنا ایک خطرناک اقدام ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ ناک کی عروجیت کا اعتراف بھی ہے کہ اسے اُٹھنا آتا ہے جھکنا نہیں۔

پتھر کی نسل

کے بعد

سیدہ حنا کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ

"جھوٹی کہانیاں"

عنقریب منظرِ عام پر آ رہا ہے

گوبھی کا پھول

خالد اقبال

پھولوں میں مجھے گوبھی کا پھول پسند ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات میری اس پسند کو احمق کی پسند قرار دیں اور مجھے بد ذوق کہیں مگر مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ گوبھی کے پھول کو پسند کرنے سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ مجھے دیگر نرم و نازک، لطیف کومل نرمل پھولوں گلاب، چنبیلی، نرگس، سورج مکھی، موتیا، کنول سے محبت نہیں۔ پھر بھی میں ہر صبح جب ہوا خوری کے لیے گھر سے نکلتا ہوں تو سب سے پہلے گوبھی کے پھولوں کو دیکھنے جاتا ہوں اور گوبھی کے پھول کا دودھیا چمکتا مکھڑا دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتا ہوں کہ نہ جانے شاعروں نے اس جانب توجہ کیوں نہ کی حالانکہ شاعر حضرات چاہتے تو اس کے من موہنے مکھڑے کو اپنے محبوب سے تشبیہہ دے سکتے تھے۔ خدانخواستہ اگر میں شاعر ہوتا تو اپنی غزل کے مطلع یا مقطع میں گوبھی کے پھول کے حوالے سے کوئی نہ کوئی مضمون باندھنے کی سعی ضرور کرتا بلکہ اسے بطور تخلص باندھنے کی جسارت بھی کرتا مگر کیا کروں میں شاعر نہیں ہوں۔

کچھ لوگ ناقدریٔ زمانہ کا شکار ہوتے ہیں محض اپنی گوشہ نشینی، قناعت یا شرافت کی وجہ سے یہی معاملہ گوبھی کے پھول کے ساتھ ہے جب کہ سورج مکھی کے پھول کو دیکھئے کہ کیسا زمانہ ساز — ہاں میں ہاں ملانے والا پھول ہے اپنی مرضی سے گھوم پھر نہیں سکتا۔ سورج کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ دھوپ ہو یا چھاؤں اسے کسی کی پرواہ نہیں۔ سورج کی آنکھ کھلتے ہی بیدار ہو جاتا ہے اور سورج کی آنکھ بند ہوتے ہی سو جاتا ہے گویا اس کا ہر عمل اس کے اختیار سے باہر ہے یہ چڑھتے سورج کا پجاری ہے۔ سورج مکھی اور گوبھی کے پھول میں یہی بڑا تضاد ہے کہ گوبھی کا پھول تو گوشہ نشین، قلندر صفت، نرم مزاج ہے اور کبھی کسی کی بے جا خوشامد نہیں کرتا، نہ کسی کے آگے جھکتا ہے بلکہ انا پرست پھول ہے۔ دوسری طرف گلاب کے پھول کو دیکھئے کہ ہر شخص کے گلے کا ہار بن جاتا ہے، کیسا خوشامدی ہے! مجھے یہ بات گوبھی کے پھول میں کہیں نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اسے دیگر پھولوں پر فوقیت دیتا ہوں پھر یہ تیز کانٹوں سے بھی تو مسلح نہیں۔ اسے ہاتھ لگا کر دیکھئے کیا مجال جو کہیں کوئی کانٹا چبھ جائے۔ نہ جانے پھر کیوں یہ شاعر، تتلیاں اور بھونرے، گلاب ایسے پھولوں کے پیچھے پاگل بنے مارے مارے پھرتے ہیں اور ان بد مزاج پھولوں کو دیکھئے کہ اگر کوئی انہیں ہاتھ لگانے کی کوشش کرے تو یہ اپنے کانٹوں سے اس کا استقبال کرتے ہیں۔

گوبھی کا پھول دنیا کے کن کن شمالی — جنوبی علاقوں میں پایا جاتا ہے؟ اگر وہاں پایا جاتا ہے تو اس پھول کے بارے میں وہاں کے لوگوں کا کیا ردِ عمل ہے؟ یہ سب کچھ بتانے سے میں قاصر ہوں اس لیے یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ ایک خوشنما دیدہ زیب سوندھی سوندھی مہک والا پھول جو سبز رنگ کے لباس میں ملبوس ہے انفرادی خصوصیت کا حامل ہے۔ اگر میں کسی دفتر میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہوتا تو اپنی TABLE پر مختلف پھولوں کا گلدستہ سجانے والے کو گوبھی کا پھول سجانے کے لیے کہتا کیونکہ گوبھی کا پھول بنا بنایا گلدستہ ہے اور پھر یہ مرجھا جانے کے ستم سے بھی پاک ہے۔ میرے خیال کے مطابق "اگر پھولوں کو توڑنا سخت منع ہے" والی بات درست ہے تو پھر گوبھی کے پھول کو کھا جانا گناہِ کبیرہ سے ہرگز کم نہیں۔

گوبھی قبیلے کا ایک فرد، بند گوبھی کا پھول کہلاتا ہے مگر اس میں نسوانیت بہت زیادہ ہے ہمہ وقت گھونگھٹ کاڑھے رہتا ہے یا شاید کسی پہنچے ہوئے

صوفی کی طرح ہے کہ پرت در پرت اور لعاب اندر نقاب ہے ــــ مگر نسوانیت والی بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ بند گوبھی پھول ہی شرمانے، لجانے خود میں سمٹ جانے کا وصف بہت نمایاں ہے، سو اگر بند گوبھی کو گوبھی کے پھول کی محبوبہ قرار دیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، بہر حال گوبھی کا پھول اپنی رنگت اور جسامت کے اعتبار سے پھولوں کا شہزادہ ہے۔

بزرگوں کا کہنا ہے کہ خود اعتمادی بڑے کام کی شے ہے۔ جس کسی میں خود اعتمادی نہیں وہ سدا احساسِ کمتری کا شکار رہتا ہے گلاب، چنبیلی، موتیا یہ سب اگرچہ پُرکشش ہیں لیکن خود اعتمادی سے یقیناً محروم ہیں۔ ذرا تیز ہوا چلے تو یہ پتّی پتّی ہو کر زمین پر آرہتے ہیں، زمانے کا مقابلہ تو کر ہی نہیں پاتے۔ لیکن گوبھی کے پھول کو دیکھیے کہ کھلی آب و ہوا میں رہنے کے باوجود کس قدر POWERFUL ہے گوبھی کا پھول حسد اور رشک دونوں سے بے نیاز ہے۔ سب زرد، سُرخ، نیلے، پیلے پھول ایک دوسرے سے بہت جلتے ہیں۔ آپ گلاب کی طرف مائل ہوں تو چنبیلی جل کر خاکستر ہو جائے گی، نرگس آنسو بہانے لگے گی گویا نسوانی جلاپا دوسرے تمام پھولوں میں ایک قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہے مگر مردانہ خوبیوں کا حامل گوبھی کا پھول اس قسم کی باتوں پر ہمیشہ خندہ زن رہا ہے۔

یہ کتاب راولپنڈی کی غزل کی تاریخ بھی ہے اور تذکرہ بھی۔ مرتب کا یہ دعویٰ درست ہے کہ راولپنڈی کے شعرا کا اتنا تفصیلی جائزہ پہلے کبھی مرتب نہیں ہوا۔ (انور سدید)

شعرائے راولپنڈی

مرتبہ

بشیر سیفی

جس میں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۸۰ء تک راولپنڈی کے تقریباً تمام شعرا کا ذکر معہ نمونۂ کلام اور منتخب شعرا کی غزلیں معہ کوائف شامل ہیں۔

آفسٹ طباعت ۱۲۸ صفحات۔ دبیز کاغذ

قیمت مجلد ۲۰ روپے

ناشر: شاخسار پبلشرز۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۶۰ راولپنڈی

میرے پسندیدہ انشائیے

ھرچرن چاولہ

وزیر آغا نے مجھے بھی "اوراق" کے انشائیہ نمبر میں شمولیت کی دعوت دی ہے۔ ان کے انشائیوں کا مجموعہ "دوسرا کنارہ"، سلیم آغا قزلباش کا "سرگوشیاں" انور سدید کا "ذکر اس پری وش کا" اور جمیل آذر کا "شاخِ زیتون" شروع سے ہی مجھے ملے اور میرے زیرِ مطالعہ رہے ہیں۔ اکثر یہ چاروں کتابیں میرے ساتھ میرے گھر کی سٹڈی ٹیبل سے دفتر کی میز تک سفر بھی کرتی رہی ہیں اور جب جب میں فرصت کے کچھ لمحے چُرا سکا ہوں میں نے دوسرے ادب کے مطالعہ کے ساتھ انہیں بھی برابر کا وقت دیا ہے۔ مگر میں نے آج ۳۵ سال تک افسانہ نگاری کرنے کے باوجود افسانے پر بھی کوئی خاص مضمون نہیں لکھا تو انشائیہ پر کیا لکھ سکوں گا مگر نہ جانے کیوں اس بار 'کیا لکھ سکوں گا' کے ساتھ لفظ 'کیا' ہٹا لینے کو دل چاہنے لگا ہے۔

آج جب ڈاکٹر وزیر آغا "اوراق" کا انشائیہ نمبر نکالنے کا اعلان کرتے ہیں تو قاری سوچنے لگتا ہے کہ اُسے انشائیہ کے نام پر کسی اور کھلونے سے نہیں بہلایا جائے گا کیونکہ انشائیہ پر اتنی محنت اور بحث مباحثہ کے بعد اس کی اتنی واضح تصویر قاری کے سامنے آچکی ہے کہ وہ اب اُسے لائٹ ایسے بھی کہنے کو تیار نہیں۔ لائٹ ایسے آپ اُسے انگریزی میں کہتے رہیں کیونکہ انگریزی میں آپ کے پاس اور کوئی ایسا بھرپور نام ہی نہیں جبکہ اردو میں آپ اُسے انشائیہ نہیں تو اب اور کون سے نام سے پکار سکتے ہیں؟

انشائیہ میں اب جو گہرائی اور گیرائی دیکھنے میں آنے لگی ہے وہ 'چچا چھکن نے تصویر ٹانگی' جیسے مزاحیہ مضمون سے اُسے بہت آگے لے گئی ہے۔ انشائیہ قاری کو ایک صاف تصویر کی طرح دکھائی دیتا ہے جس کے ہر موڑ کے ساتھ اُس کا ذہن بھی موڑ کاٹتا، اور موڑ کے ڈگمگاہٹ جھیلتا ہے۔ اور قاری محسوس کرتا ہے کہ جو کچھ انشائیہ لکھتے وقت انشائیہ نگار کے ساتھ بیتتا رہا ہے انشائیہ پڑھتے ہوئے وہی ہل چل اور اتھل پتھل اس کے ذہن کے ساتھ بھی ہوتی رہی ہے۔ جب کہ 'چچا چھکن نے تصویر ٹانگی' میں تصویر ٹانگتے ہوئے شیشے کا ٹوٹنا، ہاتھ کا زخمی ہونا، کیل کا نہ ملنا، سوتری کا عین موقعہ پر نمارد ہو جانا، ایک ایک چیز کے لیے ایک ایک آدمی کا دوڑایا جانا، وغیرہ قاری کو ذہنی طور پر قبول نہیں ہوتا۔ اُس کا ذہن چچا چھکن کی مشکلات کے ساتھ ساتھ نہیں چلتا بلکہ اُسے برداشت کرتا ہے۔ وہ اُسے لائٹ ایسے کہہ کر اپنا دل بہلا لیتا ہے اور سوچتا ہے جیسے اُسے خواہ مخواہ ہنسنے ہنسانے کا سامان مہیا کیا گیا ہے یا جیسے لکھنے والے نے اُسے کہا ہو کہ آپ کو ہنسنا ہے تو میرے ساتھ چلئے۔ آپ کو پتہ ہے کہ میری ٹانگیں صحیح سلامت ہیں مگر میں تو ٹیڑھا اس لیے چل رہا ہوں کہ آپ کو ہنسا سکوں۔ آپ میری سیدھی ٹانگوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیجئے اور اُنہیں ٹیڑھی ہی تصور کیجئے تاکہ آپ کو ہنسی آسکے۔ اسی طرح کوئی کہانی کار یا دوسرا کچھ نگار اپنی کہانی یا کسی چیز کو انشائیہ کہہ کر آپ کو ٹھگنے کی کوشش کرتا ہے تو آپ کا کچھ بگڑتا تو نہیں آپ اُسے خوش کرنے کو خاموشی دھارن کر لیتے ہیں۔ وہ خوش کہ اُس نے اپنی کہانی یا کسی اور عجیب و غریب چیز کو آپ سے انشائیہ منوا لیا، آپ پر سن کہ کہانی یا اُس چیز کو آپ نے ایک نئے چولے میں دیکھ لیا مگر دل میں کہیں آپ کے یہ حقیقت عیاں رہی کہ عورت نے مرد کا لباس پہن رکھا تھا تو کیا وہ مرد بن گئی ہو؟ اب یہاں کوئی انشائیہ کو مرد سمجھ کر کہانی سے بڑا رتبہ اس لیے دے کہ میں نے کہانی کو عورت کہہ دیا ہے

جبکہ عورت کا بھی اپنا ایک بھرپور حسن ہوتا ہے۔ کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ ہر صنفِ ادب اپنے ہی رنگ روپ اور لباس میں زیب دیتی ہے۔

انشائیہ نگار اتنی طویل ریاضت کے بعد اب خود اس صنفِ ادب پر اتنا واضح ہو چکا ہے کہ اُسے بھی علم ہے کہ اُسے اپنے قاری کو کیا دینا ہے۔ اور قاری کو بھی معلوم ہے کہ اُسے بند پڑیا میں کیا ملنے جا رہا ہے کیونکہ انشائیہ کے سفر کے تمام مراحل میں وہ بڑی تابعداری اور صبر و سکون کے ساتھ ایک دھاگے کی طرح سلائی کے تمام ٹیڑھے میڑھے راستوں پر آگے بڑھتی ہوئی سوئی کے پیچھے چلتا رہا ہے۔ میں یہاں وزیر آغا کے ایک انشائیہ "حقہ پینا" کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ قاری جب یہ انشائیہ پڑھتا ہے تو اُسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ نہ صرف خود حقہ پی رہا ہے بلکہ حقے سے نکلنے والے دھوئیں کے ساتھ شروع سے ہی وہ حقہ کی نلکی سے گزرتا، پینے والے کے حلق میں پہنچتا، منہ سے گزرتا، ناک کے نتھنوں میں قلابازیاں کھاتا، گلے میں کھیل کود کرتا، منہ میں تھوڑی یا بہت دیر رکتا، ساتھ ساتھ چلتا رہا ہے حتیٰ کہ اس دھوئیں نے جو جو کھیل تماشے پینے والے کے اندر کیے ہیں، اُسے اور اس کے حلق کو کھیل کا میدان بنا کر جو جو کبڈیاں، کشتیاں، اور بچے بازیاں کی ہیں، ان کے پل پل کا علم اسے ہو گیا ہے کیونکہ وہ اُسی دھوئیں کے ساتھ شانہ بشانہ قدم بہ قدم چلتا رہا ہے۔ ایک نیا انکشاف اس انشائیہ کو پڑھنے کے بعد اُس پر یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی جس کے جسم کے تمام بال وقت کے بے رحم ہاتھوں نے بھلے ہی سفید کر دیئے ہیں، حقے کے دھوئیں کے کرم اور عنایت سے زندگی کے آخری لمحوں تک ناک کے اندر اس طرح کالے پڑے رہیں گے جیسے کوئی ہر روز انہیں برش باقاعدگی سے ڈائی کرتا رہا ہو۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک دوسرا انشائیہ 'لاہور'، میں نے بڑے شوق سے پڑھا تھا اس خیال سے کہ اس میں 'لاہور کا جو ذکر کیا' قسم کا مضمون ہوگا۔ لاہور کے بارے پڑھ پڑھ کر لاہور سے دُور رہنے اور میانوالی کی ریتوں کو پیار کرنے کے باوجود میں نے ہمیشہ لاہور سے بھی ایک لگاؤ محسوس کیا ہے۔ رام چندر کے بیٹے لوہ کے شہر کے پاس کچھ تو خاص ہوگا جس نے ایک دنیا کو دیوانہ بنا رکھا ہے مگر 'لاہور' پڑھ کر مجھے دوسرے بڑے صنعتی شہروں کی طرح یہ شہر بھی ایک آکاس بیل ہی نظر آیا جو دوسروں کے خون پر پلتی اور بڑھتی ہے۔ تصویر کا یہ دوسرا رُخ دل شکن سہی مگر حقیقت سے دُور نہیں۔ گاؤں کا حسن، ہم کلامی مہیا کرنے والا ماحول بہرحال شہر کی گہما گہمی اور ہیرا پھیریوں سے ہزارہا درجے زیادہ دل پسند اور زندگی بخش ہوتا ہے ــــ کلکتہ کے ادیبوں نے کلکتہ کو جہاں بے انتہا پیار دیا ہے وہاں بعض اوقات گالیوں سے بھی نوازا ہے مگر لاہور کو جتنا پیار اُس کے قلم کاروں سے ملا ہے شاید ہی کسی اور شہر کے حصے میں آیا ہو۔ سچائی کا یہ چبھتا ہوا لشکارہ پہلی بار وزیر آغا نے ہماری آنکھوں پر مارنے کی جرأت کی ہے۔

ویسے تو وزیر آغا کا ایک ایک انشائیہ اپنے آپ پر سوچنے اور لکھنے کی تحریک دیتا ہے مگر ایک اور انشائیہ 'ٹھنڈا برف ہاتھ' کا ذکر کیے بغیر میں آگے نہیں بڑھ سکوں گا۔ آج کے انسان کا یہ المیہ کہ وہ ٹوٹ پھوٹ کر، ہزاروں ٹکڑوں میں بٹ کر جی رہا ہے۔ کسی خوف یا کسی بہانے سے واپس جڑتا اور اپنا آپا مکمل کر لیتا ہے تو اُسے پتہ چلتا ہے کہ اُس نے جھوٹوں کے کتنے عماموں کا بوجھ خواہ مخواہ اپنے سر پر لاد رکھا ہے۔ اور اُس کا سر اب اس قدر ایسے بوجھوں کا عادی ہو چکا ہے کہ جب بھی کوئی عمامہ ذرا سی دیر کے لیے بھی کھسکتا ہے تو اُسے سر کی وہ جگہ خالی خالی اور ننگی ننگی سی محسوس ہونے لگتی ہے اور جب وہ جگہ پھر سے بھرتی اور ننگے پن سے آزاد ہوتی ہے تو وہ کسی دوسرے کے خیالی خالی پن کا مذاق اُڑا کر اور اپنے آپ کو بھرا پڑا محسوس کر کے خوش ہو لیتا ہے۔ خوشی جو دراصل اُس کی سچی روحانی خوشی پر چمک مہیا کر دینے کا جھوٹا لیپ ہوتی ہے۔

انور سدید کا ایک انشائیہ ہے۔ 'دسمبر'۔ بھئی کیا انشائیہ ہے بادشاہ قسم کا۔ دسمبر کا مہینہ بیچارا کتنا نظر انداز ہوتا رہا ہے۔ تمام اُردو، ہندی اور پنجابی ادب میں آپ کو ایک ساون کے مہینے کا ذکر مل جائے تو مل جائے اور وہ بھی بس ایک ہی 'ساون کے مہینے میں اک درد سا سینے میں' قسم کے انداز میں۔ بس اللہ اللہ خیر صلا۔ ظلم یہ کہ شاہی لکڑہارا، شاہی کسان، شاہی دربان قسم کی داستانیں تو آپ کو ہزاروں مل جائیں گی مگر خود شہنشاہ دسمبر کا ذکر آپ کو کہیں نہیں ملے گا ــــ انور سدید کے 'دسمبر' کو پڑھ کر آپ کو پتہ چلتا ہے کہ اصل مہینہ تو یہی ہے۔ آتا ہے تو گرمیں غوطے دیتا ہوا، مسکراتا اور چھیڑ چھاڑ کرتا ہوا۔ بہت سویلے اب

جاگو، کا نعرہ لگاتا ہوا۔ باادب، باملاحظہ ہوشیار۔ شہنشاہِ انطول، جمیل الجمول تشریف لا رہے ہیں۔ (اب آپ انطول اور جمول کے معنی دیکھنے کسی ڈکشنری کی طرف مت دوڑیے کیونکہ یہ آپکو وہاں کہیں دستیاب نہیں ہوں گے۔ بس اسے ہی دوبارہ یا سہ بارہ پڑھ لیجئے۔ ہر چرن چاولہ ساختہ ان الفاظ کے معنی آپ کی سمجھ میں آجائیں گے۔)

انور سدید کا ایک اور انشائیہ 'مونچھیں' بھی میں نے بڑے شوق اور توجہ سے پڑھا ہے۔ ویسے تو اُن کے سب ہی انشائیے میری پسند کی کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں مگر مضمون کی طوالت کے ڈر سے میں نے اِسے ہی ذکر کے لیے چُنا ہے ـــــ یہ سچ ہے کہ مونچھوں نے دنیا میں بہت سے کھیل تماشے دکھائے ہیں۔ خود میں نے ہر رُوپ بدل سکنے کی شکتی حاصل کرنے والی سو سالہ ناگن کی طرح عورت کا رُوپ دھار کر اُنہیں ہر رنگ اور ہر زاویے سے دیکھنے، سمجھنے اور پیار کرنے کی کوشش کی ہے کہ اب یہ چیز مرد کے پاس تھی، میرے پاس نہیں تھی اور مرد نے میری کمزوری کو تاڑ کر داڑھی اور مونچھوں کا عجیب و غریب حُلیہ بنا بنا کر اور بگاڑ بگاڑ کر مجھے مرعوب کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ کبھی اُس نے داڑھی مُونڈ دی اور مُونچھیں بھی صفا چٹ کر دا ڈالیں۔ کبھی مونچھیں رکھ لیں اور اُن پر بُو ٹھہرا ٹھہرا کر مجھے ڈرانے لگا اور میں اسے اندر اور باہر سے جاننے کے باوجود اس کے بدلتے رُوپوں پر حیران اور خوفزدہ ہو ہو کر اُسے خوش کرتی رہی۔ پھر اُس نے مونچھوں کو بچھو کے ڈنک بنا ڈالا۔ وہ مجھے ڈنکتی رہیں، میں نے اُف تک نہ کی۔ پھر اُس نے اُنہیں تلواریں بنا بنا کر میری آنکھوں میں چبھویا۔ میں خاموش رہی۔ کبھی دو بیچ سے ٹنڈی، کونوں سے لٹکتی، مجھے سرکنڈوں کے جھیروں سے نکلے پُرے لگیں۔ کونوں سے تراشی گئیں اور اُسترے کی بڑھتی یلغار نے انہیں چاٹتے چاٹتے ناک کی پہاڑی کے سائے تلے بیٹھی مکھی کی صورت پناہ گزیں کر دیا۔ پہاڑی کی وادی کی آب و ہوا میں مکھی کبھی چھوٹی اور کبھی موٹی ہوتی رہی۔ کبھی مُونچھیں اتنی سخت بُرش بنیں کہ جب کبھی وہ ہونٹوں کے قریب آئیں، اُنہوں نے اپنے سخت اور کھُردرے بالوں سے ہونٹوں تک کو چھیل چھیل ڈالا۔ کبھی یہی مونچھیں بالائی لب کی وادی سے کوہ پیما کی طرح اُوپر چڑھتی تلموں کے ہمالیہ کی چوٹیوں میں مدغم ہوتیں، سر کی دُنیاؤں میں گُم ہو گئیں۔ کبھی نیچے کا رُخ کیا تو دونوں ہونٹوں کے ارد گرد کھیت کی باڑھ کی صورت بیٹھ گئیں۔ گھنی مونچھیں، ہلکی مونچھیں، جالی مونچھیں، لٹکتی، اُٹھی، مُڑی، مختصر، طویل، غائب، حاضر، جھجکتی، ملائم جیسے ملائی کے لچھے سے

تماشے کیا کیا نہ ہوئے مُونچھوں کے بازار میں

میں نے بطور عورت مونچھوں کی دنیا صرف لبوں کے آس پاس ہی محدود دیکھی تھی مگر انور سدید صاحب نے اسے چارلی چپلن کی مونچھیں بنا کر پردۂ سکرین کے ذریعے ہر قسم کے کروڑوں انسانوں کے لبوں کی مسکراہٹ میں تبدیل کر دیا۔ اُن کی موجودگی کو فتح اور غیر موجودگی کو شکست کا مظہر بنا کر ہمیں ثبوت اُنہیں ایک نیا رُوپ دے دیا ـــــ ایسی کھیتی، جو کاٹتے کاٹتے تھک جاؤ، بناں ہل چلائے، بناں کھاد مہیا کیے بڑھتی ہی چلی جائے۔ بڑے بڑے ڈبل ایج اُستروں کے مُنہ پھر جائیں مگر یہ خود رو کھیتی ہر صبح نئے اُسترے کو للکارتی اور دعوتِ پنجہ آزمائی دیتی نظر آتی رہے۔

جمیل آذر کا ایک انشائیہ ہے، 'نیم پلیٹ' یہ نام کی بھوک، شہرت کی بھوک کی بات کرتا ہے یہ انشائیہ۔ آپ افسانہ نگار، شاعر یا لیکھک نہیں تو اِس تشنگی کا علاج گھر کے باہر نیم پلیٹ لگا کر کر سکتے ہیں، چھپے ہوئے نام کو دیکھنے اور بار بار دیکھنے کا شوق بلکہ جنون، خود مجھ میں بھی ہے ورنہ زندگی بھر میں کیوں رات رات بھر بیٹھ بیٹھ کر اور اِتنے صفحات کالے کر کر کے اپنا اور پڑھنے والوں کا وقت برباد کرتا۔ اِس جنون میں میں نے بہت سوں کو مُبتلا دیکھا ہے۔ اُن کو بھی جن کی کوئی لیکھنی ترجمہ ہو کر، کسی ایسی زبان میں چھپ جاتی ہے جو اُنہیں اِس جنم میں تو کیا، اگلے سات جنموں میں بھی نہیں آسکے گی۔ یہاں ناروے میں میرے ایک اُردو ادیب دوست کا نارویجیئن اخبار میں اِنٹرویو کچھ قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ وہ، وہ کالے اکشر، جیسی برابر کو دیکھنے کے لیے ہر روز وہ مہنگا اخبار (قیمت تقریباً پانچ روپے) خریدتے تھے اور گھنٹوں اپنے چھپے ہوئے نام پر اُنگلیاں پھیرتے رہتے تھے یا مجھ سے پڑھوا اور ترجمہ کروا کر سُنتے تھے تب مجھے بھلا نارویجیئن زبان اِتنی کہاں آتی تھی کہ اخباری مشکل زبان کا ترجمہ کر سکتا مگر اُن کے مجبور کرنے پر ایسے ہی اُلٹی باتیں شاتیں ترجمہ کر کے اُنہیں سُنا دیتا

اور وہ نہال ہو جاتے تھے۔

ایک اور انشائیہ نگار جس نے ہمیشہ مجھے چونکایا اور حیران کیا ہے وہ سلیم آغا قزلباش ہے۔ مشتاق قمر کے کتھن انوسار سلیم آغا قزلباش نے واقعی مسیں بھیگ جانے تک بھی انتظار نہیں کیا اور اتنے اچھے انشائیے لکھنے لگا کہ آج اُسے بڑے بڑے انشائیہ نگاروں کی صف میں کھڑا کرتے ہوئے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ سلیم کے انشائیوں میں اُس کے جذبات کی تندی آگے بڑھتی ایسی بے پناہ فکری وسعتوں اور گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے کہ حیرانی ہوتی ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ سلیم آغا نے انشائیے واقعی سوچنے، سمجھنے اور ہنسنے مُسکرانے والی مخلوق کے لیے تخلیق کیے ہیں۔

اُن کا انشائیہ 'ہل'، 'کُرسی'، اور 'آئینہ' نے مجھے خاص طور پر مسحور کیا ہے۔ سونے کا ہل راجہ جنک نے چلا کر سیتا جیسی نیک طینت، خوبصورت اور وفا شعار بیٹی پائی تھی جبکہ سلیم آغا کے لوہے اور لکڑی کے ہل نے ہمیشہ دھرتی کی گود سے سونا اور چاندی نکال کر دیا ہے۔ سلیم آغا کو 'ہل' سے اِس لیے عشق کی حدوں تک پیار رہا ہے کیونکہ وہ سیدھا سادا لکڑی کا ہل ہے جو ہر حال میں مالک کے شانہ بشانہ، قدم بہ قدم کھیت میں کام کرتا اور اُسے روٹی روزی مہیا کرتا ہے۔ یہ سلیم آغا کی اپنی دھرتی اور اپنے وطن سے محبت کا اظہار بھی ہے — یہ کتنا بڑا سچ ہے کہ ہل غریب کسان کا ساتھی ہے اور برابری کی تقسیم کا علمبردار جبکہ ٹریکٹر رعونت، غرور اور نابرابری کا مظہر ہے۔ ٹریکٹر دھرتی کا سینہ اُدھیڑتا اور ہل ایک شفیق ماں کی طرح اُس کے پیروں سے کانٹے نکالتا ہے۔ ہل انسان انسان اور دھرتی ماں کے رشتے کو مضبوط کرتا ہے جبکہ ٹریکٹر اُس ماں کی چھاتیوں سے ایک ہی بار سارا دودھ نچوڑ لینا چاہتا ہے اور دوسرے بھائیوں کے لیے ایک بُوند بھی چھوڑنے کا روادار نہیں ہوتا۔ ہل ماضی، حال اور مستقبل ہر دور کے ساتھ اپنا رشتہ قائم رکھتا ہے مگر ٹریکٹر کسی اور بہتر کام کرنے والی مشین کے آگے سیلیوٹ مار کر خود کسی کوڑا کباڑ کے ایک کونے میں ابدی نیند سو جائے گا — مشین مشین کو کاٹتی اور موت کے گھاٹ اُتارتی آئی ہے۔ ہل زندہ رہتا اور زندہ رکھتا ہے۔ جب مشینیں انسان کو نیست و نابود کردیں گی اور اس کی راکھ سے نیا انسان جنم لے گا تو اس کے ہاتھ میں سب سے پہلا ہتھیار ہل ہی ہوگا۔

'کُرسی' بھی سلیم آغا قزلباش کا ایک ایسا ہی انشائیہ ہے۔ کُرسی نے کیا کھیل تماشے، کینگیاں اور قتلِ عام انسان کے کیے اور انسان کو دکھائے ہیں۔ ایک اچھے بھلے شریف انسان کو کُرسی پر بٹھا دو اُس کی تو سُر ہی بدل جائے گی۔ آواز میں کڑک اور آنکھوں میں کھا جانے والی سُرخی نہ آجائے تو جو سزا چور کی، وہ میری۔ کُرسی نے وقت کے ساتھ کئی رُوپ بدلے۔ نہ اِنسان کو آرام سے بیٹھنے دیا اور نہ ہی آرام سے سوچنے دیا۔

اوراق کے پچھلے شمارے میں ارشد میر کے انشائیے 'دھوتی' نے بھی مجھے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ دھوتی کے جو اوصاف ہیں، پہننے کی جو مشکلیں ہیں، جو آسانیاں ہیں۔ دھوتی پہننے والے کی اُس سے جو ATTACHMENTS ہیں یہ انشائیہ پڑھ کر سب قاری کے سامنے آتی ہیں اور وہ رائے قائم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ اُسے دھوتی پہننی چاہیئے یا نہیں۔ یہ انشائیہ اُس کے دل میں دھوتی پہننے کا شوق یا نفرت پیدا کر سکتا ہے۔ فوائد اور نقصانات — دھوتی کا رول سماج میں، کھیل کُود میں، سیاست وغیرہ میں — سے مکمل آگاہی ہوتی ہے۔ دھوتی پہننے والوں کے طور طریقوں سے مکمل واقفیت ہوتی ہے۔ اُن کی ذہنیت بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ ارشد میر نہ جانے دھوتی پر بنے محاورات کو کیوں بھُول گئے مثلاً دھوتی چھوڑ کر بھاگنا وغیرہ۔

اِنشائیے کبھی قاری کی زندگی میں ایک بہت بڑا پارٹ بھی ادا کر جاتے ہیں یا اُس کی زندگی کا دھارا ہی بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ مَیں اپنے بارے عرض کرتا ہوں، جب مجھے اِنشائیہ کا پتہ ہی نہیں تھا کیونکہ یہ لفظ تب شاید وجود میں ہی نہیں آیا تھا اور اگر آیا تھا تو اِس شدت سے پڑھنے والوں سے متعارف نہیں ہوا تھا جیسا کہ اب پچھلے کچھ سالوں سے سامنے آیا یا لایا گیا ہے۔ آج سے قریب تیس پینتیس سال پہلے مَیں نے غالباً چارلس لیمب کا ایک انشائیہ انگریزی میں کہیں پڑھا تھا۔ جس کا عنوان اب مجھے یاد نہیں آرہا ہے۔ یہ دات کو سر دھونے کے متعلق تھا۔ اُس نے میری صبح نہانے کی عادت کو تقریباً ختم کر کے رکھ دیا۔ ہندوستان جیسے

ملک میں گرمیوں میں تو دو تین بار اشنان ہو ہی جاتا ہے مگر سردیوں میں صبح نہا کر دفتر جانا، گویا زکام کو (میرے لیے) دعوت دینا ہے مگر رات کو سونے سے پہلے نہا کر بستر میں گھس جانے سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ میں نے کسی حد تک زکام جیسے موذی مرض کو یہ بہانہ مہیا کرنا بند کر دیا کہ میں تمہیں کیسے نہ لگتا۔ تم گیلے سر کے ساتھ کھلی اور ٹھنڈی ہوا میں باہر جو نکل آتے ہو۔ دوسرا فائدہ مجھے یہ ہُوا کہ صبح دفتر جانے کی بھاگ دوڑ میں کچے پکے اشنان سے بھی چھٹکارہ مل گیا اور پُرسکون نیند اُوپر سُود کی صورت وصول ہونے لگی۔

بہت پہلے ہر کچی پکی تخلیق کو انشائیہ کا نام دیا جاتا رہا۔ پچھلے دنوں 'مقالاتِ جوش' میں مجھے جوش ملیح آبادی کے تین چار مضامین پڑھنے کا موقعہ ملا ہے جنہیں انشائیہ کہا گیا ہے مگر میں انہیں ذہنی بھٹکن کے علاوہ اور کوئی نام دینے کو تیار نہیں۔ تسلیم کہ جوش ملیح آبادی کے ہاں فقروں کی نشست و برخاست کا ایک ایسا فن ہے کہ اُن کے قلم کو چوم لینے کو جی چاہتا ہے مگر ہر تخلیق کو اندھا دھند انشائیہ کہہ دینا بھی اب مشکل نظر آتا ہے۔ اب انشائیہ نگار خود بھی اُوٹ پٹانگ لکھ کر اور اس پر انشائیہ کا لیبل لگا کر اپنے قاری کو ٹھگنا نہیں چاہتا (اور نہ ہی قاری اب ٹھگا جا سکتا ہے) کیونکہ انشائیہ کی واضح تصویر کے بعد وہ خود اپنے ضمیر کی کچہری میں بھی جواب دہ ٹھہرتا ہے۔

آج انشائیہ لکھنے والوں میں متذکرہ بالا ناموں کے علاوہ بھی کچھ نام اور کچھ انشائیے اِس قدر اُبھر کر سامنے آ گئے ہیں کہ اُن کے ذکر کے بغیر یہ مضمون ختم کرنا بے انصافی محسوس ہوگا۔ مثلاً تقی حسین خسرو کا 'میز اور کرسی'، داؤد رہبر کا 'لمحے'، طارق جامی کا 'لکھنا'، غلام جیلانی اصغر کا 'گالی دینا'، مشتاق قمر کا 'اقبال کی ایک تصویر'، رام لعل نابھوی کا 'پوسٹ کارڈ'، مشکور حسین یاد کا 'ناک پکڑنے کا عمل' اور نظیر صدیقی کا 'پدرم فقیر بود' وغیرہ۔ اِن سب انشائیوں پر بھی ہزاروں الفاظ لکھے جا سکتے ہیں مگر ڈر ہے کہ پھر یہ مضمون اتنا طویل ہو جائے گا کہ میرے قابو میں نہیں رہ سکے گا اور میں کون سا ایسا بڑا انشائیہ کا نقاد ہوں کہ آپ کو اِتنے طویل مضمون کے بعد اور زیادہ بور کرنے یا برداشت کرنے پر مجبور کروں۔

انشائیہ کے چند پہلو

رشید نثار

انشائیے کے بارے میں اب تک بہت سے نظریات تشکیل دیئے گئے ہیں۔ ان میں یورپی انشائیہ نگاروں کے علاوہ پاکستانی انشائیہ نگاروں نے نوعیت کے اعتبار ایسے نظریے تخلیق کئے ہیں جو زمان و مکان کی حدود میں رہ کر کسی نہ کسی سمت کی تلاش میں رہتے ہیں اور جب انہیں سمت مل جاتی ہے تو وہ ایک نظام کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہ ایک منظم رشتہ ہوتا ہے جو اپنے مرکز کے ساتھ جڑا رہتا ہے۔ ان حضرات کے نظریات حیرت و استعجاب، تہذیبی و ثقافتی اقدار اور معصومیت کی بازیافت پر مبنی ہیں۔ بقول سیموئیل ٹیلر زندگی ایک طویل تھکا دینے والی مشقت ہے۔ اور بقول ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ انسان پر تھکاوٹ طاری نہیں ہونے دیتا۔ لہٰذا انشائیہ شے ہو کر بھی روح کی حیثیت رکھتا ہے جب کہ انشائیہ کی ہمزاد اصناف طنز یہ مزاحیہ "شے" ہو کر صرف شے تک محدود رہتی ہیں۔ انشائیہ ہیئت کے اعتبار سے ایک حدود رکھتا ہے۔ ہم اسے ذہنی مقامات کے ذریعے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ذہنی مقامات کچھ تاریخی ہوتے ہیں اور کچھ سماجی۔ لہٰذا ہیئت کو اگر روشنی تسلیم کر لیا جائے تو اس کی کرنوں کی سمت دیکھ کر پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ یہ روشنی کس مقام سے آ رہی ہے چنانچہ انشائیہ بھی اپنی سمت کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔

آیئے انشائیے کی سمت کا اندازہ لگائیں۔

ہمارا ذہن اگر خلاقانہ سطح سے واقف ہے تو وہ آسانی کے ساتھ کسی شعاع کی رفتار، اس کی سمت اور اس کے منبع کا تعین کر لیتا ہے۔ بعض اوقات اشیاء کے ذریعے سمت کا اندازہ لگاتے رہتے ہیں۔ لیکن اشیاء کی ہیئت اور ساخت سے سمت کے بارے میں دھوکہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایک انسان اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو سمت ہی بدل جاتی ہے اور ایک ہی شے کی مختلف سمتیں دکھائی دینے لگتی ہیں انشائیے کے بارے میں ایک مقبول نظریہ یہ بھی ہے کہ سمندر کو آپ ایک جگہ کھڑے ہو کر دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی سمت وہی رہے گی لیکن آپ سامنے کی بجائے اُسے گردن گھما کر یا اُسے ٹانگوں کے نیچے سے جھانک کر دیکھیں گے تو سمندر کی سمت ہی بدل جائے گی۔ اس ہیئت کذائی پر ممکن ہے اچنبھا بھی پیدا ہو لیکن سمندر کو ایک ہی جگہ بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر دیکھا نہیں جا سکتا اس لئے سمندر سے لطف اندوز ہونے کے لئے زاویوں اور جگہوں کو بھی بدلنا پڑے گا۔ اسی طرح دو انشائیوں کو ایک دوسرے کے متصل رکھ کر بڑی آسانی سے جانچا جا سکتا ہے۔ یہ دو انشائیے ایک ہی عہد سے متعلق ہو سکتے ہیں اور دونوں کا عہد مختلف بھی ہو سکتا ہے چونکہ یہ دو انشائیے اپنا ایک مزاج بھی رکھتے ہیں اور سمت بھی تو ظاہر ہے کہ ان کے درمیان فضا بھی حائل ہو گی۔ یہ فضا خارجی و معروضی اور شخصی ہو سکتی ہے لیکن اس فضا کو خارجی حیثیت سے دیکھا نہیں جا سکتا اور نہ ہی ذاتی تاثرات کے ذریعے بلکہ انشائیے کو بصارت کے ساتھ بصیرت کے ذریعے ہی پہچانا جا سکتا ہے۔ چنانچہ

انشائیہ کے لئے روشنی، سمت، مزاج اور بصیرت بے حد ضروری ہیں اور انہی کے ذریعے انشائیے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انشائیے
کے بارے میں اُن منکرین کے خیالات اس اعتبار سے از خود باطل ہو جاتے ہیں جو فن کو جامد اور خیال کو غیر متغیر قرار دیتے ہیں۔ چونکہ انشائیہ اپنی
ہیئت کے ساتھ سمت بھی بدلتا رہا ہے اس لئے سرسید عہد کے مضمون کو آج کے موجودہ انشائیے کے سامنے رکھ کر "انشائیہ" نہیں کہا جا سکتا
سرسید عہد کا مضمون اور موجودہ عہد کا انشائیہ مزاج، سمت اور روشنی کے اعتبار سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ سرسید عہد کا مضمون مقصدی
تناظر رکھتا تھا لیکن موجودہ انشائیہ مقصد کو خوشبو کی طرح چھپائے رکھتا ہے اور خوشبو کی کوئی صورت نہیں ہے۔ انشائیہ ہیئت کے اعتبار سے
قلعہ بند نہیں ہے۔ ہیئت اس کے لئے کوئی خارجی مطلق شے نہیں بلکہ وہ قابلِ تقسیم ہے۔ لیکن انشائیے کا مزاج اور سمت آزاد وجود رکھتے
ہیں۔ اس لئے انشائیے کا اثر اور نفوذ بھی مسلّم ہے جب کہ سرسید عہد کا مضمون اور اسی ترتیب سے دوسرے اصحاب کے "انشائیے" دو
متصلہ نقطوں کا فاصلہ رکھتے ہیں، چنانچہ جیومیٹری کے تھیورم کے لحاظ سے نقطے ساکن رہتے ہیں لیکن انشائیے میں جو فضا پائی جاتی ہے وہ
روزمرہ زندگی کو تصوراتی زندگی سے نکال کر زندہ رہنے اور متحرک زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب غیر حرکیاتی تصور
کے ساتھ فنونِ لطیفہ کو سمجھا اور پرکھا جاتا تھا۔ یہ سکونی اور غیر حرکیاتی تصور سرسید عہد کے مضمون کو ہمارے عہد کے انشائیے سے جدا کرتا ہے
ہمارے عہد کا انشائیہ واقعات اور رفتار کے بہاؤ کے ساتھ تخلیق کیا جاتا ہے۔ دراصل موجودہ عہد نئے ذہن کا آدم لے کر آیا ہے۔ یہ "آدم"
مجسمے کی خوابیدگی، رنگ کی روشنی، اور لفظ کی خوشبو سے واقف ہے۔

ہمارے عہد کے نئے آدم نے مسلمات کو توڑ دیا ہے۔ اس طرزِ عمل میں ہماری نفسیاتی زندگی کا بہت بڑا عمل دخل ہے۔ ہم نفسیاتی اعتبار
سے اس ترقی یافتہ عہد میں ایک نئی روحانیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہماری "میں" انائے مطلق کے قریب رہ کر لامحدود زمانے میں محدود
ہو کر نہیں رہنا چاہتی بلکہ تہذیبی، سماجی اور اخلاقی سطح پر اس زینے تک جانا چاہتی ہے جہاں انسان کے تخیل اور اس کے فطری تجربے نے
ناقابلِ بیان حد تک ترقی کی ہے۔ اس جدید تفصیل کی روشنی میں انشائیے نے مذہب، فلسفے اور نئے تصورات سے فائدہ اٹھایا ہے۔
انشائیے نے کہیں بھی "میں" کو منہا نہیں ہونے دیا۔ مگر انشائیہ "میں" کے تصور کو ایک خاص مدار میں لا کر جگہیں تبدیل کرتا ہے۔ یہ جگہیں بہت
سے مدار بھی ہو سکتے ہیں۔ ان مداروں کے درمیان ایک خلا بھی واقع ہے۔ تاہم انشائیے کی "میں" فنی طور پر ایک انفرادیت کا نام ہے جو
ہر مقام، جگہ اور ماحول میں موجود رہتی ہے۔ سائنس اس "میں" کو ایک اکائی قرار دیتی ہے۔ منطق اسے ناقابلِ تقسیم اور فن اسے ایک تصور
ثابت کرتا ہے۔ چنانچہ موجودہ انشائیے کی "میں" نے گذشتہ عہد سے بغاوت کی ہے اور خود کو ایک ایسے نظام کے ساتھ مربوط کیا ہے جو دکھوں
سے نجات اور مفاہمت کے نظریے پر مبنی ہے۔

داخلی پن، دکھوں سے نجات حاصل کرنے کی جد و جہد اور خود کو تازہ دم رکھنے کا حوصلہ انشائیہ کی سمت بھی واضح کرتا ہے۔ یہ
صورتِ حال ادب دوستی اور انسان پرستی سے عبارت ہے لیکن انشائیہ نگار فکری اعتبار سے بھی خود کو ماضی کے انشائی عہد سے بالکل الگ
رکھتا ہے۔ یہ علیحدگی منطقی طور پر بھی درست کہ پاکستان میں انشائیہ تحریک کی روح دوسری تحریکات سے بالکل مختلف ہے۔ انشائیہ تحریک
کے فن کار زندگی سے جسم اور روح دونوں سطحوں پر پیار کرتے ہیں۔ اس لئے وہ کسی قسم کی تفریق کے قائل نہیں۔ وہ تعصبات کی پروا نہیں کرتے اور
نہ ہی وہ کسی ازم سے خوف زدہ ہوتے ہیں۔ انشائیہ نگار بنیادی طور پر فطرت، انسان اور روح کو ایک ہی شے تصور کرتا ہے۔ اس لئے
اس کے انشائیے ایک مربوط اکائی بن کر سامنے آتے ہیں۔ وہ روح کی بالیدگی، خیال کی معنویت کو مجسم کر کے انشائیے کا ایک الگ کلچر

بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

ہیراکلیتس نے ایک جگہ کہا ہے کہ "ایک صورت، دوسری صورت اختیار کرتی ہے"۔ یہ قول انشائیے پر بھی منطبق ہوتا ہے کہ انشائیہ بھی اپنی ذات میں ادراک کا ایک ذریعۂ عقل رکھتا ہے لیکن یہ ذریعۂ عقل خارج میں آزاد وجود کا حامل بھی ہے۔ لہٰذا انشائیہ ایک صورت سے دوسری صورت اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن انشائیہ کوئی آئیڈ لمیٹ فلسفہ نہیں۔ اس کی تخلیق استدلالی قوت کی مرہون ہے اور استخراجی طریقہ کار اسے دنیائے رنگ و بو اور تمام محسوسات کے ساتھ ملانے کا کردار ادا کرتا ہے۔ اس طرح انشائیہ تاثرات حسی کو ایک الگ زاویے سے کوئی صورت دیتا ہے تو تعقل کو الہامی یا وجدانی صورت دے کر محسوس تجربے کی تکمیلی حیثیت کے غیر مبہم معنی تخلیق کرتا ہے۔ لہٰذا انشائیہ تکمیل پا کر معنویت کی تشکیل بھی کرتا ہے۔

انشائیے میں حواس اور عقل کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور نہ ہی اسے قانونی تخالف کے تحت تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ انشائیہ دراصل معنوی استحاد کی ایک صورت کا نام ہے جس کے ذریعے حسن و صداقت کے معاملات خوشگواریت سے سمجھائے جا سکتے ہیں۔ اس کی مثال تو یہ ہے کہ انشائیے کا تجزیہ جھوٹے تضاد کے خلاف ایک محسوس ردِ عمل ہوتا ہے۔ بلکہ انشائیے میں طبقاتی اثر بھی کوئی کردار ادا نہیں کرتا۔ صرف انشائیہ نگار کا سچا ذہن سارے تضادوں کی نفی مثبت اقدار سے کرتا ہے اور یہ کام اس کا اپنا تجربہ کرتا ہے، نہ کہ ماضی یا حال کے ادبی اثرات۔ اس اعتبار سے انشائیے کا انسان اپنی ذات میں ایک مقصد ہوتا ہے۔ اور وہ دوسرے انسانی رشتوں سے الگ نہیں ہوتا۔ انشائیہ قانونِ حسن اور قانونِ استحاد کا پابند ہو کر دیدہ و دل کی مفلسی کا علاج کرتا ہے اور محبتوں کی تمنا کو فروغ دے کر انسان کے سینے کو زیادہ کشادہ کر دیتا ہے۔

انشائیہ کیا ہے

ذوالفقار احمد تابش

انشائیہ کیا ہے؟

جس طرح ہم ادب کی بہت سی دیگر اصناف کی کوئی جامع اور متفق علیہ تعریف ابھی وضع نہیں کر سکے اسی طرح انشائیے کے لیے چند چنے تُلے الفاظ کی متفق علیہ تعریف کو وضع کرنا بھی بے حد مشکل ہے۔ تاہم میرے نزدیک انشائیہ وہ نثری صنفِ ادب ہے جس میں مصنف کسی موضوع کی مخفی جہتوں اور پہلوؤں پر ہلکے پھلکے اور خوشگوار تخلیقی اسلوب میں اپنے مشاہدے، مطالعے اور سوچ کا اظہار کرتا ہے۔

دیکھا جائے تو یہ تعریف بڑی ڈھیلی ڈھالی سی دکھائی دیتی ہے لیکن انشائیہ جس وضع کی گریزپا صنفِ ادب ہے اس کے لیے ایسی ہی تعریف ممکن ہے اگر آپ نے اسے پابند کرنا چاہا اور بڑی واضح اور ٹھوس قسم کی کوئی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی تو ممکن ہے یوں آپ ایک پیمانہ تو بنانے میں کامیاب ہو جائیں لیکن اس پیمانے سے ہر انشائیے کی پیمائش ہی ممکن نہ رہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں انشائیہ ایک خوبصورت، دلچسپ اور قابلِ قدر صنفِ ادب ہے جس کی ترقی اور مقبولیت کے وسیع امکانات ہیں بشرطیکہ اس کے بارے میں نظری بحثوں میں اُلجھنے کی بجائے اس کے دامن کو تخلیقی سطح پر وسعت دینے کی کوشش کی جائے کیونکہ اس کی تخلیقی سطح پر اٹھان ہی قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے گی اور یہ صنف پڑھنے والوں میں مقبول ٹھہرے گی۔ کیونکہ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ عام لوگوں کو کسی بھی موضوع کی نظری بحث سے بے حد کم دلچسپی ہوتی ہے۔ انہیں دلچسپی اصل چیز سے ہوتی ہے۔ مثلاً اگر آپ افسانے یا شاعری کے کسی بہت اچھے قاری سے بھی یہ پوچھیں کہ شاعر کیا ہوتا ہے یا افسانے کی تعریف کیا ہے تو ممکن ہے وہ آپ کے سوال کا جواب اوّل تو دینا ہی پسند نہ کرے اور اگر جواب دے بھی تو وہ آپ کے نزدیک قابلِ قبول ہی نہ ہو۔ چنانچہ انشائیے کی تعریف اور اس پر نظری بحث کو طول دینے کی بجائے بہت سے اچھے انشائیے لکھنے کی ضرورت ہے۔

اگر دیکھا جائے تو انشائیہ شاعری اور فکشن کی دو اقلیموں کی سرحدوں کے درمیان واقع ایک مرغزار کی حیثیت رکھتا ہے اور یوں درمیان میں واقع ہونے کے باعث دونوں اطراف سے فیض یاب ہوتا ہے۔ اس کو نرمی و نزاکت، رفعتِ خیال اور خیال آرائی تو شاعری کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے جب کہ معنی آفرینی، جزئیات نگاری اور ایک خاص وضع کا کہانی پن اسے فکشن کی اقلیم سے ملا ہے۔ چنانچہ انشائیہ شاعری کے قریب ہونے کے باوجود شاعری (نثری بھی) نہیں ہے۔ ہاں اس میں شعریت ضرور ہے اور یہی شعریت اسے عام مضمون اور جواب مضمون سے الگ کرتی ہے۔ جواب مضمون میں شعریت کا ہونا اس کا عیب شمار ہوتا ہے۔ جواب مضمون بڑی براہ راست اور دو ٹوک قسم کی چیز ہوتی ہے جبکہ مضمون کسی موضوع پر سنجیدہ اظہارِ خیال کا نام ہے اس میں شعریت کا ہونا عیب تو نہیں لیکن اس سے گریز ہی مناسب سمجھا جاتا ہے۔ انشائیہ ان دونوں کے برعکس ہوتا ہے۔ شعریت انشائیے کا جزوِ اعظم ہے۔ اگر کوئی لکھنے والا اپنے اسلوب کے جوہر ہی کو تبدیل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تو وہ انشائیہ نگار نہیں بن سکتا۔ فکشن کی طرف سے انشائیہ کو ظاہری خد و خال، رنگ روپ اور ناک نقشہ ملا ہے۔ بات کو کہانی کے انداز میں کہنے کا ڈھنگ بھی انشائیے نے فکشن ہی سے حاصل کیا

ہے۔ لیکن ان خوبیوں کے باوجود انشائیہ کہانی یا فکشن سے قطعی طور پر الگ چیز ہے اور وہ یوں کہ کہانی میں لکھنے والا ایک مخصوص لکیر پر سفر کرتا ہے اور کہانی کے جملہ لوازمات کو دھیان میں رکھتے ہوئے کہانی بیان کرتا ہے جب کہ انشائیہ مسلسل گریز پا کیفیت کا متقاضی ہے۔ یہاں ایک مرکزی نقطۂ خیال ہونے کے باوجود لکھنے والا سیدھی لکیر پر سفر نہیں کرتا نہ ہی ایک سیدھ میں سوچتا ہے، بلکہ اس صنف کے تقاضے کے مطابق اسے خود کو بھی آتش زیر پا رہنا پڑتا ہے، تاکہ انشائیے کی سیمابیت کا ساتھ دے سکے۔ یہی نہیں کہانی کے اپنے تقاضے ہیں، شعر کے اپنے تقاضے ہیں۔ انشائیہ ان دونوں سے جُدا اپنے الگ تقاضے رکھتا ہے۔ ہیئت کی سطح پر بھی اور خیال کی سطح پر بھی!

یہ تو خیر بہت بڑا دعویٰ ہے کہ انشائیہ اُمّ الاصناف ہے (بلکہ مضحکہ خیز دعویٰ ہے) لیکن اس بات سے انکار مشکل ہے کہ انشائیہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس پر مختلف دیگر اصنافِ ادب کی چھوٹ سی پڑتی ہے اور ان اصناف کا حُسن، رنگ، جھلملاہٹ، روشنیاں اور خوشبوئیں انشائیے کو دلچسپ اور قابلِ قبول بنانے میں بہت اہم حصّہ لیتی ہیں۔

انشائیے کو مَیں ہمیشہ "آزاد تلازمۂ خیال" کہا کرتا ہوں اور میرے پاس اس کی وجوہ اور دلائل ہیں۔ دیگر اصنافِ ادب لکھنے والے پر خاص وضع کی پابندیاں ضرور لگاتی ہیں۔ ان اصناف کے اپنے اپنے ضابطے، قاعدے قرینے اور حدود ہیں، لیکن انشائیے میں ایک خاص سلیقے کے ساتھ مصنّف کو موضوع کے ساتھ "کُھل کھیلنے" کی اجازت ہوتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ کھُل کھیلتا ہے۔ اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے ایک مثال!

بہت سے گانے والے راگ گانے کے بعد ٹھمری بھی گاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ راگ گاتے وقت، گانے والے پر، راگ کی قیود، بندشیں ضابطے اور حدود کا تانا بانا پھیلا ہوتا ہے۔ ان سب کا دھیان رکھ کر اسے گانا پڑتا ہے اور صحیح خوانی کے تقاضوں کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ راگ گا چکنے کے بعد گانے والے کا جی چاہتا ہے کہ اب قدرے آزاد روی کا مظاہرہ کرے۔ کھُلی تانیں پلٹے لے، لمبے سانس لے، ہَوا میں پَر پھیلائے اور پرواز کرے۔ یہ ساری اجازتیں اسے ٹھمری دیتی ہے جو راگ پر مبنی ہونے کے باوجود راگ جیسی سخت پابندیاں نہیں رکھتی اور گانے والے پر سارے دروازے کھول کر اسے آزادی دیتی ہے گانے کی اور مرضی کی تانیں اور پلٹے لینے کی۔ یہی حال انشائیہ کا ہے۔ انشائیہ لکھنے والے کو بڑی آزادی دیتا ہے۔ وہ سب کچھ کہہ جانے کی آزادی جو کوئی دوسری صنفِ ادب نہیں دیتی۔۔ لیکن اس آزادی کا ہمارے ہاں لکھنے والوں نے غلط استعمال بھی کیا ہے۔ انشائیے کو کوئی بہت آسان اور ایری غیری صنف سمجھ کر انٹ شنٹ جو جی میں آیا لکھ دیا ہے۔ انشائیے کے نام پر ایسی ایسی تحریریں بھی نظر آتی ہیں جو اور کچھ بھی ہو سکتی ہیں، انشائیہ نہیں۔

انشائیے کو جب مَیں "آزاد تلازمۂ خیال" کہتا ہوں تو اس سے میری مراد یہ ہے کہ کسی ایک مرکزی خیال پر سوچنے والے کی آزادانہ تخلیقی سوچ کی یہ ایک تحریری شکل ہے کہ اس سوچ یا تفکّر کو کسی حدود میں مقید کیے بغیر مرکزی خیال کے ہزاروں ممکن پہلوؤں پر نیز مرکزی خیال کی جزئیات پر محیط کیا جاتا ہے۔ یہ ایک لطیف، بے حد لذیذ، تفریح بخش اور فکر انگیز مشغلہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ تخلیقی عمل بھی بن سکتا ہے۔ شرط صرف ایک ہوگی اور وہ یہ کہ کسی بھی سطح پر اس میں بھاری بھرکم آثار و اسناد، علم و فضل، معلومات، انفرمیشن، اعداد و شمار، تصریحات، ترجیحات، دلائل بازی کا گزر نہ ہو۔ کیونکہ انشائیہ ایک ایسی لطیف صنف ہے جو بھاری بھرکم اعمال کا بوجھ اٹھانے سے گریزاں ہے۔

انشائیہ سوچنا یا انشائیہ لکھنا اپنی جگہ مصنّف کے لیے بھی ایک لطف انگیز تخلیقی عمل ہے۔ کبھی آپ نے شہد کی مکھی کو کسی پھُول پر منڈلاتے ہوئے اس کے اردگرد اٹھلاتے، اڑتے، رقص کرتے، خوش ہوتے اگر دیکھا ہے اور پھر اس کے رس کشید کرنے کے عمل کو ملاحظہ کیا ہے تو آپ سمجھ لیں گے کہ انشائیہ نگار بھی اپنے مرکزی خیال یا موضوع کے ساتھ اسی طرح مشغول ہوتا ہے۔ وہ اپنے موضوع کے اردگرد اسی طرح منڈلاتا اور اس کے تمام ابعاد کو بغور دیکھتا، اس کی جزئیات کا جائزہ لیتا، اس کے قریب و دُور کے امکانات پر نظر ڈالتا، اس کے تمام زمانوں اور اوقات کا مطالعہ کرتا، روشنی اور اندھیرے میں رکھ کر اس کی شباہت کو

دیکھتا اور اس کے حسن و قبح پر تبصرہ کرتا اور اس سارے عمل سے لطف لیتا ہے۔ وہ اپنے موضوع کے ہر اس پہلو اور امکان کو چھوتا ہے جو اس کی سوچ اور تفکر کے دائرے میں آسکتا ہے۔ اور آخر میں پھول سے رس کشید کرنے کے عمل کی مانند خوبصورت اسلوب میں بات کو سپردِ قلم کرتا ہے۔ لیکن انشائیہ اپنی تمام تر آزادہ روی اور آزادی کے باوجود نہ تو بوجھل فلسفیانہ انداز اختیار کرتا ہے اور نہ منطق و استدلال کی سطح ہی کا متحمل ہوتا ہے۔ شگفتگی (بلکہ تازگی) انشائیے کی بنیادی شرط ہے مگر طنز و مزاح سے اسے بچائے جانا مصنف کے لیے نہ صرف ضروری ہے بلکہ اس کے کمالِ فن کی دلیل ہے۔

انشائیہ لکھنے میں سب سے بڑا امتحان اس کے لکھنے والے کا یہی ہوتا ہے کہ وہ بہت ساری دیگر اصنافِ ادب کے سایوں اور گہرے اثرات سے بچ بچا کر انشائیے کو انشائیہ کیسے بناتا ہے۔ یہ تار پر چلنے سے مشابہ عمل ہے۔ یہ سارا کھیل ہی توازن کا ہے۔ ذرا سا توازن بگڑا تو بجائے انشائیے کے جواب مضمون، طنز و مزاح، افسانہ نثری شاعری یا محض بے مغز نثر بن جانے کے تمام تر اندیشے اس کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ کامیاب انشائیہ نگار وہی ہے جو انشائیے کے مزاج کو پالے اور دوسری اصناف سے بچ بچا کر لکھنے میں کامیاب ہو جائے۔ وہ لکھنے والے جن کے پاس لکھنے یا کہنے کو بہت کچھ ہوتا ہے لیکن بعض اصنافِ ادب کی حدود و قیود یا پابندیاں راہ روکتی ہیں یا ان کے پاس کہنے کا مواد اس نوع کا ہے کہ وہ مروّج اصنافِ ادب میں سماتا ہی نہیں، ان کے لیے اظہار کی انشائیے سے بہتر اور کوئی صنف نہیں ہے۔ وہ لوگ جو سوچ کی پگڈنڈی پر چلتے نت نئے جہان اور نت نئے مناظر تلاش کرتے رہتے ہیں اپنے مشاہدے، اپنی دریافت اور اپنے حال کے بیان کے لیے انہیں انشائیے سے بہتر اور کوئی صنف نہ مل سکے گی۔ انشائیے کا وسیع دامن دنیا جہان کے موضوعات کو اپنے اندر جگہ دینے کے لیے ہمہ وقت تیار ہے۔

ایک نئی صنفِ ادب ہونے کے ناتے انشائیہ اگرچہ نئے لکھنے والوں میں مقبول و معروف ہے اور بہت سارے نئے لکھنے والے اسے اظہار کا ذریعہ بنا رہے ہیں مگر انشائیہ لکھنے سے پہلے اگر وہ اس کے لوازمات اچھی طرح جان لیں اور اس کی ضروریات کو اچھی طرح پہچان لیں تو یہ خود انہیں کے لیے بہتر ہے ورنہ ایک عرصہ لفظوں کی بازی گری کرکے اگر ایک سطح پر انکشاف یہ ہو کر جو کچھ لکھا وہ انشائیہ تھا ہی نہیں تو ایسی مشقت کا حاصل کیا ہوا؟ انشائیہ صرف ایک زیرک، قوتِ متخیلہ سے مالا مال اور کثیر مشاہدے والا شخص ہی لکھ سکتا ہے۔ جو مصنف زیرک اور باریک بین نہیں وہ اور جو بھی لکھ لے انشائیہ نہیں لکھ سکتا۔

انشائیہ فرصت اور سکون کے لمحات کی چیز ہے اس لیے انشائیہ لکھنے والے کے پاس بھی فرصت اور سکون کے لمحات ہونے چاہییں تاکہ وہ خیال اور سوچ کی شطرنج کھیل سکے۔ موضوع کی ابعاد اور اطراف میں طواف کرسکے اور پھر اس سارے مشاہدے کو دل نشین اسلوب میں الفاظ کا پیکر دے سکے۔ اسی طرح پڑھنے والے کے پاس بھی ایسے لمحات ہونے چاہییں جب وہ ہلکی پھلکی چیز پڑھ کر ایک انوکھی مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ذہن پر لمبا چوڑا بوجھ ڈالے بغیر ایک معیاری، خوبصورت فکر انگیز اور دلچسپ چیز پڑھنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لمحات میں انشائیے سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ انشائیہ نئی صنفِ ادب ہونے کے باوجود روشن مستقبل رکھتا ہے۔

شہزاد منظر

کچھ انشائیے کے بارے میں

انشائیہ اُردو کی ایک نئی صنف ہے، جس کی تعریف کے ضمن میں ناقدوں اور انشائیہ نگاروں میں بڑے اختلافات ہیں اور آج تک انشائیہ کی کوئی ایسی جامع و مانع تعریف متعین نہیں ہوئی، جس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہو۔ ادب اور شاعری کی تعریفیں بھی مشکل ہوتی ہے، لیکن ایسی مشکل بھی نہیں کہ اس کی تعریف ہی نہ ہو سکے، جس طرح ادب کی ایک سے زیادہ تعریفیں ہو سکتی ہیں، اسی طرح انشائیہ کی بھی علمی اور فنی اعتبار سے مختلف تعبیریں ممکن ہیں، کوئی نہ کوئی ایسی تعریف تو ہونی چاہیئے، جس پر اکثریت کا اتفاق ہو یا جس سے اس صنف کے بنیادی وصف کو سمجھنے میں مدد ملے۔

جہاں تک اُردو انشائیے کا تعلق ہے اس بارے میں کچھ کنفیوژن پایا جاتا ہے، خصوصاً انشائیہ لکھنے اور پڑھنے والوں میں — سب سے پہلا کنفیوژن تو مضمون اور انشائیہ کے فرق کے بارے میں ہے۔ اُردو میں ایک عرصے تک مضمون انگریزی اصطلاح ایسے کے مفہوم میں استعمال کیا گیا، چنانچہ سرسید احمد خان، مولانا محمد حسین آزاد اور میر ناصر علی دہلوی وغیرہ نے مذہب، معاشرے اور اخلاق کے بارے میں جو کچھ لکھا، اُسے مضمون کہا گیا، چنانچہ بعض ناقدین نے سرسید احمد خاں کو اُردو کا پہلا انشائیہ نگار قرار دیا تو کسی نے جدید انشائیہ کا مُلّا وجہی اور میر ناصر علی دہلوی سے ڈانڈا ملایا۔ سوال یہ ہے کہ اگر سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، مولانا حالی، مولوی ذکاء اللہ، خواجہ حسن نظامی اور فلک پیما وغیرہ کے اخلاقی، علمی، معاشرتی اور مذہبی مضامین انشائیہ ہیں تو انشائیہ اور علمی مقالہ میں کیا فرق ہے؟ اگر انشائیے میں علمی لب و لہجے میں علم و دانش کا اظہار مقصود ہے تو اس کے لیے لفظ انشائیہ استعمال کرنا کیا ضروری ہے؟ اُردو میں اس کے لیے پہلے سے مقالے کی اصطلاح موجود ہے۔

اُردو میں اس سے قبل ایسے کے لیے مضمون کا لفظ رائج تھا چنانچہ سرسید احمد خاں اور ان کے ہم عصروں نے اپنے دور میں جو کچھ لکھا، اُسے مضمون ہی کہا گیا، لیکن قباحت یہ تھی کہ مضمون میں ہر قسم کے موضوع کا احاطہ ہو جاتا ہے، خواہ وہ علمی ہو یا غیر علمی۔ یہ دقت انگریزی میں بھی تھی چنانچہ انگریزی کے ناقدین نے علمی اور غیر علمی موضوعات کی تخصیص کے لیے لائٹ ایسے یا پرسنل ایسے کی اصطلاح وضع کی۔ اب لائٹ ایسے سے مراد ایسے موضوعات کے بارے میں مضامین تھے، جو خالص علمی نہ ہوں یعنی جو روز مرہ کے ہلکے پھلکے واقعات اور موضوعات کے بارے میں ہوں۔ سرسید احمد خاں کے عہد میں اور اس کے بعد بھی بہت عرصے تک، حتیٰ کہ چوتھی دہائی تک اُردو میں ایسے کے لیے مضمون کی اصطلاح استعمال کی گئی، چنانچہ کرشن چندر، کنہیا لال کپور اور پطرس وغیرہ کی مزاحیہ اور طنزیہ نگارشات کے لیے مضمون کی اصطلاح ہی استعمال ہوئی۔ ایسے کے لیے جب تک مضمون کا لفظ استعمال ہوا، کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہوئی اور نہ اس کا مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری پیش آئی، پریشانی اس وقت ہوئی جب انشائیہ کی اصطلاح وضع کی گئی اور ہمارے بعض ناقدین نے اسے مضمون کے مفہوم میں استعمال کرنا شروع کیا۔

اُردو میں لفظ "انشا" پہلے سے موجود تھا، لیکن انشائیہ کی اصطلاح سب سے پہلے کس نے استعمال کی؟ اس پر ہمارے ناقدین اور محققین میں کافی

اختلاف ہے، مثلاً سید محمد حسنین کا کہنا ہے کہ "۱۹۴۲ء میں سید علی اکبر قاصد کے چھوٹے چھوٹے ہلکے پھلکے مضامین کے مجموعے "ترنگ" کا مقدمہ لکھتے ہوئے سب سے پہلے اختر اورینوی نے لفظ انشائیہ استعمال کیا اور کہا کہ اس قسم کے مضامین کو انشائیہ کہنا چاہیے۔" ڈاکٹر وحید قریشی کا خیال ہے کہ "انشائیہ کا لفظ سب سے پہلے محدود معنوں میں غالباً مہدی حسن نے استعمال کیا۔" انور سدید کا خیال ہے کہ "اردو انشائیہ کی نمودِ اول ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ ہوئی۔ اس نووارد صنفِ ادب کو انشائے لطیف، خیال پارے، ادبِ لطیف اور نثر پارہ کہنے کی سعی کی گئی لیکن ان میں کوئی نام بھی قبولِ عام حاصل نہ کر سکا۔ پھر وزیر آغا کی تجویز اور میرزا ادیب کی تائید سے ماہنامہ "ادبِ لطیف" نے اس صنف کے لیے انشائیہ کا نام پیش کیا۔ اس کے برعکس ڈاکٹر وزیر آغا نے کراچی کے ادیبوں سے ایک پینل انٹرویو میں اعتراف کیا کہ لفظ انشائیہ سب سے پہلے اختر اورینوی نے استعمال کیا ہے مگر سید علی اکبر قاصد کے جن مضامین کے بارے میں استعمال کیا وہ انشائیہ کی ذیل میں نہیں آتے۔ ادبی اعتبار سے اس بات کی زیادہ اہمیت نہیں کہ اردو میں انشائیہ کی اصطلاح سب سے پہلے کس نے استعمال کی۔ اصل اہمیت انشائیے کی تعریف اور پہچان کی ہے۔

انشائیہ کی اصطلاح کو زیادہ سے زیادہ مبہم بنانے میں ہمارے بعض ناقدین نے بھی بھرپور حصہ لیا ہے، جن میں احتشام حسین، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر سیدہ جعفر اور صفی مرتضیٰ وغیرہ شامل ہیں۔ جنہوں نے انشائیہ (لائٹ ایسے) کو مضمون (ایسے) کے مفہوم میں استعمال کرکے قاری کے لیے مزید دشواریاں پیدا کردیں۔ ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف کے بارے میں خود ان کا ذہن صاف نہیں ہے، مثلاً ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اپنی ڈاکٹریٹ کی تھیسس "اردو مضمون نگاری کا ارتقا" میں آل احمد سرور کی تنقید کو محض شگفتہ بیانی کی وجہ سے "تنقیدی انشائیہ" قرار دیا۔ صرف اتنا ہی نہیں انہوں نے اپنی تھیسس میں ایسے کے لیے مضمون کی اصطلاح کے ساتھ ساتھ انشائیہ کی اصطلاح بھی استعمال کی۔ ہندوستان کے صفی مرتضیٰ نے مضمون کو مضمون مانتے ہوئے بھی اپنی کتاب کا نام "انشائیہ" رکھا۔ احتشام حسین جیسے سینئر اور ثقہ نقاد نے مولانا محمد حسین آزاد کی نثر نگاری سے بحث کرنے کے لیے انشائیہ کا لفظ استعمال کیا۔ انہوں نے لکھا کہ "گذشتہ ایک صدی میں اردو ادب کا دامن بھی انشائیوں سے مالا مال ہے۔" اسی طرح ڈاکٹر سلام سندیلوی نے لکھا کہ "اردو انشائیہ کے نمونے سرسید احمد خاں کے ہاں بھی ملتے ہیں۔" نظیر صدیقی کا خیال ہے کہ "سرسید احمد خاں کا مضمون "امید کی خوشی" منشی سجاد حسین اور اودھ پنچ کے دوسرے قلمی معاونین کے مزاحیہ خاکے اردو میں انشائیہ نگاری کے پیش رو کہے جا سکتے ہیں۔" ڈاکٹر وحید قریشی کا کہنا ہے کہ "سرسید احمد خان، مولوی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا حالی، علامہ شبلی، شرر، مولوی وحید الدین سلیم کے ہاں بھی انشائیے خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔" ہمارے ناقدین ادبی اصطلاحات کے استعمال میں کس قدر غیر ذمہ دار واقع ہوئے ہیں۔ اس کی چند مثالیں مندرجہ بالا سطور میں پیش کی گئی ہیں۔

نیاز فتح پوری کا خیال ہے کہ اردو ایسیز (ESSAYS) کی ابتدا سرسید احمد خاں سے ہوتی ہے۔ ایسے کی حد تک ان کا یہ خیال بہت حد تک درست ہے اس لیے کہ اس سے قبل اردو میں اس قسم کی تحریر یعنی مضمون نگاری کی مثال نہیں ملتی، لیکن ہمیں یہاں ایسے اور لائٹ ایسے کے فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ عام طور پر یہ فرق نہ رکھنے کی وجہ سے ہی ابہام اور الجھن پیدا ہوتی ہے۔ اردو میں اس وقت لفظ "انشائیہ" انگریزی اصطلاح لائٹ یا پرسنل ایسے اور فرانسیسی اصطلاح بیلے لیترس (BELLES LETTRES) کے مفہوم میں استعمال ہو رہا ہے۔ آج سے قبل اردو میں ایسے کے لیے مضمون کا لفظ مستعمل تھا، جو میرے خیال میں درست تھا۔ مضمون کے لیے انشائیہ کے لفظ کو استعمال کرنے سے جو الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں، انہیں دور کرنے کے لیے میرے خیال میں ایسے کے لیے مضمون اور لائٹ ایسے کے لیے انشائیہ کا لفظ استعمال کرنا چاہیے تاکہ انشائیہ کی تعریف متعین کرنے میں آسانی ہو۔ ایک دقت لائٹ ایسے اور پرسنل ایسے کے مابین فرق کے سلسلے میں پیدا ہو رہی ہے۔ مغربی ناقدین نے لائٹ اور پرسنل ایسے کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ لائٹ ایسے میں اگر مصنف ہلکے پھلکے موضوعات پر اظہارِ خیال کرتا ہے تو پرسنل ایسے میں وہ قطعی شخصی تاثرات کا اظہار۔ اس اعتبار سے پرسنل ایسے اس کا قطعی ذاتی یعنی داخلی معاملہ ہوا اور لائٹ ایسے خارجی معاملہ۔ یہ درست ہے کہ انشائیہ کی اصطلاح اختر اورینوی کی وضع کردہ ہے لیکن

انشائیہ سے اُن کی مراد انگریزی کا ایسے تھا، لائٹ یا پرسنل ایسے نہیں۔ لائٹ ایسے کے لیے انشائیہ کی اصطلاح سب سے پہلے وزیر آغا نے ہی استعمال کی ہے اور انہوں نے ہی پاکستان میں اس نوزائیدہ صنف کو پروان چڑھایا اور اُسے تحریک کی شکل دی ہے لیکن انہوں نے اپنے مختلف مقالات میں انشائیہ کی جو تعریف پیش کی ہے، اسے تمام انشائیہ نگاروں اور ناقدوں نے مکمل طور پر قبول نہیں کیا ہے اور آج بھی انشائیہ کی تعریف کے ضمن میں بہت ابہام اور اختلاف پایا جاتا ہے۔

انشائیے کے سلسلے میں اُلجھن کی ایک وجہ یہ ہے کہ بعض انشائیہ نگار، طنز و مزاح اور انشائیہ کو ایک ہی سمجھ لیتے ہیں، جب کہ طنز و مزاح یقیناً لائٹ ایسے سے مختلف ہے۔ اگر مختلف نہیں ہے تو پھر لائٹ ایسے یعنی انشائیہ اور مزاحیہ اور طنزیہ تحریروں میں کیا فرق ہے؟ میرے خیال میں الجھن کی وجہ یہ ہے کہ طنز و مزاح کو ایک صنف سمجھ لیا گیا ہے جب کہ طنز و مزاح اسلوب کا نام ہے، صنف کا نہیں۔ طنز نگاری اور مزاح نگاری نثر کے ہی مختلف اسالیب ہیں۔ انشائیہ میں ہلکی طنز یا ہلکے مزاح کی گنجائش ہے، لیکن خالص طنز یا خالص مزاح کی نہیں۔ ہمیں طنز و مزاح اور انشائیہ کے درمیان خطِ فاصل ضرور کھینچنا چاہیے۔

ان دنوں بعض افسانے پڑھ کر یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ افسانہ ہے یا انشائیہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انشائیے کے انداز میں افسانے لکھنے والے افسانہ نگار نہ افسانے کے فن سے واقف ہوتے ہیں اور نہ انشائیے کے وصف سے۔ اگر کوئی افسانہ انشائیہ بن جائے تو اس سے افسانہ اور افسانہ نگار دونوں کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ افسانے کو ہر حال میں افسانہ ہونا چاہیے۔ اگر افسانہ، افسانہ نہیں رہتا تو پھر اسے افسانے کے بجائے کچھ اور کہنا چاہیے۔ انشائیہ ایک آزاد صنف ہے، اس کے لیے کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں، جب کہ افسانے کا اپنا گرامر ہے۔ خواہ وہ علامتی ہو یا غیر علامتی۔

اس وقت انشائیہ نگاری سے ہندوستان میں کم اور پاکستان میں بہت زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے اور اس کی نت نئی تعریفیں بیان کی جا رہی ہیں، اور عام لوگ پوچھ رہے ہیں کہ انشائیہ کیا ہے اور کیا نہیں۔ پاکستان میں اس صنف کے بارے میں جن مصنفین اور ناقدین نے اس کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی ہے، ان میں وزیر آغا، نظیر صدیقی اور مشکور حسین یاد کے نام سرِ فہرست ہیں۔ اس بارے میں پاکستان میں یوں تو ڈاکٹر وحید قریشی، انور سدید، رشید نثار، مشکور حسین یاد، سلیم اختر، جمیل آذر، غلام الثقلین نقوی، محمد ارشاد اور عبادت بریلوی نے اور ہندوستان میں سید احتشام حسین، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر سید محمد حسنین، ڈاکٹر ظہیر الدین برنی، ڈاکٹر قمر رئیس، احمد جمال پاشا، سید صفی مرتضیٰ، اطہر پرویز اور سیدہ جعفر نے بہت کچھ لکھا ہے، لیکن وزیر آغا کا کام سب سے وقیع ہے۔ انشائیہ کی تعریف متعین کرنے کے سلسلے میں وزیر آغا نے سب سے زیادہ مضامین تحریر کیے ہیں اور اپنے جریدہ "اوراق" کو انشائیے کی ترقی و ترویج کے لیے وقف کر دیا ہے۔ انشائیہ پر اگرچہ وزیر آغا کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے، لیکن انہوں نے انشائیہ کے موضوع پر سب سے زیادہ کام کیا ہے اور وہ آج بھی اس موضوع پر مسلسل لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے ہر جہت سے انشائیے کی پہچان متعین کرنے اور انشائیے کو علمی اور فکری مضامین اور طنزیہ مزاحیہ تحریروں سے جدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں ان کے مضامین "انشائیہ کیا ہے؟" "انشائیہ کا سلسلۂ نسب" اور "دوسرا کنارہ" کا دیباچہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ تمام لوگ وزیر آغا کی انشائیہ کی پیش کردہ تعریف کو سو فی صد تسلیم کر لیں۔ اختلاف کی گنجائش ہر صنفِ ادب میں رہتی ہے اس لیے اختلاف و اتفاق کا سلسلہ جاری رہے گا لیکن کیا یہ بات کم اہم ہے کہ ایک بڑی ادبی شخصیت نے اپنی ادبی زندگی کے تیس سال جزوی طور پر اس صنفِ ادب کی تعریف و ترویج کے لیے وقف کیے رکھے۔

وزیر آغا نے اپنے مقالے "انشائیہ کا شجرۂ نسب" میں انشائیے کے ضمن میں سب سے واضح باتیں کہی ہیں اور ثابت کیا ہے کہ انشائیہ، عام مضمون اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین سے کن معنوں میں مختلف ہے۔ انہوں نے انشائیہ کے لیے "خالص ایسے" کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے انشائیے کا ایک مختصر سا شجرہ بھی مرتب کیا ہے تاکہ بات واضح ہو جائے۔ انہوں نے ادب کو واضح طور پر نثر اور شاعری میں تقسیم کرنے کے بعد نثر کو آٹھ مختلف حصّوں میں تقسیم کیا ہے، یعنی داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ، سوانح عمری، سفر نامہ، انشائیہ اور مضمون۔ پھر انہوں نے مضمون کو مزید پانچ حصّوں میں تقسیم کیا ہے، یعنی طنزیہ مضمون، مزاحیہ مضمون، تنقیدی مضمون، علمی مضمون اور تحقیقی مضمون۔ اس طرح انہوں نے انشائیے کو عام مضمون سے الگ صنف گردانا ہے۔ ان کی ان کوششوں کا مقصد انشائیے کی انفرادیت اور طہارت کو قائم رکھنا اور اسے خالص

مضمون اور اس کی دیگر قسموں سے الگ کرتا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے سرسید احمد خاں سے لے کر آج تک کی مضمون نگاری کا جائزہ لیا ہے اور اس ابہام اور کنفیوژن کا اعتراف کیا ہے، جو انشائیے کی اصطلاح کے سلسلے میں آج تک موجود ہے۔

انشائیہ کے سلسلے میں نظیر صدیقی اور مشکور حسین یاد نے بھی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے درمیان بھی شدید اختلاف ہے۔ آیئے انشائیہ کے بارے میں مختلف ناقدین کی آرا کا جائزہ لیں۔ نظیر صدیقی انشائیہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "انشائیہ ادب کی وہ صنف ہے، جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کیے جاتے ہیں اور بامعنی باتوں کی مہملیت اور مجہولیت اجاگر کی جاتی ہے۔ یہ وہ ادبی صنف ہے، جس میں لکھنے والا غیر سنجیدہ ہونے کے باوجود سنجیدہ ہوتا ہے، جس میں تفریح اور تنقید ایک دوسرے سے بغل گیر نظر آتی ہیں اور بصیرت اور ظرافت ایک دوسرے کی سگی بہنیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس میں اسلوب کا دل نشیں ہونا اتنا ہی ضروری ہے، جتنا خیالات کا دلچسپ ہونا، جن چیزوں کی بنا پر کسی انشائیہ نگار کو اونچا مرتبہ حاصل ہوتا ہے وہ پر تکلف خیال (FANCY) ذہن کی ترنگ (WHIM) اور مصنف کا اسلوب (IDIOSYNCRACY) نہیں بلکہ زندگی اور انسانی فطرت پر وہ تنقید ہے، جو گہرے مشاہدے اور مطالعے پر مبنی ہوتی ہے۔" انور سدید کا خیال ہے کہ "جب تک انشائیے میں موضوع کا انوکھا پن، اظہار کا غیر رسمی انداز، عدم تکمیل، غیر منطقی استدلال، کفایتِ لفظی اور شخصیت کی ذاتی رونمائی نہ ہو، کسی تحریر کو انشائیہ کہنا موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ اچھی انشا مصنف کے ذاتی اسلوب کا ایک عمدہ وصف ہے۔" وحید قریشی کا خیال ہے کہ "فلسفیانہ مباحث اور طنزیہ افکار انشائیے کے جذباتی رویّے کے لیے خام مواد فراہم کرتے ہیں۔ ان کی موجودگی کسی طرح بھی انشائیے کے بنیادی وصف کو زائل نہیں کرتی" اس بارے میں وزیر آغا کا خیال ہے کہ "انشائیہ کا کام یہ ہے کہ وہ سوچ کے لیے غذا مہیا کرے، شے میں مضمر مخفی مفہوم کو سامنے لائے، معنی آفرینی کے عمل کو جنبش دے، البتہ اس کے لیے عام مقالات کی طرح دلائل و براہین سے کام نہ لے۔ انشائیے میں سوچ قطعاً پرسنل نوعیت کی ہوتی ہے اور بنیادی طور پر معنی آفرینی میں ہی اجاگر ہوتی ہے۔" مشکور حسین یاد کے خیال میں "انشائیہ ایک امکانی صنف ہے۔ اس کا سب سے بڑا اور بنیادی اصول غیر رسمی اور بے تکلف اندازِ بیان ہے۔ انشائیہ لکھتے وقت ایک ادیب کے ذہن میں مروجہ اصناف میں سے کوئی صنف نہیں ہوتی۔ وہ اپنے دل کی بات کہنا چاہتا ہے اور اس طرح کہنا چاہتا ہے، جیسے اس کے [illegible] اس بات کو اور کوئی نہیں سن رہا ہے۔ انشائیہ نگاری کے لیے نہ مزاح ضروری ہے اور نہ سنجیدگی۔ انشائیہ نگار اپنے قاری کو خوش بھی کر سکتا ہے اور اداس بھی، البتہ جو چیز لازمی ہے وہ جذبہ و فکر کا اچھوتا پن ہے۔ انشائیے کی خصوصیات میں بے تکلفی اور آزادہ روی بنیادی شرط ہے۔" مشکور حسین یاد انشائیے کی کوئی واضح تعریف بیان کرنے کے بجائے صرف اتنا کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ "انشائیہ کی تعریف یا تو انشائیہ پڑھنا ہے یا انشائیہ لکھنا۔"

راقم الحروف نے انشائیے کی یہ تعریفیں مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے ناقدین کے نقطہ ہائے نظر کی وضاحت کے لیے پیش کی ہیں۔ مصنف کا ان سے اتفاق قطعی ضروری نہیں۔ انشائیے کے سلسلے میں ان مصنفوں کی بہ نسبت وزیر آغا کا ذہن زیادہ واضح ہے۔ وزیر آغا انشائیے کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "انشائیے کے خالق کے پیش نظر کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا، جس کی تکمیل کے لیے وہ دلائل و براہین سے کام لے۔ اس کا کام چند لمحوں کے لیے زندگی کی سنجیدگی اور گہما گہمی سے قطع نظر کر کے ایک غیر رسمی طریقۂ کار اختیار کرنا اور اپنے شخصی ردِ عمل کے اظہار سے ناظر کو اپنے حلقۂ احباب میں شامل کرنا ہے۔ انشائیہ کی صنف شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے۔ انشائیہ نگار کا کام ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہے۔ اس کے لیے وہ طنز سے کچھ زیادہ کام نہیں لیتا کیونکہ طنز ایک سنجیدہ مقصد لے کر برآمد ہوتی ہے چنانچہ ایک اچھے انشائیے میں طنز کبھی بھی مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ محض "سہارے" کا کام دیتی ہے۔ انشائیے کی ایک اور امتیازی خصوصیت اس کی عدم تکمیل ہے۔ اس میں موضوع کی مرکزیت تو قائم رہتی ہے، لیکن اس مرکزیت کا سہارا لے کر بہت سی باتیں بھی کہہ دی جاتی ہیں، جن کا بہ ظاہر موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ انشائیے کا ڈھانچہ مقالے کی بہ نسبت زیادہ لچکیلا (LOOSE) ہوتا ہے۔ انشائیے میں مرکزی خیال کے باوصف دلائل کا کوئی منضبط سلسلہ قائم نہیں کیا جاتا۔ انشائیہ نثر کی دوسری اصناف سے اپنے اختصار کے باعث علیحدہ نظر آتا ہے۔ ایک آخری چیز، جسے انشائیے کا امتیازی وصف سمجھنا چاہیے، اس کی "تازگی" ہے۔ تازگی سے مراد محض اظہار و ابلاغ کی تازگی نہیں، تازگی سے مراد موضوع اور نقطۂ نظر کا انوکھا پن

بھی ہے۔ وزیر آغا کا خیال ہے کہ "انشائیہ میں اصلاحی رنگ اور سنجیدہ اندازِ بیان انشائیہ کے لیے مضر ہے۔"

ہم نثر میں جو کچھ لکھتے ہیں وہ کسی نہ کسی صنف میں لکھتے ہیں۔ انشائیہ وہ صنف ہے جو نہ تنقید ہے، نہ افسانہ اور نہ علمی مقالہ۔ وہ ان تمام اصناف سے مختلف اپنی جگہ ایک مکمل صنف ہے۔ انشائیے کا اگرچہ ابھی تک کوئی کلیہ مقرر نہیں ہوا ہے لیکن اس کی پہچان مقرر کرنے کی پوری کوشش کی جارہی ہے۔ انشائیے میں اصل شے طرزِ بیان اور اسلوب ہے۔ اگر آپ صاحب طرز مصنف ہیں تو آپ انشائیے میں بھی علم و دانش یا زندگی کے کسی بھی پہلو کے بارے میں بہت کچھ کہہ سکتے ہیں اور اگر آپ کے پاس کہنے کا انداز نہیں ہے تو آپ انشائیے کے نام پر جو کچھ بھی لکھیں گے، ایلور ڈوم اور اکتاہٹ پیدا کرنے والا ہوگا۔ وزیر آغا کا یہ خیال درست ہے کہ "انشائیہ کے امتیازی اوصاف کو نشان زد کرنے یا انشائیہ کی "تعریف" پیش کرنے سے بات نہیں بنے گی کیونکہ "تعریف" کو رٹ لینے سے کسی چیز کی پہچان نہیں ہو جاتی۔ اکثر لوگ انشائیہ کی بالکل صحیح تعریف کرتے ہیں اور اس کے امتیازی اوصاف کو بڑی خوش اسلوبی سے بھی پیش کرتے ہیں لیکن جب پہچان کا مرحلہ آتا ہے تو ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔" اصل سوال انشائیے کی تعریف کو سمجھنا اور اسے تخلیقی سطح پر صحیح طور پر پیش کرنا ہے۔ لوگ چونکہ عام طور پر انشائیے کی صنف کے سلسلے میں غلط فہمی اور ابہام کے شکار ہیں اس لیے وہ اس صنف میں طبع آزمائی کرتے وقت اُلجھ جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا انشائیے کے بارے میں لوگوں کا شعور واضح ہوتا جائے گا۔ اور انشائیہ نگاری کی اچھی مثالیں سامنے آتی جائیں گی۔ اس بارے میں غلط فہمی اور ابہام دُور ہوتا جائے گا اور یہ صنف نکھر کر سامنے آجائے گی۔ اصل اہمیت تخلیق کی ہے۔ انشائیے کی تعریف یا نظریے کی نہیں۔ تخلیق ہی کسی صنف کی صحیح تعریف ہو سکتی ہے۔ اس لیے میری رائے میں مصنفوں کو انشائیے کی تعریف میں اُلجھنے کے بجائے انہیں جو کچھ لکھنا ہے لکھتے رہنا چاہیئے۔ ان کی تحریر اگر انشائیے کی تعریف پر صحیح اُترتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ کسی دوسری صنف سے متعلق ہو جائے گی۔ اصل مشکل اُن فیشن پرست اور نام نہاد انشائیہ نگاروں کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے جو اپنی ہر اناپ شناپ تحریر کو انشائیہ کہلوانے بلکہ منوانے پر مُصر ہیں۔ ایسے مصنفوں کا اصرار ہے کہ ان کی خالص طنزیہ، مزاحیہ یا سنجیدہ تحریر کو انشائیہ تسلیم کرلیا جائے، جیسے طنزیہ یا مزاحیہ مضمون لکھنا بہت شرم کی بات ہو، حالانکہ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کی اپنی جگہ بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اُردو میں اچھے طنز و مزاح نگار خال خال ملتے ہیں جبکہ نام نہاد انشائیہ نگاروں کی فوج ظفر موج موجود ہے۔ اس لیے ایسے مصنفوں کو انشائیہ نگاری کا پیچھا چھوڑ کر اپنی ساری توجہ طنز و مزاح نگاری کی جانب مرکوز کرنی چاہیئے۔ اس طرح وہ اُردو ادب کی زیادہ خدمت کر سکیں گے اور انشائیہ کی صنف اُن کی مشقِ ستم سے بچ جائے گی۔

تخلیق کو ہر دَور میں تنقید پر فوقیت رہی ہے اور تخلیق کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد ہی تنقید کے اصول مرتب ہوتے ہیں اس لیے انشائیہ کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ مصنف کو آزاد ماحول میں لکھنے کا موقع دیا جائے۔ اس کے ضوابط اور ڈسپلن پر زیادہ اصرار نہ کیا جائے۔ جب یہ صنف اچھی طرح ترقی کر جائے گی اور اس کی شکل نکھر کر سامنے آجائے گی تو انشائیہ کی صحیح تعریف متعین کرنا نسبتاً آسان ہو جائے گا۔ اس وقت اس صنف پر کسی قسم کا قدغن لگانا خود اس کی ترقی کے لیے مناسب نہیں ہے۔ انشائیہ کی صنف غزل کی طرح جس قدر آسان ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔ اسی لیے بعض ناقد اسے مشکل ترین صنف کہتے ہیں ——————

—————— انشائیے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ انشا کا اعلیٰ نمونہ ہو۔ لہٰذا اچھی انشائیہ نگاری کے لیے تخلیقی زبان ضروری ہے، لیکن تخلیقی زبان سے مراد طنز و مزاح، لطائف یا پند و نصائح نہیں ہے۔ انشائیہ ان دِنوں مظلوم ترین صنف ہے، جس پر ہر کس و ناکس طبع آزمائی کر رہا ہے۔ خواہ اسے انشائیہ اور مضمون کے درمیان فرق معلوم ہو یا نہ ہو۔ اگر انشائیہ کو پروان چڑھنا ہے تو اس صنف میں قد آور شخصیتوں کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ صرف بڑی اور تخلیقی شخصیتیں ہی اس صنف کو ترقی دے سکتی ہیں، اس کے مستقبل کو روشن کر سکتی ہیں اور اُردو میں بھی مونتین اور چارلس لیمب جیسے مصنف پیدا ہو سکتے ہیں۔

حامد برگی

انشائیہ کا فن

انشائیہ نثر سے زیادہ شعر و سخن کا فن معلوم ہوتا ہے۔

انشائیہ کی ہیئتِ ترکیبی غزل کی سی ہے۔ انشائیہ لکھنے کی تحریک بھی کسی ایسے خیال یا جملے سے ہوتی ہے جو مطلع کی صورت انشائیہ نگار کے ذہن میں طلوع ہوتا ہے اور بنیادی تحریک یا انسپریشن (INSPIRATION) کا کام دیتا ہے پھر غزلِ مسلسل کی طرح موضوع سے متعلق مضامین ذہن میں آنے لگتے ہیں جو نظم ہونے کی بجائے نثر ہوتے جاتے ہیں۔ انشائیہ کا ہر نیا پیراگراف خیال کی ایک نئی لہر کو پیش کرتا ہے۔ شعر کی طرح انشائیہ کے ہر نئے خیال کی خوبی بھی اس کی جامعیت میں ہے ہر خیال جو انشائیہ نگار کے ذہن میں وارد ہوتا ہے وہ اپنی پوری معنویت کے ساتھ مختصر سے مختصر الفاظ میں ادا ہونا چاہیئے۔ انشائیہ میں مقالہ کی طرح وضاحتوں کی گنجائش نہیں۔ ایہام اور ایمائیت انشائیہ کا حسن ہے۔ بات جتنی اشاروں کنایوں میں ہو اتنی ہی خوبصورت اور فنکارانہ ہوتی ہے بشرطیکہ وہ سوچ و خیال کے دروازے کھولتی جائے۔ انشائیہ نگار کا عندیہ مبہم ہونے کے باوجود قاری کی سمجھ میں آجائے اسے انشائیہ نگار سے وضاحتیں طلب کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔

غزل کی طرح ایک اچھے انشائیہ میں جزوی تاثر بھی لازمی ہے۔ انشائیہ ایک غزلِ مسلسل کی طرح ہے جس کا ایک مجموعی تاثر بنتا ہے مگر ہر شعر انفرادی طور پر بھی اپنے معنی و مفہوم رکھتا ہے اسی طرح انشائیہ کے مجموعی تاثر کے علاوہ اس کی جزئیات کے حسنِ معنی کی طرف بھی نگاہ ہونی چاہیئے اگر انشائیہ میں شامل کوئی جزوی خیال قاری کو متاثر نہیں کرتا تو اس کو بھی اسی طرح "ہُوٹ" ہو جانا چاہیئے جس طرح غزل کا کوئی شعر رد ہوتا ہے۔

انشائیہ لکھتے ہوئے انشائیہ نگار موضوع پر سوجھنے والے ہر خیال کو انشائیہ میں شامل نہیں کرتا انظر انتخاب سے کام لیتا ہے۔ اور اس طرح بھی انشائیہ نگار غزل گو شعرا کی صف میں آجاتا ہے وہ خیال کے حسن و نزاکت کی طرف نگاہ رکھتا ہے اور اپنے فن پارہ کے مجموعی حسن کو غارت نہیں کرنا چاہتا جس طرح غزل میں وارد ہونے والا ایک بھونڈا شعر غزل کے مجموعی حسن کو متاثر کرتا ہے اور اس کا خارج کر دینا ہی مناسب نظر آتا ہے اسی طرح انشائیہ میں در آنے والا کوئی ناقص خیال بھی بآسانی انشائیہ سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ اس اخراج سے انشائیہ کی مجموعی ہیئت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

انشائیہ میں وارد ہونے والا ہر خیال اپنی جگہ اتنی اہمیت اور حیثیت کا حامل ہونا چاہیئے جیسے غزل کا ہر شعر اور ایک غزل کی سی حیثیت سے انشائیہ کو پرکھا جانا چاہیئے۔ ایک اچھے انشائیہ میں کوئی خیال اپنے نفسِ مضمون کے اعتبار سے زیادہ اہم اور کم اہم نہیں ہونا چاہیئے اچھے انشائیہ کا حسن برقرار رکھنے کے لیے کم اہم حصوں کو یا تو خارج کر دینا چاہیئے یا ان کی حیثیت کو اہم بنا کر پیش کرنا چاہیئے کسی ادنیٰ سی بات کو ندرتِ فکر و نظر دینے کا نام ہی فن ہے اور انشائیہ میں اس کا اتنا ہی عمل دخل ہے جتنا شعر و سخن میں بالخصوص صنفِ غزل میں۔

اچھے انشائیہ نگاروں نے اکثر ادنیٰ باتوں کو انشائیہ کا موضوع بنایا ہے۔ بعض اوقات یہ موضوع بادی النظر میں اتنا معمولی دکھائی دیتا ہے کہ اس میں کسی خیال آفرینی کی گنجائش نظر نہیں آتی، عام انسان بھی ان موضوعات کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے لہذا ان میں قطعاً کسی ندرتِ فکر و نظر کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہوتا مگر

انشائیہ نگار جب اسی موضوع میں گہرائی، وسعت اور بلندی تلاش کرتا ہے اور اس موضوع پر غور کرنے کے نئے زاویے ڈھونڈھ نکالتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ عام آدمی کا تاثر و علم ان روز مرہ کے موضوعات پر کتنا سطحی ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار کی ژرف نگاہی، جودتِ فکر اور رعنائیِ خیال کن کن اسالیب سے اس ادنیٰ موضوع کو اٹھا کر فکر و فن کی بلندیوں پر لے جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں اردو انشائیہ نگاروں کی جو کھیپ سامنے آئی ہے بڑے کامیاب تجربے کرتی دکھائی دیتی ہے ____
بارہواں کھلاڑی، "چرواہا"، "دسترخوان" (وزیر آغا)۔ "سوال اٹھانا"، "مکان بنانا" (غلام جیلانی اصغر)۔ "آئس کریم کھانا" (مشتاق قمر)۔ "چھینک" (انور سدید) "اخبار پڑھنا"، "مچھلی کا شکار" (جمیل آذر)۔ "پوسٹ کارڈ" (رام لعل نابھوی)۔ "درمیانی منزل" (اکبر حمیدی)۔ "تکلف" (حامد برگی)۔ "عینک" (پرویز عالم) "ڈائری" (اسد اللہ) وغیرہ انشائیے اپنے موضوعی اعتبار سے اتنے اہم نہیں جتنے اپنے ٹریٹمنٹ (TREATMENT) کے لحاظ سے انشائیے بنے ہیں۔ یہی موضوعات کسی غیر انشائی ذہن رکھنے والے ادیب کے ہاتھوں میں جا کر کوئی اور ہی رنگ اختیار کرتے انشائیہ نہیں پاتے۔

کہتے ہیں جان کیٹس اور اس کے دوست لے ہنٹ نے ایک شب باہم چیپ مین کی 'ہومر' پڑھنے میں گزاری اگلے روز لے ہنٹ نے اس تجربے اور عمل کو خشک حقائق کی صورت اپنی ڈائری میں درج کیا جبکہ کیٹس نے اس تجربے کی بنیاد پر ایک انتہائی خوبصورت 'سانیٹ' تخلیق کی جہاں اس تجربے کو خیال و خواب کے گمنام جزیروں میں بادیہ پیمائی سے تشبیہہ دی اور ماضی کی وسعتوں میں اپنے تصورات کی ان جولانیوں کا ذکر کیا جو اس مطالعہ کے دوران اسے نصیب ہوئی تھیں۔

انشائیہ نگاری کے موجد مونتین کے علاوہ بیکن کے مضامین بھی جو انشائیہ کی بنیاد کہے جا سکتے ہیں، روز مرہ کے موضوعات پر ہیں۔ دوستی، تحفہ، باغات، پھول، موت اور اسی نوعیت کی مجرد اور غیر مجرد حقیقتوں پر۔ اُن کے موضوعات میں بظاہر کسی فکر و فلسفہ کی تلاش ممکن نہیں، ان روز مرہ حقیقتوں پر حقیقت مندانہ غور و خوض ہی ہو سکتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان موضوعات پر فکر و فلسفہ کا اظہار فکر و فلسفہ بگھارنے والی بات ہوگی اور کسی ذہن کو قائل نہ کر سکے گی مگر جب انشائیہ نگار حقیقت کی کھونٹی پر فلسفہ و خیال کی رنگ برنگ ڈوریاں باندھنے لگتا ہے تو آنکھوں کے سامنے قوسِ قزح سی بکھرنے لگتی ہے اور موضوع ____ آبِ رواں کی طرح اپنی گہرائی، وسعت اور فاصلے سمیٹتا آگے بڑھنے لگتا ہے، موضوع کی کثافت اور دھند دور ہونے لگتی ہے اور نئے منظر سامنے آنے لگتے ہیں۔

انگریزی ادب میں انشائیہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جنہوں نے انشائیہ نگاری کے ذریعہ ہی انگریزی ادب میں اپنا مستقل مقام پیدا کیا ہے۔
چارلس لیمب، ولیم ہیزلٹ، لے ہنٹ، آر ایل سٹیونسن وغیرہ گزشتہ صدی کے نامور انشائیہ نگار تھے۔ ان کے انشائیوں کے موضوع بھی روز مرہ کے ادنیٰ مشاہدوں تجربوں اور سوچوں پر مبنی تھے۔ سٹیونسن نے تو 'کاہلوں کی وکالت' میں ایک خوبصورت انشائیہ رقمطراز کیا۔ لیمب نے 'کنواروں کا شکوہ' نام کا خوبصورت انشائیہ قلمبند کیا۔ فطری مناظر، مظاہر اور مشاہدات پر تو بہت گرانقدر انشائیے لکھے گئے۔ ولیم ہیزلٹ کا انشائیہ 'سیر و سفر پر' ان انشائیوں میں سرِ فہرست ہے۔ یہ وہ جواہر پارے ہیں جن کے ذکر کے بغیر انگریزی ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔

رومانوی تحریک کے احیاء کے اس دور سے پہلے اٹھارویں صدی کا ادب بھی انگریزی ادب کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے بالخصوص یہ وہ دور ہے جس میں انگریزی نثری ادب نے زبردست فروغ پایا۔ افسانوی ادب ناول نگاری کی صورت میں بھی ابھی منصۂ شہود پر نہ آیا تھا، ہم اس دور کو بجا طور پر انشائی ادب کا دور کہہ سکتے ہیں، اس دور کا شعر و ادب معقولیت کا حامل ہے۔ پختگیٔ فکر و خیال انشائی ادب کی خاص صفت ہے۔ انشائیہ اور افسانہ میں بنیادی فرق یہی ہے کہ انشائیہ بالغ نظری اور زندگی کے وسیع تجربے اور فکر کی پختگی اور بلوغت کا تقاضا کرتا ہے۔ جبکہ افسانہ کا تعلق انسان کی جذباتی زندگی سے ہے افسانہ نگار عمر کے ایک خاص دور میں بیٹھ کر اس دور کی باتیں کہہ رہا ہوتا ہے۔ اس کے مخاطب بھی بالخصوص اسی جذباتی دور سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ جس طرح کہانی قصہ اور داستانوں کے اصل مخاطب لڑکپن کے دور سے تعلق رکھنے والے نوعمر لڑکے لڑکیاں ہیں جو کل کے گھوڑوں پر سوار پرستانوں اور کوہ قاف کی مہمات پر روانہ ہوتے ہیں، جنوں، بھوتوں، پریوں اور جادوگروں کی طلسماتی دنیاؤں میں خیالی پروازیں کرتے ہیں، اسی طرح افسانہ بھی جوان امنگوں کی تسکین کا ذریعہ بنتا ہے اور افسانہ کا

مخاطب اٹھارہ سال کی عمر سے کر چالیس سال عمر تک کا قاری ہے جبکہ انشائیہ کی صحیح امنگ اور تحریک ہی دورِ شباب سے گزر کر ہوتی ہے۔ اس دور میں جب انسان زندگی بھر کے اتار چڑھاؤ، بچپن کی بلند پروازیوں اور شباب کی امنگوں اور جذباتی بوقلمونیوں پر خوش دلی سے، تحمل اور بردباری سے اور کامل بصیرت سے ہنس اور مسکرا سکے، اپنی زندگی بھر کی کارگزاری کی روشنی میں اپنی حماقت اور کم عقلی اور بے بصیرتی کا جائزہ لے سکے۔ وہ عرفان و آگہی کے اس مقام پر ہو جہاں زندگی بھر کی سنجیدہ باتیں ادنیٰ اور بے حقیقت نظر آئیں، زندگی لہو و لعب اور دنیا بازیچۂ اطفال دکھائی دے۔

اٹھارویں صدی کے انگریزی شعری ادب میں بھی واضح طور پر انشائیہ کا رنگ جھلکتا ہے۔ کلاسیکی شاعری جس میں جذبہ و تخیل کی بجائے شعور، ہیئت اور زبان و بیان کو زیادہ اہمیت دی گئی، شاعری ہوتے ہوئے بھی مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری کے زیادہ قریب آگئی۔ الیگزانڈر پوپ نے تو باقاعدہ پابند شاعری میں انسان پر اور فنِ تنقید پر منظوم انشائیے تحریر کیے۔ دراصل نظم میں معقولیت اور حقیقت کا رنگ اگر جذبہ و تخیل اور ماورائی حقائق سے گریز ہو جائے تو وہ نظم نظم ہوتے ہوئے بھی نثر ہوتی ہے۔ اپنی ان منظومات کا نام ESSAYS رکھ کر پوپ نے مزید حقیقت پسندی کا ثبوت دیا۔ پوپ کے علاوہ ایڈیسن اور سٹیل نے معقولیت پسندی کے اس رجحان کو اپنے نثری روزنامچوں کی صورت میں ٹیٹلر اور سپیکٹیٹر میں رائج کیا۔ یہ نثر نامے موضوعی اعتبار سے بھی اور اسلوب کے لحاظ سے بھی انشائیہ کی مخصوص بنیادیں بنے۔ ان روزنامچوں میں معاشرہ کی بعض کمزوریوں اور فیشن کے رجحان کو موضوع بنایا گیا۔ ان تحریروں میں ہلکے ہلکے دبے دبے طنز اور مزاح کو شامل کیا گیا مگر کچھ اس طرح کہ خود جھینپنے والا اپنے آپ پر ہنس اور مسکرا سکے۔ ان تحریروں کو ہم باقاعدہ طنز نگاری اور مزاح نگاری میں شمار نہیں کر سکتے بلکہ شگفتہ تحریر کے زمرے میں لا سکتے ہیں۔ انشائیہ بھی اسی شگفتگی کا تقاضا انشائیہ نگار سے کرتا ہے۔ سوفٹ اور گولڈ سمتھ اس دور کی دو اور قد آور شخصیتیں ہیں جنہوں نے نثر نگاری اور انشا پردازی کے فن سے معاشرے کو سنوارنے کا کام لیا۔ اس دور کا انشائیہ صاف اور جلی آئینہ ہے جس میں اس دور کی تصویر من و عن دکھائی دیتی ہے، صرف شکل و صورت ہی نہیں عکسِ باطن بھی۔ دراصل اس دور کے انشائیہ نگاروں نے ظاہر کو اس طرح پیش کیا ہے کہ باطن بھی ظاہر ہو کر سامنے آگیا ہے۔

انشائیہ کی فضا ہلکے پھلکے لطیف اندازِ نگارش کا تقاضا کرتی ہے کچھ اس طرح کہ جیسے انشائیہ نگار اپنے کسی قاری کے ذہن کو گرانبار نہیں کرنا چاہتا۔ انشائیہ نگار اپنے قاری کو ساتھ لے کر آگے چلتا ہے جہاں ہنستا ہے وہاں اپنے قاری کو بھی ہنسنے پر مجبور کرتا ہے، جن کیفیات سے گزرتا ہے قاری کو بھی ان میں مبتلا کرتا ہے۔ غزل کے اشعار کی طرح انشائیہ نگار کا خیال بھی قاری کے دل کی آواز ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار کے خیال کی گونج کو قاری اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ انشائیہ کا ہلکا پھلکا رنگ اور لطیف انداز اپنے اندر وہی کیفیت رکھتا ہے جو غزل میں حسنِ تغزل، دونوں ہی صورتوں میں بات کہنے کا انداز خواہ کتنا ہی سہل ہو اپنی معنوی گہرائی ضرور رکھتا ہے۔ سادہ الفاظ کے پس پردہ مفہوم و مطالب کا خزانہ پوشیدہ نظر آتا ہے۔

غزل کے مقطع کی طرح انشائیہ کا "مقطع" بھی بڑا اہم ہے۔ اسے بالخصوص بڑا جاندار ہونا چاہیئے۔ غزل کے آخری شعر کی حیثیت سے مقطع کا اثر قاری کے دل و دماغ پر دیرپا ہوتا ہے۔ عموماً کسی شاعر کے جو اشعار دوہرائے جاتے ہیں اور ضرب الامثال کی طرح استعمال کیے جاتے ہیں وہ مقطع کے ہی شعر ہوتے ہیں۔ مقطع میں شاعر اپنا ایک ذاتی ٹچ (TOUCH) دیتا ہے اور غزل میں بیان کردہ مضمون یا مضامین کو اپنی ذات کا حوالہ عطا کرتا ہے۔ لہٰذا مقطع غزل کے خیال اور مزاج کو سمیٹتا ہے اور اپنا ایک ڈرامائی تصور رکھتا ہے، جہاں شاعر کی ذات غزل کی مجسم صورت بن کر سامنے آتی ہے۔ غزل نے جو نوادراتِ خیال ہمیں مہیا کیے تھے وہ ہم اسی شاعر کی ذات سے منسلک کرنے لگتے ہیں۔ غزل کے ہر شعر و خیال میں شاعر کی روح سمائی ہوئی نظر آتی ہے اور ہر شعر و خیال ایک جاندار وجود کی صورت ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اسی طرح انشائیہ کے اختتام کو بھی اپنا ڈرامائی تاثر چھوڑنا چاہیئے۔ انشائیہ میں جو نتیجہ اخذ کیا جائے جو تاثر پیدا کیا جائے اسے ہم انشائیہ نگار کی ذات کے حوالے سے دیکھیں تو وہ ایک زندہ تجربہ و خیال نظر آئے گا ایک جیتے جاگتے انسان کی سوچ جو ایک انسان سے منسوب ہونے

کے باوجود ایک انسان کی سوچ نہیں، نوعِ انسانی کی سوچ دکھائی دے گی ہر شخص اسے اپنی ہی ذات کا اظہار سمجھے گا۔ انشائیہ نگار کا ہر خیال قاری کو اپنا خیال معلوم ہوگا اپنے دل کی بات، صرف اظہار کا انداز انشائیہ نگار کا منفرد ہوگا بالکل اسی طرح جس طرح غزل کی روایات تو جانی پہچانی ہوتی ہیں صرف ان روایات کو برتنے کا انداز شاعر کو انفرادیت عطا کر دیتا ہے۔

میرے خیال میں انشائیہ، مضمون اور مقالہ میں بنیادی فرق وہی ہے جو غزل، نظم اور قصیدہ یا مثنوی کی نوعیت کی طویل نظم میں موجود ہے۔ انشائیہ کو میں نثر نگاری کی غزل قرار دیتا ہوں جس میں اسی نکتہ رسی، ژرف نگاہی، خیال آفرینی، ایمائیت، ندرتِ فکر، نغمگی اور پرکاری کی ضرورت ہے جیسی غزل میں۔ یہ بات شاعری یا نثر نگاری کی کسی اور صنف میں اس درجہ موجود نہیں جتنی انشائیہ میں ہے۔

اعجاز راہی کے تنقیدی مضامین

کا

ایک دلآویز مجموعہ

اظہار

خوبصورت گٹ اَپ کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

انشائیہ ایک ہمہ جہت صنفِ نثر

سلیم آغا قزلباش

گزشتہ دس بارہ برسوں میں انشائیہ اور انشائیہ نگاری کے فن پر مختلف حوالوں سے لاتعداد مضامین لکھے جا چکے ہیں، جن سے انشائیہ کے خد و خال اور اس کے مزاج کو متعین کرنے میں بڑی مدد ملی ہے اور اب یہ پھبتی قریب قریب اپنی موت آپ مر چکی ہے کہ "چونکہ انشائیہ ایک نزاعی صنفِ نثر ہے لہٰذا اس کو پڑھنا اور سمجھنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔" یہاں میں ایک دلچسپ حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ پچھلے دس سالوں میں جو نام انشائیہ نگاری کے اُفق پر طلوع ہوئے ہیں، ان میں زیادہ تعداد نوجوان قلم کاروں کی ہے۔ اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ نوجوان بڑی حد تک لبرل اندازِ فکر رکھتے ہیں نیز انہیں خود پر پہلے سے چڑھے ہوئے کسی روایتی خول کو بھی توڑنا نہیں پڑتا۔ اس کے مقابلے میں اکثر پرانے قلم کار چونکہ "مبتلائے خمارِ رسوم و قیود" ہیں، اس لیے شعوری طور پر اس صنفِ نثر کی مخالفت کرتے ہیں تاکہ ان کی "وضعداری" کا بھرم قائم رہے۔ بہر حال بزرگ اہلِ قلم کے اس سخت گیر رویے سے جہاں انشائیہ کو اُردو ادب میں قدم جمانے میں کافی زور آزمائی کرنا پڑی وہاں نوجوان نسل نے اسے بطور چیلنج قبول کیا اور مختصر مدت میں مضامینِ نو کے انبار لگا دیئے۔ اب اُردو انشائیہ ایک ایسے "مرکزی نقطہ" پر کھڑا ہے، جس کے ایک طرف منجھے ہوئے انشائیہ نگاروں کا تجربہ ہے تو دوسری طرف نوجوان انشائیہ نگاروں کا جوش و خروش۔ اور جب عقل اور جذبہ ایک دوسرے سے مصافحہ کر لیں تو پھر برسوں کا فاصلہ دنوں میں طے ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اب تک انشائیہ نگاری کے ضمن میں جو مباحث ہو چکے ہیں ان کو سامنے رکھ کر انشائیہ نگاری کے فن کا اجمالی جائزہ پیش کر دوں تاکہ ادب کا ایک عام قاری انشائیہ کے بارے میں زیادہ وثوق سے غور و فکر کر سکے اور اُس قسم کی "بالک ہٹ" کا مظاہرہ نہ کرے جو بعض ادبی حلقوں میں اکثر دیکھنے سننے کو ملتی ہے۔ کم سے کم اندازے کے مطابق بھی انشائیہ کو اُردو ادب میں داخل ہوئے پچیس برس ہونے کو آئے ہیں، گویا اُردو انشائیہ "سلور جوبلی" منانے کی حدود میں داخل ہو گیا ہے، لہٰذا میں یہ مضمون اسی موقع کے حوالے سے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

انشائیے کی تعریف کے سلسلے میں "GREAT ESSAYS" کے مرتب ہاوسٹن پیٹرسن رقمطراز ہیں:

"ایسے کا مطلب تحریر کا ایک ایسا چھوٹا سا ٹکڑا ہو گا جس میں کسی بھی موضوع سے بحث کی گئی ہو، مگر شخصی، غیر رسمی اور غیر مصنوعی انداز میں۔ "ایسے" متفکرانہ ہو گا لیکن سنجیدہ نہیں۔ وہ فلسفے سے قریب ہو گا لیکن فلسفے کی طرح باقاعدہ نہیں۔ اس میں ایک قسم کی ڈھیلی ڈھالی وحدت ہو گی لیکن اس میں اصل موضوع سے مسرت بخش انحراف بھی ہو گا۔ وہ ہمیں مصنف کی رائے سے اتفاق کی ترغیب دے سکتا ہے لیکن وہ ہمیں اتفاقِ رائے پر مجبور نہ کرے گا۔ "ایسے اسٹ" چاہے اور جو کچھ بھی ہو، وہ ہمارا دوست اور لفظوں کا فنکار ہوتا ہے ——"

اپنی اس رائے میں پیٹرسن نے نہایت خوش اسلوبی سے صنفِ انشائیہ کے اجزائے ترکیبی کو بیان کیا ہے، پھر یہ کہ اس تعریف میں انشائیہ نگاری کے وہ تمام بنیادی پہلو یکجا ہو گئے ہیں جن کا ہر اچھے انشائیے میں موجود ہونا ضروری ہے جن میں سے کسی ایک کی عدم موجودگی سے انشائیہ کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ خاص طور پر یہ تعریف ان حضرات کے لیے سوچ کا وافر سامان مہیا کرتی ہے جو انشائیہ کے عناصرِ ترکیبی میں سے کسی ایک کو ہی تمام تر اہمیت تفویض کرتے ہیں اور یوں انشائیہ کی

ہمہ گیری کو ختم کرنے کی سعی فرماتے ہیں۔

آلڈس ہکسلے — کے نزدیک

"سب سے تسلی بخش ESSAYS وہ ہیں — جن میں قلم کار اپنی ذات سے لے کر کائنات تک، مجرد سے لے کر محسوس تک اور خارجی سے لے کر باطنی دنیاؤں تک کے مراحل طے کر جائے —"

آلڈس ہکسلے کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا کہ انشائیہ وحدت الوجودی یا وحدت الشہودی مزاج رکھنے والی کوئی شے ہے بالکل ناسمجھی والی بات ہوگی۔ اس بیان میں انشائیہ نگار کی وسیع المشربی اور اس کے غور و فکر کے پھیلاؤ کو واضح کیا گیا ہے نیز یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر انشائیہ نگار کی شخصیت میں عالمگیری موجزن ہو تو زمان و مکان کے فاصلے خود بخود طے ہونے لگتے ہیں۔

آر۔ ڈبلیو جیپسن (R.W JEPSON) ESSAYS BY MODERN WRITERS میں لکھتا ہے —

"انشائیہ کسی واقعہ کی تشریح، تفسیر یا بیان ہو سکتا ہے۔ اس میں استدلالی، تنقیدی، مباحثی یا سوانحی تحریریں شامل کی جا سکتی ہیں۔"

اور "MODERN ESSAY" میں سی۔ ڈی نیٹو رقمطراز ہے۔

"انشائیہ ایک تجربہ ہے۔ انشائیہ کا لب و لہجہ سبک بھی ہو سکتا ہے اور سنجیدہ بھی اس میں کوئی کہانی، کسی واقعہ کی منظر کشی یا کسی نظریہ کی تشریح ہو سکتی ہے۔ بنیادی طور پر انشائیہ کا مقصد اور مطمحِ نظر تفریح و انبساط ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں کسی قسم کی تعلیم یا تبلیغ نہیں ہونا چاہیئے۔"

ان دونوں تعریفوں کو بغور پڑھنے سے یہ بات سامنے آئے گی کہ دونوں حضرات نے کسی واقعہ یا نظریہ کی تشریح کو انشائیہ کی جنت میں شامل کیا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے بقول[1] مشتاق قمر یہ کہنا ہے کہ "ہر اچھے فنکار میں توضیحی رویہ کم اور تشریحی انداز زیادہ ملتا ہے۔" لیکن اگر تشریحی سے مراد ٹھوس خیالات کی استدلالی و منطقیانہ تشریح مراد لی جائے تو مجھے اس سے سخت اختلاف ہے کیونکہ یہ کام تو مقالے کا ہے نہ کہ انشائیے کا۔ اس طرح سوانحی تحریروں کے لیے جب — AUTOBIOGRAPHY کی الگ صنف موجود ہے تو پھر انشائیہ پر یہ عتاب کیونکر نازل کیا جائے۔ ہاں البتہ اتنی بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ کسی انشائیہ نگار کے انشائیوں کے مطالعہ سے اگر اس کی سوانح عمری کا خاکہ اُبھر آئے تو یہ ایک دلچسپ چیز ہوگی اور ریسرچ اسکالر کے کام آئے گی اور بس! نہ کہ اسے انشائیہ کا جزوِ لاینفک قرار دیا جائے۔ سی۔ ڈی نیٹو کی یہ بات خیال افروز ہے کہ انشائیہ کسی قسم کی تعلیم یا تبلیغ کا انداز اختیار نہیں کرتا کیونکہ انشائیہ SERMON نہیں ہے کہ پند و نصائح کا بوجھ سہار سکے یہ کام کٹھ ملاؤں، مصلحین یا پادریوں کا ہے۔ انشائیہ کا اس سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

نیاز فتح پوری صاحب فرماتے ہیں:

"یہ ہے ایک قسم کی SOLILOQUY زیادہ تر SUBJECTIVE قسم کی جسے ہم SELF COMMUNICATION بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک خاص قسم کے فکر و تصور کا نتیجہ ہے، جس میں تجزیہ جذبات، نفسیاتی مطالعہ، منطقی استدلال، فلسفیانہ تفکر، متصوفانہ استغراق اور انشائے عالیہ کا جمالیاتی اسلوب سب کچھ پایا جاتا ہے۔"

(اعتراف و تعارف اُردو الیٹرز)

اگرچہ نیاز فتح پوری صاحب کے زمانہ میں انشائیہ نگاری کے خطوط پوری طرح اُجاگر نہیں ہوئے تھے تاہم انہوں نے انشائیہ فہمی کا اچھا مظاہرہ کیا ہے۔ خاص طور پر متصوفانہ استغراق اور فلسفیانہ تفکر کے پہلو اُن قلم کاروں کے لیے لمحۂ فکریہ ہیں جو انشائیے کو گڈی گڈے کا کھیل سمجھتے ہیں اور لفظی اچھل کود اور چہل کو انشائیہ کا

---

[1] حرفِ اوّل — "سرگوشیاں"

امتیازی وصف قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ فلسفیانہ تفکّر کا مطلب افلاطون یا ارسطو کے اقوال زرّیں نہیں ہیں اور منشور فانہ استقراء کے معنی علمی بحث کا سا اندازِ نظر اختیار کرکے خود کو منفرد کرنا بھی نہیں ہے بلکہ ان دونوں اصطلاحوں کا مطلب اگر PURE WISDOM لیا جائے تو مجھے نیاز فتح پوری صاحب کی رائے سے مکمل اتفاق ہے۔ البتہ منطقی استدلال کا عنصر انشائیے کے مزاج کے منافی ہے مگر نفسیاتی مطالعہ والی بات انشائیے کے دائرہ کار میں شامل ہے۔

احتشام حسین صاحب کا فرمانا ہے کہ:

"انشائیہ کو ایک ایسی فلسفیانہ شگفتگی کا حامل ہونا چاہیئے جو پڑھنے والوں کے ذہن میں استدلال کے ذریعے نہیں بلکہ محض خوشگوار استعجاب اور بے ترتیب اندازِ بیان کے ذریعے اپنا تاثر قائم کرے۔"

(اردو انشائیہ (مرتبہ سید صفی مرتضیٰ)

احتشام صاحب کی یہ رائے بڑی دلچسپ ہے۔ اس میں انہوں نے استدلالی انداز کو رد کرکے "فلسفیانہ شگفتگی" کے حوالے سے اپنی بات کو واضح کیا ہے۔ ایک اچھے انشائیے میں فلسفیانہ شگفتگی ضروری ہے جو خوشگوار استعجاب کو تحریک دے کر قاری کو غور و فکر پر مائل کر سکے۔ جہاں تک "بے ترتیب اندازِ بیان" کا معاملہ ہے تو اس ضمن میں گزارش ہے کہ بے ترتیبی یعنی DISORDER کی اصطلاح کا جو بے محابا استعمال انشائیہ کی تکنیک کے سلسلے میں کیا گیا ہے اس نے اکثر قارئین اور بیشتر ناقدین کی سوچ کو بے ترتیب کر دیا ہے۔ وہ نجانے کیوں اس بات کو فراموش کر بیٹھے ہیں کہ بے ترتیبی میں بھی ایک اندرونی ترتیب مضمر ہوتی ہے جسے انشائیہ نگار اپنی تیسری آنکھ سے ڈھونڈ نکالتا ہے اور پھر اپنے طرزِ تحریر کے ذریعے DELIGHT IN DISORDER والی کیفیت پیدا کر لیتا ہے جس سے تحریر کی معنویت نکھر آتی ہے۔ وہ لوگ جو DISORDER کی اصطلاح کو بالکل ڈھیلی ڈھالی اور غیر مربوط کے معنوں میں لیتے ہیں وہ انشائیے کے مزاج سے بخوبی آشنا نہیں ہیں۔

محمد ارشاد صاحب اپنے مضمون "موضوعین انشائیہ اور انشائیہ نگار" میں لکھتے ہیں:

"انشائیہ وہ صنفِ نثر ہے جس میں کسی بھی علمی اور سماجی اہمیت کے حامل موضوع پر استقرائی طور پر حاصل کردہ معلومات اور ان پر مبنی آرا کو شخصی نقطۂ نظر کے طور پر گھریلو پیرایۂ بیان میں اسی طرح پیش کیا جائے کہ موجودہ ترتیب میں نظم و ضبط اور معلومات میں اضافے کی صورت میں آرا پر نظرِ ثانی کی گنجائش موجود ہو۔"[1]

یہ رائے اس لیے محلِ نظر ہے کہ اس کے مطابق علمی اور سماجی اہمیت کے حامل موضوعات اور معلومات کو شخصی پیرائے میں بیان کرنے کو انشائیہ نگاری متصوّر کرنا ہے حالانکہ انشائیہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ موضوعات اور ان سے متعلق معلومات کی قلبِ ماہیت ہو جو ظاہر ہے کہ انشائیہ نگار کی تخلیقی اپج کے بغیر ممکن نہیں۔ محمد ارشاد صاحب کی رائے کو اگر تسلیم کیا جائے تو پھر انشائیہ ایک میکانکی انداز میں لکھی گئی ایسی تحریر قرار پائے گا جس میں معلومات کو واحد متکلم کے انداز میں بیان کر دیا گیا ہے یا موضوع کو اس کی علمی بلندی سے نیچے اتار کر محض گھریلو زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایسی تحریر انشائیہ کی پیروڈی تو کہلا سکتی ہے مگر اسے انشائیہ کہنا ممکن نہیں ہے۔

عبدالماجد دریا بادی کے بقول:

"انشائیہ کی امتیازی خصوصیت حسنِ انشا ہے۔ یہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ انشائیہ وہ ہے جس میں مغزِ مضمون کی اصل توجہ حسنِ عبارت پر ہو۔"

(ادیب علی گڑھ۔ انشائیہ نمبر)

اس تعریف میں انشائیہ کی زبان و بیان کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ عبدالماجد دریا بادی کی یہ رائے فنی اعتبار سے بالکل درست ہے کہ انشائیہ میں زبان کا بڑا اہتمام کرنا پڑتا ہے کیونکہ گھتی ہوئی تحریر ہی انشائیے کے حسن کو نکھارتی ہے۔ غیر مانوس الفاظ اور غیر تخلیقی اور آرائشی زبان سے انشائیہ کی روانی میں رکاوٹ آجاتی ہے۔

---

[1] فنون لاہور، جولائی اگست ۱۹۸۲ء

ڈاکٹر آدم شیخ کے خیال میں :

"خود ساختہ رسوم و قوانین میں جکڑا ہوا انسان شعوری یا غیر شعوری طور پر آزادی کی ایک ایک سانس کے لیے جد و جہد کرتا ہے۔ انشائیوں میں ایک انسان یا فنکار کے اِسی جذبۂ حریت کی تسکین ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار ہمیشہ ایک حقیقت کی طرف لوٹنا چاہتا ہے۔ وہ بُت پرست نہیں بلکہ بُت شکن ہے۔"

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں :

"وہ (یعنی انشائیہ نگار) تو اپنے پڑھنے والے کو دوستانہ انداز میں زندگی کے ان انوکھے اور دلچسپ پہلوؤں سے روشناس کراتا ہے جو عام نظروں سے پوشیدہ رہے ہوں۔"

"انشائیہ" بمبئی ۱۹۶۵ء

ڈاکٹر آدم شیخ نے انشائیوں کو جذبۂ حریت کی تسکین کا وسیلہ قرار دے کر ان حضرات کو لاجواب کر دیا ہے جو کہتے ہیں کہ انشائیہ ایک غیر مقصدی صنفِ ادب ہے اور کسی چیز کے حصول کا وسیلہ نہیں بنتی۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر آدم شیخ نے انشائیہ نگار کو بُت پرست نہیں بُت شکن قرار دیا ہے اور یہ بات واقعی درست ہے کہ انشائیہ نگار رسوم و قیود میں جکڑے ہوئے انسان کی اس انفعالی حالت کے خلاف ایک کھلا احتجاج ہے جو اُسے بُت پرستی پر مجبور کر دیتی ہے۔ آرنلڈ ٹائن بی کا کہنا ہے کہ تہذیب جب روبہ زوال ہوتی ہے تو وہ کئی طرح کے بُت گھڑ لیتی ہے، جن میں پرانی رسوم و روایات کا بُت بھی شامل ہوتا ہے۔ لہٰذا انشائیہ نگار کا بُت کو توڑنا اُس زوال آمادہ ذہنیت کے خلاف واضح اعلانِ جنگ ہے جو کسی نئے تجربے یا خیال کو اپنے ارد گرد پھٹکنے نہیں دیتی اور پیش پا اُفتادہ ڈگر پر آنکھیں بند کر کے چلنا چاہتی ہے۔ یہ چیز انشائیہ کی فعالیت کی تصدیق بھی کرتی ہے۔ ڈاکٹر آدم شیخ کی دوسری بات بھی سو فی صد درست ہے کہ انشائیہ زندگی کے انوکھے اور دلچسپ پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتا ہے، اور یوں ان مخفی پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے جو عام قاری کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ پہلو انشائیہ کی سب سے بڑی پہچان ہے اور ڈاکٹر آدم شیخ نے ایک اچھے نباض کا ثبوت مہیا کیا ہے۔

انشائیہ میں ایجاز و اختصار کو ملحوظِ خاطر رکھنا بہت ضروری ہے مگر شرط یہ ہے کہ اِس سے انقباض کی صورت پیدا نہ ہو بلکہ اِس کے اختصار کا دامن وسیع نظر آئے، چنانچہ بعض ناقدین نے اسی بات کے پیشِ نظر انشائیہ کو غزل کے مماثل قرار دیا ہے مثلاً "خیال پارے" کے دیباچے کے مطابق :

"انشائیہ اور غزل کے ایک شعر میں گہری مماثلت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ غزل کے شعر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی ایک نکتہ کو اجاگر تو کیا جاتا ہے لیکن اس کے تمام پہلوؤں کو ناظر کے فکر و ادراک کے لیے نامکمل صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہی حال انشائیہ کا ہے اس میں موضوع کے صرف چند ایک انوکھے پہلوؤں کو پیش کر دیا جاتا ہے اور اس کے بہت سے دوسرے پہلو تشنہ اور نامکمل حالت میں رہ جاتے ہیں۔"

بجمن اے ہیڈرک "TYPES OF ESSAYS" میں رقمطراز ہے :

"عام طور پر یہ (انشائیہ) مصنف کی شخصیت کا کسی نہ کسی حد تک انکشاف کرتا ہے اور اِس لحاظ سے یہ شاعری میں لیرک LYRIC سے مشابہ ہے۔"

اسی طرح ڈاکٹر سید محمد حسنین کا ارشاد ہے کہ

"انشائیہ نثر کی غزل ہے جس کا ہر ٹکڑا ایک نیا کیف و سرور بخشتا ہے۔"

نیز ڈاکٹر صاحب نے انشائیہ کو صنفِ کیفیہ سے بھی موسوم کیا ہے

(صنفِ انشائیہ اور اُردو انشائیے)

ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کے نزدیک :

"معلومات کا فراہم کرنا اس کا مقصد نہیں۔ اس کی نوعیت ذاتی اور انفرادی ہے۔ ایک داخلی آہنگ بھی اس میں پایا جاتا ہے جس کی حدیں غنائیت سے جا ملتی ہیں۔" (ادیب علی گڑھ۔ انشائیہ نمبر)

غلام جیلانی اصغر صاحب کے مطابق:

"مزاج کے لحاظ سے غزل اور انشائیہ میں کوئی فرق نہیں لیکن ہیئت کے لحاظ سے یہ دونوں اصناف جداگانہ خاصیتوں کی حامل ہیں۔"

(ادبی دنیا۔ بحث انشائیہ کیا ہے؟ خاص نمبر ۹)

جبکہ جمیل آذر صاحب کے خیال میں:

"انشائیہ میں غزل کا سا ایجاز، افسانے کا تاثر، ناول کا سا فلسفۂ حیات اور ڈرامے کے انتظاریہ لمحات اور اس کے پس منظر میں طنز و مزاح کی دھیمی دھیمی سنسنی ہوتی ہے اور ان سب پر مستزاد انکشافِ ذات جو خاص انشائیے کے لیے مختص ہے۔"

(اوراق ۱۹۶۶ء انشائیہ ایک لطیف صنفِ نثر)

سجاد نقوی صاحب کا کہنا ہے کہ

"انشائیہ پڑھتے ہوئے میں نے ایک بیٹھک میں افسانے کا سا لطف بھی حاصل کیا، فلسفہ اور حکمت کی باتوں سے بصیرت بھی پائی اور وہ حظ بھی اٹھایا جو اچھے شعر سن کر حاصل ہوتا ہے۔" (اوراق ۱۹۷۲ء افسانہ انشائیہ نمبر — انشائیہ۔ ایک بحث)

مندرجہ بالا آرا میں ایک چیز قدرِ مشترک ہے اور وہ ہے انشائیہ میں شاعرانہ عناصر کی موجودگی۔ مگر میرے خیال میں انشائیہ غزل کے شعر سے نہیں بلکہ غزلِ مسلسل سے مشابہ ہے جس کا ہر شعر دوسرے شعر یعنی خیال کو کروٹ دیتا ہے، جس سے معنی کا پیکر قدم بہ قدم ایک داخلی آہنگ کے زور پر پھیلتا چلا جاتا ہے اور قاری ELEVATION کی سطح تک پہنچ جاتا ہے۔ غزل کی طرح انشائیہ میں کئی پہلو تشنہ بھی رہ جاتے ہیں مگر اس تشنگی کو قاری اپنی سوچ بچار سے پورا کر لیتا ہے۔ جہاں تک "کیفیہ" کی اصطلاح کا معاملہ ہے تو اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیفیہ ایک قسم کا کیتھارسس ہے اور ہر معیاری انشائیہ ایک حد تک فرد کی ناآسودگی کا وجدانی INTUITIVE سطح پر تزکیہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک دوسرا پہلو بھی غور طلب ہے کہ انشائیے میں دیگر اصنافِ نثر کی خوبو پائی جاتی ہے مگر اس سے یہ قطعاً مراد نہیں ہے کہ انشائیہ محض دیگر اصناف کا مرکب ہے اور اس کی الگ پہچان نہیں ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید صاحب کی یہ رائے بہت وزنی ہے کہ

"افسانوی یا ڈرامائی عناصر انشائیے کی ترتیب میں قیمتی اجزا کا کام تو دے سکتے ہیں لیکن اس کا مجموعی مزاج نہیں بن سکتے۔"

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے خیال میں:

"انشائیے میں طنز اور فلسفیانہ مباحث خام صورت میں ہو سکتے ہیں بلکہ ایسا بھی ممکن ہے کہ کسی ادب پارے کی اوپر کی سطح پر سختی اور منطق کی سنجیدگی ہو لیکن نیچے کی سطح میں انشائیے کی آزادہ روی کارفرما ہو۔" (انشائیہ۔ ایک بحث۔ افسانہ انشائیہ نمبر ۱۹۷۲ء اوراق)

اگر ڈاکٹر صاحب کا فلسفیانہ مباحث اور منطق سے مراد WISDOM کا استعمال ہے تو مجھے ان کی بات سے اتفاق ہے۔ اسی طرح اگر سنجیدگی سے مراد چھپے تلے پیرائے میں کسی خیال، تجربے یا چیز میں مضمر کسی گہرے معنی کا اظہار مقصود ہے تو مجھے یہ بات بھی قبول ہے۔

غلام جیلانی اصغر صاحب کا کہنا ہے کہ

"انشائیہ ایک ایسی نثری تحریر ہے جو اتنی ہی بے ربط ہے جتنی کہ زندگی خود اور جس طرح زندگی کے آخر میں حیاتیاتی وحدت وجود میں آ جاتی ہے اسی طرح انشائیے کے منتشر اجزا میں دیکھتے ہی دیکھتے ایک وحدتِ تاثر پیدا ہو جاتی ہے۔ زندگی خود کئی اجزا سے عبارت ہے۔ انشائیہ کی بھی یہی خوبی

یا خصوصیت ہے۔ یہ اجزاء فکری بھی ہوتے ہیں اور جذباتی بھی یعنی انشائیہ سوچنے پر بھی مجبور کرتا ہے اور محسوسات کے وسیع تر امکانات بھی چھوڑ جاتا ہے۔ آپ جب انشائیہ ختم کر لیتے ہیں تو آپ کی سوچ کو ایک نیا اور غیر رسمی سا زاویہ مل جاتا ہے۔"

(انشائیہ کیا ہے؟ — افسانہ انشائیہ نمبر ۱۹۷۲ء اوراق)

اس تعریف میں لفظ "بے ربط" کو کوئی بندۂ خدا لغوی معنوں میں لے تو اس سے فقط ہمدردی ہی کی جا سکتی ہے۔ دراصل "بے ربط" کی یہ اصطلاح UNITY IN DIVERSITY کے معنوں میں ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ انشائیہ مجموعۂ اضداد ہے بالکل غلط ہے۔ البتہ انشائیہ کی اکائی یا وحدت کو دیکھنے کے لیے تیسری آنکھ کی ضرورت پڑتی ہے۔

مشکور حسین یاد صاحب کے نزدیک :

"انشائیہ کے لیے نہ مزاح ضروری ہے اور نہ سنجیدگی۔ انشائیہ نگار اپنے قاری کو خوش بھی کر سکتا ہے اور اداس بھی۔ البتہ جو چیز لازمی ہے وہ جذبہ اور فکر کا اچھوتا پن ہے۔ اگر کسی لکھنے والے کے پاس اپنے تجربہ اور احساس و خیال کی ندرت موجود نہیں ہے تو وہ کبھی بھی ایک کامیاب انشائیہ نہیں لکھ سکتا۔"

(انشائیہ ایک بحث — افسانہ انشائیہ نمبر ۱۹۷۲ء اوراق)

اس رائے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے مجھے ان سے کلی اتفاق ہے لیکن ذرا غور سے اس رائے کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کا اطلاق تقریباً تمام اصنافِ نثر پر کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر صاحب لکھتے ہیں :

"انشائیہ دراصل مہذب ذہن کی ترجمانی کا نام ہے۔ اسے مہذب معاشرے میں لکھا جا سکتا ہے اور اس سے مہذب قاری لطف اندوز ہوتا ہے۔ لیکن انشائیہ ہر ذہن کے لیے نہیں ہے۔ یہ تو بالغ ذہن کے حامل مرد کے لیے ہے۔"

وہ مزید لکھتے ہیں :

"بلکہ میں تو اس حد تک جانے کو تیار ہوں کہ صرف انشائیہ ہی خالص نثری صنف ہے ورنہ کہانی اور ڈرامہ تک سبھی کچھ منظوم ہو سکتا ہے۔ اچھی نثر کے بغیر انشائیہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

(اوراق افسانہ انشائیہ نمبر ۱۹۷۲ء، مضمون انشائیہ کیوں!)

ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے اپنے اس بیان میں انشائیہ کو مہذب ذہن کی ترجمانی قرار دے کر اس بات کی ضرورت پر زور دیا ہے کہ انشائیہ نگار کے لیے POLISHED ہونا از بس ضروری ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ انہوں نے انشائیہ کو خالص نثری صنف قرار دے کر اس کی توقیر اور اہمیت کا واشگاف اقرار کیا ہے اور یہ بیان انشائیہ کی اثر پذیری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ البتہ ان کا یہ کہنا کہ انشائیہ صرف بالغ ذہن کے حامل مرد کے لیے ہے، محلِ نظر ہے۔ خود مرد کے ہاں ANIMA اور عورت کے ہاں ANIMUS کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ نفسیات اور پھر ادب میں اس قسم کی صنفی برتری یا تخصیص کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں توجہ طلب رائے مرزا حامد بیگ کی ہے وہ لکھتے ہیں :

"مجھے اعلیٰ انشائیہ میں جذباتی سطح پر مادرسری اصول کی کارفرمائی اور پدرسری اصول کا ٹھہراؤ اور بُردباری کا ایک توازن نظر آیا ہے۔"

(انشائیہ کی کونپل جنوری فروری ۱۹۷۸ء اوراق)

میرے خیال میں وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ انشائیہ فعالیت اور انفعالیت کا سنگم ہے، گویا یہ سونے جاگنے کی ایک ایسی درمیانی کیفیت ہے کہ جب آنکھ پوری طرح کھلتی ہے تو آدمی حیرت زا مسرت سے دوچار ہوتا ہے کہ وہ کہاں سے چلا تھا اور کہاں پہنچ گیا یا پھر دوسرے لفظوں میں یہ جان لیجیے کہ مادرسری اور پدرسری اصول کا

مطلب افقی اور عمودی دونوں زاویوں کا انشائیہ میں شامل ہونا ہے۔

اب آیئے ایک اور مسئلے کی طرف! مسئلہ یہ ہے کہ جب ہم ایسے کے ساتھ LIGHT کا سابقہ لگاتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے۔ کیا LIGHT کا مطلب محض ہلکا پھلکا ہونا ہے یا کچھ اور؟ اس ضمن میں پروفیسر محمد یٰسین کی رائے ہے کہ:

"انشائیہ ادبِ لطیف کی وہ صنف ہے جسے ہم عام طور پر ہلکے پھلکے LIGHT LITERATURE سے منسوب کرتے ہیں یعنی جس میں انشاپردازی کا مقصد علمی و ادبی یا سیاسی و سماجی اصلاح نہیں بلکہ محض نشاطی اور انبساطی ہے۔"

(ادیب علی گڑھ۔ انشائیہ نمبر)

اس سلسلے میں یہ بات غور طلب ہے کہ انشائیے کو مضمون ESSAY یا جواب مضمون سے متمیز کرنے کے لیے جب LIGHT ESSAY کی اصطلاح برتی جاتی ہے تو اس سے عموماً یہ بات اخذ کر لی جاتی ہے کہ LIGHT کے معنی ہلکا پن، ہلکا پھلکا یا HAPPY یعنی خوش ہونے اور خوش کرنے کے ہیں۔ اس لیے انفرادی سوچ بچار، انکشافِ ذات، نکتہ آفرینی اور پاسبانِ عقل کی موجودگی انشائیہ میں جائز نہیں ہے۔ جیسے مثلاً نظیر صدیقی صاحب کا یہ ارشاد کہ:

"انشائیہ کسی نہ کسی اعتبار سے غیر سنجیدہ یعنی لائٹ ہوتا ہے۔"

(انشائیہ کیا؟ بحث ادبی دنیا شمارہ نہم)

چنانچہ اس بات کو ذہن میں رکھ کر اچھے بھلے قلم کار اپنی تحریروں میں لطیفے، چٹکلے اور ہنسی ٹھٹھے اور چہل ایسے اجزا کو یکجا کر کے کہتے ہیں کہ ہم نے انشائیہ لکھ لیا ہے حالانکہ LIGHT کے معنی KNOWLEDGE—ASPECT اور THING TO IGNITE SOMETHING وغیرہ کے بھی ہیں اور یہ انشائیہ کی مروجہ صورت میں زیادہ قرین قیاس ہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ تینوں عناصر باہم یکجا ہو کر انشائیے میں ENLIGHTENMENT کا جوہر پیدا کرتے ہیں جو فی الحقیقت انشائیے کی جان ہے۔ یہاں اس بات کو جاننا از بس ضروری ہے کہ "نالج" سے مراد منطقی استدلال، ٹھوس فلسفیانہ مبحث یا تحقیقی مواد جمع کرنا یا ترتیب سے پیش کرنا نہیں ہے بلکہ موضوع کے بارے میں عمیق مشاہدہ مراد ہے۔ ASPECT کا مطلب کسی چیز، تجربہ یا خیال میں پنہاں ان مختلف پہلوؤں کی تخلیقی پیرائے میں نقاب کشائی ہے جو بظاہر مخفی معلوم ہوتے ہیں۔ نیز انشائیے میں شگفتہ یا پُر مسرت ہونے کا مطلب INTELLECTUAL PLEASURE اور جمالیاتی حظ کا حصول ہے نہ کہ ہنسی مذاق سے پیدا ہونے والی وقتی قسم کی HAPPINESS کی تحصیل!

اور اب ہم انشائیہ کی اس DEFINITION کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کے بارے میں خاصی بحث و تمحیص ہو چکی ہے۔ یہ تعریف ڈاکٹر جانسن کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

A LOOSE SALLY OF THE MIND, AN IRREGULAR INDIGESTED PIECE, NOT A REGULAR AND ORDERLY COMPOSITION.

(THE ENGLISH ESSAYS AND ESSAYISTS)

میرے نزدیک جانسن نے جس طرح اس تعریف میں انشائیہ کو ایک بے قاعدہ اور غیر منظم کمپوزیشن قرار دیتے ہوئے ناہضم مواد کا بے ترتیب ٹکڑا اور دانش کی ڈھیلی ڈھالی اختراع کہا ہے، ساری گڑبڑ اسی تعریف کو محدود معنوں میں لینے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ڈاکٹر جانسن کی اس تعریف میں INDIGESTED کا مطلب غیر ہضم شدہ مواد ہرگز نہیں۔ دراصل جانسن PRIMORDIAL IMAGES کی بات کرنا چاہتا ہے جو اصلاً ایک طرح کے کچا یا خام مواد ہوتے ہیں۔ اسی طرح REGULAR نہ ہونے سے اس کی مراد یہ ہے کہ انشائیہ پیش پا افتادہ اسالیب اور کلیشیز کی قید و بند سے آزاد ہو گیا وہ ———

LOOSE TALK کی سفارش ہرگز نہیں کر رہا۔ دوسری جانب ہمارے ہاں یہ صورت ہے کہ ہم مغرب والوں کی ہر بات من و عن قبول کر لیتے ہیں، چنانچہ یہی رویہ ہم نے جانسن کی تعریف کے سلسلے میں بھی برتا اور کہا کہ انشائیہ بالکل آزاد ہے اور ہم اس صنف کے لیے کسی قسم کی پابندی کے قائل نہیں ہیں — یعنی "آزاد صنفِ نثر" کی اصطلاح نے اردو کے متعدد ناقدین اور بیشتر قارئین کو غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے اور انہوں نے اس کا مفہوم کمل آزادی یا بالفاظِ دیگر مادر پدر آزادی کے معنوں میں قبول کر لیا ہے جو ظاہر ہے ان کی سادہ لوحی کا ثبوت ہے۔ دراں حالیکہ آزاد صنفِ نثر کے معنی یہ بھی تو ہو سکتے ہیں کہ وہ کسی مخصوص قسم کے اصطلاحی رنگ، نظریات، تصورات و تعصبات یا سسٹمز SYSTEMS کا پرچار کرنے کی مجبوریوں سے "آزاد" ہو۔ نیز اُسے اختیار حاصل ہو کہ وہ جملہ علوم و فنون سے حسبِ منشا اکتساب کرے اور پھر انہیں ایک نئے زاویے اور ذاتی حوالے سے موضوع کی بُنت میں کچھ اس طور شامل کر دے کہ ایک ایسی نئی پرت اُجاگر ہو جائے جو مسرت اور فکری حظ کے حصول کا ذریعہ بھی بن سکے۔ آزاد صنفِ نثر کا مطلب آزادیٔ فکر بھی ہو سکتا ہے نہ کہ اس کا مفہوم منتشر خیالی یا غیر منضبط ہونا سمجھ لیا جائے۔ اسی طرح پابندی سے مراد اگر پلاٹ، تھیم، کردار یا وحدتِ زمانی و مکانی یا مخصوص منطقی رویے کی پابندی ہے تو پھر ظاہر ہے کہ انشائیہ اس قسم کی پابندی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب LOOSE SALLY OF THE MIND کی اصطلاح کو اندھادھند قبول کر کے انشائیہ پر بات کی جائے تو آخری نتیجہ ڈاکٹر سید محمد حسنین کی اس رائے کی صورت میں برآمد ہوتا ہے کہ :

"انشائیہ میں داخلیت یعنی SUBJECTIVITY ہوتی ہے جو قلم کار کے اپنے تاثرات کو پیش کرتی ہے۔ یہ داخلیت مگر مجرد نہیں ہوتی۔ یہ سماجی کوائف سے آلودہ ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار کا مقدس فریضہ آوارہ خیالی ہے"

(صنفِ انشائیہ اور اردو انشائیے)

آپ نے غور فرمایا کہ کس طرح انشائیہ کی آزادہ روی آخر آخر میں منفی شکل اختیار کر گئی یعنی آزادہ روی کو آوارہ خیالی STRAY THOUGHTS میں بدل دیا گیا جو ظاہر ہے کہ ایک گمراہ کن بات ہے۔ ویسے جانسن کی مہیا کردہ انشائیہ کی تعریف نے مغرب میں بھی خاصا ردِ عمل پیدا کیا چنانچہ C.H.LOCKITT رقمطراز ہے کہ :

"WE HAVE TRAVELLED A LONG WAY FROM JOHNSON'S "LOOSE SALLY OF THE MIND;" HIS UNDIGESTED MEAL HAS BECOME A LIGHT DIGESTIBLE REPAST AND HIS DISORDERLY COMPOSITION A CAREFULLY CONSTRUCTED AND ELABORATELY DESIGNED WORK OF ART."

انشائیہ کی ایک اور توجہ طلب "تعریف" ڈاکٹر وزیر آغا کی ہے وہ رقمطراز ہیں :

"انشائیہ اُس تحریر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیاء یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آکر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہوتا ہے۔"

(پیش لفظ۔ دوسرا کنارا)

پیش کردہ تعریف کی وضاحت کرتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں :

"اس تعریف میں یہ بات مضمر ہے کہ انشائیہ ایک تو اسلوب یا انشاء کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرے یعنی زبان کو تخلیقی سطح پر استعمال کرے۔ دوسرے شئے یا مظہر کے اندر چھپے ہوئے ایک نئے معنی کو سطح پر لائے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی بُت تراش پتھر کی سل پر سے فاضل بوجھ

اتار کر اس کے اندر سے وہ شبیہہ برآمد کرے جو ظاہری آنکھ سے تو پوشیدہ تھی لیکن جسے بُت تراش کی باطنی آنکھ نے گرفت میں لے لیا تھا۔ تیسرے انشائیہ ذہن کو بیدار اور متحرک کرے یعنی شعور کی توسیع کا اہتمام کرے۔ جب تک یہ تینوں باتیں یکجا نہ ہوں انشائیہ وجود میں نہیں آسکتا۔"

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ "تعریف" اردو انشائیہ کے مزاج کو سمجھنے میں بڑی حد تک مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

اس سارے جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انشائیہ کے اجزائے ترکیبی کے تعیّن کی حد تک تقریباً سبھی نقاد ایک دوسرے کافی حد تک اتفاق کرتے ہیں تو پھر نزاع کس بات پر ہے! اس سلسلے میں ایک مثال سے بات واضح کرنا چاہوں گا مثلاً اگر آپ کسی سے کہیں کہ ہر انسان کے دو ہاتھ پاؤں، دو آنکھیں، دو کان، ایک منہ اور ناک ہوتی ہے تو وہ فوراً کہے گا کہ مجھے اس سے اتفاق ہے مگر جب ان تمام اشیاء کا مجموعہ یعنی گوشت پوست کا جیتا جاگتا آدمی اس شخص کے سامنے آجائے تو وہ کہے گا صاحب میں تو اسے نہیں پہچانتا! بالکل یہی مسئلہ انشائیہ کے ساتھ درپیش ہے کہ اس کے SALIENT FEATURES پر تو تقریباً سبھی نقادوں کا اتفاق ہے یعنی اسے شخصی ہونا چاہیئے، اس کا اسلوب شگفتہ ہوتا ہے یہ غور و فکر پر ابھارتا ہے، اس میں عدم تکمیل کا احساس ہوتا ہے وغیرہ۔ مگر جب ان تمام اجزائے ترکیبی کا مرکب "انشائیہ" سامنے آتا ہے تو اکثر قارئین کرام اسے پہچاننے میں دھوکہ کھا جاتے ہیں گویا سارا مسئلہ اس کی پہچان کا ہے نہ کہ اس کی تعریف اور دائرہ کار کا!

○

مختلف نقادوں کی آراء کا تجزیہ کرنے کے بعد اب میں مجموعی حوالے سے انشائیہ نگاری کے فن کا محاکمہ پیش کرنا چاہوں گا تاکہ ایک متحرک تصویر نظروں کے سامنے آجائے، اور ہم انشائیے کے ہمہ جہت مزاج کا احاطہ کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

انشائیہ ذہن کی آزاد ترنگ ان معنوں میں ہرگز نہیں ہے کہ اسے "شعور کی رَو" سے ملتی جلتی تکنیک والی کوئی تحریک سمجھ کر جب چاہیں ماضی کے واقعات حال کے تجربات یا مُستقبل کے سہانے سپنوں کو آپس میں گڈمڈ کرکے کاغذ پر منتقل کرنا شروع کر دیں اور پھر دعویٰ کریں کہ انشائیہ جس قسم کے آزاد تلازمۂ خیال کا تقاضا کرتا ہے وہ ہم نے پورا کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انشائیہ ایک گتھی ہوئی تحریر ہے جس میں ایک نقطۂ خیال دوسرے نقطۂ خیال سے پھوٹتا ہے اور پھیل کر دوبارہ پہلے نقطے میں سمٹ آتا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ جب یہ دوبارہ مرکزی نقطے کو چھوتا ہے تو معنی کی ایک نئی پرت، فکر کا ایک انوکھا زاویہ اور خیال کی ایک تازہ لہر نمودار ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ انشائیہ کا مرکزی خیال "باؤلر" کے ہاتھ میں پکڑی گیند ہے، وہ جب چاہتا ہے اسے ایک زوردار شِٹے کی صورت میں ابھری ہوئی وکٹوں کی طرف اُچھالتا ہے مگر یہ گیند تھوڑی دیر بعد مختلف ہاتھوں میں سے ہوتی ہوئی دوبارہ باولر کے ہاتھ میں آجاتی ہے یہی حال انشائیہ کے مرکزی نقطے کا ہے کہ وہ مختلف موضوعات کو چھونے کے بعد دوبارہ انشائیہ نگار کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ بلکہ انشائیہ لکھتے ہوئے اگر کسی واقعہ یا منظر کا ذکر آجائے تو وہ بھی مرکزی نقطے کے ساتھ پیوست ہوتا ہے، نہ کہ مرکزی نقطے سے پہلو تہی کرنے کے لیے برتا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک بات کو بیان کرتے ہوئے اچانک بغیر کسی منطق کے غیر متعلقہ قصہ کہانی شروع کر دی جائے اور پورا کاغذ سیاہ کرنے کے بعد یہ لکھا جائے کہ "یہ تو جملہ معترضہ تھا"۔ اس روش نے موجودہ دور کے متعدد قلم کاروں کو غلط ڈگر پر ڈال رکھا ہے اور وہ انشائیہ کے مرکزی خیال سے منقطع ہو کر غیر متعلق باتیں کرنے لگتے ہیں یا لطائف کی آمیزش کے مرتکب ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مضحک صورت واقعہ کو نمایاں کرنے میں ہی انشائیہ کی کامیابی ہے۔ جبکہ انشائیہ کا بنیادی جوہر نکتہ آفرینی ہے۔ جب تک اس پہلو سے روگردانی کی جاتی رہے گی اُس وقت تک انشائیہ لکھا نہیں جا سکے گا اور یہ ساری کارگزاری محض چیز، تجربہ یا خیال کی بالائی سطح تک کی اُلٹ پلٹ یا موضوع کی ناہمواریوں پر استہزائی نظر ڈالنے اور پھر خندۂ دنداں نما کا مظاہرہ کرنے تک محدود رہے گی۔ سنگ تراش کی طرح انشائیہ نگار موضوع کے

ٹھوس پتھر میں سے مخروطی صفات کو تراش خراش کر اُجاگر کرتا ہے نہ کہ پتھر کی کھردری سِل پر چاک سے اُلٹی سیدھی لکیریں، کارٹون یا خاکہ نما چیزیں بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جسے ملحوظِ خاطر رکھ کر انشائیے اور طنزیہ، مزاحیہ مضامین کے فرق کو مزید سمجھا جا سکتا ہے۔ کچھ قلم کار کسی چیز، خیال یا تجربے کے سطحی پہلو گنواتے چلے جانے کو بات میں سے بات نکالنے کے عمل کے مماثل جانتے ہیں مثلاً "نمک" کے موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے کچھ اس قسم کا طرزِ عمل اختیار کریں گے —— ایک نمک حرام ہوتا ہے اور پھر نمک حراموں کے کرتوت بیان کر دیں گے ایک نمک کی کان ہوتی ہے اور رعایتِ لفظی کا استعمال کر ڈالیں گے۔ پھر یوں رقمطراز ہوں گے، ایک نمکدانی اور ایک نمک پارہ ہوتا ہے اور اس حوالے سے کوئی لطیفہ چٹکلا پیش کر دیں گے اور یوں لفظی بازیگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تحریر کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں گے اور پھر کہیں گے کہ دیکھئے جناب ہم نے نمک کے حوالے سے کتنے نکات اور صورتیں آشکار کی ہیں۔ حالانکہ آشکار کچھ نہیں کیا، محض چیزیں گنوائی ہیں اور وہ بھی نہایت سطحی طریقے سے۔ دوسری طرف اگر انشائیہ نگار نمک کو اپنا موضوع بنائے گا تو وہ انسان کی ذات میں مضمر نمکین پانی کے سمندر کا ذکر چھیڑے گا۔ نمک اور انسانی جسم کے ربطِ باہم پر ایک نظر ڈالے گا اور شاید نمکینی کو انسان کی فطرتِ ثانیہ قرار دینے کی بھی جسارت کرے گا۔ نمک سے انسان کے رشتے کو پلِ صراط ایسا نازک رشتہ قرار دے گا کہ ذرا سی کمی بیشی بھی اس کے توازن کو متزلزل کر سکتی ہے اور شاید آخر آخر میں وہ پانی اور نمک کے رشتے کو کسی صوفیانہ مسلک کی توضیح کے لیے بھی استعمال کر ڈالے۔ غرضیکہ انشائیہ نگار کے سامنے معانی کا ایک جہان ہوشربا ہے جو نمک کے موضوع کو محض ذرا سا چھو لینے پر متحرک ہو سکتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں کوئی کلیہ قاعدہ مرتب کر رہا ہوں کہ اتنے گرام شاعرانہ و متصوفانہ عناصر یا فلسفیانہ موشگافیاں یا معاشرتی و سیاسی اجزاء جب تک ایک دوسرے میں اچھی طرح حل نہ کیے جائیں انشائیہ کا محلول تیار نہیں ہو سکتا۔ دراصل یہ وہ تمام وسیلے ہیں جن کو بروئے کار لا کر انشائیہ نگار اپنے موضوع میں گہرائی اور وسعت پیدا کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ مگر ان تمام عوامل کا غیر معتدل استعمال انشائیے سے انشائیہ پن چھین لے گا اور اسے ایک جواب مضمون یا طنزیہ یا مزاحیہ مضمون میں مُبدل کر دے گا۔ یہاں میں سعداللہ کلیم صاحب کی اس بات کا ذکر ضرور کروں گا کہ[2] "خیال ایک پتنگ کی صورت کتنی ہی بلندیوں میں پرواز کرے مگر اس کی ڈور ہر حال میں انشائیہ نگار کے ہاتھ میں رہتی ہے"۔ ان کی اس بات میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ جب طنز نگار دوسروں کو پتنگ اڑاتے ہوئے دیکھتا ہے تو جُھگے کستا ہے اور طعن و تشنیع کا حربہ استعمال میں لاتا ہے۔ اس کے برعکس انشائیہ نگار اپنے اردگرد کے ماحول کو اپنی ذات میں پنہاں ایک جہانِ معنی کے حوالے سے جانچنے اور پرکھنے کی سعی کرتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ مجموعی خوبیوں اور خامیوں پر ہمدردانہ طریقے سے غور و خوض بھی کرتا ہے۔ بقول مشتاق قمر صاحب[3] "انشائیہ کا ایک داخلی عنصر انشائیہ نگار کا وہ ہمدردانہ رویہ ہوتا ہے جو مثبت سوچ کا ثمر ہے۔" میرے خیال میں صرف یہی نہیں بلکہ انشائیہ نگار زندگی کی منفی اور مثبت، داخلی و خارجی پہلوؤں کا ژرف نگاہی سے مطالعہ کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر انشائیہ بنے بنائے قاعدوں، اصولوں اور سانچوں کو جب توڑتا ہے تو پہلے داخلی طور پر تصادم CONFLICT سے دوچار ہوتا ہے جس سے منفی چیزیں مثبت اور مثبت چیزیں منفی دکھائی دینے لگتی ہیں اور یوں بقول ایک دانشور CHAOS کی صورت نمایاں ہو جاتی ہے، مگر پھر انشائیہ نگار ایک تخلیقی جست بھرتا ہے اور یوں " وژن، میڈیم اور آہنگ کو بروئے کار لا کر بے ہیئتی کو ہیئت میں بدل دیتا ہے" جس سے تحریر میں وحدتِ تاثر پیدا ہو جاتی ہے۔ جمیل آذر صاحب نے اپنے مضمون[3] "ایک لطیف صنفِ نثر" میں منفی اور مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں جان گُنتھے کی یہ مثال دی ہے ——

"خوش بختی ایک نٹ کھٹ دوشیزہ ہے، جس کے لیے کسی ایک جگہ رکنا ممکن ہی نہیں، وہ کرسی کی پُشت پر سے تمہارے بالوں کو انگلیوں سے چھیڑتی

---

[1] انشائیہ مقبولیت کی راہ پر —— اوراق افسانہ انشائیہ نمبر ۱۹۷۲ء

[2] انشائیہ نگاری —— اوراق سالنامہ ۱۹۷۵ء

[3] جمیل آذر بحوالہ "ایک لطیف صنفِ نثر" اوراق ۱۹۶۶ء

ہے۔ تمہارے ہونٹوں پر ایک اڑتا ہوا بوسہ ثبت کرتی ہے اور پھر شرما کر کھلکھلاتی ہوئی بھاگ جاتی ہے لیکن بدبختی بڑے وقار کے ساتھ تمہاری جانب آتی ہے۔ تمہارے بستر پر اطمینان سے بیٹھ جاتی ہے اور پھر اُون کی سلائیوں سے تمہارے لیے ایک کبھی ختم نہ ہونے والا سویٹر بُننے لگتی ہے۔"

اس مثال سے جمیل آذر صاحب بتانا چاہتے ہیں کہ انشائیہ نگار کے لیے خوش بختی اور بدبختی یعنی مثبت اور منفی دونوں پہلو جاذبِ نظر ہیں اور وہ ان کو نئے زاویے سے پرکھنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ میرے خیال میں یہاں اس بات کا اعادہ کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ انشائیہ نگار نہ تو اپنی انا EGO کو اتنی وسعت دیتا ہے کہ پوری زندگی کو خود میں جذب کرے اور نہ ہی اپنی ذات کی اس حد تک نفی کرتا ہے کہ ہر شے اسے اپنے اندر مدغم کرلے بلکہ یہ دونوں صورتوں کو ملا جلا کر ایک امتزاجی صورت پیدا کرتا ہے۔ انشائیہ نگار کے مقابلے میں مزاح نگار اپنی ذات کو ہدف بنا کر اس کا تمسخر اڑاتا ہے اور یوں دوسروں کے لیے سامانِ تفنن مہیا کرتا ہے۔ ایسا کرنا کوئی عیب نہیں ہے بلکہ یہ تو مزاح نگار کی تکنیک ہے۔ انشائیہ نگار کی حتی المقدور کوشش اس بات میں ہوتی ہے کہ جس چیز، خیال یا تجربے کو وہ بیان کر رہا ہو وہ خود بخود اپنی نقاب کشائی کرتا چلا جائے۔ اس سے قطع نظر انشائیہ "غیر معمولی سنجیدگی" کو صرف اس وقت ہی اپنے پیکر میں جگہ دے سکتا ہے جب یہ آشوبِ آگہی سے پیدا ہوئی ہو جس سے زیرِ لب تبسم وجود میں آجاتا ہے یا یوں سمجھ لیجئے کہ جب غیر معمولی سنجیدگی اپنی آخری رکاوٹ کو عبور کرتی ہے تو ایسی معنی خیز غیر سنجیدگی وجود میں آتی ہے جس کا دوسرا نام خودشناسی ہے اور انشائیہ اسی کیفیت کو خود میں سمونے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ ایک اچھے انشائیے کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ سہ ابعادی THREE DIMENSIONAL ہوتا ہے یعنی وہ چیز، خیال اور تجربے کے مقررہ مفہوم میں مستور نئے معانی کو منکشف کرتا ہے جس سے وہ چیز، خیال اور تجربے کے مقررہ مفہوم کی دیوار پر فریم میں لگی تصویر کی طرح محض دو ابعادی نہیں رہتی بلکہ فاصلہ، گہرائی اور اونچ نیچ کا احساس اسے ایک سچ مچ کے منظر میں تبدیل کر دیتا ہے اور ناظر اس سارے منظر نامے میں چلتا پھرتا اور اس کی نزاکتوں اور لطافتوں سے براہ راست لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔ البتہ انشائیہ میں چوتھی DIMENSION پیدا کرنا سب سے مشکل کام ہے اور جس تک فن کار اپنی چھٹی حس کی مدد ہی سے پہنچ سکتا ہے۔

کفایتِ لفظی انشائیہ کے اسلوبِ نگارش میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر اچھے انشائیے کا ایک ایک لفظ چنیدہ ہونا چاہیئے۔ اس کی عبارت میں مترادفات کا کم سے کم استعمال ہونا ضروری ہے، تاکہ لفظوں کے ضیاع سے بچا جا سکے۔ انشائیہ کی انشاء کا "خیال" کی ندرت سے بھی بڑھ کر اہتمام کرنا پڑتا ہے کیونکہ خیال کی باریکیوں اور لطافتوں کو تخلیقی اور منجھی ہوئی انشاء ہی سنوار کر پیش کر سکتی ہے۔ چنانچہ ایک معیاری انشائیہ وہی شمار ہوگا جس میں اسلوب رواں دواں، مترنم اور کفایتِ لفظی کا حامل ہوگا۔ یہاں اس چیز کی صراحت بھی ضروری ہے کہ بعض قلم کار انشائیہ میں غیر معمولی سنجیدگی کو غلط طریقے سے در آنے کی اجازت دیتے ہیں اور اس پر مستزاد INSTRUMENTALISM کے انداز کو اختیار کرنے سے اُن کی تحریروں میں تکرار بازی کے علاوہ خطیبانہ استدلالی انداز اور ناصحانہ اندازِ فکر کو دخل اندازی کی کھلی اجازت بھی مل جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انشائیے جیسی کول صنفِ نثر اس قسم کے طرزِ نگارش کی قطعاً متحمل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس نوع کا پیرایۂ اظہار اپنانے والوں کو انشائیہ نگار کہنا بہت مشکل ہے، انہیں زیادہ سے زیادہ مضمون نگار یعنی ایسے ایسٹ ESSAYIST ہی کہا جا سکتا ہے۔
چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ انشائیے کے INFRA STRUCTURE میں انشاء اور اسلوب کو اساسی اہمیت حاصل ہے اور اس کے SUPER STRUCTURE میں احساس، مشاہدہ اور تجربہ کلیدی رول ادا کرتے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انشائیے میں تجربہ کی دونوں صورتوں کا امتزاج بھی مل جاتا ہے یعنی ایک وہ تجربہ جو اشیاء کے مشاہدے سے عبارت ہے اور دوسرا وہ تجربہ جو اشیاء کے مفہوم کو گرفت میں لیتا ہے۔ جہاں تک تشبیہاتی، تلمیحاتی، استعاراتی اور تمثیلی اندازِ بیان کا تعلق ہے تو یہ چیز یقیناً زبان کی تر و تازگی اور نفاست میں گوناں گوں اضافہ کرتی ہے لیکن ان محاسن کا غیر معتدل استعمال خیال کی دھار کو کُند کر کے اسلوب کی گل کاری اور مرصع سازی EUPHISTIC STYLE کا موجب بن سکتا ہے اور قاری کا ذہن تشبیہہ اور استعارے کی ندرت اور طراوت کی داد دینے کی طرف زیادہ مائل ہو جاتا ہے۔ یہ چیز شاعری کا طرۂ امتیاز ہے مگر انشائیے کے سلسلے میں یہ محض اضافی خصوصیت ہے جس کا برمحل استعمال ہونا چاہیئے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ

نوجوان انشائیہ نگاروں میں یہ پہلو نسبتاً نمایاں ہے، وجہ یہ کہ نوجوانوں کے ہاں جذباتیت کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے، چنانچہ وہ نت نئی تشبیہات کے ذریعے اپنی بات کو نئی نویلی شکلیں دیتے ہیں، جس سے شاعرانہ عناصر اور اضافتوں کا استعمال اُن کی تحریروں میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہو جاتا ہے مگر درحقیقت یہ عمر کی مجبوری ہے جیسے جیسے اُن کی عمر، علم اور تجربے کا دائرہ وسیع ہوگا یہ اجزاء بھی بتدریج مدھم پڑنے لگیں گے تا آنکہ تحریر کی وہ صورت اُبھر آئے گی جو ہر لحاظ سے پختہ اسلوبِ نگارش کا نمونہ ہوتی ہے۔ انشائیے کے اسلوب کے ضمن میں رشید امجد صاحب کی اس رائے میں بڑا وزن ہے کہ:

"انشائیہ میں اسلوب کی دو باتیں خصوصی ہیں۔ اوّل یہ کہ اشیاء کو لفظوں اور لفظوں کو اشکال میں ڈھالنے کی وہ قدرت جس سے ان کی داخلی اور خارجی تصویریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ دوسرے وہ اعلیٰ درجہ کی روانی جو سلاست و بلاغت کے ساتھ ایک ادبی معراج اور حُسن بھی رکھتی ہے۔"[1]

اسی طرح اپنے مضمون "ON SOME TECHNICAL ELEMENTS OF STYLE" میں رابرٹ لوئس سٹیونسن ایک اچھے سٹائل کے بارے میں لکھتا ہے:

"FIRST THAT THE PHRASES SHOULD BE RYTHMICAL AND PLEASING TO THE EAR; SECONDLY, THAT THE PHRASES SHOULD BE MUSICAL IN THE MOUTH; THIRDLY, THAT THE WRITER SHOULD WEAVE THE ARGUMENT INTO A PATTERN, BOTH BEAUTIFUL AND LOGICAL, AND LASTLY, THAT HE SHOULD MASTER THE ART OF CHOOSING APT, EXPLICIT, AND COMMUNICATIVE WORDS."

مزاحیہ طرزِ اظہار کا استعمال انشائیے میں ایک بڑی حد تک انشائیہ نگار کے خاص موڈ پر مبنی ہوتا ہے بلکہ انشائیہ نگار تو ناہمواریوں کے باطن میں کارفرما ابدی سچائیوں کو بیان کرتا ہے۔ یہاں "مزاحیہ لب و لہجے" اور "مزاح نگاری" کے مابین فرق کو ملحوظِ خاطر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس نوع کے انشائیے جن میں مزاحیہ لب و لہجہ اختیار کیا جاتا ہے بعض دفعہ ایک عام قاری کو مزاحیہ تحریریں نظر آتے ہیں، لیکن اگر وہ ان کا بغور مطالعہ کرے تو وہ دیکھے گا کہ مزاحیہ لب و لہجے کے حامل جملوں میں کوئی دوسری نسبتاً گہری بات بیان کی گئی ہے، ایک نیا انکشاف ہوا ہے، یہی وہ نقطۂ تقاطع NODAL POINT ہے جہاں سے طنزیہ، مزاحیہ مضمون اور مزاحیہ لب و لہجہ رکھنے والے انشائیے کی حدود اور سمتیں ایک دوسرے سے بالکل جُدا ہو جاتی ہیں، مگر اس مقام پر اکثر قارئین ان کے باہمی فرق کو آپس میں خلط ملط کر دیتے ہیں اور یوں بات اُلجھ کر رہ جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید صاحب:

"انشائیہ کی بحث میں عموماً شگفتگی کو طنز و مزاح کا مترادف تصور کر لیا جاتا ہے اور اس طرح انشائیہ اور ظرافت کی حدود کو آپس میں گڈمڈ ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔"

اس فرق کے ادراک کے لیے یہ چند مثالیں دیکھیے:

<u>مزاحیہ انداز کی مثال:</u>

"صاحب سائیکل کیا ہے یہ تو چوں چوں کا مربّہ ہے۔ اس پر بیٹھتے ہی انسان سرکس کا کوئی مسخرہ نظر آنے لگتا ہے۔ بعض اوقات تو یوں لگتا ہے کہ عامل پر معمول سوار ہو کر جا رہا ہو۔"

---

[1] "اُردو زبان" انشائیہ نمبر ۱۹۸۳ء - انشائیوں کی ایک نئی کتاب

طنزیہ انداز کی مثال:

"معاشی نظام کے سائیکل کی گدی بیٹھ گئی ہے اور اخلاقی روایات کا ایکسل ٹوٹ چکا ہے جبکہ باقی ماندہ روایات مڈگارڈوں کی طرح کھڑ کھڑ کر رہی ہیں اور معاشرے کے بریک کبھی کے فیل ہو چکے ہیں۔"

انشائیہ کا انداز:

"زندگی بھی ایک سال خوردہ سائیکل ہے جس پر سوار ہو کر میں راستے کے نشیب و فراز اور راہ میں آنے والے ہر گڑھے کو بصورت ایک حادثہ اپنے جسم و جاں پر براہِ راست محسوس کرتا ہوں اور یوں گویا زندگی کے مختلف دھچکوں سے مسلسل روشناس ہوتا چلا جاتا ہوں۔"

انشائیہ میں "انکشافِ ذات" سے مراد محض لکھنے والے کی ذات کا اظہار نہیں ہے بلکہ اس میں اُس چیز، خیال یا تجربے کی مکمل اکائی بھی شامل ہے جس پر وہ طبع آزمائی کرتا ہے اور یوں اُن تمام صورتوں کو ان کے مقررہ اور مخصوص معانی سے الگ کر کے ان میں نئی معنویت اور نئے امکانات کو ذاتی وابستگی کے حوالے سے اجاگر کرتا ہے۔ ایسا کرنے سے وہ صورت سامنے آتی ہے جسے ہم شخصی حوالہ PERSONAL TOUCH کا نام دیتے ہیں، مگر یہ شخصی حوالہ کوئی ذاتی ڈائری کی صورت میں نہیں ہوتا کہ اسے ہم لکھنے والے کے شخصی معاملات نجی مسائل یا خود کلامیوں تک محدود کر دیں۔ اس کے علاوہ انشائیہ کے موضوعات کے انتخاب میں بھی انشائیہ نگار کی ذاتی دلچسپی کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے مثلاً آئس کریم کھانا، اخبار پڑھنا، بچہ پالنا یا حقہ پینا وغیرہ یہ تمام موضوعات بالواسطہ اور بلاواسطہ انشائیہ نگار کی وابستگی کو نمایاں کرتے ہیں اور قاری کو ان کا مطالعہ کرنے کی تحریک دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک اچھا انشائیہ فرد کی وجدانی ضرورتوں کو پورا کرنے کا وسیلہ بھی بن سکتا ہے [۱]بقول مرزا حامد بیگ "انشائیہ تو MEDITATION سے جنم لیتا ہے۔" یعنی یہ بات برملا کہی جا سکتی ہے کہ جہاں انشائیے کا رُخ بصارت سے بصیرت کی طرف ہے وہاں بصیرت سے بصارت کی طرف بھی ہے۔ گویا انشائیہ نگار DOUBLE VISION کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اسی طرح انشائیہ نگار کسی ایکسپریشنسٹ EXPRESSIONIST کی طرح نہ تو دن میں خواب دیکھتا ہے اور نہ ہی علامت پسندوں کی طرح خارج کو فقط INNER ABSOLUTE کا عکس سمجھنے لگتا ہے بلکہ یہ تو جوہر اور وجود کو بیک وقت اہمیت دیتا ہے اور انہیں ایک ہی سکے کے دو رُخ سمجھتا ہے، چنانچہ انشائیہ نگار کے نزدیک خیال IDEA اور ہیئت FORM ایک نامیاتی وحدت رکھتے ہیں اور یوں خارج و باطن کا سنگم انشائیہ میں موضوعی اور معروضی اندازِ فکر کو بیک وقت شامل کر دیتا ہے جس سے اس کی زود اثری میں اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ موضوع سے انشائیہ نگار کی ذاتی وابستگی کے بغیر ممکن نہیں۔

[۲]بقول ڈاکٹر آدم شیخ:

"انشائیہ نگار فرد کو جماعت یا جزو کو کل پر ترجیح دیتا ہے۔"

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انشائیہ نگار کسی IVORY TOWER کا باسی ہے اور ارد گرد کی زندگی اور اس کی اجتماعیت سے اُسے کوئی علاقہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فرد کے بھی دو پہلو ہیں — ایک اُس کا شخصی پہلو اور دوسرا اجتماعی پہلو۔ اجتماعی پہلو اُس کی ذات میں مضمر ہوتا ہے۔ چنانچہ انشائیہ نگار جب فرد کی ترجمانی کرتا ہے تو اُس کے اجتماعی پہلو کے حوالے سے زندگی اور معاشرے کے کُل کو بھی پیش کر دیتا ہے مگر لطف یہ ہے کہ وہ محض زمانۂ حال کے معاشرے سے کہیں زیادہ اُس معاشرے کو درخورِ اعتنا سمجھتا ہے جو اُس کی ذات میں مستور ہوتا ہے اور اُس معاشرے کو بھی اہمیت دیتا ہے جو اُس کے خوابوں کی آماج گاہ ہے اور جس کے مستقبل میں طلوع ہونے کے واضح امکانات موجود ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انشائیہ کسی محدود مقصدیت کا نہیں بلکہ ایک وسیع تر

---

۱ انشائیہ کی کونپل "اوراق" ۱۹۷۸ء جنوری فروری۔

۲ ڈاکٹر آدم شیخ "انشائیہ"

انکشافی اور عرفانی رہنے کا علمبردار ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں رشید نثار صاحب لکھتے ہیں:

"اسے (یعنی انشائیہ نگار کو) کسی اصلاحی لگن کا بھی دُکھ نہیں ہوتا اور یہ غم بھی نہیں ستاتا کہ اس کے فن پارے سے کسی سماجی پرتو کی بھی روشنی آرہی ہے یا نہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ سماجی پرتو تو اس میں موجود ہوتا ہے مگر وہ اس کی چلبلیٹی نہیں کرتا۔ پھر یہ کہ کُل سے مربوط ہونے کا زاویہ انشائیہ کی ہیئت میں بھی موجود دکھائی دیتا ہے، چنانچہ ہر اچھے انشائیے کی یہ خوبی ہے کہ اس کا آخری فقرہ یا پیراگراف موضوع کے سارے بکھرے ہوئے دھاگوں کو جوڑ کر ایک ایسی مکمل صورت تشکیل دے ڈالتا ہے جس کو دیکھتے ہوئے LOOSE SALLY OF THE MIND والی بات محض انشائیہ کا ایک پہلو ہی دکھائی دیتی ہے۔ گویا فنی تکمیل انشائیہ کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ بصورتِ دیگر انشائیہ STRAY THOUGHTS کی سطح سے اُوپر ہی نہ اُٹھ سکے۔ اس سلسلے میں چند انشائیوں کے اختتامی فقرے ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ ان کی مدد سے انشائیہ نگار نے کس طرح انشائیہ کی فنی تکمیل کی ہے:

مثال نمبر ۱: "ویسے احباب و اقربا کی سہولت کے لیے بھی قبر پر نیم پلیٹ کا ہونا ضروری ہے، لیکن نیم پلیٹ وہی ہوگی جو مجھے پسند ہے۔ مجھے یہ بات ہرگز گوارا نہیں کہ مرنے کے بعد عزیز و اقارب اپنی پسند کی نیم پلیٹ میری قبر پر لگائیں۔"

(انشائیہ نیم پلیٹ) جمیل آذر

مثال نمبر ۲: "فنا و بقا کا سارا رنگ انگنی پر ٹنگا دیکھیے کہ انگنی ہماری تہذیب کی علامت ہے جس کا ایک سرا ازل اور دوسرا سرا ابد سے بندھا ہے۔"

(انشائیہ انگنی) کامل القادری

مثال نمبر ۳: "دُور اندیشی دراصل ہوا سے ڈرنے کا نام ہے۔ اس ہوا سے جس کا رُخ ابھی متعین نہیں ہوا۔"

انشائیہ (دُور اندیشی) اکبر حمیدی

مثال نمبر ۴: "انسان ہونے کے ناتے میری خواہش بھی یہی ہے کہ فائل سے میری محبت کا رشتہ کبھی نہ ٹوٹے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنی بیوی سے اُلجھنے اور کبھی کبھی اسے جھڑکنے کی جرأت تو کر لیتا ہوں لیکن فائل کو ناراض کرنے کی کوشش کبھی نہیں کرتا۔"

انشائیہ (ذکر اس پری وش کا) ڈاکٹر انور سدید

مثال نمبر ۵: "جب میرا مکان بالکل تیار ہو جائے گا تو میں اس کے سائے میں بیٹھ کر اپنے رشتۂ ازدواج پر غور کروں گا اور سوچوں گا کہ کیا دھرتی یعنی مکان سے وابستہ رہنا بہتر ہے یا مکان کی "مکانیت" سے نکل کر غیر محدود فضا میں چہل قدمی کرنا؟"

انشائیہ (مکان بنانا) غلام جیلانی اصغر

مثال نمبر ۶: "لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ شخصیت کی تکمیل آندھی کے بے رحم تھپیڑوں ہی کی رہینِ منت ہے اور جس شخص کی زندگی میں کبھی آندھی نہیں آئی، اس کی حالت قابلِ رحم اور اس کی ذہنی پختگی محلِ نظر ہے۔"

انشائیہ (آندھی) وزیر آغا

مشکور حسین یاد صاحب نے انشائیہ کو "اُم الاصناف" کہا ہے۔ اس سے اگر اُن کی یہ مراد ہے کہ اصنافِ ادب میں سب سے پہلے انشائیہ نے جنم لیا تھا تو یہ بات قرینِ قیاس نہیں ہے۔ ان معنوں میں صرف شاعری ہی کو اُم الاصناف کہنا واجب ہے، البتہ انشائیہ کو ایک حد تک امتزاجی صنف کہہ لیجیے کہ اس میں افسانہ کی

ف افسانہ انشائیہ نمبر "اوراق" ۱۹۷۲ء انشائیہ۔ ایک بحث

علامتی گہرائی، ڈراما کا تحرک، ناول کی ہمہ گیری، فلسفہ کی زیرکی اور مشاہدہ پسندی، شاعری کی معنی آفرینی اور جدتِ خیالی اور نفسیات کی دروں بینی —— یہ سب لکھنے والے کے ذاتی تجربہ اور شعور کا حصّہ بن کر ایک نئے افق کو سامنے لانے کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ انشائیہ نگار کے اسی دائرہ کار کے ضمن میں اے۔ کرسٹوفر بنسن (THE ART OF THE ESSAYIST مرتبہ۔ سی۔ ایچ۔ لاکٹ) میں رقمطراز ہے:

"HE DOES NOT SEE LIFE AS THE HISTORIAN, OR AS THE PHILOSOPHER, OR AS THE POET, OR AS THE NOVELIST, AND YET HE HAS A TOUCH OF ALL THESE."

یوں بھی انشائیہ نگار اس سارے جہان کا ادراک THE WORLD AS MY IDEA کے حوالے سے کرتا ہے۔ اس لیے یہ تمام گوشے بصورت واردات اس میں از خود شامل ہو جاتے ہیں اور اسے حسّی ادراک سے آگے کی چیز بنا دیتے ہیں۔ آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ وہ حضرات جو صنفِ انشائیہ کی مقبولیت اور اثر پذیری کو انشائیہ پڑھنے اور لکھنے والوں کے گراف کی کم بیشی سے جانچنے کی سعی فرماتے ہیں، میرے خیال میں درست نہیں کرتے کیونکہ انشائیہ جس قسم کا مزاج رکھتا ہے اس کو سمجھنے اور اس سے لطف کشید کرنے کے لیے ذاتی تربیت اور ریاضت کی اشد ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ باطنی دنیا سے نشر ہونے والے پیغامات کو حاصل کرنے کے لیے انشائیہ لکھنے اور پڑھنے والے کے ذہنی چینل کا ذکی الحس ہونا بھی ضروری ہے۔ تبھی وہ ایک اچھا "سیٹ" (RECEVING SET) بن سکتا ہے۔ لہٰذا گنتی کر کے کہنا کہ چونکہ انشائیہ نگاروں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے اس لیے یہ ہر دلعزیز صنفِ نثر کا درجہ نہیں رکھتی، فی الحقیقت زُود اندیشی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ مختصر یہ کہ اُردو ادب میں انفرادی سوچ جس خون کی کمی کا شکار تھی انشائیہ نے اس کو حتی المقدور پورا کرنے کی کوشش کی ہے اور میں اسے انشائیے کی ایک اہم دین تصوّر کرتا ہوں۔ باقی رہا انشائیے کی ترویج کا معاملہ تو اس ضمن میں انشائیہ کی خود کار نمو پذیری نے اس کے خدوخال کو واضح کیا ہے اور اسے برتر مقام کی طرف دمادم لے جا رہی ہے۔ میں رشید امجد صاحب کے ان کلمات کے ساتھ ہی اس مضمون کا اختتام کرنا چاہتا ہوں کہ:

"جدید انسان کبھی اپنے حوالے سے کائنات کو اور کبھی کائنات کے حوالے سے اپنے آپ کو سمجھنے کی جستجو کر رہا ہے۔ یہ دوہرا سفر پیچیدہ بھی ہے اور قدم قدم پر نئے نئے انکشافات اور اسرار سے بھی بھرا ہے۔ اس پیچیدگی، کشف اور اسرار کا بہترین اظہار انشائیہ ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس لیے میرے خیال میں انشائیہ ہی مستقبل کا سب سے اہم پیرایۂ اظہار ہو سکتا ہے —— انشائیہ اب ایک رجحان نہیں، تحریک بن چکا ہے ایک ایسی تحریک جو بتدریج مستقبل کے اظہار کا ذریعہ بنتی چلی جا رہی ہے۔"

۱؎ انشائیوں کی ایک نئی کتاب —— انشائیہ نمبر ۱۹۸۳ء "اُردو زبان"

کرکٹ

انور سدید

بیسویں صدی کی طغیانی زندگی میں سے اگرچہ لمحۂ فراغت نکالنا بہت مشکل ہو گیا ہے لیکن جب بھی کرکٹ کا موسم آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس صدی کی طغیانی رَو نے اپنی سمت یکدم تبدیل کر لی ہے اور اس کے داخل سے عافیت، مسرت اور بہجت کے اَن گنت لمحات کا فوارہ پھوٹ پڑا ہے۔ کرکٹ کا موسم آتا ہے تو زندگی کی خارجی تیز رفتاری رک جاتی ہے لیکن انسان کا داخل بیدار ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اندر کے مست بلاوے پر کسی مخصوص سمت میں بے اختیار لپکتا چلا جاتا ہے۔ یہ بلاوا کوہِ ندا کا بلاوا نہیں کہ آدمی اس پر لبیک کہے تو واپس ہی نہ آئے اور پیچھے مڑ کر دیکھے تو پتھر بن جائے۔ یہ بلاوا تو محبوب کے اُس بلاوے کی طرح ہے جس میں تجدیدِ حیات کی نویدِ تازہ موجود ہوتی ہے اور ایک طویل ملاقات کے بعد زندگی کرنے کی نئی آرزو بیدار ہو جاتی ہے۔

کرکٹ ایک والہانہ جذبے کا نام ہے۔ لیکن اس کی جذباتی کیفیت چند سر پھرے اور جنونی لوگوں پر طاری نہیں ہوتی بلکہ صدرِ مملکت سے لے کر پان فروش تک اور پیر خانہ سے لے کر طفلِ مکتب تک سب لوگ اس میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ بچے سکولوں اور کالجوں کو بند کروا دیتے ہیں۔ والدین اپنے افسر مجاز سے رخصتِ اتفاقیہ لے لیتے ہیں۔ بڑے بوڑھے جن کے پاؤں چلنے سے عاری ہو چکے ہیں شست لگا کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ تاجر اپنی دکانیں ملازموں کی تحویل میں دے دیتے ہیں اور پھر چست لباس پہنتے اور سروں پر رنگ برنگی ٹوپیاں سجاتے ہیں۔ ٹفن باکس ہاتھ میں تھامتے ہیں اور مقبول فلمی گانے الاپتے ہوئے جوق در جوق اس راہ پر ہو لیتے ہیں جو ہمیشہ کرکٹ سٹیڈیم کی طرف جاتی ہے۔ راستے میں اگر کوئی عمارت سنگسار ہو جائے، کسی بس کو آگ کے شعلے اپنی لپیٹ میں لے لیں یا سڑک پر ایستادہ چند خوبصورت ٹریفک سگنل اس ہجوم فراواں کی سرخوشی کی تاب نہ لا کر سرنگوں ہو جائیں تو اس کی پروا نہ کیجئے۔ یہ سب کچھ تو کرکٹ کا موسمی عطیہ ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے آندھی یا طوفانِ باراں آتا ہے تو شکست و ریخت اور اکھاڑ پچھاڑ کے بہت سے مناظر ہمیں تحفتہً عطا کر جاتا ہے۔

کرکٹ میں چونکہ پوری قوم مبتلائے شوق ہو جاتی ہے اس لیے مجھے کرکٹ بجائے کھیل کے ایک بھرا پُرا میلہ نظر آتا ہے۔ یہ کھیل اگر بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں رائج ہو جاتا تو شہنشاہِ عالم پناہ کو پھول والوں کا میلہ سجانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ بلکہ وہ قطب صاحب کے گرد و نواح میں جو طویل و عریض میدان ہے اس میں کرکٹ کے پانچ روزہ مقابلوں کے انعقاد کا حکم دے دیتے۔ اور خود قلعۂ معلیٰ میں بیٹھ کر کرکٹ کی کمنٹری سنتے۔ افسوس کہ مغلوں نے برصغیر میں کرکٹ رائج کرنے کے بجائے اپنا ٹھاٹھ ہی سمیٹ لیا اور برصغیر کا طویل و عریض میدان انگریزوں کے لیے خالی کر دیا تاکہ وہ ایل بی ڈبلیو ہو جانے کے خطرے کو خاطر میں لائے بغیر بے تحاشا اور بے محابا کرکٹ کھیلیں۔ گیند کو معمولی سا بلّا دکھائیں اور جس سمت میں چاہیں پھینک دیں۔ اور پھر خود ہی باؤنڈری کی لکیر پار کرنے کا اعلان کر دیں۔

برصغیر میں انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں طویل ترین اننگز کھیلی اور حسبِ مرضی خوب چوکے چھکے لگائے۔ بس بد احتیاطی کی تو یہ کہ اس ہذیانی عمل میں انہوں نے کرکٹ کی اخلاقیات کو ملحوظِ نظر نہیں رکھا۔ انگریز کھلاڑی وکٹوں کے سامنے اکڑ کر کھڑے ہو جاتے اور من مانی کرنے لگتے۔ ہندوستانی ٹیم اس بدعنوانی پر زور شور سے اپیلیں کرتی لیکن وکٹ پر قابض انگریز اپیلوں کو مسلسل نظر انداز کرتے جاتے اور کسی با اختیار ایمپائر کو گراؤنڈ کے قریب تک نہ آنے دیتے تاکہ وہ اس بد اعتدالی

کے خلاف کہیں انگشتِ شہادت بلند کرکے انہیں واپس پیویلین میں جانے کا حکم نہ دے دے۔ یہی وجہ ہے کہ برِّصغیر کی تاریخ میں انگریزوں کے دورِ حکومت کو تحسین کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا اور اس دور کے انگریزوں کو ایسے کھلاڑیوں میں شمار کیا جاتا ہے جو گراؤنڈ کو رگید ڈالتے ہیں، گیند کے پرخچے اڑا دیتے ہیں، بلا توڑ دیتے ہیں اور جاتے جاتے اپنے ساتھ وکٹیں بھی اٹھا لے جاتے ہیں۔

کرکٹ ہذیانی عمل نہیں۔ یہ تو صبر و تحمل کا کھیل ہے۔ اور ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہار جیت کا فیصلہ صادر کرنے کے بجائے یہ کھیل کبھی پورے دن پر محیط ہو جاتا ہے، کبھی تین دنوں میں پھیل جاتا ہے اور اکثر دلِ عاشق کی طرح وسعت اختیار کرتا ہے تو پورے پانچ دنوں کے بعد بھی فتح و شکست کا فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ ان پانچ دنوں میں کھلاڑیوں کی جو حالت ہوتی ہے میں اسے بیان نہیں کرسکتا لیکن تماشائیوں کی دلچسپی کا عالم یہ ہوتا ہے کہ لمحے بھر کے لیے میدان سے ان کی نظر نہیں ہٹتی اور اگر کبھی ہٹتی ہے تو بے اختیار اسکور بورڈ میں اٹک جاتی ہے جہاں کھیل کا پورا گوشوارہ نامۂ اعمال کی طرح نمایاں نظر آتا ہے۔ اور نکیرین لمحے لمحے کا احوال درج کرنے اور خلقِ خدا کو اس احوال سے باخبر رکھنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ اس عالم میں مجھے ہمیشہ یوں محسوس ہوا ہے کہ وقت کے پَر کٹ گئے ہیں، زمانے کی رفتار رک گئی ہے اور پانچ دن سمٹ کر ایک مختصر سا لمحہ بن گئے ہیں یا جیسے ہم اصحابِ کہف کے غار میں ارادۃً داخل ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے ہیں اور اپنی دنیا میں واپس آتے ہیں تو کیلنڈر اپنے پانچ اوراق اُلٹ چکا ہوتا ہے اور دنیا کچھ اور بوڑھی ہو چکی ہوتی ہے۔

کرکٹ بھی عجیب کھیل ہے۔ اس میں کسی کو نتیجہ برآمد کرنے کی جلدی نہیں۔ بلکہ اگر کبھی کھلاڑیوں کی عجلت پسندی سے نتیجہ معینہ ایام سے پہلے برآمد ہونے کے آثار پیدا ہو جائیں تو تماشائیوں میں بوریت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ تیزی سے آؤٹ ہونے والے بیٹس مینوں پر گندے انڈے، ٹماٹر، کیلے کے چھلکے اور گلے ہوئے مالٹے اور امرود حسبِ موسم پھینک کر اپنی عدم طمانیت کا اظہار برملا کرنے لگتے ہیں۔ اچھا کرکٹ تو وہ ہے جس میں باؤلر اپنا پورا زور لگا کر اور پینترے بدل بدل کر گیند پھینکے اور بیٹس مین اس کے ہر گیند پر پے در پے ضربیں لگائے اور گیند کو چاروں اطراف میں لڑھکاتا اور لہراتا چلا جائے۔ گیند کبھی ہوا میں اڑتا ہوا آئے اور فیلڈر کے ہاتھوں سے پھسل کر باؤنڈری پار کر جائے۔ کبھی گیند کے پیچھے دوڑتے دوڑتے کھلاڑی زمین پر گرے اور دیر تک گیند کی طرح لڑھکتا چلا جائے۔

کرکٹ میں وہ لمحہ بھی جان لیوا مسرت کا حامل ہوتا ہے جب عین ننانوے رنز پر سنچری کا حصول مقصود بالذات نظر آنے لگتا ہے لیکن وکٹ کیپر اچانک گیند کو دبوچتا ہے اور کھلاڑی کو آؤٹ کر دیتا ہے۔ کھیل کی پہلی گیند پر آؤٹ ہو جانے کا اور اننگز کے اختتام تک "ناٹ آؤٹ" رہنے کا اپنا الگ ذائقہ ہے۔ ایل۔بی۔ڈبلیو کی بلند آواز اپیل کی اپنی ایک مخصوص جاذبیت ہے لیکن اس اپیل کے مسترد ہو جانے کی چاشنی بھی الگ نوعیت رکھتی ہے۔ اس عالم میں بیٹس مین ماؤنٹ ایورسٹ کے فاتح شرپا تن سنگ کی طرح میدان میں گردن اکڑا کر یوں کھڑا ہو جاتا ہے جیسے کہہ رہا ہو۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق　　　ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

لیکن اسی لمحے باؤلر گردن ڈال دیتا ہے۔ ٹیم کے دوسرے دس ارکان پر مُردنی کا کہرا بکھر جاتا ہے۔ ایل بی ڈبلیو کی اپیل اور ایمپائر کے فیصلے کے درمیان جو مختصر سا وقفہ ہے میں اسے ہمیشہ قیامت کے لمحے سے تعبیر کرتا ہوں۔ اس لمحے میں ہزاروں تماشائیوں کی جان نیزے کی انی پر اٹک جاتی ہے۔ کائنات پر انقباض کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جوئے خون دل کی طرف جاتے جاتے رک جاتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چوراہے پر لگے ہوئے سگنل کی سبز آنکھ اچانک سُرخ ہوگئی ہو اور ٹریفک کا بہتا ہوا سیلاب آنکھ کے ایک نامعلوم اشارے پر رُک گیا ہو۔ لیکن جونہی ایمپائر کی انگشتِ شہادت بلند ہوتی ہے اور بیٹس مین غصّے میں دستانے اتار کر اور بلا بغل میں دبا کر پیویلین کی طرف چلنے لگتا ہے تو ساری فضا تالیوں سے معمور ہو جاتی ہے۔ زندگی کی گہما گہمی واپس آجاتی ہے۔ انقباض کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے اور پوری کائنات ایک نامعلوم مسرت کے نشے سے سرشار نظر آنے لگتی ہے۔

کرکٹ اس قسم کے لمحاتِ مسرت کی مالا ہے اور اس کی بہجت ہر لمحہ اپنا رنگ بدل لیتی ہے۔ ایمپائروں کے فیصلے جب اخبارات میں راہ پاتے ہیں تو اس مسرت

کی ایک نئی نوعیت سامنے آتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ جدال جو پہلے کرکٹ کے میدان میں ہنگامہ خیز طور پر بپا تھا اب اخبارات کے صفحات پر آراستہ ہو گیا ہے۔ اور ہر چہار جانب سے ایمپائر کے فیصلوں پر دھواں دھار بحث جاری ہو گئی ہے۔ اس قسم کے مواقع پر کرکٹ کھلاڑیوں کا نہیں بلکہ صحافیوں کا کھیل نظر آنے لگتا ہے۔ اور ہر صحافی دوسرے کو پٹخنی دینے اور "کلین باؤلڈ" کرنے کی کوشش میں ہمہ تن سرگرم نظر آتا ہے۔ اسی ہنگامے میں کرکٹ کا موسم گزر جاتا ہے لیکن بحث ختم نہیں ہوتی۔ لیکن صاحب! ایمپائر کی انگشتِ شہادت کو بھی عدالتِ عالیہ کے جج جیسا مرتبہ حاصل ہے۔ اگر بلند ہو جائے تو بیٹسمین کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے اور جھکی رہے تو پوری ٹیم کا احتجاج بھی اسے بلند ہونے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ کرکٹ بلاشبہ خون گرم رکھنے کا کھیل بھی شمار ہوتا ہے لیکن ایمپائر منہ زور گھوڑوں کو سدھا کر انہیں تسلیم و رضا کے راستے پر ڈال دیتا ہے اور وہ تعمیلِ حکم کا سبق بھی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنا نظم و ضبط کرکٹ کے کھلاڑیوں میں پایا جاتا ہے اتنا کسی اور کھیل کے کھلاڑیوں میں نہیں ملتا۔

اکثر اوقات میں نے کرکٹ کا موازنہ دوسرے کھیلوں سے بھی کیا ہے اور اسے ہمیشہ دوسرے کھیلوں سے مختلف پایا ہے۔ مثال کے طور پر ہاکی لقمۂ تر پر جھپٹنے اور خود غرضی کے کمینے مظاہرے کے بعد گیند پر قبضۂ غاصبانہ جمانے کا عمل ہے۔ والی بال میں قدرے استحسان کا زاویہ موجود ہے۔ کھلاڑی تکرارِ عمل کو خاطر میں لائے بغیر ترازوئی حجم کے بال کو ارادۃً فریقِ مخالف کی طرف پھینکتا ہے تو اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ مخالف فریق بال کو واپس بھیجنے کے بجائے اپنے پاس ہی رکھ لے۔ لیکن فریقِ مخالف بھی تو سپورٹس کے جذبے سے معمور ہوتا ہے اور ایسا گیا گزرا نہیں کہ ناخواندہ مہمان کی طرح احسان قبول کر لے۔ وہ بال کو بصد شوق قبول کرتا ہے لیکن اسے دبوچنے کے بجائے انگلیوں کی پوروں سے مس کرتا ہے اور بصد شکریہ واپس کر دیتا ہے اور اگر خدانخواستہ بال زمین پر گر جائے تو اتنا متاسف ہوتا ہے کہ بال کے ساتھ فریقِ مخالف کو جیتنے کے لیے ایک پوائنٹ بھی دے دیتا ہے۔ فٹ بال میں کھلاڑی بال کو ٹھوکر تو پائے استحقار سے ہی لگاتا ہے لیکن اسی لمحے ایک مزعوم لالچ اس پر یلغار کر دیتا ہے اور وہ اس سے مغلوب ہو کر بال کے تعاقب میں بھاگنے اور اسے دوبارہ اپنے قبضۂ قدرت میں لینے کی کوشش شروع کر دیتا ہے۔

کرکٹ میں گیند ایک پری وش کی سی خندہ جبینی کے ساتھ کھلاڑی کی طرف آتا ہے لیکن کھلاڑی اسے ایک برہمچاری کی طرح منہ تک نہیں لگاتا اور بڑی بے اعتنائی سے ٹھوکر لگا کر اسے پرے پھینک دیتا ہے۔ کرکٹ کا کھلاڑی اس یوسف کی طرح ہے جس کے بھائی اسے میدان میں تنہا چھوڑ جاتے ہیں اور خود پویلین میں بیٹھ کر چلغوزے کھاتے اور تماشا دیکھتے ہیں۔ گیند کی زلیخا اس پر پے در پے حملہ آور ہوتی ہے اور وہ اس سے اپنا دامن بچانے کے لیے کبھی وکٹوں کے شمالی قلعے کی طرف بھاگتا ہے اور کبھی جنوبی حصار میں پناہ تلاش کرتا ہے۔ کرکٹ میں آج تک کسی بیٹسمین نے گیند پر قابض ہونے کی کوشش نہیں کی بلکہ جو کھلاڑی گیند کو جتنا دور پھینک سکے اتنا ہی ماہر اور پختہ کار شمار ہوتا ہے۔ گیند کو باؤنڈری سے پرے پھینکنے والا کھلاڑی تو وکٹوں کے درمیان دوڑنا بھی ضروری نہیں سمجھتا بلکہ وہیں کھڑا کھڑا تماشائیوں سے داد حاصل کرتا رہتا ہے۔

کرکٹ میں چوکا یا چھکا لگ جانا ایک اضطراری عمل ہے۔ یہ اس سہلِ ممتنع شعر کے مماثل ہے جس میں شاعر کا شعوری ارادہ شامل نہیں ہوتا بلکہ تخلیقی عمل کے دوران خود بخود سرزد ہو جاتا ہے۔ کرکٹ میں چوکا یا چھکا چونکہ اچانک لگ جاتا ہے اس لیے تماشائی اس کی داد مشاعرے کے اچھے شعر کی طرح دیتے ہیں اور مکرر۔ مکرر اور "ونس مور" "ونس مور" کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ بعض کھلاڑی اس داد کو یوں قبول کرتے ہیں کہ دوسرا اور پھر تیسرا چھکا بھی لگا ڈالتے ہیں لیکن بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ کھلاڑی تماشائیوں کی داد کا جواب دینے سے پہلے ہی پویلین کی طرف جاتا دکھائی دیتا ہے۔

کرکٹ کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں گول کرنے کی کسی کو جلدی نہیں ہوتی۔ ہر کھلاڑی زرہ بکتر پہن کر میدان میں اس ارادے سے اترتا ہے کہ اننگز کے اختتام تک وکٹ پر جما رہے اور باؤلر کے ہر حربے کو ناکام بنا دے۔ چنانچہ کرکٹ میں ہوش و حواس کو سلامت اور طمانیتِ قلب و نظر کو مضبوطی سے تھامنا پڑتا ہے۔ ہاکی یا فٹ بال میں گیارہ کھلاڑی ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں۔ کرکٹ میں فریقِ مخالف کا سامنا کرنے کے لیے اگرچہ دو کھلاڑی میدان میں اترتے ہیں لیکن درحقیقت گیارہ کھلاڑیوں کا

مقابلہ صرف ایک بیٹسمین ہی کرتا ہے۔ یہ بے چارہ چاروں اطراف سے ہمہ وقت حملہ آور قزاقوں میں گھرا رہتا ہے۔ پھر بھی فریقِ مخالف پر وار کرنے اور اسے غچہ دینے سے گریز نہیں کرتا۔ چنانچہ جب وہ گیند پر ضرب لگاتا ہے تو پوری ٹیم میں کھلبلی مچ جاتی ہے، اور اکثر اوقات حواس باختگی میں پورس کے ہاتھی اپنے سپہ سالاروں کو ہی روند ڈالتے ہیں اور یوں کرکٹ ہر لحظہ نئی آن، نئی شان پیش کرتا چلا جاتا ہے اور پانچ سرگرم دنوں پر محیط ہو جانے کے باوجود قاری کے ذوق و شوق میں کمی نہیں آنے دیتا۔

دنیا میں کوئی کھیل ایسا نہیں جسے دیکھتے یا کھیلتے ہوئے آپ چائے پی سکتے ہوں۔ کرکٹ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آپ اس کے دوران چائے کے ساتھ چلغوزے بھی کھا سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر آپ کو دفتر میں یکسوئی حاصل نہیں اور فائیلوں کا انبار لگتا جا رہا ہے تو آپ تماشائیوں کی صف میں بیٹھ کر اہم قسم کی فائیلوں پر نوٹ بھی لکھ سکتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر کئی شاعروں کو جانتا ہوں جنہوں نے کرکٹ دیکھتے ہوئے نہ صرف اپنی نامکمل غزلیں مکمل کر لیں بلکہ وہ اطراف و جوانب کی معطر اور شعر خیز فضا سے نئی زمینیں بھی تلاش کر لائے۔ چنانچہ ہاکی، نٹ بال، سکوائیش اور والی بال کے کھیل ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے جھپٹنے، پلٹنے اور پھر جھپٹنے کا بہانہ ہیں لیکن کرکٹ آسودگی، طمانیت اور عرفان حاصل کرنے کا عمل ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کھیل کو ان معاشروں میں زیادہ مقبولیت حاصل ہے جہاں مشینوں کی حکومت نے دلوں کو تاراج کر دیا ہے اور فرد مادے کی یلغار سے نکل کر ایک طویل لمحۂ عافیت کے لیے مارا مارا پھر رہا ہے۔

دوسرے کھیلوں کے مقابلے میں مجھے کرکٹ زیادہ پسند ہے تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کرکٹ میں قدامت پسندی کا خطیر عنصر بھی موجود ہے۔ مصری تہذیب کی یہ خوبی کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکا کہ اس نے اپنا ایک شانہ حال کے ساتھ ملا رکھا ہے تو دوسرے شانے پر اپنا پورا ماضی اٹھایا ہوا ہے۔ دنیا کی بیشتر تہذیبیں اپنے ماضی سے سرگراں نظر آتی ہیں اور جدیدیت کے شوق میں اپنا رشتہ و پیوند مستقبل کے ساتھ قائم کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتی ہیں۔ اس کے برعکس اہلِ مصر نے دیو ہیکل اہرام بنا کر اپنا سارا ماضی محفوظ کر رکھا ہے اور جب جی چاہتا ہے عہدِ نو کی یلغار سے نکل کر ماضی کی عظمت و شوکت کا نظارہ کر لیتے ہیں۔ کرکٹ کے گرد اہرام تو کھڑے نہیں کیے گئے لیکن وہ ضخیم اور وزنی کتابیں جن میں کرکٹ کے لمحے لمحے کا حساب لکھا ہوا ہے اہرامِ مصر سے کم دیو ہیکل اور غیر اہم نہیں ہیں۔ اہرام کی تعمیر کا عمل جدید مصر سے قطعاً مفقود ہو چکا ہے لیکن کرکٹ کے ریکارڈ جمع کرنے کا عمل زمانۂ حال میں زیادہ تیزی اور اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اور بعض اوقات تو مجھے یہ گمان بھی گزرتا ہے کہ کرکٹ کھیلا ہی اس لیے جاتا ہے تاکہ ریکارڈ کی کتابوں میں کسی ایسے کھلاڑی کو بقائے دوام مل جائے جو دنیا کا کوئی دوسرا مفید کام سرانجام نہیں دے سکا۔

کرکٹ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس نے جدید ایجادوں کا ساتھ دے کر ناظر کو نئی نئی سہولتیں فراہم کی ہیں۔ ایک زمانے میں کرکٹ سے لطف اندوز ہونے کے لیے گھنٹوں کرکٹ سٹیڈیم میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ ریڈیو ایجاد ہوا تو اس کے ساتھ ہی کرکٹ کمنٹری بھی معرضِ وجود میں آ گئی اور بہت سے لوگوں نے ہجوم سے اپنے گھوڑے بچانے کی راہ تلاش کر لی۔ چنانچہ اب کرکٹ آنکھوں سے دیکھنے کے بجائے کانوں کے راستے دل میں اترا جانے لگا۔ اس دور میں کرکٹ کے ساتھ کرکٹ کمینٹری کو بھی اہمیت حاصل ہو گئی اور اچھے کمینٹیٹروں کی پذیرائی تو کھلاڑیوں سے بھی زیادہ ہونے لگی۔ اور کمینٹیٹر کمال یہ دکھاتے کہ بے جان کھیل میں بھی جان ڈال دیتے۔ کمزور وکٹ پر گیند اور بلے کی ٹھک ٹھک کو اپنے اعجازِ بیان سے نئی زندگی دے دیتے۔ پھر سطحِ عالم پر ٹیلی وژن رونما ہو گیا اور سیٹلائیٹوں کی معاونت سے تو دنیا بھر کے ممالک نے آپس میں گھر آنگن کا رشتہ استوار کر لیا۔ اب کرکٹ کھیل کے میدان کے علاوہ ڈرائنگ روم کی زینت بھی بن گیا۔ ریڈیو کے دور میں کرکٹ جنتِ گوش قرار پایا تھا لیکن ٹیلی وژن نے اسے پھر فردوسِ نظر بنا دیا۔ کرکٹ انگلستان، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ یا ویسٹ انڈیز کے کسی دور افتادہ مقام پر کھیلا جا رہا ہوتا ہے لیکن اس کے شائقین کالا شاہ کاکو، ٹنڈو محمد خان یا چیچو کی ملیاں جیسے غیر معروف مقامات پر اپنے گھروں میں بیٹھے ہر اچھی سٹروک پر تالیاں بجاتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ کرکٹ جو پہلے ایک اجتماعی عمل تھا اب ایک تہذیبی صورت اختیار کر گیا ہے۔ لوگ باگ تہمد باندھ کر اور کرتہ اتار کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ

جاتے ہیں، خشک میووں کی پلیٹ سامنے رکھ لیتے ہیں۔ بیگم کو وقفوں وقفوں سے چائے لانے کا آرڈر دے دیتے ہیں اور شرکائے محفل کے ساتھ سارا دن نہ صرف کرکٹ سے لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ عالمی موضوعات پر تبادلۂ خیالات بھی کرتے جاتے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ بہت سے لاینحل معاملات پر کرکٹ کمینٹری کے دوران غور و خوض کیا گیا تو جملہ حواسِ خمسہ بیدار ہوگئے اور مسئلہ آنِ واحد میں سُلجھ گیا۔ چنانچہ میرا ایقان ہے کہ دنیا کے دوسرے کھیل مسائل کو اُلجھاتے ہیں لیکن کرکٹ معاملات کو سُلجھاتا ہے۔

چھٹی کے دن جب سورج زرہ بکتر پہن کر مشرق کے دروازے سے داخل ہوتا ہے تو میں اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دیتا ہوں۔ سامنے ایک کھُلا میدان ہے۔ جب میں چھوٹا تھا تو اس میدان میں اپنے دوستوں کے ساتھ گُلی ڈنڈا کھیلا کرتا تھا۔ یہ میرا سب سے مرغوب کھیل تھا اور میں نے اس میں اتنی دسترس حاصل کر لی تھی کہ اطراف و جوانب کے دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشوں پر جہاں چاہتا نشانہ لگانے میں کامیاب ہو جاتا۔ محلے کی تمام معتبر فرسودہ مائیں اور موسم گزیدہ کہنہ باپ مجھے زہر آلود نظروں سے دیکھتے تھے۔ لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اب اس میدان میں بچے کرکٹ کھیلتے ہیں۔ ان بچوں کو دیکھ کر مجھے عجیب سی طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے روئی کے نرم و نازک گالے سطحِ زمین پر خرگوشوں کی طرح پُھدک رہے ہوں۔ کبھی ان کی تالیاں فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہیں۔ کبھی ان کے چہچہے سکوتِ کائنات کو تبسم ریز کر ڈالتے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر میرے اندر کا معصوم بچہ بیدار ہو جاتا ہے۔ میں اپنی خلعتِ فاخرہ اتار دیتا ہوں اور خیالی طور پر اپنے ماضی میں گم ہو جاتا ہوں۔ آج صبح آلامِ حیات نے پھر وہی یورش کی تو میں کھڑکی کھولنا بھول گیا اور میز پر بیٹھتے ہی سفینۂ خیال کو افکار کے تلاطم سے نکالنے میں مصروف ہو گیا۔ اچانک ایک چھناکا ہوا۔ کوئی نوکیلی سی چیز کھڑکی کے شیشے کے ساتھ ٹکرائی اور اسے کرچی کرچی کرتی ہوئی میز پر آ گری۔ میں نے دیکھا میدان میں لڑکے گُلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ ڈنڈے کی ضرب سے گُلی لہراتی ہوئی آئی اور کھڑکی کا شیشہ توڑ کر میرے کمرے کی خلوت میں پناہ گزین ہو گئی۔ شاید میرے سامنے میرا بچپن آ گرا تھا۔ میں نے شیشے کے روزن سے باہر دیکھا۔

کھیل کے میدان میں بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔

نعرہ

ارشد میر

نعرہ نسلِ انسانی کے لیے جوہرِ تابدار ہے، جس نے عظمتِ انسانی کو چار چاند لگانے میں حیرت انگیز کارنامے سر انجام دیئے ہیں۔ قدرت نے مبداءِ فیض سے پرندوں، چرندوں اور درندوں کو چہچہانے، غرّانے، چنگھاڑنے حتیٰ کہ دھاڑنے تک کا ملکہ عطا کیا ہے لیکن تادمِ تحریر نعرہ لگانے یا بنانے کا اعزاز نہیں بخشا۔ انسان غاروں سے نکل کر غباروں میں براجمان ہو گیا لیکن اس نے کسی مرحلہ اور مقام پر نعرے کو حرزِ جان بنانے میں بخل سے کام نہیں کیا۔ یوں لگتا ہے نعرہ اس کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ اگر کہیں بھولے سے اُسے نعرے کے مبارک ہاتھوں سے منہ کی بھی کھانا پڑی، تو اس نے اس وقتی اور عارضی زیاں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ بلکہ پوری لگن سے اس کی ترقی و ترویج کے لیے کوشاں رہا۔

نعرہ بازی بلاشبہ بہت بڑا آرٹ ہے۔ اس فن میں کمال حاصل کرنے کے لیے اچھی خاصی ریاضت کی ضرورت پڑتی ہے۔ مایہ ناز نعرے باز خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ ان دنوں تو بالخصوص ان کا اچھا خاصہ قحط الرجال ہے۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ درست ہوتے ہوئے بھی نعرہ سازی اس سے زیادہ مشکل کام ہے۔ چنانچہ تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھیں تو سریع الاثر، دیرپا اور مہذب نعرے انگلیوں پر ہی گنے جا سکتے ہیں۔ حیرانی کی بات ہے کہ جوں جوں زمانہ سائنس کی برکات سے ترقی کی منازل حیرت انگیز سرعت سے طے کرتا گیا علمی فکری نعرے ناپید ہوتے گئے۔ بلکہ بعض تو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیئے گئے۔ یا وہ شکستہ دل ہو کر ہمیشہ کے لیے داغِ مفارقت دے گئے۔ شاید اسی سے ملتی جلتی صورت حال کو بھانپتے ہوئے اقبالؔ نے بہ تصرفِ ادنیٰ یوں کہا تھا۔

تہذیب کا کمال ہی نعروں کا ہے زوال

مقصود موازنہ نہیں فقط تاریخی حوالے سے یہ بتانا ہے کہ قرونِ اولیٰ کے خوش کُن نعرے موجودہ دَور کے جان گسل نعروں سے یوں بھی ہر لحاظ سے جاندار اور باوقار دکھائی دیتے ہیں۔ عہدِ حاضر کے نعرے گو پہلی نظر میں خاصے بارعب اور ظاہری ٹیپ ٹاپ سے مزیّن نظر آتے ہیں لیکن ذرا غور سے دیکھیں تو ان کی ہیئت ترکیبی مہمل تراکیب اور نامانوس الفاظ کے تار و پود سے بنی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے یہ نعرے اُونچی دوکان پھیکا پکوان کے مترادف بہرے سے بے جان اور پھسپھسے ہوتے ہیں جن کا صوتی اثر بھی نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو بھری بزم میں پورس کے ہاتھی ثابت ہو کر کئے کرائے پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ دوسری جانب جدید طبقہ پُرانے نعروں کو اپنانے سے بھی گریزاں ہے وہ بزرگوں کی ہر نشانی کو اپنانا کسرِ شان سمجھتا ہے۔ چنانچہ اسی گو مگو میں نعروں کی مارکیٹ کساد بازاری کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ کچھ نام نہاد ذہین و فطین لوگوں کی مستند رائے اس کے برعکس ہے وہ سمجھتے ہیں کہ تحریر و تقریر پر تعزیر کے بے پایاں خوف و خطر نے اس فن کو گہنا دیا ہے۔ صورت حال کچھ بھی ہو یہ مسئلہ قدرے ٹیڑھا بلکہ ایک لحاظ سے پیچیدہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے مصلحت اندیشی کا تقاضا ہے کہ کنّی کترا کر اپنی راہ لی جائے۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

میں ذاتی طور پر نعرے کی فضیلت کا دل و جان سے معترف ہوں۔ نعرہ لگانے سے گھبراتا نہیں ایک لحاظ سے اسے فرضِ منصبی سمجھتا ہوں، کیونکہ بر محل

نعرہ لہو گرم رکھنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے اور پلٹنے جھپٹنے اور جھپٹ کر پلٹنے میں بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے بالخصوص رگوں میں خون کو بگٹٹ دوڑانے کی وجہ سے عارضۂ قلب سے بچاتا ہے اور پھر کسی مقصدِ جلیلہ کے حصول کے لیے فضا تیار کرنے کرانے میں بھی بڑا ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اول الذکر خصوصیت کے لیے تو خیر ہر سکہ بند ڈاکٹر سرٹیفکیٹ جاری کرنے کو تیار ہے جب کہ مؤخر الذکر خوبی کو بھی شاید کوئی مؤرخ جھٹلا نہیں سکتا کہ ہر قابلِ ذکر تحریک کے پس منظر میں نعرہ پورے کرّ و فر سے تب و تاب جاودانہ کے جلو میں جلوہ فگن دکھائی دیتا ہے۔ دُور جانے کی چنداں ضرورت نہیں، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے لے کر تشکیلِ پاکستان تک کی ان تھک جدوجہد اور مسلسل تگ و دَو کے دوران لگائے گئے فلک شگاف نعرے ہماری ملی تاریخ کا روشن باب ہیں۔ باور کریں کہ یہ انہی حیات افروز اور ولولہ انگیز نعروں کا فیضان ہے کہ برصغیر کی مایوس اقوام و ملل میں اک ولولۂ تازہ اور جنوں خیز تڑپ پیدا ہوئی، جو بالآخر باطل قوتوں کو سرنگوں کر کے آزادی سے ہمکنار کرنے کا سبب بنی۔

نعرہ فطرتاً سیمابی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ بعض اوقات حالات کی پیداوار ہوتا ہے اور کبھی مرتبہ حالات کو ایک خاص ڈگر پر لے جانے کے لیے بھی اُسے بکمال ہنرمندی وضع کیا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو "آمدی" اور "آوردی" نعرے اپنی اپنی کمین گاہوں میں اٹین شن دکھائی دیتے ہیں کہ اشارہ ملتے ہی طوطے کی طرح توپ یعنی نعرے کا گولہ داغ دیں۔ اور رونقِ محفل کا سامان پیدا کر دیں۔ مزید وضاحت درکار ہو تو "آمدی" طرز کا نعرہ خود رَو پھول سے مشابہ نظر آتا ہے جبکہ دوسرے انداز کے نعرے کو پلاسٹک کے پھول سے تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ وہ نعرہ جو ذہنِ رسا میں وارد ہو کر وردِ زباں ہوتا ہے بعض اوقات جنگل کی آگ کے مانند پھیل جاتا ہے۔ جبکہ سوچی سمجھی اسکیم اور منصوبہ کے تحت بنایا گیا نعرہ محدود حلقے میں رہ کر اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ کوئی منحوس لمحہ ہو تو جاندار نعرہ بھی تولّد ہوتے ہی رختِ سفر باندھ لیتا ہے جب کہ شبھ گھڑی میں تراشا گیا درمیانے درجے کا نعرہ بھی صدیوں تک اپنی آن بان سے قائم دائم رہتا ہے۔

وہ لوگ جو نعروں کی افادیت اور اہمیت کے منکر ہیں ان کے مبلغِ علم میں اضافہ کی خاطر اتنا ہی بتا دینا کافی ہے کہ بعض نعرے جغرافیہ دانوں کی راہنمائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ معدودے چند نفسیاتی اور فلسفیانہ موشگافیوں سے عبارت ہوتے ہیں جبکہ کئی زیرِ جنگ اور دبنگ نعرے اقتصادیات اور سیاسیات کے خوشہ چینوں کے لیے خضرِ راہ ثابت ہوتے ہیں، ایک وہ ہیں جو دریوزہ گری کی راہ سجھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی کوئی کھچاؤ اور تناؤ کا منبع بننے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ایک بلڈ پریشر کا پیش خیمہ بنتے ہیں تو دوسرے نروس سسٹم بریک ڈاؤن کا تیر بہدف علاج ہیں۔ بلکہ بعض تو دلوں کو لبھانے کی چاشنی بھی عطا کرتے ہیں۔ یہی نہیں چند نعرے تو خود غرضی اور مطلب براری کا مخزن بھی قرار پا چکے ہیں۔ پھر ان میں مثبت اور منفی دونوں رویّوں کو اپنانے کا خداداد ملکہ بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک نعرہ اقتدار کے نشہ کو ہوا دیتا ہے تو دوسرا لامحالہ اس کو ہرن کرنے کی صورت پیدا کر دیتا ہے۔ خواہ شاعر نعرہ کو برملا کہنا پڑے۔

نعرہ لگا کے ہوش میں آئے تو کیا ہوئے

کسی مفکر کا قول ہے کہ لمس کے بعد سماعت کے حوالے سے نعرہ سننا ایک عظیم انسانی اور سماجی حس ہے لیکن یہ حسِ سماعت سراسر نجی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی شعور سے بہرہ ور ہے چنانچہ کوئی مانے یا نہ مانے نعرہ جلوسوں کو ایٹمی توانائی عطا کرتا ہے، جلسہ گاہ کی رونق کو دوبالا کرتا ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو جلسوں اور جلوسوں کے لیے نعروں کی وہی حیثیت ہے جو نکاح کے لیے چھوہاروں کی ہوتی ہے۔

نعرے میں یہ وصف بھی بدرجۂ اتم موجود ہے کہ وہ اپنی گونج میں مبتدی خطیب کو بھی اک نئی امنگ اور ترنگ سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس کی شہ پر ممولہ شاہباز سے ٹکر لینے میں بھی کوئی خفت محسوس نہیں کرتا۔

نعرہ سٹیج کے اسرار و رموز سے ہی واقف نہیں بلکہ ٹیبل ٹاکرز کا راز داں اور معتمدِ خاص بھی ہے۔ لیکن یہاں یہ اپنا چولا وقتاً فوقتاً بدلتا رہتا ہے۔

چنانچہ اکثر دیکھنے سننے میں آیا ہے کہ اجل ٹیبل ٹاکرز اپنے جلو میں چیلے چانٹے بٹھا کر بھانت بھانت کے نظریات کے مخصوص نعروں کا درس دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ان میں سے ہر ایک کا ساؤنڈ بکس در آمدی ہے اور وہ اپنی طے شدہ لائن پر ہی سوچوں کی تیز گام رواں دواں رکھتے ہیں۔ صورت حال بگڑتی دکھائی دے تو پھر انڈر گراؤنڈ جانے کا نعرہ لگا کر سب سے پہلے خود رُوپوش ہوتے ہیں نئے نئے حواری تو ان نعروں کو لگانے اور دوسروں کو ہمنوا بنانے میں اچھے خاصے مخلص ہوتے ہیں لیکن جن کی عمر اس دشت کی سیاحی میں ہی گزر گئی ہو وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل کر نعروں کے برانڈ تبدیل کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

ذرا غور کیا جائے تو نعروں کی صحیح آماجگاہ برّاعظم ایشیا کو گردانا جاتا ہے اس خطہ سے بنائے بلکہ چلائے ہوئے لاجواب نعروں اور پھر ان کے مابعد اثرات کی ایک دنیا معترف ہے البتہ اہلِ یورپ اب نعروں سے اچھے خاصے الرجک ہیں۔ اُن کا موقف ہے کہ نعرے بنانے اور چلانے والے کبھی چاند پر نہیں جا سکتے۔ ستاروں پر کمندیں ڈالنا ان کے بس کا روگ نہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ جو زبانی کلامی نعروں کے کٹر مخالف نظر آتے ہیں گاہے گاہے اپنے حق میں سازگار ماحول نعرے لگوانے کے لیے بنا ہی لیتے ہیں۔ وہ ان نعروں سے لاکھ لاتعلقی کا اظہار کرتے رہیں لیکن دیکھنے والے بھی تو قیامت کی نظر رکھتے ہیں جو انہیں بڑی چابک دستی سے موقع محل کی مناسبت سے آئینہ دکھا کر دم بخود کر دیتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات نعروں کو کوئی اہمیت نہ دینے والے ایک آدھ جاندار نعرے کو سُن کر ہی بوکھلا جاتے ہیں۔ چنانچہ تیسری دنیا کے دلفریب، جاذبِ نظر اور حقیقت پسندانہ نعرے نے اچھی خاصی بے چینی پیدا کر دی ہے۔ اسی طرح غیر جانبدار ممالک نے پورے شدّومد سے اپنی بقا کے لیے جو زوردار نعرہ براڈ کاسٹ کیا تو اس سے بھی کئی ایوان لرز اُٹھے ہیں۔ ویسے نار وا اور کھوکھلے نعروں کے تو ہم بھی حق میں نہیں ہیں۔ البتہ روحانی اور شیطانی نعرے تو خیر روزِ اوّل سے ہی ستیزہ کار رہے ہیں۔ جب کہ تاریخ عالم میں قم باذنی، انا الحق اور لاتذر جیسے مقدس، پاکیزہ اور مستانہ وار نعروں نے سوچ کے دھاروں کو ایک نئی ڈگر اور سمت عطا کی ہے۔

آج کا نعرہ رائج الوقت امنِ عالم کی تلاش و جستجو ہے جو بظاہر ایک حسین سا خواب ہے بلکہ سراب سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ البتہ تیسری عالمگیر جنگ کا نعرہ ایک عرصہ سے اچھا خاصہ ذہنی کھلبلی کا باعث بنا ہوا ہے۔ اس نعرے کی چنگاری عرصۂ دراز سے سلگ رہی ہے۔ خدا کرے شعلۂ جوالہ بننے سے پہلے ہی بھسم ہو جائے۔ ویسے یار لوگ اس کا تدارک بھی امن کے نعروں کو سٹیکرز کے ذریعہ کپڑوں پر لگا کر اور گاڑیوں پر سجا کر کرتے رہتے ہیں۔ کچھ عرصہ سے بین الاقوامی فیملی اور بین الاقوامی زبان کے نعرے کی بھی اچھی خاصی پذیرائی ہوئی ہے۔ لیکن غیر مساویانہ سلوک، نفرتوں کی تقسیم، متضاد نظریات، برتری اور فوقیت کی جنگ کی موجودگی میں سرِدست ان کا مستقبل کوئی زیادہ روشن دکھائی نہیں دیتا۔ تاہم اندرونی اور بیرونی نعروں کا یہ اعجاز ضرور ہے کہ ہم خوش فہمی کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں، بلکہ دشمن کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیرنے کے لیے ہتھیاروں کی بجائے نعروں پر ہی ایمان رکھتے ہیں۔ اور بلند بانگ نعروں کی بدولت سلوگن زدہ (نعرہ باز) معاشرے کی پیداوار ہو کر رہ گئے ہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اب تو حکومتیں چلتی ہی نعروں کی بدولت ہیں۔ بلکہ ہر بار الیکشن کے موقع پر باضابطہ نعروں کے سیل بنا کر نئے نئے نعرے دے کر قوموں کو سُندر سپنوں میں اسیر کر دیا جاتا ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کی خاطر پیشہ ور نعرہ بازوں کی ایڈوانس بکنگ سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔

نعرہ انسان کے باطن کا لاشعوری اظہار ہے۔ کسی اچانک انکشاف یا عرفان کے موقعہ پر یہ انسانی حیرت کے بے محابا اظہار کی ایک حسین کاوش ہے۔ ارشمیدس نے یونہی تو یوریکا! یوریکا! کا نعرہ نہیں لگایا تھا۔ میں اس قسم کے نعروں کو سراسر تخلیقی قرار دیتا ہوں۔ البتہ جب خلقِ خدا ایسے کسی نعرہ کو فیشن کی طرح اپنا کر پست سطح پر لے آتی ہے تو ہر چند اس کا حلقۂ اثر وسیع ہو جاتا ہے مگر اس کی ندرت اور تازگی باقی نہیں رہتی۔ تقلیدی نعرہ بازی بہر حال کی ایک صورت ہے جب کہ تخلیقی نعرہ بازی کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کسی اعلیٰ پائے کی نظم یا مصوری کے کسی شاہکار کو ہوتی ہے بلکہ میں تو یہ تک کہوں گا کہ جب

کوئی شخص دعوتِ شیراز اڑانے کے بعد سیرابی کی سہانی کیفیت کی ایک نعرۂ مستانہ کی صورت میں تشہیر کرتا ہے تو اس کا یہ اقدام بھی سراسر تخلیقی ہے جب کہ کھانا کھانے کے بعد اظہارِ تشکر کا رٹا رٹایا انداز تقلید اور تتبع کے تحت شمار ہوتا ہے۔ نعرہ اور قہقہہ ـــــ دونوں جذبے کے اچانک لیکن طوفانی اظہار کی صورتیں ہیں بالکل جیسے دریا بند کو توڑ کر بہہ نکلے۔ مگر دونوں میں فرق بھی ہے۔ قہقہہ جذبے کے اخراج کا بندوبست کرتا ہے جب کہ نعرہ جذبے کو بلندیوں کی طرف اچھال کر اس کو صَرف کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔ ایک کا مقصد جذباتی تشنج کو رفع کرتا ہے۔ دوسرے کا مقصود جذبے کے طوفان سے نئی راہیں تراشتا ہے۔ دونوں میں کتنا بنیادی فرق ہے!

رشید امجد کے افسانوں کا تازہ مجموعہ

پت جھڑ میں خود کلامی

چھپ گیا ہے

صدائے بازگشت

سلیم آغا قزلباش

اپنی آواز ہر کوئی سننا چاہتا ہے، خصوصاً آج کے زمانے میں ہر کسی کی یہ دلی آرزو ہے کہ اُس کی آواز سب سے نرالی اور زوردار ہو۔ چنانچہ اکثر لوگ مختلف اندازِ تخاطب اختیار کرتے ہیں بلکہ کچھ منچلے تو آئینے کے رُو برو کھڑے ہو کر آواز کی اونچ نیچ کو چہرے مُہرے پر نمودار ہونے والے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ تال میل دینے کی خاطر گھنٹوں مشقِ سخن بھی کرتے ہیں۔ اس پر ریڈیو، لاؤڈ اسپیکر اور ٹیپ ریکارڈر جیسی ایجادات نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے اور آواز کا سحر گلی گلی پھیلنے لگا ہے، مگر ان تمام ذرائع سے پیدا ہونے والی آواز یک طرفہ نوعیت کی ہے، لوگ عموماً اسے ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دینے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ یوں بھی آوازوں کی کئی قسمیں ہیں مثلاً کرخت آواز جو کسی وحشی کی صورت کو آنکھوں کے سامنے لے آتی ہے یا پھر ملائم آواز جو مادرانہ شفقت سے لبریز ہوتی ہے اور جسے سن کر آنکھوں میں نیند کے ڈورے گہرے ہونے لگتے ہیں۔ ایک آواز ایسی بھی ہے کہ کان میں پڑتے ہی آنکھوں کو پُرنم کر دیتی ہے۔ دوسری طرف ایک پھٹی ہوئی آواز بھی اپنا وجود رکھتی ہے جس کی سمع خراشی سے آدمی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ البتہ ایک آواز ایسی سُریلی اور رسیلی بھی ہے کہ جسے سنتے ہی بلڈ پریشر سہ چند ہو جاتا ہے اور دل کی دھڑکنوں میں جوار بھاٹا آ جاتا ہے۔ بہر حال جتنے منہ ہیں اتنی ہی آوازیں بھی ہیں اور یہ آوازیں دماغ میں پیدا ہونے والی گم صم آوازوں کے اعلانیہ اظہار کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتی ہیں۔ مگر ان تمام آوازوں میں وہ سحر انگیزی اور گھمبیرتا موجود نہیں ہے جو پہاڑوں سے ٹکرا کر پیدا ہونے والی صدائے بازگشت میں موجود ہے۔ ہر چند کہ صدائے بازگشت بڑے بڑے گنبدوں والی عمارات میں بھی سنی جا سکتی ہے مگر وہاں اُس کا دم کچھ گھٹا گھٹا سا لگتا ہے اور اس میں بے زنجیر فطرت سے براہِ راست متصادم ہو کر جنم لینے والی آوازِ بازگشت کی سی آزادہ روی کا فقدان محسوس ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کی ذات اندھے کنوئیں کی طرح ہوتی ہے اور جب کوئی انہیں باہر سے پکارتا ہے تو اس کی آواز کنوئیں کی دیواروں کے اندر ہی اندر ٹکراتی سر پٹختی پاتال میں اتر جاتی ہے، آگے سے اسے کوئی جواب نہیں آتا، لیکن اگر کوئی ایسا شخص آواز دے جس کی ذات ازلی و ابدی سچائی کے ذائقے سے آشنا ہے تو اس کی آواز سنتے ہی زمان و مکان لرز اٹھتے ہیں اور پھر اس آواز کی بازگشت قرنوں تک سنائی دیتی رہتی ہے۔ اسی لیے مجھے تمام پہنچے ہوئے انسان عزیز ہیں کہ وہ صدائے بازگشت کو متحرک کرتے ہیں اور یہ صدا پھر آخری سانسوں تک ان کا پیچھا کرتی ہے اور انہیں کسی قیمت پر بھی گمنامی کی موت نہیں مرنے دیتی بلکہ ان کے گزر جانے کے بعد بھی اُن کی گواہ بن کر سنائی دیتی رہتی ہے۔

صدائے بازگشت کی خوبی صرف یہی نہیں ہے کہ وہ صدا لگانے والے کی آواز کو چند لمحوں کے بعد بغیر نفع و نقصان کے لوٹا دیتی ہے (کیونکہ لوٹانے کو تو لوگ قرض بھی لوٹا ہی دیتے ہیں چاہے اس نیک کام کے لیے انہیں کسی دوسرے شریف آدمی سے اُدھار ہی کیوں نہ لینا پڑے) بلکہ وہ تو اس میں ایک نئے اُفق کا اضافہ بھی کرتی ہے اور پکارنے والے کو اُس کی اپنی آواز کی ماہیت سے آگاہ بھی کرتی ہے۔ گویا صدائے بازگشت روح کی پکار ہے، جسم کا کیا ہے! یہ تو مٹی کے تودے کی طرح ایک جگہ ساکت و صامت رہتا ہے جبکہ آواز تمام رکاوٹوں کو عبور کرتی اپنی آخری سرحدوں تک جا پہنچتی ہے۔ لہٰذا وہ لوگ جو ساری

زندگی دوسروں کو مدد کے لیے پکارتے رہتے ہیں۔ دراصل ایسے کم ہمت اشخاص ہیں جنہیں اپنی آواز پر بھروسہ نہیں ہوتا، بلکہ کچھ مدت گزرنے کے بعد انہیں اپنی سماعت پر بھی بھروسہ نہیں رہتا، جس کے نتیجے میں انہیں دوسروں کے آلۂ گوش پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ جو اس معاملے میں دوسروں پر انحصار کرتا ہے اس کی کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ لوگ اپنے من مندر میں کھڑے ہو کر خود کو آواز دیں تو ان کی ذات کے گم شدہ حصے آگے سے لبیک ضرور کہیں گے۔ سو لبیک کہنا اس صدائے بازگشت کا اعتراف ہے جو کروڑہا دلوں میں آج بھی گونج پیدا کر رہی ہے۔ البتہ بیابان اور دشت میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے منہ سے جو صدا نکلتی ہے وہ بہت جلد ویرانیوں اور مہیب تاریکیوں میں ایک دردناک پکار بن کر گم ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی آواز دینے والا سوختہ جاں بھی سدا کے لیے کھو جاتا ہے، جبکہ پہاڑوں کے دامن میں جنم لینے والی آواز خود کو حرفِ مکرر کی طرح سنائی دیتی ہے گویا یہ اپنے مستقر سے ناطہ منقطع نہیں کرتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہونٹوں کی فصیلوں کو توڑ کر، پہاڑوں اور گنبدوں سے ٹکرا کر "صدائے بازگشت" کے روپ میں ڈھلنے کے درمیان جو "معمولی وقفہ" آتا ہے وہ کیا شے ہے؟ میرے خیال میں یہ وقفہ اندر کی آواز اور باہر کی آواز میں موجود فاصلے کو اجاگر کرتا ہے۔ یہی نہیں یہ تو اس نقطۂ مکانی کی نشاندہی بھی کرتا ہے جو زمان تسلسل کے بیچ نقطہ ایک لمحے کی صورت میں نازل ہوا مگر جس میں زندگی کا آغاز، ارتقاء، عروج و زوال سب کچھ شامل تھا۔ گویا ہماری ساری زندگی اور اس کی کتھا کہانی صرف اُس "وقفے" کا دوسرا نام ہے جو وقت کے کائناتی پیمانے میں اتنی کم مایہ حیثیت کا حامل ہے کہ بالفرض آواز کے ٹکرا کر پلٹنے میں ایک پل کا مزید اضافہ ہو جائے تو شاید جب وہ آواز گونجے تو اُسے آگے سے سننے والا کوئی ذی روح اس صفحۂ ہستی پر سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ اس لیے صدائے بازگشت سننا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ذات کے اندر کی صدائے بازگشت کو آخر سنا کس طرح جائے! اس ضمن میں لوگوں نے کئی طریقِ کار اپنا رکھے ہیں، کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ رنگوں میں مضمر ہے چنانچہ وہ عمر بھر اسے رنگوں میں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ صدائے بازگشت سنگ میں قید ہے چنانچہ وہ سنگِ مرمر سے کر سنگِ خارا تک اس آواز کا اندھا دھند پیچھا کرتے ہیں اور رسائی نہ پانے کی صورت میں کسی نہ کسی لوح سے اپنا یا دوسرے کا سر پھوڑ ڈالتے ہیں۔ چند ایک حضرات اسے موسیقی کے تاروں میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کا سازِ ہستی بیچ ہی میں کہیں اکھڑ جاتا ہے اور سازندوں کو کانوں کان خبر نہیں ہو پاتی۔ اسی طرح کوئی ـــــ کلامِ موزوں میں اسے ڈھونڈ نکالنے کی جستجو کرتا ہے اور ایک نہ ایک دن حرفِ غلط کی طرح بیاضِ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ غرضیکہ ہر کوئی اپنے اپنے فن میں صدائے بازگشت ایسی تاثیر پیدا کرنے کا خواہاں ہے تاکہ رحلت فرمانے کے بعد بھی اُس کی خبر آتی رہے گویا وہ مر کر بھی زندوں کا دامن چھوڑنا نہیں چاہتا، ہٹ دھرمی کی انتہا ہے! اگر یہ کہا جائے کہ جس طرح ہر شخص کا ماضی اس کی صدائے بازگشت ہے بالکل اسی طرح ہر قوم کی تاریخ اس کی صدائے بازگشت ہے تو بے جا نہ ہوگا بلکہ جو قوم اس صدائے بازگشت پر کان دھرتی ہے وہ آگے چل کر بہتر راستے تلاش کرنے میں بھی کامیابی حاصل کر لیتی ہے لیکن عموماً اس صدائے بازگشت سے سبق کم ہی سیکھا گیا ہے۔ ویسے ایک بات ہے! اپنی صدائے بازگشت سننا ایک غیر ذاتی عمل بھی تو ہے اور جو قلم کار اپنے صریرِ خامہ کو نوائے سروش میں بدل کر اس پر غیر جانبدارانہ نگاہ ڈالنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ اپنی تحریر کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی لگا سکتا ہے لیکن چونکہ دُور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں اس لیے اپنے خیالات عموماً مترنم گھنٹیاں جان پڑتے ہیں لیکن اُن کا بھرم اُس وقت کھلتا ہے جب یہ شائع ہو کر منظرِ عام پر آتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو صدائے بازگشت پیدا کرنے کا عمل باز آفرینی کے عمل کے مماثل ہے اسی سے فن بھی جنم لیتا ہے، فن پارہ بھی اور فن کار بھی!

کوہِ ندا بھی درحقیقت کسی پُراسرار ہستی کی صدا نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے اپنے ہی مرتعش وجود کی صدائے بازگشت ہے، اگر جب یہ دُور سے پلٹ پیچھے رہ جانے والے وجود کو پکارتی ہے تو یہ وجود سانس لیے بغیر اس نوا کے تعاقب میں بھاگ کھڑا ہوتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے کوہِ ندا کی دوسری طرف اُتر جاتا ہے۔ ہاتفِ غیبی کا یہ بلاوا گم گشتہ راہرو کو کب سنائی دے گا، کسی کو معلوم نہیں ہے کیونکہ یہ ایک بھید ہے اور بھید اتنی آسانی سے نہیں کھلا کرتے

بلکہ اب تو مجھے یوں بھی محسوس ہونے لگا ہے کہ ناموجود سے موجود کی طرف سفر کا آغاز، ایک بے ہیئت، بے سمت، بے کنار صدا کی صورت میں ہوا تھا، ایک ایسی صدا جو اپنی ہی صدا کے تعاقب میں تھی اور پھر ایک نامعلوم لمحے میں یہ اپنے آپ سے ٹکرائی اور لرزہ خیز دھماکے کے ساتھ ایک سے دو میں تقسیم ہو گئی اور یوں اس نے اپنے الگ وجود کا ادراک کیا اور پھر یہیں سے یہ سلسلہ در سلسلہ، صدا اندر صدا بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی اور آج تک پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ سو اگر یہ کہا جائے کہ جب ملے کسی کی ذات حالتِ جذب میں مبتلا ہو کر ایک خاموش صدا کو سننے لگتی ہے تو اس میں ایک ایسی گھمبیرتا پیدا ہو جاتی ہے جو کسی نے اس سے پہلے کہیں دیکھی سنی نہیں ہوتی۔ لہٰذا سارے علوم و فنون اس صدائے بازگشت کی ماہیت کو جاننے میں دن رات ایک کئے ہوئے ہیں جو نجانے کب اپنے جوہر سے نکل کر اپنے وجود کی کھوج میں روانہ ہوئی تھی اور جو ایک نہ ایک دن اپنے وجود کو لے کر لوٹ آئے گی، لیکن اس کی واپسی کس شکل میں ہو گی اور یہ کیسے سنائی دے گی یہ آنے والا وقت ہی بتا سکے گا۔ فی الحال آدمی خود اپنی تلاش میں سرگرداں ہے اور اس تلاش نے اسے دَر دَر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا ہے لیکن یہ باز پھر بھی نہیں آیا، بلکہ جب اسے ارض پر اپنا آپ نہ مل سکا تو اس نے فلک کی طرف اڑان بھری اور اب یہ خلا اندر خلا خود کو ڈھونڈ رہا ہے مگر وہ کتنا بھولا ہے اُسے اتنا بھی علم نہیں کہ یہ سارا جہانِ ہوش ربا اور یہ ساری خلقِ خدا اُسی صدائے بازگشت کا ایک رُوپ ہے جو صداء کُن کے جواب میں نمودار ہوئی تھی لیکن جو آج تک بے آواز ہے۔ البتہ کسی روز یہ صدائے بازگشت صُورِ اسرافیل بن کر پلٹے گی تو پھر شاید اُسے اس کے وجود کی خبر ہو سکے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری چار دن کی زندگی فقط "کُن" اور "فیکون" کے درمیانی وقفہ کا نام ہے۔ کیا واقعی؟

وزیر آغا کی نظموں کا پہلا مجموعہ

شام اور سائے

(دُوسرا ایڈیشن)

قیمت ۳۰ روپے

ناشر: مکتبہ اُردو زبان ریلوے روڈ سرگودھا۔

غریب آدمی

طارق جامی

دنیا کا پُر امن ترین شخص، غریب آدمی ہوتا ہے۔

دنیا اس لمحے جس بے سکونی، بد امنی اور افراتفری کا شکار ہے، اُس کا صرف اور صرف ایک ہی علاج ہے، اور وہ ہے غربت۔ اگر دنیا بھر کے لوگو کو غریب سے غریب تر کر دیا جائے تو دنیا کی اس بے سکونی بے اعتدالی اور بے ڈھنگے پن کا یکسر خاتمہ ہو سکتا ہے۔

غریب آدمی ہمیشہ ایسے طبقے اور حلقے سے ہوتا ہے، جس کے وسائل کم ہونے کے سبب مسائل بھی کم ہوتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ غریب آدمی کے مسائل ہوتے ہی نہیں۔ لیکن اگر کبھی کوئی مسئلہ سر اٹھائے بھی تو اُس کے پاس اس کا اپنا شافی علاج ہوتا ہے۔ لیکن ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے ہاں اعتما کی کمی ہونے کی وجہ سے آگے بڑھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اُس مسئلے کو اپنے طور پر خود حل کر لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو، اُس کا مسئلہ کسی بھی صورت اُس سے آگے نہیں بڑھنے پاتا اور اگر کسی شخص کا مسئلہ ہی اتنا محدود ہو کر خود اُس شخص کی ذات سے آگے نہ بڑھ سکے تو بھلا وہ کس بد امنی اور بے سکونی کا شکار ہو گا۔

غریب آدمی کی سوچ محدود ہوتی ہے اور خواہشیں مختصر ہوتی ہیں۔ لہٰذا اُس کی زندگی کا دائرہ بہت ہی سمٹا ہوا ہوتا ہے۔ خواہشیں مختصر ہونے کے سبب اُس کا ذہن کبھی اپنے قدرے اونچی بات نہیں سوچتا۔ اُس کی علمیت اِسی بنا پر محدود رہتی ہیں اور یوں وہ اپنی مختصر علمیت اور کوتاہ نظری کے باعث کسی نئی بات کا تقاضا نہیں کرتا۔ اُس کا کوئی مطالبہ کسی کے لیے پریشانی کا کارن نہیں بنتا۔ غریب آدمی اسی طور کسی قسم کے تجربے کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ ایسے کسی بھی معرکے سے اسی لیے دُور رہتا ہے کہ وہ اسے بازیچۂ اطفال سمجھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ امیر لوگوں کے ہاں بازیچۂ اطفال ہی کارنامہ بن جاتا ہے جو بد امنی اور افراتفری کا باعث بن سکتا ہے جبکہ غریب آدمی ایسے جھگڑوں سے کوسوں دُور رہ کر اپنی زندگی کے مخصوص قطر میں اپنی "اوقات" کا خیال رکھتا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ "اوقات" کی واحد جمع اور تذکیر و تانیث کا فرق امیر آدمی کو غریب آدمی سے الگ کرتا ہے۔

غریب آدمی کی زندگی میں کوئی رنگینی بہار نہیں ہوتی، کسی جولانیٔ طبع کو اُس کے شباب میں داخلہ نہیں ملتا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اُس کی زندگی میں جوانی آتی ہی نہیں۔ بچپن آتا ہے جو عام بچپن سے کم عمر ہوتا ہے یا پھر بڑھاپا آتا ہے جو عام بڑھاپے سے زیادہ طویل ہوتا ہے اور بس۔ اُس کی زندگی اُتار چڑھاؤ اور عروج و زوال سے بے نیاز ہوتی ہے اور ایک ہی پگڈنڈی کی مانند گاؤں گاؤں گزرتی کسی ویران سے قبرستان کے پچھلے سرے پر ختم ہو جاتی ہے۔

غریب آدمی کبھی اختلاف نہیں کرتا۔ خودی کے موضوع پر گفتگو نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ اونچا بھی نہیں بولتا۔ جس دن ان میں سے کچھ بھی کرنے لگے، سمجھ لیجیے کہ اُسے کچھ ہو گیا ہے، وہ غریب نہیں رہا۔ اُس کی خوشیاں تو بہت چھوٹی ہوتی ہیں۔ اُس کی مسرتوں کا مدار بہت بھی تنگ ہوتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر وہ بہت زیادہ خوش ہو جاتا ہے۔ وہ کوئی بنگلہ نہیں چاہتا، کار نہیں مانگتا، جہاز کی طلب نہیں کرتا اُسے تو بھرے ہوئے سگریٹ کے دو کش کافی ہوتے ہیں، کمر پر ہاتھ

پھیر کر ادا کیے گئے، وہ بھٹکے ہی بہت ہوتے ہیں۔ وہ ہوشیاری سے کوئی کام نہیں کر سکتا بلکہ ہر کام کو چونکہ عقل اور اصول کے تحت کرنے کی کوشش کرتا ہے، لہذا اپنی ہی عقل کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ بھلا ایسے آدمی سے کسی فتنے یا شورش کی توقع کرنا کم فہمی نہیں تو کیا ہے؟

امیر آدمی کے پاس وقت کی کمی نہیں ہوتی اور آسائشوں کی طرف سے بھی اُس کا ہاتھ تنگ نہیں ہوتا لہذا وہ جب اور جہاں چاہتا ہے حسب خواہش دندناتا پھرتا ہے۔ لیکن غریب آدمی کی مصروفیات اپنے دائرے میں اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ اُسے دنیا کی بدامنی اور سکون کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی میسّر نہیں ہوتی۔ یہی معاش کی بدمعاشی ہے کہ غریب آدمی جوانی میں غریب الوطنی پر مجبور ہو جاتا ہے اور ہجرت کے اجر میں چند اچھے دنوں کی آرزو رکھتا ہے مگر غریب آدمی ہمیشہ غریب ہی رہتا ہے۔ اُس کے لیے ہجرتیں اور طویل سفر بھی وسیلۂ ظفر نہیں بنتے اور جب وہ بوڑھا ہو کر لوٹتا ہے تو اپنے ہی گھر میں جلاوطن ہو کر رہ جاتا ہے۔ اُس کے طور اطوار کوئی پہچان نہیں پاتا اور اُس کے گھر والوں کے رسم و رواج اُس کے لیے ناقابلِ فہم ہو چکے ہوتے ہیں لہذا اُسے اپنے گھر میں پردیسی کی حیثیت سے رہنا پڑتا ہے اور یوں اُس کی زندگی کے دونوں رُخ غریبی کی نذر ہو جاتے ہیں۔

تہذیب و ثقافت، جسے لوگ کتابوں، جلسوں اور شہر کی بڑی بڑی کالونیوں کے ڈرائنگ رومز میں سجائے رکھتے ہیں، دراصل اپنی تہذیب اور ثقافت کی پیروڈی ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے نئی تراش کے لباس، نئے فیشن کی تقاریب، نئے لہجے کی زبان، نئے انداز کی ملاقاتیں اور نیا رہن سہن سب کچھ ایک نیگیٹو کی حیثیت سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا — وہ جب ان بنگلوں میں آتے ہیں تو یہ سب کچھ اُن کی تہذیب کا حصّہ بن جاتا ہے۔ اور جونہی وہ ان بنگلوں سے نکال باہر کر دیئے جاتے ہیں اور انہی کالونیوں کے عقب میں کچے پکے مکانوں میں آ رہتے ہیں تو اصل تہذیب و ثقافت اُن سے گلے آ ملتی ہے۔ اصل زبان، صحیح لہجہ اپنی حیثیت کی تراش خراش، اوقات کے مطابق تقاریب اور زندگی کی جیتی جاگتی مشکلات اِنہیں اپنے مرتبے اور اپنی اقدار سے ہم آہنگ کر دیتی ہیں۔

لیکن تہذیب و ثقافت کا یہ خمیر غریب آدمی کی مستقل متاع ہوتی ہے۔ وہ زندگی بھر جس سطح پر رہتا ہے، زندگی کے اُس جاندار مظہر کو دل و جان سے لگائے رکھتا ہے۔ امیر لوگ جن اعصابی امراض کا مستقل شکار ہوتے ہیں، غریب آدمی اُن سے سدا محفوظ رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کمزور لمحے اس پر غالب نہیں آتے اور ہیجان اُس سے کوسوں دُور رہتا ہے۔ کھانسنے چھینکنے سے لے کر گانے رونے تک کے سبھی مراحل زندگی بھر اُس کی ہمراہی میں ایک ہی آہنگ سے روشن رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے غریب آدمی تہذیب و ثقافت کا اصل پاسبان ہے۔ جب بھی تہذیب و ثقافت پر کوئی بیرونی یلغار غلبہ پانے لگی ہے، غریب آدمی نے ہی آگے بڑھ کر اُسے روکا ہے اور اپنی آہنی خود اِرادی سے تہذیب و ثقافت کا تحفظ کیا ہے۔ یوں اگر غریب آدمی زندہ ہے تو تہذیب کے منوّر باب زندہ ہیں مگر جس دن غریب کے دن پھر گئے، سمجھ لیجیے کہ ہم اپنی ثقافت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ لہذا بہتر ہے کہ غریب آدمی کے دن نہ پھرنے پائیں!

دروازہ

تقی حسین خسرو

دروازے کی ایجاد، دیواروں کے خلاف آدمی کے ایک بہت ہی مفید ردِ عمل کا اظہار ہے۔ مفید اس اعتبار سے کہ اگر دروازے کی ایجاد کا خیال آدمی کے ذہن میں نہ آیا ہوتا تو ذرا غور کیجئے کہ ہم دیوار کی دوسری طرف دیوار کو پھلانگے بغیر کیسے جا سکتے ؟ ـــــ دیوار کو پھلانگنے کا عمل ہم میں سے بہت سوں کے لیے کچھ زیادہ خوش آئند ثابت نہ ہوتا کہ اس میں کبھی دائیں پاؤں اور کبھی بائیں پاؤں اور کبھی دونوں ہی پاؤں کی ہڈی کے ٹوٹ جانے کا امکان ہوتا۔ یوں بھی دروازے کے بغیر دیوار کیا اُس داستانی پرندے کے انڈے سے مشابہت نہ رکھتی جس میں دروازے کی تلاش نے سندباد جہازی کو اتنا تھکا دیا تھا کہ وہ اتنا اپنے کسی اور سفر میں نہیں تھکا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ وہ انڈہ اپنے حجم میں ناقابلِ یقین حد تک بڑا تھا۔ اتنا ہی بڑا کہ سندباد جہازی نے اسے کوئی عمارت خیال کیا تھا۔ اور پھر ـــــ وہ اس بیضوی عمارت کے گرد دروازے کی تلاش میں چکر کاٹ کاٹ کر تھک گیا تھا ـــــ اس کی تھکن کی زیادہ اہم وجہ دروازے کی تلاش میں اس کی ناکامی تھی۔ دیوار میں دروازے کی موجودگی آدمی کے لیے طویل سے طویل سفر کی تھکن کو بھلا دینے کا باعث ہوتی ہے کہ آدمی دروازے سے داخل ہو کر اپنے سفر کے منطقی نتیجے پر پہنچتا ہے۔ سچ پوچھئے تو دروازے کی موجودگی ہی آدمی کو سفر کی ناقابلِ بیان صعوبتوں کو سہنے پر آمادہ کرتی ہے۔ دیوار میں دروازہ نہ ہو تو آدمی سفر کرنا ہی ترک کر دے۔ اور اگر ایسا ہوا تو سفر کے زمینی، بحری اور ہوائی ذرائع اور کاروباری اعتبار سے بے انتہا خوش حال ٹریولنگ ایجنسیز اسی طرح خشک سالی کا شکار ہو جائیں جیسے بدنصیب افریقہ کی بارش سے محروم زمین! ـــــ ذرا دروازے کی اقتصادی اہمیت کا اندازہ تو کیجئے!

سب سے پہلا دروازہ جو مجھے یاد ہے وہ ہمارے گھر کا دروازہ تھا۔ یہ اس گھر کا دروازہ تھا جہاں میری بسم اللہ ہوئی تھی۔ بچے کی زندگی میں یہ عمر کا وہ دور ہوتا ہے جب وہ جبلّت کی بے ارادہ دنیا سے نکل کر، عقل، شعور، فکر اور ارادے کی دنیا میں داخل ہوتا ہے، گویا اس کے اندر موجود سپاٹ دیوار میں اب ـــــ ایک خوبصورت چوکھٹے والا دروازہ نمودار ہو چکا ہے اور وہ اس خوبصورت چوکھٹے والے دروازے میں بہ عجلت تمام داخل ہو کر گویا ایک عجائب گھر میں پہنچ گیا ہے۔ عجائب گھر جس کی ہر شے اس کے لیے بے انتہا پُر اسرار، ناقابلِ بیان حد تک دلچسپ اور بے انتہا رنگین ہے۔ یہ اور بات کہ یہی بے انتہا پُر اسرار، دلچسپ اور رنگین عجائب گھر زندگی کے بعد کے دور میں اس کے لیے گویا گنبدِ بے در ثابت ہوتا ہے اور وہ اپنی باقی زندگی اس سے باہر نکلنے کی کوشش میں صرف کر دیتا ہے۔

مَیں اپنے گھر کے جس دروازے کا آپ سے ذکر کر رہا تھا وہ ظاہر ہے کہ ہمارے گھر کا صدر دروازہ تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ باقی دروازوں سے نہ صرف سائز میں بڑا تھا بلکہ کسی قدر موٹا بھی تھا۔ یہ دو وزنی کواڑوں پر مشتمل ایسا دروازہ تھا جس کا روغن جگہ جگہ سے اُتر گیا تھا۔ مگر دروازے کی اس سال خوردگی کے باوجود اس کے یہ دو کواڑ قانونِ فطرت کے عین مطابق تھے کہ ہر شے جوڑوں میں پیدا کی گئی ہے۔ دو کواڑوں والا دروازہ ذہن میں پہلے سے موجود ترتیب اور توازن میں کوئی خلل پیدا نہیں کرتا۔ جب کہ ایک کواڑ والا دروازہ اس توازن اور ترتیب میں نہ صرف خلل بلکہ انتشار پیدا

کرنے کا باعث ہوتا ہے کہ اس کا مجرّد وجود قانونِ فطرت کی صریح خلاف ورزی کے مترادف ہے۔ اگر آپ غور کریں تو موجودہ دَور میں یہ جو انتشار ناہمواری اور بے ترتیبی آپ کو نظر آتی ہے وہ اِسی ایک کواڑ کے دروازے ہی کا نتیجہ ہے۔ کاش ہم لوگ اپنے اپنے گھر کے دروازوں سے اس غائب کواڑ کو تلاش کر کے اُسے جلد از جلد اس کی جگہ لگا دیں اور اس طرح قانونِ فطرت کی تعمیل و تکمیل کا اہتمام کریں اور اپنے چاروں طرف پھیلے انتشار سے نجات حاصل کریں۔
دراصل میں آپ سے اپنے گھر کے دو وزنی کواڑوں والے دروازے کا ذکر کر رہا تھا۔ اُس دروازے میں پڑی وزنی زنجیر اُس کے دونوں کواڑوں کو ایک عجیب رشتے میں منسلک کرنے کا باعث تھی، رشتہ جس میں رضا و رغبت بھی تھی اور جبر و اکراہ بھی! جیسے ازدواجی رشتہ! ـــــ گھر میں کیونکہ مَیں سب سے چھوٹا تھا شاید اسی لیے دروازے پر کوئی ہلکی سی دستک یا کوئی شائستہ کھٹکھٹاہٹ یا دروازے کی ہلکی سی جنبش بھی میرے پہلے سے بیدار حواس میں ایک زبردست ہلچل پیدا کر دیتی تھی۔ اور میں گویا ہوا کے دوش پر سوار دروازے کی جانب روانہ ہو جاتا تھا۔ مگر اب خیال ہوتا ہے کہ اس کی وجہ محض میرے حواس کی بیداری نہ تھی بلکہ وہ ناقابلِ بیان مسرت بھی تھی جو وزنی دروازے میں پڑی وزنی زنجیر کو کنڈی سے الگ کرنے اور پھر اُن کواڑوں کو ایک ایک کر کے کھولنے سے مجھے حاصل ہوتی تھی۔ زنجیر کو کنڈی سے الگ کرنے میں مجھے طاقت لگانی پڑتی تھی۔ اور جب مَیں اس میں کامیاب ہو جاتا اور دروازے کی دوسری جانب منتظر اپنے کسی عزیز یا ملازم کو دروازہ کھول کر خوش آمدید کہتا تو مجھے ایک عجیب کامرانی اور فتحمندی کا احساس ہوتا تھا! اور وزنی زنجیر کا کنڈی سے الگ ہو کر ایک چھناکے کے ساتھ دروازے کے ساتھ جھُول جانا بھی میرے لیے ایک عجیب دلچسپی کا باعث تھا! مَیں بڑی دیر تک اس جھُولتی زنجیر کو دیکھتا رہتا جو میرے احساسات سے بے خبر جھُولتی جاتی!
کسی بھجن کے یہ بول "گھونگھٹ کے پٹ کھول رے تجھے پیا ملیں گے۔" مَیں نے اپنے بچپن میں ریڈیو سے بار بار سُنے تھے۔ مگر اُس وقت صرف گانے والی کی آواز کے اتار چڑھاؤ اور مترنّم طرز پر ہی توجہ تھی ـــــ نہیں صرف یہی بات نہیں تھی۔ اگر صرف یہی بات ہوتی تو مَیں ان بولوں کو کبھی کا بھول چکا ہوتا۔ یقیناً میں ان میں پوشیدہ معنوں کا کوئی غیر محسوس شعور ضرور رکھتا تھا۔ اب محسوس کرتا ہوں کہ پٹ گھونگھٹ کے ہوں یا دروازے کے اگر کھولے نہ جائیں تو طالب و مطلوب کے بیچ دیوار بن جاتے ہیں۔
گھر کا دروازہ نہ صرف تحفّظ کا احساس عطا کرتا ہے بلکہ اپنے آپ میں یقین کا باعث بھی ہوتا ہے۔ جب کہ جیل کا دروازہ نہ صرف عدم تحفظ کا احساس دلاتا ہے بلکہ تمام انسانیت ہی سے یقین کے اٹھ جانے کا باعث ہوتا ہے۔ اور جنّت کا دروازہ ـــــ اُس دنیا میں بھی دیواروں کے موجود ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ اور ـــــ غالبؔ کا یہ شعر ویسی ہی فراخی اور کشادگی عطا کرتا ہے جیسی کسی مدّت سے بند دروازے کو اچانک ہی کھولنے سے حاصل ہوتی ہے۔

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

یوں بھی غالبؔ کے ہاں دروازے کا ایک بہت اعلیٰ درجے کا شعور ملتا ہے۔ اتنا ہی اعلیٰ درجے کا کہ غالبؔ کی شاعری دیوار اور دیوار کے تصوّر کے خلاف محض ایک احتجاج معلوم ہوتی ہے۔ یا یوں ہے کہ شاعری کی سنگلاخ دیواروں میں غالبؔ ـــــ ایک دروازہ ہے!
دروازے سے کسی عمارت یا مکان کے اندر داخل ہونا ایک خالص جسمانی عمل ہے۔ اور یہ جسمانی عمل کسی عمارت سے تعارف حاصل کرنے کے لیے ناگزیر بھی ہے۔ جب اس عمل کو ہم بار بار دہراتے ہیں تو وہ عمارت یا مکان اپنے تمام روشن اور تاریک گوشوں کے ساتھ ہمارے لیے رفتہ رفتہ کھلتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر یہی سیمنٹ، گارے اور لوہے سے عبارت بے جان عمارت ایک جیتی جاگتی، جانی پہچانی شخصیت اختیار کر لیتی ہے۔ عمارت

کا اس شخصیت کو ہم اُس کی فضا میں محسوس کرتے ہیں جو نہ صرف ہیں سانس لیتی ہوئی بلکہ گرم جوشی سے ہماری جانب اپنی باہیں پھیلائے محسوس ہوتی ہے مگر ـــــ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اُس میں دروازے سے داخل ہوں، کیوں کہ دیوار سے کُود کر اندر داخل ہونے والے کے لیے نہ صرف وہ عمارت یا مکان اپنے آپ کو سمیٹ لیتا ہے بلکہ آسیب زدہ بھی لگتا ہے۔ گویا دروازہ وہ اسمِ اعظم ہے جس کے دُہرانے سے عمارت کے اندر موجود دروے بے شمار دَر وا ہو جاتے ہیں! بعض شخصیتیں بھی کسی عمارت ہی کی طرح سمٹی سمٹائی اور آسیب زدہ سی لگتی ہیں۔ مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی اسمِ اعظم کا جاننے والا اس طرف آنکلتا ہے اور پھر ـــــ یہ آپ نے کسی انٹرویو کے دوران میں دیکھا ہوگا کہ کیسے کیسے نامعلوم گوشے ٹیلی ویژن کیمرے کے احاطے میں آتے ہوئے کرکٹ کے گیم کی طرح ہماری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اور ـــــ وہی غیر مانوس شخصیت کتنی مانوس اور آباد لگتی ہے! یوں بھی شخصیتیں دیواروں کی طرح ہوتی ہیں یا بے دَر قلعہ کی مانند! اُن میں گداز کا پیدا ہونا یا اُن کا نشو و نما اُسی وقت ممکن ہے جب دیوار میں کوئی دروازہ نمودار ہو اور شخصیت کی خوشبو اپنے بندی خانے سے نکل کر خلقِ خدا تک پہنچے۔ دروازہ دوہری معنویت کا حامل ہے کہ خارج کو داخل سے اور داخل کو خارج سے ملاتا ہے چنانچہ جب کسی شخصیت کا دروازہ وَا ہوتا ہے تو آپ اُس شخص کی روح سے متعارف ہوتے ہیں اور خود وہ شخص اپنے زندان سے رہائی پاکر کھُلی اور بے کنار فضا میں سانس لینے لگتا ہے۔

ماہنامہ **اُردو اَدب** راولپنڈی

مدیران

اقبال حسین

بشیر سیفی (اعزازی)

تازہ شمارہ چھپ گیا ہے

شیخ چلّی

حامد برگی

ہر خوبصورت اور دلکش بات ضروری نہیں کہ قابلِ عمل بھی ہو جس طرح ہر سہانی آرزو ضروری نہیں کہ پوری بھی ہو سکے۔ ویسے بھی سہانی آرزو کا تعلق محض ہمارے خواب و خیال سے ہوتا ہے عملی زندگی سے نہیں ہوتا۔ شاید حقیقت کا سامنا کرنے کی اس میں تاب ہی نہیں ہوتی۔ حقیقت کو اسی لیے تلخ کہا جاتا ہے۔ خیال اور حقیقت میں بڑا فرق ہے۔ خیال کی کوئی انتہا اور حد و بست نہیں جبکہ خیال کو حقیقت کے حد و بست میں لانے کا عمل بڑا کٹھن ہے۔

انسان کی ایک فضیلت یہ بیان کی جاتی ہے کہ اسے سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کی صلاحیت سے نوازا گیا ہے۔ انسان کے علاوہ کوئی اور جاندار اس طرح سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس کا تعلق تو صرف حال سے ہوتا ہے اور حال میں بھی صرف موجود لمحے سے جبکہ انسان کی عقل و فکر ماضی، حال اور مستقبل تینوں کا احاطہ کر سکتی ہے۔ میں سوچتا ہوں انسان کی یہ صلاحیت کیا واقعی اپنے اندر کوئی فضیلت رکھتی ہے! میرے نزدیک یہ صلاحیت بیک وقت دکھ بھری بھی ہے اور مضحکہ خیز بھی، حال اور موجود کا دکھ ہی اسے کیا کم ہے کہ وہ ناموجود زمانوں کے دکھوں کو بھی اپنے تصرف میں لانے کی کوشش کرے!۔

عقل مند لوگ شیخ چلی کی قوتِ متخیلہ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس کی سہانی سوچوں اور دلکش آرزوؤں کو خیالی پلاؤ کہہ کر اور ہوائی قلعوں سے تعبیر کر کے اسے ایک کم درجہ انسان خیال کرتے ہیں اور اُن لوگوں کو بالکل کچھ نہیں کہتے جن کی زندگیاں بلند آرزوؤں اور روشن امیدوں سے خالی ہیں، جو اپنے سامنے کوئی آدرش نہیں رکھتے، جو ماضی و مستقبل سے لاتعلق محض حال کے لمحے میں زندہ ہیں حالانکہ فقط حال کے لمحے میں جینا، جینے کا بہت نچلا درجہ ہے۔ فکر و تخیل سے عاری بے حسی کی میکانکی زندگی، کھانے پینے اور سو رہنے کا عمل، جس میں کوئی احتجاج نہیں، کوئی اضطراب نہیں، زندگی کو گزارے چلے جانے کا عمل ہے، کوئی روشن تصور موجود نہیں، کوئی جدوجہد ممکن نہیں، کسی شے کو حاصل کرنے اور پالینے کی کوئی آرزو نہیں۔ کوئی میٹھا سہانا خواب نہیں۔ کچھ بھی نہیں!۔

اس اعتبار سے دیکھیں تو شیخ چلی ایک مکمل انسان دکھائی دیتا ہے اس کے پاس صرف روشن خیالیاں ہی نہیں جدوجہد کا ایک تصور بھی موجود ہے۔ اس کی اس جدوجہد نے ہی اس کے خیال کو مہمیز لگائی ہے۔ اس کے خیال و خواب کی پرواز قطعی بعید از قیاس منزلوں کی طرف نہیں، اس نے اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کا جو ڈول ڈالا ہے اسے فراخی و کشادگی، فراوانی و خوش حالی کے اس مقام تک پہنچا دیا ہے جہاں ایک زمانہ اس کی نازبرداری کرتا اور اُسے سر آنکھوں پہ بٹھاتا نظر آتا ہے جہاں خدام ذی حشام اسے اپنے جلو میں گھیرے اپنے حکم اور اشارے کے منتظر دکھائی دیتے ہیں اور چشم زدن میں کسی بھی ملکۂ سبا کی مسند اس کے حضور لا حاضر کرنے کو تیار ہیں، شیخ چلی کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے اس کرّ و فر اور اختیار سے خود مرعوب نہیں ہوتا۔ وہ اس صورت حال پر پوری طرح حاوی نظر آتا ہے۔ وہ ونڈر لینڈ کی چکا چوند میں ایلس کی طرح حواس باختہ، پریشان اور مضطرب دکھائی نہیں دیتا، کسی قسم کے ہیجان میں مبتلا نہیں بلکہ بڑے بانع اور پختہ رویّے کا اظہار کرتا ہے اس کی شان و مقام کے آگے ملکۂ حسن و جمال کی حیثیت بھی ایک ادنیٰ کنیز سے زیادہ نہیں، حکم عدولی کی صورت میں وہ بھی اس کے عتاب کا نشانہ بنتی ہے یہ اور بات کہ اس پیش پا افتادہ صورت حال میں اس کی کنیز و غلام ملکۂ عالیہ نہیں بلکہ کانچ کے

برتنوں سے بھری ٹوکری ہوتی ہے جو اس کی ایک ہی ٹھوکر سے چکنا چور ہو جاتی ہے اس ایک ٹھوکر سے اس کے کانچ کے برتن ہی چکنا چور نہیں ہوتے، اس کے تصورِ خواب کی کرچیاں بھی بکھر جاتی ہیں، کیا یہی سب کچھ ہماری زندگیوں میں اور ہمارے گرد و پیش نہیں ہو رہا اگر نہیں ہو رہا تو وہ لوگ جو شیخ چلی پر ہنستے ہیں اس کا مذاق اڑاتے ہیں اس سے بہت چھوٹے انسان ہیں۔ ان کی نظر اپنی ناک کی نوک سے آگے نہیں جاتی۔ وہ انتہائی محدود سوچ رکھنے والے انسان ہیں، بلند آدرش سے خالی، روشن اُمیدوں سے عاری، پختگیٔ فکر و عمل اور خود اعتمادی کے جوہر قابل سے محروم! یہ شیخ چلی کے کردار کی بلند ہمتی اور عزم و حوصلہ ہی ہے جو اسے نتائج سے بے نیاز کر دیتا ہے اور پوری صورتِ حال پر حاوی کر دیتا ہے۔

اگر زندگی کا مدار حقیقت بینوں اور معقولیت پسندوں کے ہاتھوں میں ہوتا تو زندگی کی گاڑی اب تک مکمل بریک ڈاؤن کا منظر دکھا چکی ہوتی۔ ہم ابھی ابتدائی مدارج میں ہی ہوتے اور غاروں، جھونپڑوں، گھروں، مکانوں، محلوں سے سکائی سکریپرز تک کا فاصلہ طے نہ کر پاتے۔ انسان نے شیخ چلی بن کر ہی قدم آگے بڑھایا ہے۔ شیخ چلی پر ہنسنے والوں اور پھبتی کسنے والوں میں اکثریت ان ہی لوگوں کی ہے جنہوں نے اپنے اندر کے شیخ چلی کو پابزنجیر کر رکھا ہے اور بظاہر جیتے جاگتے نارمل انسانوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔

سہانی آرزوؤں اور خوبصورت دلکش باتوں سے ہی زندگی کو سرفرازی ملی ہے ضروری نہیں کہ یہ سب آرزوئیں اور باتیں حقیقت کا رنگ بھر کے بھی ہمارے سامنے آسکیں مگر بے شمار چیزیں جو حقیقت بن کر اس عالمِ امکان میں ظاہر ہوتی ہیں کبھی محض شیخ چلی کے خوابوں کا درجہ رکھتی تھیں اور اب بھی جو کچھ عالمِ وجود میں آچکا ہے اس سے کہیں زیادہ دلکش حقیقتیں، انسان کے ذہن و تصور میں مضمر پڑی ہیں اور عالمِ امکان سے عالمِ ظاہر میں ظہور پانے کے لیے بے قرار ہیں۔ سائنسدان جو جدید زمانے کا شیخ چلی ہے اپنے خوابوں کے ذریعے ان رعنائیوں تک رسائی پانے کی کوشش کرتا ضرور نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے تیشۂ تخیل سے بسا اوقات ایک ایسا پیکر تراش لیتا ہے جس کا حقیقت میں کوئی وجود نہ تھا۔

خیال و فکر کی یہ رعنائیاں مانگے سے نہیں ملتیں یہ وہ کمیاب پھول ہیں جو زندگی کے چمن زار میں خود بخود کھلتے ہیں۔ ان کے بیج، ان کی پنیری اور کھاد بازار سے بندھے ٹکے داموں حاصل نہیں کی جاسکتی۔ یہ وہ کانچ کے خوبصورت برتن ہیں جو ٹوکروں میں سجا کر آپ کے حوالے کیے جاتے ہیں۔ تاکہ آپ اپنی مضمحل زندگی کو تازہ دم کر لیں، ناکامیوں سے نکل کر کامیابیوں کی طرف تیزی سے گامزن ہو جائیں، بے عملی کی کیفیت کو آناً فاناً عمل سے بدل لیں اور انتہائی کامیاب و بامراد انسان قرار پائیں۔ مگر آپ؟

بک سٹالوں میں بھی ہوئی لاتعداد کتابیں جو کامیاب زندگی گزارنے کا فن سکھانے کا دعویٰ کرتی ہیں محض ہماری خام خیالی سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ "جینا سیکھو"، "خوش رہنا سیکھو"، "جینے کی اہمیت"، "زندگی کی نفسیات"، "جیو اور جینے دو"، "زندہ رہنے کا فن"، یہ کتابیں کتنے لوگوں کو جینے کا فن سکھا سکی ہیں اور ان کتابوں کو پڑھ کر کتنے لوگ مثالی شخصیت کے مالک بن گئے ہیں؟ زندگی محض نفسیات کا اصول یا فلسفہ کا مسئلہ نہیں اور نہ کسی فارمولے اور قاعدے کلیے کی صورت بیان ہو سکتا ہے۔ زندگی صرف تنہائی میں خواب دیکھنے کا نام ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ شامل نہیں ہو سکتا۔ کتابوں میں لکھے گئے قاعدوں کلیوں کے سانچے میں زندگی کو ڈھالیں تو اس میں سے کاریگر پیدا ہوں گے، خوابوں کی بھٹی میں اسے جھونک دیں تو فنکار پیدا ہوں گے۔ شیخ چلی جنم لیں گے۔

مگر شیخ چلی کی یہ بات مجھے پسند نہیں کہ وہ کبھی کبھی کسی لمحہ خود فراموشی میں پاؤں کی ٹھوکر سے کانچ کے برتنوں کو کرچیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ گویا خوابوں کے آبگینوں کو توڑ کر ایک حقیقت پسند دنیا دار کی طرح نہ ٹوٹنے والے برتنوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آنے لگتا ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ یہ شیخ چلی کے مسلک کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ سو میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنے اس بزرگ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس آخری ٹھوکر کی لغزش کا مرتکب نہ ہونے پاؤں۔ میں تو یہ

چاہتا ہوں کہ دل کی تمام حسرتیں دل میں لیے کانچ کے ان برتنوں کو قدموں میں سجائے زندگی کی اس ہما ہمی کے درمیان بیٹھا خیال و خواب کے رنگین محل اور ہوائی قلعے تعمیر کرتا رہوں۔ برتنوں کے اس چھوٹے موٹے کاروبار سے لے کر ملک التجار بننے تک کا فاصلہ دیکھتے ہی دیکھتے طے کر جاؤں، شہزادی بھی بیاہ لاؤں، خدام باادب، کنیز و غلام ہر طرف میرے حکم کے منتظر نظر آئیں۔ قلعہ کے اندر اور باہر میرے نام کا سکہ چلے اور کوئی سرپھرا میرے حکم سے انحراف کی جرأت نہ کرے۔

خیال و خواب کے یہ گھوڑے دوڑاتے ہوئے میں اپنے آپ کو شیخ چلی سے برتر تصور کرتا ہوں کیونکہ میں کسی صورت بھی یہ نہیں چاہتا کہ اپنی ایک بے نیازانہ ٹھوکر سے قدموں میں دھرے خوش نما کانچ کے برتنوں کو پاش پاش کر دوں۔ اپنے خوابوں کو پلک جھپکتے ہی زمیں بوس کر کے اور ان میں بسنے والی نازک اندام شہزادی کو کسی پہاڑ کی تاریک گپھا میں سسکتا چھوڑ کر زندگی کے لق و دق صحرا میں ٹھوکریں کھاتا، بھٹکتا پھروں! نا صاحب! میں شیخ صاحب قبلہ کی غلطی کا اعادہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا!

سرگوشیاں کی مقبولیت کے بعد جواں سال انشائیہ نگار

سلیم آغا قزلباش

کے

انشائیوں کا دوسرا مجموعہ

"آمنا سامنا"

(زیرِ طبع)

انتظار گاہ

اکبر حمیدی

یہ دنیا ایک بڑا ریلوے اسٹیشن ہے جہاں ہم سب انتظار گاہوں میں بیٹھے اپنی اپنی گاڑی کے منتظر ہیں۔

آج مجھے اندازہ ہوا کہ انتظار گاہ کتنی ضروری اور کتنی اہم جگہ ہے جہاں مَیں انتظار کی مدت صبر و سکون کے ساتھ گزار رہا ہوں۔ ایک لمحے کے لیے مَیں سوچتا ہوں اگر انتظار گاہ نہ ہوتی تو اتنے بڑے ریلوے اسٹیشن پر مَیں کہاں اور کب تک مارا مارا پھرتا؟ آن چاہے لوگوں کی اتنی بڑی تعداد سے ملاقات ہوتی کہ اب تک خود سے جُدا ہو چکا ہوتا۔ تب اگر میری گاڑی آ بھی جاتی اور مَیں گاڑی پر سوار ہو بھی جاتا تو شاید سوار ہونے والا "مَیں" وہ نہ ہوتا جو صبح سویرے زرق برق لباس پہنے جذبوں اور اُمنگوں بھرے دل کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پہنچا تھا!!

انتظار گاہ نے نہ صرف انتظار کی اذیت کو قابلِ برداشت بنایا ہے بلکہ اتنے بڑے ریلوے اسٹیشن کے شور شرابے سے مجھے پناہ بھی دی ہے۔ مَیں محسوس کر رہا ہوں کہ انتظار گاہ کسی پُر شور سمندر کے درمیان ایک چھوٹا سا پُر امن جزیرہ ہے جہاں سے جب چاہیں ہم سمندر کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ اور جب چاہیں گوشۂ عافیت میں اپنے آپ کو احساسِ تحفظ بھی عطا کر سکتے ہیں۔

صبح جب مَیں ریلوے اسٹیشن پہنچا میری گاڑی آنے میں نصف گھنٹہ باقی تھا۔ مَیں نے پلیٹ فارم سے ایک ادبی رسالہ، افسانوں کی ایک کتاب اور سگریٹوں کا پیکٹ خریدا۔ پلیٹ فارم کی ایک سمت سے دوسری سمت تک تماشائے اہلِ کرم کیا۔ اپنے شوقِ سفر کو خوبصورت رنگوں، خوش کُن آوازوں اور نو تراشیدہ گُل پیراہنوں کے احساسِ رفاقت سے تازہ تر کیا۔ تب پلیٹ فارم کے مائیکروفون سے پیغام موصول ہوا کہ میری گاڑی ایک گھنٹہ تاخیر سے آ رہی ہے۔ چنانچہ مَیں بغیر کوئی وقت ضائع کیے انتظار گاہ میں چلا آیا۔

انتظار گاہ میں اگر زندگی کی بنیادی ضروریات اور تھوڑی سی آسائشیں میسر ہوں تو وقت بہتر طور پر کٹ سکتا ہے۔ نشست اگر ذرا آرام دہ ہو اور قدرے کشادہ بھی جس میں نیم دراز سا ہوا جا سکے تو آدمی بے چینی سے پہلو بدلنے کی اذیت سے محفوظ رہ سکتا ہے اور اگر نشست کسی ایسی کھڑکی کے ساتھ ہو جو پلیٹ فارم کی طرف کھلتی ہو تو پھر کیا ہی کہنے!!

خوش قسمتی سے انتظار گاہ میں مجھے جو نشست ملی ہے اس میں یہ سب خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ مَیں محنت کی عظمت کا قائل ضرور ہوں مگر مَیں نے دیکھا ہے جو کچھ ہمیں خوش قسمتی سے مل جاتا ہے وہ محنت سے ہرگز نہیں ملتا۔ اس نشست کی بدولت مَیں بیک وقت پلیٹ فارم کے ہجوم میں بھی ہوں اور انتظار گاہ کی عافیت میں بھی!

انتظار گاہ کی اپنی ایک دنیا ہے جو ریلوے اسٹیشن کی دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ یہاں خاموشی ہے، سکون ہے، ٹھہراؤ ہے، یکسوئی ہے۔ انتظار کے نتیجے میں اضطراب کی کیفیت تحت الشعور کے راستے دل میں ضرور اُتر آتی ہے مگر انتظار گاہ کی ٹھہری ہوئی فضا جیسے اسے تھپکیاں دے کر

سُنائی بھی دیتی ہے۔ ویسے بھی عالمِ محسوس اور عالمِ شعور کے درمیان موٹے شیشے کی ایک مضبوط کھڑکی ہے جسے اگر مہارت کے ساتھ بند کر دیا جائے تو ہم شیشے کے پیچھے انگڑائیاں لیتی کیفیات کا مشاہدہ تو کر لیتے ہیں مگر اُن کی پُر شور اذیتوں سے محفوظ رہتے ہیں بشرطیکہ ہم مشاہدہ کو مشاہدہ تک محدود رکھنے پر قادر ہوں اور اسے نفسیاتی واردات بننے سے روک سکتے ہوں !!

بالکل اس طرح جیسے مَیں نے اپنی نشست کے قریب پلیٹ فارم کے ہنگاموں کی طرف کھُلنے والی موٹے شیشے کی کھڑکی مضبوطی سے بند کر دی ہے۔ اب مَیں جب چاہوں اس کے شیشوں میں سے پلیٹ فارم کی صورتِ حال سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں اور جب چاہوں اپنی گردن گھُما کر اُس کی تصویروں کو انتظار گاہ میں داخل ہونے سے روک سکتا ہوں۔ یہ کھڑکی میرے لیے ایک رنگین ٹی۔ وی ہے۔ مَیں چاہوں تو اس کے دونوں پٹ کھول کر آواز اور تصویر دونوں سے دل بہلاؤں۔ چاہوں تو پٹ بھیڑ کر آواز بند کر دوں اور محض رنگ دار تصویروں سے لطف اُٹھاؤں ـــــ اور جب چاہوں گردن کو ذرا سی جنبش دے کر ٹی۔ وی بند کر دوں !!

اس انتظار گاہ میں میرے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں مگر سب ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر۔ ایسا لگتا ہے جیسے سب اپنی اپنی انتظار گاہوں میں اپنی اپنی فرصت کے لمحات اپنے اپنے طور پر بہتر انداز میں بسر کرنے کی کوشش میں ہیں۔ بعض حضرات کی مصروفیات اور انہماک دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے انتظار گاہ کو گھر بنا لیا ہے۔ اطمینان سے بیٹھے شیو بنا رہے ہیں۔ ایک صاحب نے کپڑے دھو کر پنکھے کے نیچے سُوکھنے کے لیے ڈال رکھے ہیں اور خود ایک۔ بنچ پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے استراحت فرما رہے ہیں۔ ایک صاحب مطالعہ میں مصروف ہیں۔ ایک صاحب نے خضاب لگا رکھا ہے اور اب تولیہ شانوں پر رکھے غسل خانے میں جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ایک صاحب جوتوں کو چمکا رہے ہیں۔ غرض سب کو کسی نہ کسی گاڑی کا انتظار ہے مگر کسی نے بھی گاڑی کو اعصاب پر سوار نہیں ہونے دیا۔

مَیں نے کھڑکی کے شیشوں میں سے دیکھا ایک گاڑی بغیر آواز پیدا کیے آہستگی سے پلیٹ فارم پر آ کر رُکی ہے۔ لوگ سُوٹ کیس، اٹیچی کیس، بریف کیس بستر، بیگ اور گٹھڑیاں اٹھائے گاڑی پر پل پڑے ہیں ـــــ پتہ نہیں کتنے صبر آزما انتظار کے بعد ان کی گاڑی آئی ہے۔ پورا منظر عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب کی تصویر بنا ہوا ہے۔ استقبال کرنے والوں اور الوداع کہنے والوں کی کیفیات دیکھنے کے قابل ہیں۔ سب لوگ آنے والے اور جانے والے عزیزوں سے اپنے اپنے انداز میں بڑی گرم جوشی سے مل رہے ہیں۔

پلیٹ فارم ایک ایسی ہی جگہ ہے جہاں ہم ہنس ہنس کر ملتے ہیں اور رو رو کر جُدا ہوتے ہیں۔ آنے والوں کے لیے پھولوں کے ہار ہیں اور جانے والوں کے لیے آنسوؤں کی مالا !!۔

تھوڑی ہی دیر میں گاڑی حرکت کرنے لگتی ہے۔ گاڑی کے دروازوں میں کھڑے لوگ اپنے عزیزوں سے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر رخصت طلب کر رہے ہیں۔ گویا انہیں ان کی مطلوبہ گاڑی مل گئی ہے۔ ان کے جواب میں پلیٹ فارم پر اَن گنت رنگا رنگ رومال فضا میں لہرا رہے ہیں۔ گاڑی پلیٹ فارم عبور کر چکی ہے مگر پلیٹ فارم پر لہرانے والے رومالوں کی وارفتگی کا ابھی تک وہی عالم ہے۔ رنگوں میں رچے اور خوشبوؤں میں بسے ہوئے رومالوں نے پلیٹ فارم کی فضا کو تھوڑی دیر کے لیے گل و گلزار بنا دیا ہے۔ انسانی رشتوں، جذبوں اور امنگوں کا ایسا والہانہ اظہار بہت کم جگہوں پر دیکھنے میں آتا ہے۔

ایسا لگتا ہے ہوا کا کوئی جھونکا پھولوں کو مَس کرتا ہوا گزر رہا ہے اور پھول ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے الوداع کہہ رہے ہیں !!

موٹے شیشے کی بند کھڑکی میں سے یہ سارا منظر ایک حسین ـــــ رنگین ـــــ اور بے آواز خواب کی مانند لگ رہا تھا۔ مَیں نے اپنی مسرور اور اُداس نظریں سکرین پر سے ہٹا لیں !!

تب مجھے اندازہ ہوا خاموشی کتنی بڑی آواز ہے ــــ اور اس خاموش منظر نے اپنے پُرجوش اعضا کی زبان سے کتنی جذباتی باتیں کہہ دی ہیں۔

میری توجہ اُس انسانی عہد کی طرف چلی گئی جب عظیم انسانی جذبوں کا اظہار اعضا کی زبان سے کیا جاتا تھا ــــ لیکن پھر یہ جان کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ آج کا زبان دان بلکہ شاید زبان دراز انسان بھی اپنے عظیم جذبوں کو زبان کی بجائے اعضا کی زبان سے ہی ادا کرتا ہے !!

مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے انسان نے اس جہت کا صدیوں پر محیط سفر تاریخ کی انتظار گاہ میں بیٹھ کر طے کیا ہے !!

انتظار گاہ ــــ گھر اور منزل کے درمیان ایک قیام گاہ ہے جہاں ہم پر نہ تو گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے اور نہ ہی منزل پر قدم جمانے کے مسائل۔ ایک ایسا خلائی مقام جہاں زمین کی کشش ختم ہو جاتی ہے اور کسی اگلے سیارے کی کشش ابھی شروع نہیں ہوتی۔ جہاں ہم خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر سکتے ہیں۔

انتظار گاہ میں آپ وقت کس طرح گزارتے ہیں؟ یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے !! کیا ہر لمحہ بھڑک کر خاکستر ہو جانے والی چوبِ خشک کی طرح؟ کیا آہستہ آہستہ سُلگنے والی گیلی لکڑی کی طرح ؟ کیا اُس نفسیات دان کی طرح جو موجود سے غیر موجود ہونے کا ہنر جانتا ہے اور اس طرح ہر اذیت ناک صورتِ حال سے خود کو بچا لے جاتا ہے ؟۔ کیا ایک سیاح کی طرح جس کے لیے کائنات کا ذرہ ذرہ تاریخ کا عجائب خانہ ہے اور جو ایک ایک قدم پر عمریں بسر کر سکتا ہے ؟ کیا ایک ایسے انسان کی طرح جو خلوت میں پھیل کر انجمن کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح کبھی تنہائی کا شکار نہیں ہوتا ؟

ارسطو نے سکندر سے کہا تھا سب سے پہلے اکیلے زندہ رہنا سیکھو۔ شاید اس طرح ارسطو نے سکندر کو انتظار گاہ میں قیام کرنے کا سلیقہ سکھایا تھا !!

انتظار گاہ میں قیام کا عرصہ بعض لوگوں کے لیے بڑا ہی اذیت ناک ہوتا ہے۔ مثلاً جب انہیں گھر کی یاد ستانے لگے یا منزل کی تمنا بیتاب کرنے لگے ! جب گاڑی آنے میں تاخیر پر تاخیر ہو رہی ہو ! جب گھر واپس جانے کو جی نہ مانے اور انتظار گاہ میں بیٹھنا مشکل ہو رہا ہو !!

بڑے ریلوے اسٹیشنوں کی انتظار گاہیں تو پھر بھی کچھ وسعت اور آسانیاں رکھتی ہیں، ان کے پلیٹ فارموں پر دل لگی کے لیے کچھ نہ کچھ سامان بھی مل جاتا ہے۔ وہاں اپنی نہ سہی کسی نہ کسی کی گاڑی تو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد آتی رہتی ہے اور اس طرح کچھ نہ کچھ رونق اور دلچسپی کی صورت پیدا ہوتی رہتی ہے ــــ لیکن چھوٹے ــــ اور برانچ لائنوں کے اسٹیشنوں کی انتظار گاہیں تو بعض اوقات مقتل بن جاتی ہیں۔ جہاں مسافر لمحہ لمحہ قتل ہوتا رہتا ہے ــــ جہاں انتظار گاہ سنسان اور پلیٹ فارم ویران ہو جاتے ہیں۔ جہاں دوپہر کی شوک اور راتوں کی کوک سُن سُن کر کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے !!

لیکن مسافروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سب کچھ سفر کا حصہ ہے !!

ایک کامیاب سفر کا انحصار بہت حد تک اس بات پر ہے کہ آپ نے انتظار گاہ کا زمانہ کس طرح بسر کیا !! دنیا کے بڑے لوگوں نے انتظار گاہ کو پہلی منزل سمجھ کر بسر کیا ہے۔ انہوں نے اس فرصت کو طویل اور عظیم سفر کی مصروفیات طے کرنے میں صرف کیا ہے !!

لیکن اگر کسی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہیں ــــ تب بھی روئے زمین پر شاید انتظار گاہ ہی ایک ایسی جگہ ہے جو ہمیں اُس وقت پناہ دیتی ہے۔ جب گھر واپس جانا ندامت کا باعث ہوتا ہے اور منزل کی طرف سفر کرنے کے لیے گاڑی نہیں ملتی !!!

نافرمانی

محمد اسد اللہ

نافرمانی بیک وقت انسان کی ایک پُر اسرار طاقت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ نافرمانی جیسا شاندار عمل شیطانی حرکات کے زمرے میں داخل ہوگیا۔ جب کہ شیطان کی مملکت میں یہی عمل عین عبادت ہے۔ عبادت ہمیشہ ایک ذریعہ اور وسیلہ رہی ہے۔ نافرمانی کا عمل شیطان سے منسلک سہی اسے محبوب و مرغوب ہرگز نہیں۔ اس لیے کہ وہ بھی ہزار جان سے یہی چاہتا ہے کہ اس عمل کے ذریعے انسان اس کا تابع فرمان ہو جائے۔ چنانچہ شیطان کے چیلے صبح شام نافرمانی کے چھوٹے بڑے کروڑوں جال وقت کے پانی میں تیرتی ہوئی انسانی آبادی پر پھینکتے رہتے ہیں۔ فرمانبرداری ایک عہد وفا ہے ایک رسّی ہے جس سے فرمانبردار بندھا ہوا ہوتا ہے۔ نافرمانی فرمانبرداری کی رسّی تُڑا کر بھاگ جانے کے سوا اور کیا ہے؟

نافرمان ایک کھلنڈرا لڑکا ہے جو شیش محل پر پتھر اُچھال کر بھاگ کھڑا ہوا ہے اب اس شیش محل کی خیر و عافیت سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ انسان فرمانبرداری کی جس ڈور کو کاٹتا ہے اس کا اگلا سرا گھر، سماج، ماں، باپ، حکومت جیسی کھونٹیوں سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اس ڈور کو توڑ کر وہ خواہشاتِ نفسانی کی چکیلی راہوں پر بے تحاشا دوڑتے وقت یہ بھول جاتا ہے کہ وہ ازل سے ایک کٹھ پتلی ہے جس کے ہاتھ پاؤں، آنکھ کان غرض پورے کے پورے وجود پر ڈوریاں بندھی ہیں۔ نافرمانی کو اپنا کر ہم ایک ہاتھ سے ان ڈوریوں کو چھین کر کسی دوسرے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں۔ یہ عمل ایسا ہی ہے جیسے حکومت کی باگ ڈور کسی دوسرے کے ہاتھوں میں چلی جائے۔ بغاوت نافرمانی کا اعلامیہ ہے، اس بغاوت یا غدر کے بعد انسان کو آزادی و خود مختاری حاصل ہو جائے تب بھی جسم کے پنجرہ میں مقید اس مجبورِ ازل کی قسمت میں آزادی کہاں؟ دوسرا ہاتھ جو انسانی وجود میں عنانِ حکومت سنبھالتا ہے عموماً اس کا نفس ہوتا ہے جو نفیس اور اُجلا اُجلا ہوا تو خیریت اور اگر اس کے سر پر شیطان کے چیلوں کا سایہ ہوا تو وہ اسے سیاہ راستوں پر چلا لیں گے اور اندھیروں کے منطقے میں دھکیل کر خود گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو جائیں گے۔

نافرمانی دراصل ایک ذریعۂ اظہار ہے جسے بروئے کار لا کر نافرمان اپنے وجود کو روشنی کی صورت چہار دانگِ عالم پر آشکار کرتا ہے۔ نافرمان ندِ مقابل کی نفی سے خود کا اثبات مہیا کرتا ہے۔ البتہ اکثر اس کے وجود کی آبدوز میں کوئی تیسرا شخص براجمان ہوتا ہے جو نافرمانی کے پردے میں اپنا اثبات کروا کر علیحدہ ہو جاتا ہے جیسے اندھیرے میں آدمی کا سایہ اس کا بدن چھوڑ کر چل دے۔ میں نے اکثر اس سائے کو بھاگتے ہوئے دیکھا تو اس کے پیچھے لاحول کی گونجتی ہوئی گونج بھی سنائی دی اور کبھی اسی آبدوز سے ایک روشنی نکلتی دیکھی جو بالآخر نافرمان کے پورے وجود پر چھا گئی۔

مجھے نافرمانی کا عمل پسند ہے مگر اس سے مراد خدا کی نافرمانی ہرگز نہیں۔ خدا معاف کرے میں تو ایسی قبیح نافرمانی کا تصور تک نہیں کر سکتا کہ اس صورت میں میری پسند خدا کی پسند سے ٹکرا جائے۔ اتنی بڑی ہستی سے ٹکرا کر کس کا کاسۂ سر سلامت رہا ہے۔ مجھے اس درسگاہِ عبرت میں فرعون کی لاش بن کر یا تاریخ کے صفحات پر تازیانۂ عبرت بن کر رہنا پسند نہیں۔ اس کے لیے تو فرعون اور نمرود جیسے نافرمان ہی کافی ہیں۔

دراصل مجھے چھوٹی چھوٹی نافرمانیاں پسند ہیں۔ اس لیے پسند ہیں کہ نافرمانی میرے نزدیک ایک دفاعی ہتھیار ہے۔ اکیلا آدمی جب وہ علی الاعلان کسی برتر ادارے یا طاقت در شخص کی نافرمانی کو اپنا طرۂ امتیاز بنا لیتا ہے تو گویا اپنی ذات کے جُزو کو سماج کے کُل سے جُدا کر لیتا ہے۔ اسی طرح سول نافرمانی کی تحریکات دراصل کولہو کے اندر پس کر مَن تُو شدم تُو مَن شدی ہو جانے سے انکار ہی کے مختلف پیرائے ہیں۔ افسوس کہ فرعون و نمرود نے اپنے ازلی دشمن اور مدِّ مقابل شیطان کو ہلاک نہ کیا اور اس ہتھیار سے خود اپنا سر پھوڑ کر سرزمینِ خباثت میں دفن ہو گئے۔ اگر وہ شیطان کی نافرمانی کرتے تو آج قابلِ احترام اور معتبر کہلاتے۔

ویسے بظاہر میں فرمانبرداری کے مدار ہی کا ایک سیّارہ ہوں۔ لہٰذا وہ لوگ جن کا میں فرمانبردار ہوں حتیٰ کہ میرا سماج نامی مدار بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ میں نے اپنے آپ کو اس کے اندر ایسے جذب کر لیا ہے جیسے چینی چائے کی پیالی میں حل ہو جاتی ہے۔ ان کے تئیں میری انفرادی پسند یا ناپسند منوں مٹی تلے دفن ہو چکی ہے۔ حالانکہ جب بھی میری پسند ناپسند اور اپنے طور پر آزادانہ جینے کی خواہش میرے اندر انگڑائیاں لینے لگتی ہے تو میں گویا اس قدیم خواہش کو چھو لیتا ہوں جس کی تکمیل اس کائنات کی صورت میں ہوئی تھی۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ میں پہچانا جاؤں۔ میں اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دینا چاہتا ہوں۔ اسی سوچ کی ضد میں کبھی کبھی مجھ سے کوئی نافرمانی بھی سرزد ہو جاتی ہے۔ دوستوں کے ٹوکنے کے باوجود میں کوئی حرکت کر گزرتا ہوں۔ بزرگوں کے پند و نصائح کا خرقہ اُتار پھینکتا ہوں۔ سینہ تان کر سڑک کی دائیں جانب چلنے لگتا ہوں۔

خدا کی نافرمانی میرے وجود میں کسی چھچھوندر کی طرح روزِ ازل ہی سے گھُس بیٹھی ہے۔ میں اسے ڈھونڈ کر اپنے گھر سے باہر نکال دینے سے بھی قاصر ہوں۔ بس راتوں کی گہری تاریکی اور تنہائی میں اس کی الارم نما چِک، چِک، چِک کی آواز سے ڈرتا ہوں۔ دن کے اُجالے میں چھچھوندر بے خبری کے اندھیرے میں روپوش ہو جاتی ہے۔ میں سوچتا ہوں خدا مجھے ضرور معاف کر دے گا کہ وہ چھوٹوں پر رحم فرمانے والا ہے۔ میری نافرمانی بھی کوئی نافرمانی ہے! نافرمانی تو اس وقت قابلِ اعتراض قرار پاتی ہے جب اس کے چہرہ پر ایک عدد بڑی سی مونچھ بھی نکل آئے اور وہ انسان کے اندر سے باہر آ کر سارے عالم پر ایک حقارت کی نظر ڈالنے لگے۔ سرِ پُر غرور کو دو انچ مزید سربلندی سے سرفراز کر دے۔ گردن کو تھوڑی اور اکڑ فراہم کر دے۔ بچہ اس وقت عالمِ وجود میں آتا ہے جب گوشت کے لوتھڑے میں جان پڑتی ہے۔ نافرمانی اعمال و افعال کی مملکت میں اسی وقت لائقِ گردن زدنی قرار پاتی ہے جب اس پر انانیت کا خول چڑھ جائے۔ مجھے اس قسم کی نافرمانی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ البتہ میں چھوٹی چھوٹی نافرمانیوں کے حق میں ہوں۔ میرے خیال میں تو یہ انسانیت کی تکمیل کرتی ہیں۔ ہمیں نفرت کے ٹکڑے اور بوٹیاں ڈال کر اپنے آنگن میں نافرمانی کے کچھ کتّے ضرور پال رکھنے چاہئیں۔ دنیا جو روز بروز مجموعۂ خرافات بنتی جا رہی ہے شرافت و اخلاق اور مروّت کی مملکت، طوائف الملوکی سے دوچار ہے، خباثتوں کے بپھرے سمندر کی موجیں ہمیں اپنے آغوش میں لینے کے لیے بیقرار ہیں، ایسے میں آج کے انسان کا مکان کے اندر کی متاعِ بے بہا کی حفاظت کے لیے آنگن میں نافرمانی کے کتّے چھوڑنا وقت کی ایک عین ضرورت ہے۔

نافرمانی ایک سکّہ ہے جس کا دوسرا پہلو یقیناً فرمانبرداری ہے۔ شیطان کے یہاں فرمانبرداری والا پہلو نفسانی خباثت میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاید اسی لیے خدا نے انسان کو بھی نافرمانی کے آلات سے لیس کیا تاکہ اُسے خیر و شر میں تمیز کرنے کی صلاحیت حاصل ہو سکے۔ فرشتے عبادت کے ذریعے اپنا دفاع تو کر سکتے تھے البتہ یقین کی سطح پر خدا کی ذات کے اثبات کی ایک ارفع صورت یہ قرار پائی کہ خدا کے ماسوا کی نافرمانی (نفی) کی جائے تاکہ خدا کی ذات کے اثبات کی صبح خود بخود نمودار ہو جائے جیسے تاریکی کی چادر پھاڑ کر صبح کا اُجلا اُجلا وجود ہر طرف بکھر جاتا ہے۔

شاید اسی لیے خدا نے اپنے کلمہ کو بھی لا سے شروع کیا جو اپنے ایک ہی وار میں تاریکی اور جہالت کا پردہ چاک کر دیتا ہے۔

نکٹائی

بشیر سیفی

میرے دوستوں کو مجھ سے شکوہ ہے کہ میں سوٹ کے ساتھ نکٹائی باندھنے کے بجائے دیہاتیوں کی طرح مفلر لپیٹ لیتا ہوں۔ یوں تو کھانا اور پہننا خالص انفرادی افعال ہیں جن سے کسی کو کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے مگر چونکہ ابھی ہمارے ہاں شخصی آزادی کا دور دورہ نہیں ہوا، اس لیے خاندان پر سربراہ اور افراد پر معاشرے کو برتری حاصل ہے۔ سربراہ اگر خاندان پر اپنی پسند و ناپسند مسلط کرنے پر تُلا رہتا ہے تو معاشرہ افراد کی آزادی پر قوانین اور رسوم کے پہرے بٹھاتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں دنیاوی رسموں کے اسیر لوگوں پر تنقید نہیں کرتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ اس معاملے میں مجبورِ محض ہیں۔ فیشن کے مطابق گھروں کی آرائش کرنا اور لباس سلوانا بھیڑ چال نہیں بلکہ معاشرے کا تقاضا ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود میں اس مقولہ پر یقین نہیں رکھتا کہ "کھاؤ مَن بھاتا اور پہنو جگ بھاتا۔" میں کھاتا بھی مَن بھاتا ہوں اور پہنتا بھی مَن بھاتا ہوں۔ اسی لیے میرے دوستوں کو مجھ سے شکایت پیدا ہوتی ہے۔

ایسا بھی نہیں کہ میرے پاس نکٹائی نہیں یا مجھے نکٹائی میں گرہ لگانا نہیں آتی۔ میرے پاس نکٹائی بھی ہے اور میں نکٹائی میں گرہ لگانا بھی بخوبی جانتا ہوں۔ اس کے باوجود اگر میں نکٹائی باندھنے سے گریز کرتا ہوں تو اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مجھے نکٹائی سراسر بے مصرف نظر آتی ہے۔ قمیص، شلوار (یا پتلون) بدن ڈھانپنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ بنیان، سویٹر، کوٹ، جرابیں، دستانے اور مفلر بدن کو سردی سے بچاتے ہیں مگر نکٹائی سے اس قسم کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ الٹا نقصان ہی ہوتا ہے کیونکہ نکٹائی لگانے کے لیے کالر کا آخری بٹن بھی بند کرنا پڑتا ہے جس کے باعث دَم گھٹنے کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے جو اپنی وضعداری یا منصبی ذمہ داری کی وجہ سے گرمی کے موسم میں بھی نکٹائی باندھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مزید برآں جو لوگ کالر کا آخری بٹن بھی بند کر لیتے ہیں انہیں دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے اپنی ذات کے ایوان میں داخل ہونے کے تمام دروازے بند کر رکھے ہیں اور ان کی شخصیت میں جھانکنا کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ بالفاظِ دیگر بند کالر قلعہ بند شخصیت کا غماز ہے جسے فتح کرنا آسان نہیں جبکہ کھلا کالر کھُلی ڈُلی شخصیت کی دلیل ہے۔ جو لوگ اپنا کالر کھُلا رکھتے ہیں وہ گویا اپنی ذات کے رنگ محل کا صدر دروازہ ہر وقت وا رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت کھُلی کتاب کی طرح ہوتی ہے اور میرا تجربہ ہے کہ ایسے لوگ مخلص اور قابلِ اعتماد ہوتے ہیں۔

نکٹائی نہ باندھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں جونہی نکٹائی باندھتا ہوں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زمین سے میرا رشتہ منقطع ہو گیا ہے اور میں خلا میں معلق ہو کر رہ گیا ہوں۔ نکٹائی باندھنے کے بعد سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر تکہ کباب کھانے کے بجائے کسی اعلیٰ ہوٹل میں بیٹھ کر شامی کباب کھانے کو جی چاہتا ہے اور سائیکل چلانے کے بجائے ٹیکسی میں سفر کرنے کی خواہش مچل اٹھتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ میں جاگتے میں خواب بھی دیکھنے لگتا ہوں مثلاً میں دیکھتا ہوں کہ میرا تنگ و تاریک چھوٹا سا مکان ایک خوبصورت کشادہ بنگلے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ مکان کی ڈیوڑھی اور اس میں رکھی ہوئی سائیکل معدوم ہو گئی ہے اور اس کی جگہ گیراج نے لے لی ہے جس میں نئی مرسیڈیز کھڑی ہے۔ میں ایک شانِ تفاخر سے مرسیڈیز نکالتا ہوں اور صدر کے ایک فیشن ایبل ہوٹل کی طرف اڑنے

لگتا ہوں۔ پائپ سے دھواں اڑاتے ہوئے جب میں صدر دروازے کے پاس پہنچتا ہوں تو خودکار دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے اور دروازے پر کھڑے باوردی چوکیدار کا ہاتھ مشینی انداز میں کھٹ سے ماتھے پر جا پہنچتا ہے۔ مَیں اس کے سلام کو نظر انداز کرتا ہوا شاہانہ انداز میں اندر داخل ہوتا ہوں۔ ریستوران میں پہنچتا ہوں تو حاضرین میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ ہر شخص میری طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ کئی ایک بڑھ کر میرا استقبال کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ مَیں اپنی موجودگی سے ان کے میز کی رونق بڑھاؤں کیونکہ مَیں ملک کا نامور شاعر ہی نہیں، بہت بڑا افسر بھی ہوں ورنہ خالی خولی شاعروں کو کون پوچھتا ہے۔ میری تنی ہوئی گردن کچھ اور تن جاتی ہے اور مَیں بخوشی ان کی دعوت قبول کر لیتا ہوں۔ جب ویٹر بل لاتا ہے تو اس سے قبل کہ مَیں سب کی طرف سے بل ادا کر دوں ایک آواز مجھے خواب کی دنیا سے باہر کھینچ لاتی ہے۔ "اپنا اپنا خلوص"! یہ فقرہ سنتے ہی مَیں چونک پڑتا ہوں۔ میرا خواب ادھورا رہ جاتا ہے اور مَیں خود کو اس درمیانہ درجے کے ہوٹل میں موجود پاتا ہوں جہاں میری طرح جاگتے میں خواب دیکھنے والے بعض دیگر "دانشور" اپنے اپنے خرچ پر چائے پینے کے لیے جمع ہوتے ہیں اور چائے کی پیالی پی کر ادیب اور قاری کے رشتے پر لمبی لمبی بحثیں کرنے کے بعد یہ فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ قاری ادیب سے بہت پیچھے رہ گیا ہے کیونکہ وہ ان کے تجریدی افسانے کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا اور آج بھی کرشن چندر، منٹو اور بیدی کی کہانیاں پڑھتا ہے۔ مَیں جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں اور گن کر ایک روپیہ آٹھ آنے نکال کر پلیٹ میں رکھ دیتا ہوں کیونکہ مَیں جانتا ہوں کہ اگر دو روپے دے دیے تو آٹھ آنے واپس نہیں ملیں گے اور پیسے جمع کرنے والے کی چائے مفت میں ہو جائے گی۔

لیکن نکٹائی نہ باندھنے کی صرف یہی ایک وجہ نہیں۔ بعض اوقات نکٹائی باندھنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مَیں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا ہوں۔ ممکن ہے مجھ میں یہ احساس اس لیے پیدا ہوتا ہو کہ نکٹائی کو صلیب کی علامت بتایا جاتا ہے۔ یا پھر مَیں موت سے خوفزدہ ہوں گا جبھی تو مجھے نکٹائی پھندا محسوس ہوتی ہے۔ لیکن موت سے تو کسی کو بھی مفر نہیں۔ موت تو نکٹائی نہ لگانے والوں کو بھی وقتِ مقررہ پر آ دبوچتی ہے کہ ہر نفس کو جلد یا بدیر موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ ویسے بھی موت سے ڈرنا بے معنی بات ہے کیونکہ زندگی کی ساری گہما گہمی محض اسی لیے ہے کہ انسان کو ایک دن مرنا ہے اور وہ اس مہلتِ یک دو نفس کو غنیمت جان کر کچھ کر گزرنا چاہتا ہے کیونکہ زندگی مہلتِ عمل ہی تو ہے۔ جس نے اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر کوئی نیک کام کر لیا وہی فلاح پانے والوں میں سے ہے اور جس نے اس مہلت کو لہو و لعب میں ضائع کر دیا وہی خسارہ پانے والوں میں سے ہے۔ موت کا ڈر بھی درحقیقت انہی لوگوں کو ہوتا ہے جن کے پاس موت کا مقابلہ کرنے کے لیے اعمالِ صالح کے ہتھیار نہیں ہوتے۔ سو اگر میں موت سے خوفزدہ ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے پاس اعمالِ صالح کے وہ ہتھیار نہیں جن سے مَیں موت کے خوف کو شکست دے سکوں۔

لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ نکٹائی نہ باندھنے کے کچھ اور محرکات ہوں جو میری گرفت میں نہ آ رہے ہوں۔ ممکن ہے میرے نفس میں کوئی ایسی گرہ پڑ گئی ہو جس کا نکٹائی کی گرہ سے خاص تعلق ہو۔ ایسی صورت میں میرا اس مسئلہ پر سوچنا بیکار ہے کیونکہ مَیں نفسیات دان نہیں لیکن مَیں کسی نفسیات دان کو بھی اس مسئلہ پر غور کرنے کی دعوت نہیں دے سکتا۔ ممکن ہے وہ میرے شعور اور لاشعور کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ صادر کر کے مجھے شرمندہ کر دے کہ مَیں نکٹائی باندھنے سے محض اس لیے گریز کرتا ہوں کہ ایسی صورت میں مَیں اپنی وہ پرانی قمیص استعمال کرنے سے محروم ہو جاتا ہوں جس کے پھٹے ہوئے کالر پر مفلر پردہ ڈالے رکھتا ہے۔

شادی

جان کاشمیری

آج تک دنیا کا کوئی فلسفی یا سائنسدان یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ زندگی کس خاص مقام سے بڑھتی ہے اور کس مقام سے گھٹنے کے عمل سے دوچار ہوتی ہے جہاں سالگرہ منا کر زندگی کو ایک نئے سال کی گرہ میں جکڑ کر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے وہاں اُسی ثانیے گھڑیال کی ٹن ٹن انسان کو خبردار کرتی ہے کہ اے نادان تُو نے عمر کی ایک اور اہم گھڑی گنوا دی ہے۔ کیا خوشی غم کا دُم چھلا ہے یا غم خوشی کا پس انداز کیا ہوا خزانہ یا دونوں کی حقیقت کچھ اور ہے۔ زندگی ماورائی ہو یا غیر ماورائی، لیکن یہ امر ناقابلِ استرداد ہے کہ زندگی ایک شاہراہ ہے جس پر انسان بچپن، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے کے عناصرِ اربعہ کو اپنے سانسوں کے آب و گل سے تعمیر کرتا ہے چونکہ انسانی روح جسدِ خاکی میں سمانے سے قبل ایک طویل عرصہ تک فضاؤں میں آزاد منشی اور بے پروائی کا شکار ہو چکی ہوتی ہے اس لیے جب اس کا انسانی بدن میں ورودِ مسعود ہوتا ہے تو یہ اپنی سابقہ تہذیب و تربیت کے کمالات کا خاطر خواہ مظاہرہ کرتی ہے۔ وہی بادشاہوں کی سی ادائیں، ہر چیز سے بے نیازی۔ راضی ہونے پر آجائے تو صرف مسکراہٹ کے عوضانے میں راضی ہو جائے اگر ضد پر اڑ جائے تو پاؤں میں ارض سما کی تمام تر نعمتوں کو لا کر رکھ دیجیے، راضی ہونا تو کجا موڈ تک ٹھیک نہیں ہوگا۔ انسان نے اپنی سہولت کے لیے اس عرصۂ حیات کو بچپن کے نام سے موسوم کر رکھا ہے۔ بچپن دستِ فطرت کی بے ساختہ بُنت کاری ہے، بچپن فطرت ہی کا ایک رُوپ ہے، بچپن زندگی کی کونپل ہے، بچپن پارے کا سونا ہے جو ملمع سازی اور تصنع سے پاک ہوتا ہے۔ بچپن مجسّم سچائی ہے، بچپن خدا کی ایسی عطا ہے جو سب انسانوں میں برابر تقسیم ہوتی ہے، بچپن دیکھنے میں کچھ نہیں مگر حقیقتاً وہ بنیاد ہے جس پر بعد میں انسانی عظمت کی عمارت ایستادہ ہوتی ہے۔

جب یہی بچپن گردشِ زمانہ کی آغوش میں لڑکپن اور جوانی کی صورت میں کونپل سے کلی اور کلی سے پھول بنتا ہے تو اس کی بے نیازی کسی کے نیاز کے لیے تگ و دو کرتی ہے، لڑکپن بچپن کے جوانی کے سانچے میں ڈھلنے کی مقدس مدت ہے۔ لڑکپن بچپن اور جوانی کے مابین حدِ فاصل ہے، لڑکپن بچپن اور جوانی کا گٹھ جوڑ ہے اور جوانی پھولوں کے خوشبو پاش ہونے کا خوشگوار عمل ہے۔ جوانی خدا کو تلاش کرنے کا شارٹ کٹ رستہ ہے، جوانی حُسن کی محتاج نہیں بلکہ حُسن اس کے دَر پر کاسۂ گدائی لیے کھڑا رہتا ہے، جوانی جوان جذبوں کا مخزن ہے، جوانی عزم و عمل کا وہ طوفان ہے جو کسی سے روکے نہیں رُکتا۔ جوانی زندگی کا سولہ سنگار ہے۔ جوانی زیست کی معراج اور شادی اس معراج کا تاج ہے۔ شادی زندگی کی گیند کو آسمان کی جانب پھینکنے کے بعد وہ سیماب صفت لمحہ ہے جو انتہائے عروج اور ابتدائے زوال کے درمیان معلق ہوتا ہے۔ شادی زندگی کے سہل ترین اور مشکل ترین مراحل کو گرفت میں لینے کا نام ہے، اس وقت انسان کی ایک آنکھ پر عروج کا نشہ سوار ہوتا ہے اور دوسری آنکھ میں اس نشے کے ہرن ہونے کی داستانِ عبرت رقم ہوتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تک زندگی بڑھتی اور پھولتی پھلتی ہے اس کے بعد زندگی زوال پذیری کا شکار ہو جاتی ہے اس لیے عقلمند لوگ شادی کے بعد عمر کی سالگرہ کو زینتِ طاقِ نسیاں بنا کر شادی کی سالگرہ مناتے ہیں۔

شادی نسلِ آدم کی افزائش کا پاکیزہ فارمولا ہے۔ شادی دو دلوں کی دھڑکنوں کا ملاپ ہے۔ شادی محبت کرنے والوں کی رومانی مسرتوں کا زرق برق خاکہ ہے۔ شادی گناہ کی ترغیب سے روکتی ہے۔ شادی ایک ایسی طویل دعوتِ سمرقند ہے جس کی ابتدا سویٹ ڈش سے ہوتی ہے۔ شادی والدین کی طرف سے اپنے فرائض سے سبکدوشی

کا اعلان اور دولہا کے لیے ذمہ داریوں کو نبھانے کا عہدنامہ ہوتی ہے ۔ والدین جوں جوں اپنے بچوں کی شادیاں رچاتے جاتے ہیں وہ قسط وار ریٹائر ہوتے رہتے ہیں۔ یا اپنے عہدِ زریں کی یاد کو تازہ کرکے بڑھاپے کی جھریوں کے غرفوں سے جوانی کو تلاش کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں والدین کا اپنی شادی کی سالگرہ منانا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے مگر سال خوردہ بڑھاپا جوانی کو کیونکر ڈھونڈ سکتا ہے، جب کامیابی کے آثار دُور دُور تک دکھائی نہیں دیتے تو بڑھاپا اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ شاگرد رفتہ رفتہ یہ استاد فی رسد کے خود کار نظام کے تحت دائرۂ دنیا ٹوٹ پھوٹ کی نذر ہوتا رہتا ہے اور پھر کاملیت کے جذبات سے سرشار ہو کر انسان کی بے بسی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

سگائی شادی کی بسم اللہ، جہیز گنج قاروں اور ولیمہ اس گنج قاروں کی رسمِ افتتاح ہے۔ شادی نسلِ آدم کی تخلیق کے ساتھ بہت سے دیگر مسائل کی تخلیق کا بھی موجب بنتی ہے۔ بھائیوں کی علیحدگی کے علاوہ ساس بہو کا تاریخی جھگڑا شادی کا اوّلین کارنامہ ہوتا ہے۔ ساس اپنے اختیارات کی منتقلی میں ٹال مٹول سے کام لیتی ہے جبکہ بہو بلا کسی تاخیر کے انتقالِ اقتدار چاہتی ہے، ایک طرف مجسم تقدس اور دوسری طرف سراپا جذبات ہونے کے سبب اس جھگڑے میں دولہا کی حیثیت دو مُلاؤں کے درمیان مُرغی والی ہوتی ہے۔ ویسے ساس اور بہو کا جھگڑا اس قدر اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ جس گھر میں اس کی گرم فرمائی نہ ہو لگتا ہے کہ اس گھر میں شادی نہیں ہوئی خدانخواستہ کچھ اور ہوا ہے۔ دولہا بزعمِ خود یہ خیال کرتا ہے کہ شادی کے بعد اس کی حکمرانی کا دُور دورہ ہوگا لیکن اس کے برعکس تمام تر آزادیاں سلب کرلی جاتی ہیں اور دورِ غلامی کی ابتدا ہوجاتی ہے۔ شادی جہیز کے علاوہ نئے رشتہ داروں ساس، سُسر، سالا، سالی، ہم زلف، چچا سُسر، ماموں سُسر، خالہ ساس، پھپھی ساس وغیرہ ہم کی ایک طویل فہرست بھی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اصل میں ساس، سُسر، سالا اور سالی ہی قابلِ ذکر رشتے ہوتے ہیں جو تمام کے تمام لفظ "س" سے شروع ہو کر اپنے دائمی ہمیشہ کی دلیل مہیا کرتے ہیں بقیہ آپس داریاں تو ان کے احساسات کا جوار بھاٹا ہوتی ہیں۔

کچھ شادیاں خود تشخیصی نظام کے تحت عمل میں آتی ہیں، ان میں دولہا اور دلہن کے اہلِ خانہ پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ پیش منظر فقط دولہا اور دلہن کا "کلوز اپ" تسلسل کے ساتھ پیش کرتا ہے چنانچہ دولہا اور دلہن پھولے نہیں سماتے جس کے نتیجے میں کبھی کبھار شادی مرگ کا سانحہ بھی رُونما ہوجاتا ہے۔ کچھ شادیاں خطائے بزرگاں گرفتن خطا است کے خوف سے پایۂ عروسی تک پہنچتی ہیں اس طرح کی شادی میں دُولہا اور دلہن خود کو سُپردِ فریقین کرنے کی بجائے سپردِ خدا کرتے ہیں۔ ساری فضا گھٹن کی ماری ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں پھولے نہ سمانا تو ایک طرف مسکراہٹوں کی رم جھم تک برسانے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ شادیاں روحانی وصال سے تہی ہو کر جسمانی ملاپ تک محدود رہتی ہیں۔ ان پر شادی مرگ کی بجائے "مرگِ شادی" کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ روحیں عالمِ بالا ہی میں عقد کی مراحل سر کرکے عالمِ موجودات میں وارد ہوتی ہیں جو دنیاوی تقاضوں اور مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر روحانی صداؤں کے لیے گوش بر آواز رہتی ہیں۔ اس سلسلے میں ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، عذرا وامق شیریں فرہاد اور لیلیٰ مجنوں وغیرہ کے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ کچھ اور لوگ بھی پیدائشی اعتبار سے شادی شدہ ہوتے ہیں، ان کے شادی کرنے کا اپنا ایک خاص وضع کردہ طریق ہوتا ہے، ان کو عموماً شادی خاں، شادی لال یا دولہا خان کہہ کر پکارا جاتا ہے، یہ لوگ زمین کے جس ٹکڑے پر نازل ہوتے ہیں اُسی سے اپنی شادی رچا کر کہیں شادیوال اور کہیں شادی پور کی پیدائش کا سبب بنتے ہیں۔

ہر شعبۂ حیات میں جدید ٹیکنالوجی کا عمل دخل ہوگیا ہے، بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ آدابِ عقد اس سے استفادہ نہ کرتے۔ شادی پہلے حیات بخش یا اولاد بخش ہوتی تھی لیکن اب ان دونوں خوبیوں کے یہاں بین منافع بخش کاروبار کی شکل میں تبدیل ہوگئی ہے یہی وجہ ہے کہ جگہ جگہ میرج بیورو کے دفاتر کھل گئے ہیں، کہیں فون پر معاملات نپٹائے جارہے ہیں، کہیں اخبارات کے توسل سے ابتدائی اُلجھنیں دُور کی جارہی ہیں۔ کہیں شربت کے پیالے پر نکاح پڑھا کر اطمینان کا اظہار کیا جاتا ہے، کہیں دنیا جہان کی سب نعمتوں کے حصول کے بعد بھی بے سکونی ہی بے سکونی ہوتی ہے، اس کے باوجود مختلف شادیاں مختلف انسانوں پر نوع نوع کے اثرات مرتسم کرتی ہیں جو منفی بھی ہوتے ہیں اور مثبت رویوں کے غماز بھی۔ کہیں لفظ "شادی" خانہ آبادی کا ہم قافیہ ثابت ہوتا ہے، کہیں خانہ بربادی کے قافیہ کو استعمال کرتا دکھائی دیتا ہے، کہیں

ایک ہی وقت میں دونوں قافیوں کو بروئے کار لا کر محبت کی غزل کو خارج از بحر کر دیتا ہے۔ کہیں شادی کے بعد بخت کا ستارہ چمک اٹھتا ہے اور کہیں تلاشِ بسیار کے باوجود چمکنا تو در کنار ستارہ نظر تک نہیں آتا۔ کہیں ملٹن جیسے عظیم لکھاری کو شادی کے بعد "فردوسِ گمشدہ" تحریر کرنی پڑتی ہے اور بیوی کے انتقال کے بعد "فردوسِ بازیافت" کی سولی پر لٹکنا پڑتا ہے۔ بنا بریں یہ امر مسلّمہ ہے کہ فریقین کی قدر و اہمیت کا ادراک اسی وقت ہوتا ہے جب دونوں میں سے ایک اس جہانِ بے ثبات سے کوچ کر جاتا ہے۔

انسان فطرتاً قناعت پسند نہیں ہے اور "اور" کی رٹ لگائے پھرتا ہے۔ اس لیے مذہب کے لحاظ سے چار شادیوں کو جائز قرار دیا گیا۔ انسان نے پھر بھی قناعت پر تکیہ نہ کیا اور بادشاہی ادوار میں اصول و ضوابط کے روشن میناروں کو یوں تعددِ ازدواج کے گڑھوں میں دفن کیا گیا جیسے سوراخ دار کشتی کو دریا میں دھکیل کر خدا حافظ کہہ دیا جائے۔ چنانچہ بادشاہی تاریخ سنہری کارناموں سے زیادہ شادیوں سے بھری پڑی ملتی ہے۔ رعایا کا تعددِ ازدواج کے چکر میں پڑنا بادشاہ کے لیے خطرے کا سگنل ہوتا ہے۔ لیکن جب بادشاہ اس وبا کی لپیٹ میں آ جائے تو قوم کو قعرِ مذلت میں گرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

دنیا کی ہر چیز کو شادی کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ جو چیزیں اس کی افادیت سے انکاری ہوتی ہیں ان کی نسل رفتہ رفتہ اس دنیا سے ناپید ہو جاتی ہے۔ جو ان میں تجربات نہیں کرتیں ان کا دامن تنوّع کی دولت سے خالی ہو کر یکسانیت کے عیوب سے مملو ہو جاتا ہے۔ زبانیں، الفاظ، درخت، پودے، رنگ اور چاند ستارے بھی بیاہے جاتے ہیں۔ انسانوں کی طرح ان کی شادیاں کامیاب اور ناکام بھی ہوتی ہیں۔ یونانی اور عبرانی کا عقد ہوا تو عربی کی ترویج ہوئی۔ انگریزی اور فارسی نے عربی کی اس قدر خوشہ چینی کی کہ انگریزی بڑی بہن اور فارسی چھوٹی بہن بن گئی۔ بڑی بہن انگریزی نے حیرتناک حد تک ترقی کی منازل طے کر کے بظاہر خون کے ناتوں کو فراموش کر دیا لیکن چوری چھپے الفاظ کے شہزادوں کو اپنے شجرۂ نسب کی یاد دہانی کراتی رہی۔ آگے چل کر فارسی اور عربی نے پرانے رشتوں کی بازیافت کے لیے اپنی اولاد کے ایک دوسرے سے رشتے کیے جس کے نتیجے میں اردو معرضِ وجود میں آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اردو نہ صرف جوان ہو گئی بلکہ اس قابل بن گئی کہ علیحدہ گھر بسانے کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی نسل سے اپنی نسل کے عقد طے کر سکے۔ جب فارسی کے لفظ "دُھل" نے سرائے اردو میں رات گزاری تو ڈھل سے "ڈھول" بن گیا۔ جب فارسی لفظ "پیل" نے سایۂ تعریب تلے کچھ دیر آرام کیا تو "فیل" کے قالب میں ڈھل گیا۔ جب عربی کے لفظ "افراط و تفریط" کا اردو زبان سے ناتا ہوا تو یہ "افراتفری" کی صورت اختیار کر گیا۔ جب فارسی کے لفظ مادر اور برادر نے انگریزی سے نسلی گٹھ جوڑ کیا تو مدر (MOTHER) اور برود (BROTHER) کا موقر سوانگ بھر لیا۔ جب انگریزی خاندان کے پسٹل (PISTOL) نے مجلوم تہذیب میں رات بسر کی تو فقط "پستول" رہ گیا۔ جب فارسی کے "تبہ ریزہ ام" اور "پاشو نیدان" نے پنجابی زبان کی طرف نظرِ التفات کی تو "تر یجا امب" اور "نہ پھویا کُن" کہلائے۔

کنو، مالٹے اور سنگترے کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ان میں سے ہر اپنی شاخچہ بندی سے "کھٹی" کے پودے کی کھیپی بھرتا ہے۔ کھٹی کا پھل اپنے دامن میں اسی کی لذت اور شکل کو پرورش کرتا ہے۔ اسی طرح خوبانی کی قلموں کو آڑو کے درخت سے رشتۂ مزاوجت میں پرو کر مطلوبہ ثمر حاصل کیا جاتا ہے۔ کچھ پودوں اور درختوں پر داب کی نکاح خوانی کر کے ان کی نسل کو بڑھایا جاتا ہے۔ اگرچہ رنگوں کے جہان میں بنیادی طور پر سرخ، سبز اور نیلا تین رنگ ہیں مگر ان ارکانِ ثلاثہ نے افزائشِ نسل کا اس قدر وافر اور عمدہ اہتمام کیا ہے کہ آج ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔ مور کے پروں، گلاب کے مختلف پھولوں اور خوبصورت مناظرِ فطرت کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان تین رنگوں نے انسانوں کی کیسے کیسے بصارتی خدمت کی ہے۔ بالخصوص آسمان کے سر کی مانگ قوسِ قزح کو دیکھ کر یہ خیال عود کر آتا ہے کہ بنیادی طور پر تین کی بجائے سات رنگ ہیں حالانکہ ایسا نہیں بلکہ یہ تین رنگوں کا منہ بولتا معجزہ ہے۔ چاند سرِ شام سر پہ چاندنی کا سہرا سجائے ستاروں کی بارات ساتھ لیے اپنی دلہن کو بیاہنے کی خاطر گھر سے نکلتا ہے۔ صبح تک کے سفر کی تھکاوٹ کو دور کرنے کے لیے سارا دن آرام و سکون سے گزار کر پھر نئے ولولے سے عازمِ منزل ہوتا ہے۔ شاید اس کی دلہن کی نگریا بہت ہی دور ہے یا پھر چاند میاں انسانوں کی آنکھوں میں مٹی جھونک کر اپنا کام نکال رہے ہیں۔

شادی ہر علاقے کے رسم و رواج کے مطابق پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ رسم و رواج کا انداز چاہے کتنا ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہو اس میں جو مرکزی عنصر مشترک ہوتا ہے وہ مسرت کا اظہار ہے۔ ڈھولک کی تھاپ دل کی تھاپ بن جاتی ہے۔ شہنائی کی آواز سے سانسوں کی آمد و رفت تیز ہو جاتی ہے۔ انسانوں کے جمِ غفیر میں بھی دل میں تخلیہ کی خواہش انگڑائیاں لینے لگتی ہے مگر دلہن گھر کے ایک کونے میں دبکی بیٹھی شادیانوں کی لے کو آنسوؤں کی روانی میں مدغم کرنے میں مشغول ہوتی ہے۔ پہلے دلہن میکے سے میت کے گھر کا سفر پالکی میں بیٹھ کر کہاروں کے دوش پر کیا کرتی تھی تاکہ نئی حیات کی راہِ کٹھن پر گامزن ہونے کے لیے اُسے سوچ بچار کی خاطر آرام و سکون فراہم کیا جا سکے۔ اب پالکی کا استعمال اسلاف کی نشانی کے طور پر تبرکاً ہوتا ہے حالانکہ حقیقت پسندی سے دیکھا جائے تو پالکی کے بغیر شادی کا تصور نثری نظم کی سی بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ دولہا کی شادی کا تو محض تکلفاً ذکر کیا جاتا ہے۔ بن محافہ کے شادی، اُس لفظ کے مانند لگتی ہے جس سے مفہوم کا گوہر برعنقا ہو گیا ہو۔ شادی تو دلہن کی ہوتی ہے جو ڈولی میں بیٹھ کر زمین پر پاؤں رکھے بغیر دشوار گزار مراحل پر ایسے گامزن ہوتی ہے جس طرح تن کے پنجرے سے رہائی کے بعد روح۔ دراصل یہ شادی اُس شادی کی ریہرسل ہوتی ہے جس میں ہر انسان تابوت کی پالکی کو قبر کی پالکی میں رکھ کے نئی مگر لافانی زندگی کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔

جان کاشمیری کی درج ذیل کتب بہت جلد اشاعتی مراحل طے کر کے عوام الناس تک پہنچنے کا شرف حاصل کر رہی ہیں

"تیسری آنکھ" زیرِ طبع (انشائیے)

"اعراف" زیرِ طبع (شعری مجموعہ)

"تکلف برطرف" زیرِ طبع (خاکے)

"ہم تم پاکستان ہیں" زیرِ طبع (بچوں کی نظمیں)

محمد یونس بٹ۔ "شوخیاں" زیرِ طبع (انشائیے)

محمد اقبال انجم۔ "گہرائیاں" زیرِ طبع (انشائیے)

انگڑائی

محمد اقبال انجم

ہمارے شاعروں نے انگڑائی کو ایسی حرکت سے تشبیہہ دی ہے کہ یہ فقط محبوب کی توبہ شکن ادا بن کر رہ گئی ہے جسے وہ شاخِ بدن میں تلاش کرتے کرتے شاخِ گل تک جا پہنچے ہیں۔ لیکن میں جب بھی انگڑائی کی ماہیت پر غور کرتا ہوں تو ڈارون کی تھیوری پر میرا شک یقین میں بدل جاتا ہے۔ اس نے محض بندر کو انسان کا جدِّ امجد قرار دیتے وقت نہ جانے اس کی کس خوبی کو مدِّنظر رکھا۔ حالانکہ انگڑائی جیسی ہمہ گیر صفت کا مطالعہ کیا جائے تو انسان کا رشتہ بندر سے تو کیا ننھی منّی چڑیا سے لے کر شیر تک سے ملایا جا سکتا ہے کیونکہ انگڑائی ان سب میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ پرندے طویل اڑان کے بعد کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی چونچ سے جسم کے مختلف حصّوں کو گدگدا کر سرور کے لمحے تخلیق کرتے ہیں۔ پھر اڑنے سے پیشتر پروں اور ٹانگوں کو تا حدِ امکان پھیلا کر انگڑائی لینے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کتّے اور بلّیاں بھی شکار کی تلاش میں نکلنے سے پہلے انگڑائی کے لیے اپنے جسم کو یوں کھینچتے ہیں جیسے تیر اندازی کے لیے کمان کو کھینچا جاتا ہے۔ انسان بھی مختلف کیفیات کے تحت انگڑائی کے عمل سے گزرنے پر مجبور ہے۔ گویا انگڑائی زندہ حیات کی علامت ہے۔

یہ بات تو اہلِ زبان بتا سکتے ہیں کہ لفظ انگڑائی کیسے وجود میں آیا۔ اس کی ترکیب کن حروف کا مجموعہ ہے لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ رقص کو اعضاء کی شاعری قرار دینے والوں نے انگڑائی کے پیچ و خم کو کس طرح نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ مختلف قوموں کے رقص دیکھ کر اُن پر انگڑائیاں لینے کا گمان گزرتا ہے۔ انگڑائی لینے کے دوران ایک سنجیدہ اور باوقار شخص بھی سرکس کا جوکر نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو دیکھنے والوں کو نہ سہی لیکن انگڑائی لینے والوں کو ایسی لذت سے ہمکنار کرتی ہے کہ اکثر اسی حالت میں رہنے کو جی چاہتا ہے لیکن اس کے اختصار کا یہ عالم ہے کہ اپنے آغاز ہی میں انجام کو پہنچ جاتی ہے۔

ایک دفعہ میں دن میں مختلف اوقات میں آنے والی انگڑائیوں پر غور کر رہا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ ہم تو انگڑائی کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ سونے سے قبل اور بیداری کے بعد، طویل مطالعے، سفر یا کسی بھی مصروفیت کے آخر میں انگڑائی پورے وجود کو یوں جھنجھوڑ دیتی ہے جیسے نئی فصل بونے سے قبل زمین کو ہل چلا کر اتھل پتھل کر دیا جاتا ہے۔ جب زمین کی ٹھوس سطح کے اندر دبے ہوئے معدنیات کے ذخیرے ایک طویل گھٹن کے بعد انگڑائی لے کر بیدار ہوتے ہیں اور زمین کا سینہ چاک کر کے اُبل پڑتے ہیں تو ہم اس عمل کو زلزلے کا نام دیتے ہیں۔ سمندروں میں پیدا ہونے والے بھنور دراصل موجوں کی انگڑائی ہیں جو اُنہیں حدودِ بحر کو پھلانگ جانے کی ترغیب دیتی ہیں۔ گویا اکتاہٹ انگڑائی کو جنم دیتی ہے اور انگڑائی کچھ کر گزرنے کی خواہش کو مہمیز لگاتی ہے۔ انگڑائی ماضی سے رشتہ توڑ کر مستقبل سے استوار کرتی ہے۔

انگڑائی کی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض عالمِ بے قراری میں فقط انگلیاں چٹخا کر رہ جاتے ہیں اور بعض صرف جماہی پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔ یوں تو یہ تینوں ادائیں ہم رشتہ معلوم ہوتی ہیں لیکن اُن کی حدود و قیود مختلف ہیں۔ جماہی لیتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دونوں جبڑے متناطیس کے دو مخالف پول بن

پٹکے ہیں جو ایک دوسرے کو پوری شدت سے پرے دھکیل رہے ہوں۔ اور انگڑائی پورے جسم کو یوں کھینچتی ہے کہ بعض اوقات انسان بلبلا اٹھتا ہے۔ لمحے بھر کو پورا بدن انگڑائی کی صلیب پر آویزاں نظر آتا ہے۔ جماہی بیزاری کی علامت ہے اور انگڑائی آسودگی کی خواہش، جماہی نیند کا پیغام ہے اور انگڑائی عمل کی صدا۔ جب سینے میں دبی ہوئی خواہشیں ذہن کے پردۂ سکرین پر ایک موہوم سی تصویر بناتی ہیں تو انسان کامیابی کے تصور سے کھل اٹھتا ہے۔ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا سوچتا ہے تو انگڑائی اس کے جسم کے پوشیدہ گوشوں میں چھپے ہوئے کاہلی کے جراثیم جھٹک کر ان میں حوصلے اور ولولے کی دنیا آباد کرتی ہے۔ گویا انگڑائی ایک ایسی طرزِ سخن ہے جو صدا میں نہیں، ادا میں ڈھل کر اعضا کے راستے باہر نکلتی ہے۔

ابرو باراں کے دوران سورج بادلوں کی نقاب اوڑھے چھپا رہتا ہے لیکن اندر ہی اندر اس کے اضطراب اور پیچ و تاب کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جہاں ذرا سا راستہ دیکھا اپنی کرنوں سمیت جھپک پڑا۔ لیکن بادل بھی ایک کائیاں ہوتے ہیں۔ وہ بھی روزنِ فلک پر پنبہ کاری سے راستہ روکے رہتے ہیں۔ پھر جب طویل غیر حاضری کے بعد خورشیدِ جہاں تاب کی کرنیں بادلوں کی اوٹ سے سر نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں تو ایک انگڑائی لے کر دھنک کی صورت میں تمام آسمان پر پھیل جاتی ہیں۔

شہر میں ایک دن ملک کے بہت بڑے مصور کے آرٹ کی نمائش کا اعلان ہوا۔ مصوری کا خیال آتے ہی افکار کو خطوط کے حسنِ ترتیب میں ڈھالنے کا صبر آزما عمل نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ دوستوں کے اصرار اور اپنی خواہش پر ہم بھی نمائش دیکھنے گئے۔ چار سُو دیواروں پر چھوٹے بڑے کینوس رنگوں کا بوجھ اٹھائے آویزاں تھے۔ میں نے ہر چند ان سے چہرے کے نقوش اور مناظر کا حسن تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ رنگوں کے اس جہان کی کوئی بھی کل سیدھی نہ تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے مختلف خطوط انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ یہ کس قسم کی مصوری ہے جو اپنے ماضی سے رشتہ توڑ کر پریشان ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ تجریدی آرٹ ہے۔ مجھے حیرت ہوئی لیکن چند لمحوں میں میری سوچ نے میری حیرت کا گلا دبا دیا کہ شاید یہ انگڑائیاں بھی صدیوں کی گھٹن کے خلاف بغاوت کا اظہار ہیں۔ اور اب ایک نیا دور شروع ہونے کو ہے۔ اسی طرح آزاد شاعری بھی سینۂ شباب کی وہ منچلی روح ہے جو صدیوں سے روایت کے بوجھ تلے دبی ہوئی کراہ رہی ہو۔

محض افراد ہی نہیں قومیں بھی انگڑائی لیتی ہیں اور تاریخ نے ایسی تمام انگڑائیوں کو اپنے اوراق میں محفوظ کر رکھا ہے۔ میں جب بھی امریکہ کے مجسمۂ آزادی کو دیکھتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ نیم انگڑائی کی صورت میں کھڑا ہے۔ ہو سکتا ہے اہلِ فرانس نے شمعِ آزادی کو امریکی عوام کے دلوں میں فروزاں رکھنے کے لیے اسے ایسی شکل میں ڈھالا ہو۔ لیکن نادانستگی میں قوم کے جذبۂ آزادی کی پہلی انگڑائی دھات میں مجسم ہو چکی ہے۔ حقیقتاً وہی پہلا قدم محفوظ رکھنے کے قابل ہوتا ہے، جو انسان یا قوم کو منزلِ مراد پر لے جائے۔ ویسے تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ تمام جذبے اور کوششیں بار آور نہیں ہوتیں۔ انسانوں کی کتنی نسلیں ان جذبوں کی پرورش میں مصروف رہتی ہیں۔ پہلی انگڑائی سے کامیابی کا پرچم تھامنے تک خون کی کتنی ندیاں عبور کرنا پڑتی ہیں، لیکن یہ تمام سفر بہت نازک ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے نشیب کی پستیاں اور سامنے فراز کی کامیابیاں باہیں پھیلائے منتظر ہوتی ہیں۔

جس طرح انگڑائی لینے کے مختلف انداز ہیں، اسی طرح اس کے مختلف اوقات بھی ہیں۔ یہ اوقات و انداز انگڑائی کے دروبست اور اس کے اثرات پر مختلف نقوش ثبت کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انگڑائی اسی وقت مزہ دیتی ہے جب جسم میں حرارت اور توانائی ہو، ضعیفی میں انگڑائی کا کیا تصور۔ اگر اس عمر میں کوئی بچی کھچی انگڑائی سر اٹھانے کی کوشش کرے بھی تو خمیازے کے طور پر جسم کا کوئی نہ کوئی پٹھا چڑھ جاتا ہے۔ ہماری ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی بھی بجھتے ہوئے چراغ کی آخری انگڑائی تھی۔ لیکن یہ انگڑائی ایسے وقت لی گئی جب بادشاہ ضعیف اور قوم مضمحل ہو چکی تھی۔ نتیجتہً یہ انگڑائی پھیل کر نوّے برس کو محیط ہو گئی۔ کتنی نسلیں اس صلیب پر آویزاں رہیں۔ کتنے لوگوں نے اسے تاریخ کے دامن سے کھرچنے کی کوشش کی۔ تب جا کر بہادر شاہ کے ہم قوم اس قابل ہوئے کہ وہ لارڈ کلائیو کے جانشین سے اپنا اقتدار واپس لے سکیں۔

نقاب

حیدر قریشی

اگلے روز ایک شاپنگ سنٹر پر خریداری کرتے ہوئے میری دو واقف خواتین سے ملاقات ہوئی تو مجھے پہلی بار ایک حیرت انگیز حقیقت سے آشنائی ہوئی۔ ان میں سے ایک خاصی خوبصورت خاتون تھی اور ایک نہایت بدصورت لیکن برقع پہننے کا انداز اور آدھے نقاب کا کمال تھا کہ خوبصورت خاتون تو پہلے سے بڑھ کر خوبصورت لگ رہی تھی۔ بدصورت خاتون بھی حیرت انگیز طور پر خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ تب میں نے پہلی دفعہ نقاب کے بارے میں غور کیا تو مجھ پر منکشف ہوا کہ نقاب نہ صرف حسن کو مزید نکھارتا ہے بلکہ عیوب کو ڈھانپ کر ان میں بھی ایک حسن پیدا کر دیتا ہے۔ مزید غور کرنے پر مجھے انسانی ذہن اور خواتین کے نقاب کے ارتقاء کی کہانیاں ایک دوسرے سے مربوط نظر آنے لگیں۔

شٹل کاک برقع اس دور کی بات ہے جب انسان خود کو اور کائناتی رموز کو جاننے کے لئے سرگرداں ہونے لگا تھا۔ پھر جب ریشمیں برقع پورے نقاب کے ساتھ آیا تو انسان اپنی ذات اور کائنات کی گتھیاں جان چکا تھا اور انہیں سلجھانے میں مشغول تھا۔ ریشمیں برقع پورے نقاب سے آدھے نقاب تک آیا تو انسان بھی حیرت انگیز انکشافات اور ایجادات کے دور میں آ گیا۔ جوں جوں خواتین کا نقاب ارتقاء کے مرحلے طے کرتا جائے گا انسانی ذہن بھی اپنی اور کائناتی دریافت کے عمل میں اسی رفتار سے آگے بڑھتا جائے گا۔

ویسے دنیا میں ہر شخص نے ایک نقاب اوڑھ رکھا ہے۔ تاجر، ادیب، ملا، پنڈت، افسر، ملازم، دکاندار، خریدار، سیاستدان۔ کیا یہ سب لوگ بظاہر جیسے نظر آتے ہیں حقیقتاً ویسے ہیں؟ یہ سب لوگ محبت، خلوص، ایمان اور دیانت وغیرہ کے نقاب اوڑھ کر نفرت اور ریاکاری کے کھیل کھیلتے ہیں لیکن ان کے نقابوں نے ان کے ——— عیوب کو ڈھانپ رکھا ہے۔

انسانی چہرہ بجائے خود ایک نقاب ہے جس میں سے کبھی کبھی اس کے اندر کا حیوان جھانکتا ہوا نظر بھی آ جاتا ہے۔ (اندر کا فرشتہ تو اکثر چہرے پر ہی ملتا ہے) کون ہے جو کسی دوسرے انسان کو پوری طرح جاننے کا دعویٰ کر سکے۔ انسان دوسروں کے لئے تو نقاب میں ہے ہی، خود اپنے لئے بھی وہ نقاب میں ہے۔ کوئی انسان آج تک خود کو پوری طرح نہیں دیکھ سکا نہ ہی تا حال کوئی ایسا آئینہ دریافت ہو سکا ہے جو انسان کے اندر کے سارے بھید اس پر کھول سکے۔ اسی لئے تو سلطان باہوؒ نے کہا ہے۔

"دل دریا سمندروں ڈونگھے، کون دلاں دیاں جانے ہُو"

سطح سمندر کا پانی بھی دراصل ایک نقاب ہے جس نے اس کے اندر کی ایک پوری آباد دنیا کو چھپا رکھا ہے۔ پھر یہ دھرتی بھی ایک نقاب ہے جس کے اندر چھپے ہوئے پُراسرار خزانے تمام تر معدنی اور آتش فشانی دریافتوں کے باوجود ابھی تک نقاب میں ہیں۔ اسی

بھی آگے دیکھیں تو یہ پوری کائنات ہی ایک نقاب ہے جس کے عقب میں خالق کائنات کا مسکراتا ہوا ان دیکھا مقدس حسن ہے۔ اس کائناتی نقاب سے جھانکتے ہوئے چاند، سورج، کہکشائیں اور کروڑوں ستارے اس نقاب کے عقب میں موجود ازلی حسن کی ہلکی سی جھلک دکھا کر ہمیں بے تاب کرتے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اگر ساری کائنات بنانے کے باوجود خود نقاب نہ اوڑھا ہوتا تو اس کی تلاش اور جستجو کا وہ سفر پھر کہاں ہوتا جو بڑے بڑے سادھو اور صوفی ہزاروں برسوں سے کرتے چلے آ رہے ہیں گویا نقاب ہمیں سکوت اور ٹھہراؤ کی حالت سے اٹھا کر متحرک کرتا ہے۔ تجسس کی آگ ہمارے سینوں میں بھڑکا کر ہمیں سفر پر روانہ کرتا ہے اور یہ سفر بھی چوتھے کھونٹ کا۔ چنانچہ انسان کا چاند کی طرف اور پھر اس سے بھی آگے کی طرف کا سفر ہو یا کسی عاشق صادق کا ریشمیں نقاب والے محبوب کے تعاقب میں اس کے گھر تک کا سفر ہو سب اسی چوتھے کھونٹ کے سفر کی داستانیں ہیں۔

نقاب معلوم کے جہنم اور نامعلوم کی جنت کے درمیان عالم برزخ ہے۔ نقاب کی پُراسراریت ہمارے تجسس کو بڑھاتی ہے، نقاب اوڑھنے والا خود ہی سب کو نہیں دیکھ رہا ہوتا دوسرے بھی اس کی موجودگی کا لطیف احساس رکھتے ہیں لیکن موجودگی کے اس احساس کی لطافت اس اسرار کے ساتھ بندھی ہوتی ہے کہ وہ نقاب کے باعث دکھائی دے کر بھی دکھائی نہیں دے رہا ہوتا۔ "ہونے" "نہ ہونے" کی یہ لذت صرف نقاب کی بدولت ممکن ہے۔ اگر ہر شے بے نقاب ہوتی تو کسی شے میں کوئی جاذبیت نہ رہتی۔ ہر شے معلوم، دیکھی بھالی، جانی پہچانی ہوتی تو ہم پر یکسانیت، بیزاری اور اکتاہٹ طاری کر دیتی۔ لیکن یہاں تو نقاب در نقاب سلسلے ہیں۔ کسی شے یا شخصیت کا ایک نقاب ہٹائیں تو اندر ایک اور جہانِ حیرت ایک اور نقاب سے جھانکتا نظر آنے لگا۔ پھر اس نقاب کو ہٹائیں تو ایک اور نقاب اور ایک اور جہانِ حیرت و تجسس! اسی لئے معلوم کی دریافت (بالخصوص ادب میں) ایک اختتام عمل ہے جب کہ نامعلوم کی دریافت کا عمل ہی دراصل سچائی ہے۔

انسانی جسم بھی ایک نقاب ہے جسے روح نے اوڑھ رکھا ہے۔ روح جسم سے نکل کر فنا نہیں ہوتی بلکہ موت کا نقاب اوڑھ کر اس میں زندگی بن کے دھڑکنے لگتی ہے۔

زمانے کی ماہیت پر سنجیدگی سے غور کریں تو ماضی سے مستقبل تک زمانہ نقاب اوڑھے نظر آتا ہے۔ مستقبل کے باریک مگر پورے نقاب سے ہر لحظہ جھانکتا ہوا "حال" پلک جھپکتے ہی "ماضی" کے آدھے نقاب کی اوٹ میں چلا جاتا ہے اور ہم اس لمحے کو چھونے کی پوری طرح دیکھنے کی خواہش دل میں ہی لئے رہ جاتے ہیں۔

ڈپلومیسی کا نقاب آج کل بہت عام ہے۔ عام زندگی سے لے کر بین الاقوامی سیاست تک اس نقاب کو بے حد پسند کیا جا رہا ہے۔ اس کے رواج سے پُرتکلف اخلاقیات کا فروغ ہو رہا ہے۔ بعض سرپھرے سے منافقت بھی کہتے ہیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا!

خوشامد اور چاپلوسی کا نقاب اوڑھ کر لوگ بڑے بڑے کام بھی ٹھیک کرا لیتے ہیں۔ یہ ایسا خوبصورت اور دلآویز نقاب ہے جو بڑے بڑے اصول پرستوں کو بھی متاثر کر دیتا ہے۔

دبیز نقاب جب کسی معمولی انسان کی عقل پر پڑتا ہے تو وہ عاشقِ زار بن کر محلے کے شرفا کے لئے متعدد مسائل پیدا کر دیتا ہے لیکن جب یہی نقاب کسی ادیب کی عقل پر پڑتا ہے تو وہ بے سروپا نظمیں یا مضحکہ خیز کالم لکھ کر قوم کے لئے خود ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔

امجد طفیل

دیوار

دیوار انسانی تہذیب کا ایک اہم نشان ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ دیوار نے انسانی تہذیب کو جنم دیا ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ موجودہ انسان ہر وقت دیواروں میں گھرا رہتا ہے۔ وہ بڑی بڑی دیواروں میں محصور زندگی کے دن گزارتا ہے۔ انسان نے جب خود کو غاروں میں غیر محفوظ پایا تو اس کے دل میں چار دیواری بنانے کا خیال پیدا ہوا جس کا صرف ایک دروازہ ہو۔ انسان نے غار سے نکلنے کے بعد میدان میں دیواریں کھڑی کیں۔ وہ سارا دن جنگلوں اور میدانوں میں خوراک میں سرگرداں رہتا مگر رات اپنی پناہ گاہ میں گزارتا۔ یہ چار دیواری اُسے جنگلی جانوروں سے محفوظ تو ضرور رکھتی تھی مگر بارش اور آندھی سے بچاؤ کا معقول انتظام نہ تھا۔ آخر انسان نے اس چار دیواری کے اُوپر ایک پانچویں دیوار بنائی اور یوں مکان تہذیب کی علامت بن کر اُبھر آیا۔

دیوار انسانی ارتقا کی ایک داستانِ مسلسل ہے۔ جیسے جیسے وہ تہذیب یافتہ ہوتا گیا ویسے ویسے دیواروں کی تعمیر کا فن بھی ترقی کرتا گیا۔ آج دنیا میں مختلف طرزِ تعمیر کے مکان مختلف تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ گاؤں کی کچی دیواروں کے اندر رہنے والے لوگ اپنے اندر گوشۂ نرم رکھتے ہیں مگر جونہی شہر کی پکی دیواریں شروع ہوتی ہیں لوگوں کے دل بھی سخت ہو جاتے ہیں۔

لوگوں کے نزدیک دیوار بنانے کی واحد وجہ اپنی حفاظت تھی لیکن میرے خیال میں اس کی ایک اور وجہ بھی تھی اور وہ تھی شناخت کا مسئلہ۔ جب انسان بے در و دیوار رہتا تھا تو اس کی اپنی کوئی شناخت نہیں تھی۔ مگر جب اُسے خیال آیا کہ وہ ایک کُل کا حصّہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی جگہ ایک مکمل اکائی بھی ہے تو اُسے اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ اس اہمیت کو جتلانے کے لئے اس نے اپنی ذات کے گرد دیواریں تعمیر کیں۔ اور یوں دیواروں نے اُسے کُل سے جُدا کر کے بطور جزو ایک الگ اکائی بنا دیا۔ بعد ازاں جب دیوار جس نے اسے کُل سے جُدا کیا تھا ایک رکاوٹ سی بننے لگی تو اس نے اس میں کھڑکی بنا کر کُل سے ہم کلام ہونے کی کوشش کی۔ پھر روشندان بنا لئے۔ یہ مراجعت تھی جو انسان نے اپنی اصل کی طرف لوٹنے کے لئے کی۔

میں جب بھی کسی دیوار کو بنتے دیکھتا ہوں تو مجھے FROST کی نظم MENDING WELL یاد آجاتی ہے۔ یہ نظم دیوار کی مخالفت میں ہے۔ شاعر کے نزدیک دیوار تقسیم کی ایک علامت ہے۔ خارجی اور بیرونی دیواریں انسان کی شخصیت کو متاثر کرتی ہیں فراسٹ (FROST) کے نزدیک دیوار ایک غیر فطری رکاوٹ ہے جو انسان کو انسان سے جُدا کر دیتی ہے۔ میں جب بھی یہ نظم پڑھتا ہوں، میرے ذہن میں خیالات کی رَو بہہ نکلتی ہے۔ دیوار واقعی کبھی کبھی بھائی کو بھائی سے جُدا کر دیتی ہے۔ پہلے یہ گھروں کے درمیان اُبھرتی ہے پھر دلوں کے درمیان نمودار ہو جاتی ہے۔ پھر بھی ہم دیواریں اس لئے بناتے ہیں کہ دوسرے لوگ ہمارے معاملات میں مداخلت نہ کر سکیں مگر یہ مقصد نہیں ہوتا کہ دیواریں ہمیں محدود بلکہ

محسوس کریں۔ اگر ایسا ہو تو ہم ایک جزو کی حیثیت سے اپنی شناخت ضرور کرا لیں گے مگر کُل سے ہمارا رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ بعض اوقات دیوار ایک زبردست ضرورت بن جاتی ہے۔ اس کی مثال دیوارِ چین ہے جو یاجوج ماجوج سے بچاؤ کے لئے چین کے نقشے پر نمودار ہوئی تھی۔ دیوار کی تعمیر کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اگر ہم پھر سے بے در و دیوار ہو جائیں تو ہماری تہذیب جس نے ارتقاء کی بے شمار منازل طے کی ہیں ایک دم ہزاروں سال پیچھے چلی جائے گی۔ ابتدا میں دیوار کی تعمیر اجتماع کے خلاف ایک ردِّ عمل تھا اور آج دیوار گرانا اس ردِّ عمل کی ذیل میں آتا ہے جو تنہائی کے خلاف ہے اور جو آج کے انسان کا مقدر بن چکا ہے۔ دیوار فطرت کے خلاف انسان کا پہلا اقدام بغاوت تھا جو اپنے آپ کو فطرت کے چنگل سے چھڑانے کے لئے اور اس پر فتح پانے کے لئے اٹھایا گیا تھا۔ آج کا انسان فطرت کے خلاف صف آرا بھی ہے اور پھر اسی کی آغوش میں پناہ بھی ڈھونڈتا ہے۔ چنانچہ وہ بڑے بڑے شہروں میں خوبصورت باغ لگاتا ہے مگر ان کے گرد فوراً دیوار بھی تعمیر کر دیتا ہے تاکہ ان کی حفاظت کر سکے۔

ہم ظاہرداری کی سنگلاخ دیواریں تعمیر کرتے ہوئے نجانے کیوں یہ بات فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ ان دیواروں کے پہلو بہ پہلو ایسی بہت سی دیواریں بھی ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتیں مگر جو اتنی پائیدار ہیں کہ فطرت بھی انہیں گرانے سے قاصر رہتی ہے۔ ہر چیز کو اپنے ساتھ بہا کر لے جانے والا وقت کا ریلا ان سے سر پھوڑتا ہے مگر انہیں گرانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ آج کا شہری دیوار کا اس قدر عادی ہو چکا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ ان کے اندر رہ کر گزارتا ہے۔ گو اس کے دل میں ایک خواہش مسلسل انگڑائیاں لیتی رہتی ہے کہ وہ ان دیواروں سے دُور بھاگ جائے۔ ایسی ہی ایک خواہش جب غالبؔ کے دل میں اُبھری تھی تو اس نے بے در و دیوار سا اک گھر بنانے کا پروگرام بنایا تھا مگر جسے وہ اپنے دوسرے پروگراموں کی طرح عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ یہی وہ خواہش ہے جو کبھی کبھی انسان کو در بدر بھی پھراتی ہے جس نے اسے جنّت کو خیرباد کہنے پر اکسایا تھا۔

مگر آج کے دور کے باسی نے دیوار کے بل بوتے پر ایک خوبصورت تہذیب کو جنم دے ڈالا ہے مگر بعض اوقات جب دیوار کے خلاف نفرت کا جذبہ اس کے اندر سر اٹھاتا ہے تو اصل میں وہ جذبہ دیوار کے خلاف نہیں ہوتا صرف ناروا پابندیوں کے خلاف ہوتا ہے۔

دیوار جتنی گہری زمین میں اترتی ہے اتنی ہی مضبوط اور معتبر سمجھی جاتی ہے۔ زمین اور دیوار کا رشتہ اٹوٹ ہے۔ اسی دیوار اور زمین کے رشتے نے انسان کو زمین سے پیار کرنا سکھایا ہے، وہ انسان جو دیوار بنا کر نہیں رہتا بلکہ سدا ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتا رہتا ہے زمین سے اپنا رشتہ استوار نہیں کر پاتا۔ اسی لئے خانہ بدوش کبھی زمین کی محبت میں گرفتار نہیں ہوتے۔ وہ تو ایسے پودے کے مانند ہوتے ہیں جو گملوں میں اُگتے ہیں جن کا زمین سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا کیونکہ زمین سے جُڑنے کے لئے اس کے اندر اپنی جڑیں اتارنا پڑتی ہیں اور انسان کی یہ جڑیں اس کی بنائی ہوئی دیواریں ہیں جو زمین سے اس کا رشتہ استوار کرتی ہیں۔

آنکھیں!

وزیر آغا

وہ اندھا فقیر جو صبح سویرے، گلی میں سے گزرتے ہوئے، آنکھوں والوں کو بینائی کے چھن جانے کا خوف بآوازِ بلند دلاتا ہے، دراصل اعصابی جنگ کا ایک بہت بڑا ماہر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بینائی خلقِ خدا کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ بینائی چھن جائے تو پھر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور اندھیرا چاہے وہ گہرے غار کا ہو یا گھنے جنگل کا یا تاریک قبر کا، بہرحال ایک دہشت ناک شے ہے۔ اندھا فقیر آنکھوں والوں کی اس کمزوری سے واقف ہے مگر وہ دل ہی دل میں اس نام نہاد کمزوری کی ماہیت سے بھی آگاہ ہے اور اس پر مسکرانے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہے کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ مطلق اندھیرا ایک بے معنی بات ہے۔ گہرے سے گہرے اندھیرے کی بھی ایک اپنی روشنی ہوتی ہے۔ جب بصارت کا چراغ گل ہوتا ہے تو بصیرت کی قندیل روشن ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی اندھیرے کی اوّلین یلغار آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد اندھیرے کی کوکھ میں لکیریں سی کلبلانے لگتی ہیں، نقوش اُبھر آتے ہیں، کرنیں ناچنے لگتی ہیں۔ اندھیرے کی یہ روشنی، اُجالے کی روشنی سے مختلف نوعیت کی ہے۔ اجالے کی روشنی تو بڑی ظالم چیز ہے جو اشیا کو بالکل ننگا کر دیتی ہے۔ چہرہ ہی نہیں روح تک کے داغ دھبّے اُبھر آتے ہیں۔ دوسری طرف اندھیرے کی روشنی میں سیدھی بے مہر لکیریں بھی نازک سی قوسوں کے رُوپ میں نظر آنے لگتی ہیں، نشیب و فراز کا فرق طائم ہو جاتا ہے، حقیقت کی کرختگی خواب کی خنکی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اُجالے کی روشنی میں سائنس، فلسفہ اور شماریات کو فروغ ملتا ہے۔ اندھیرے کی روشنی میں فنونِ لطیفہ کے بیج اُگتے ہیں۔ اندھے فقیر کو یہ سب باتیں معلوم ہیں مگر چونکہ وہ جانتا ہے کہ آپ اندھیرے کی برکات سے ناواقف ہیں اور اندھیرے کا نام سنتے ہی ایک نسلی اور اعصابی خوف میں مبتلا ہو جائیں گے اس لیے وہ آپ کی کور نگاہی پر فرطِ مسرت سے ایک نعرۂ مستانہ لگاتا ہے اور آپ کو اپنے پھیلائے ہوئے دام میں بآسانی گرفتار کر لیتا ہے۔ شاباش ہے!

آنکھیں محض دیکھنے کی نہیں دکھانے کی بھی چیز ہیں۔ بعض آنکھیں اُن کھڑکیوں کی طرح ہوتی ہیں جن پر رنگدار چقیں لٹک رہی ہوں۔ کوئی جب ان چقوں کی درزوں سے جھانکتا ہے تو نیچے گلی میں با ادب با ملاحظہ کھڑے نوجوانوں کی سانسیں ناہموار ہو جاتی ہیں اور شریانوں میں آبی طوفان آ جاتا ہے ——— بعض آنکھیں بالکل ننگی ہوتی ہیں، دُھلی دُھلائی ہر قسم کے لبادے سے بے نیاز! ایسی آنکھیں، آنکھیں نہیں ایکس رے (شعاعیں) ہیں۔ آپ ان کے رستے میں ہزار بند باندھیں، دیواریں کھڑی کریں، آپ ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ ان پر بال ہوتا ہی نہیں ہے۔ وہ تو ایک سُرخ آہنی سلاخ کی صورت خانۂ چشم سے باہر آتی ہیں اور آپ کے بدن ہی کو نہیں پوری شخصیت کو چھید ڈالتی ہیں۔ ہٹلر اور نپولین اور نادر شاہ کے بارے میں سنا ہے کہ ان کی آنکھیں اسی نوعیت کی تھیں کوئی ان کی آنکھوں کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا ——— بعض لوگ اپنی جسمانی قوت سے دوسروں کو زیر کرتے ہیں، بعض آواز کی گھمبیرتا، رعب اور کرختگی سے فریقِ مخالف کو زمیں بوس ہونے پر مجبور کرتے ہیں اور بعض تیز زور دار پھونکوں سے دوسروں کے چراغ گل کر دینا چاہتے ہیں مگر یہ سب ہتھیار آنکھوں کی قوت اور جبروت کے سامنے بالکل ہیچ ہیں ——— تاہم ساری آنکھیں تو دوسروں کی شخصیت کو زیر پا لانے پر مامور نہیں۔ ایسی آنکھیں بھی ہیں جو مزاج یا موڈ کی لاتعداد کروٹوں کا منظر ہمہ وقت

دکھاتی ہیں۔ ان کی حیثیت گرگٹ کی سی ہے۔ پل میں کچھ، پل میں کچھ! ابھی ان میں شرارت کھڑی مسکرا رہی تھی اور اب نفرت کٹار باندھے آکھڑی ہوئی ہے، ابھی ذہانت کا لشکارا دکھائی دیا تھا اور اب حماقت ڈان کہوٹے کے اسپ آہستہ خرام پر سوار نظروں کے سامنے سے گزر رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے آنکھوں کے پردوں پر پتلیوں کا کھیل ہو رہا ہو۔ آنکھ کو آپ آئینے سے بھی تشبیہہ دے سکتے ہیں، مگر نہیں! آئینے میں تو صرف باہر کی چیزیں منعکس ہوتی ہیں۔ آنکھ تو جامِ جہاں نما کی طرح ہے کہ اس میں لمحہ بہ لمحہ نئے سے نئے عکس پیدا ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ سارے عکس باہر سے آئے ہوئے چمکدار ریزوں یا آبدار شعاعوں سے مرتب نہیں ہوتے بلکہ از خود اندر کے "ناموجود" سے ابھرتے ہیں۔ کئی بار میں نے سوچا ہے کہ شاید ابتدا میں صرف آنکھ تھی ـــــ ایک بے کنار، محیط و بسیط آنکھ جو خلا کو گھور رہی تھی۔ پھر اچانک اس آنکھ کے اندر عکسوں کا ایک لامتناہی سلسلہ موجزن ہو گیا۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ عکسوں کا یہ سمندر، آنسوؤں میں ڈھل کر اپنے کناروں سے چھلک گیا اور پھر لاتعداد ستاروں اور سیاروں اور کہکشاؤں کی صورت بساطِ فلک پر چمکنے لگا۔ تب آنکھ نے اُسے دیکھا، مسکرائی اور کہا: "اچھا ہے[1]!"

آنکھوں کی شان میں بڑی شاندار باتیں کہی گئی ہیں۔ م۔ د۔ ک شاعر تھے آنکھوں کو آئینے پر رکھے دو خاک کے کھلونوں سے تشبیہہ دیا کرتے تھے۔ آخری عمر میں جب گوشہ نشین ہو گئے اور بینائی بھی کمزور ہو گئی تو کہا کرتے کہ آنکھیں روزنِ ادراک کے پردے ہیں۔ گویا وہ اب آنکھوں کو انکشاف کا نہیں بلکہ اخفا کا ذریعہ سمجھنے لگے تھے۔ مگر میرا خیال ہے کہ م۔ د۔ ک کی اس بات میں آدھی سچائی تھی۔ کیونکہ آنکھیں چھپاتی تو ہیں مگر ساتھ ہی منکشف بھی کرتی ہیں۔ چھپانے کے لیے آنکھوں نے شرم و حیا کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ ادھر آپ نے کسی لمحۂ خود فراموشی میں پیار بھری نظروں سے کسی کی طرف دیکھا اور اُدھر اُس جانِ حیا نے لجا کر آنکھوں کے پردے گرا لیے اور لاجونتی کی طرح سمٹ کر چادر اور چار دیواری میں محبوس ہو گئی، جیسے کہہ رہی ہو کہ میں اتنی نازک اور اَن چھوئی ہوں کہ بیباک نظروں کے لمس کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی ـــــ مگر اخفا کا دوسرا پہلو "آنکھ چرانے" کے ذیل میں آتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ آپ جب نقب لگا کر فریقِ مخالف کے دل میں اُترتے ہیں جہاں موصوف کے اندر کی ساری خباثت اور منافقت کھلے مُنہ، سربازار بیٹھی ہوتی ہے اور فریقِ مخالف کو بھی اطلاع ہو جاتی ہے کہ موصوف کی چوری پکڑی گئی ہے تو اُس کے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکے۔ سو وہ آنکھ چرانے کا مرتکب ہوتا ہے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کے لیے بلا کی خود اعتمادی درکار ہے۔ جہاں یہ صفت موجود نہ ہو وہاں آنکھیں چرائے بغیر چارہ نہیں ہے۔

مگر آنکھیں اخفا کے علاوہ انکشاف کا ذریعہ بھی تو ہیں۔ میں جب کبھی اپنے لڑکپن کی یادوں کو کریدتا ہوں تو مجھے اپنے ایک بزرگ تخت پوش پر لیٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ میں انہیں دس برس تک اسی ایک تخت پوش پر بے حس و حرکت لیٹے ہوئے دیکھتا رہا۔ ان پر فالج گرا تھا اور ان کا سارا جسم پوری طرح مفلوج ہو گیا تھا البتہ ان کی آنکھیں زندہ اور فعال تھیں۔ انہیں جو کچھ کہنا ہوتا اپنی آنکھوں کی پتلیوں کی مدد سے کہتے۔ ان کی آنکھوں کی زبان کو صرف ان کی ایک پوتی سمجھتی تھی۔ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی جہاں دو گول سی پتلیاں، بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اوپر نیچے اور دائیں بائیں حرکت کر رہی ہوتیں اور پھر فرفر اُن کی بات گھر والوں کو بتا دیتی۔ میرے اس بزرگ کا جسم تو مفلوج تھا مگر شاید تلافی کے طور پر ان کی آنکھوں کی قوتِ گویائی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اس پر تکلم کی ہزار نیرنگیوں کو بآسانی قربان کیا جا سکتا تھا۔ مگر آنکھیں قریب ہی سے نہیں فاصلے سے بھی تو گفتگو کر سکتی ہیں۔ مثلاً بعض اوقات ظالم سماج دو پریمیوں کے درمیان کسی گہرے اور کشادہ دریا کی طرح آن کھڑا ہوتا ہے۔ اُس وقت فراق زدہ پیاسی آنکھیں کچے گھڑے میں منتقل ہو کر دریا کو پار کرنے کی کوشش کرتی ہیں مگر کر نہیں پاتیں۔ تب ان کے پردوں سے ایک ایسی صدائے بے آواز بلند ہوتی ہے جسے صرف دریا کے دوسرے کنارے پر جھکتی ہوئی منتظر آنکھوں کا ٹیلی پرنٹر ہی وصول کر سکتا ہے ـــــ انسانی ارتقا میں تکلم نے

---

[1] بحوالہ "عہد نامہ قدیم"۔

بہت بعد میں جنم لیا۔ اس سے پہلے اشاروں کنایوں کی زبان رائج تھی۔ مگر ان دونوں سے پہلے آنکھوں نے بولنا سیکھ لیا تھا۔ آنکھ سے بڑا زبان داں آج تک پیدا نہیں ہوا۔ جو لوگ پلکوں اور گلابی ڈوروں کی ہیروغلیفی تحریر (HIEROGLYPH) کو پڑھنے میں مہارت رکھتے ہیں وہی دراصل آنکھ کی زبان کو سمجھنے پر قادر ہیں۔ کسی اور کو یہ سعادت کبھی حاصل نہیں ہو سکتی!

رنگ روپ اور تراش خراش کے اعتبار سے تو آنکھوں کے کئی "گھرانے" ہیں لیکن کارکردگی کے اعتبار سے آنکھیں صرف دو طرح کی ہیں ــــــ خورد بینی آنکھیں اور دور بینی آنکھیں! خورد بینی آنکھوں کی زد RANGE محدود ہے۔ وہ صرف قریب ترین اشیا ہی کو نظر کی گرفت میں لیتی ہیں۔ مقامہ ری کو ری ہمیں ان کا مطمحِ نظر ہے۔ یہ آنکھیں تخیل پر حقیقت کو، مسرت پر لذت کو اور دولتِ بیدار پر دولتِ دینار کو ترجیح دیتی ہیں۔ یہ آنکھیں اُن ایام کی یادگار ہیں جب حضرتِ انسان کے لیے ایک شاخ سے دوسری شاخ کی طرف چھلانگ لگاتے وقت نظر کی مدد سے شاخوں کے درمیانی فاصلے کی پیمائش کر لینا بہت ضروری تھا۔ ساتھ ہی جب یہ بھی ضروری تھا کہ شاخ کے رنگ کو شاخ سے لٹکے ہوئے پھل کے رنگ سے ممیز کیا جا سکے۔ چنانچہ ایسی آنکھوں کی تحویل میں فاصلے کو ماپنے اور رنگ کو پہچاننے کی یہ دونوں صفات آگئیں۔ آج جب "اہلِ نظر" کالی گوری، زرد اور عنابی قوموں کو رنگت کی بنا پر ایک دوسری سے الگ کر کے اپنے تعصبات کو پالتے پوستے ہیں یا جب مکان کی اینٹ، روپے کی جھنکار اور بدن کی خوشبو کو سمیٹ لینا چاہتے ہیں تو دراصل اپنی خورد بینی آنکھوں ہی کو مصرف میں لا رہے ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں دور بینی آنکھیں ہیں جو جسموں اور دیواروں کو عبور کر کے زمین اور آسمان کی ملتی ہوئی سرحدوں کو اپنے پیاسے ہونٹوں سے چھو تی ہیں اور ایک ہی پل میں کروڑوں روشنی کے سالوں کا فاصلہ طے کر کے ستاروں تک کو نظر کی مٹھی میں بند کر لیتی ہیں۔ ایسی آنکھیں زیادہ تر خواب ہی دیکھتی ہیں۔ متخیلہ ان کا ہتھیار ہے، وسعت طلبی ان کا موقف اور آوارہ خرامی ان کا مسلک! شاعروں اور صوفیوں کو قدرت نے انہیں آنکھوں سے نوازا ہے۔

لیکن وہ لوگ بھی جنہیں قدرت نے اس قسم کی آنکھوں سے محروم رکھا ہے، اس بات سے تو بہر حال واقف ہوں گے کہ یہ کرۂ ارض جس پر وہ آج آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں آج سے تقریباً چار ارب سال پہلے وجود میں آیا تھا۔ اُس وقت یہ چٹیل تھا بے آب و گیاہ تھا، بالکل اس معصوم سی گیند یا کی طرح جس پر ابھی بال و پر نمودار نہ ہوئے ہوں۔ پھر آج سے تقریباً دو ارب سال پہلے اس کرۂ ارض پر ایک پُر اسرار ہستی دبے پاؤں اُتری اور اُترتے ہی اس کی سطح سے چپک گئی۔ اُس وقت وہ اندھی بھی تھی اور بہری بھی۔ البتہ محسوس کر سکتی تھی۔ کافی عرصہ تک وہ ڈری ہوئی، گُم صُم، زمین کے سینے سے چمٹی رہی۔ پھر ایک روز اُس نے گرد و پیش کو اپنے سوتوں ایسے لمبے لمبے ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کیا۔ اُس وقت یہ ہاتھ ہی اس کی آنکھیں تھیں۔ اس کے بعد اُس نے رُک کر اپنی نئی نویلی قوتِ سماعت کی مدد سے اردگرد کی آوازوں کو سننا شروع کیا جیسے یہ جاننا چاہتی ہو کہ اس کرۂ ارض پر اُس کے علاوہ کوئی اور ذی روح تو نہیں ہے۔ مگر اس کے چاروں طرف ہواؤں، سمندروں، زلزلوں اور آتش فشاں پہاڑوں کی آوازوں کا تو محشر بپا تھا لیکن اس جیسی کسی ہستی کی چاپ بالکل نہیں تھی۔ تب اُس نے حوصلہ پا کر اس کرۂ ارض پر گھومنا پھرنا شروع کیا۔ پہلے تو وہ اشیا کو ٹٹول ٹٹول کر چلی مگر پھر اُس نے جہانِ رنگ و نور کا تماشا کرنے کے لیے اپنے اندر سے دو لالٹینیں برآمد کر لیں۔ یہ آنکھوں کی ابتدا تھی۔ زندگی کو یہ لالٹینیں اتنی اچھی لگیں کہ اُس نے انہیں بڑے پیمانے پر بنانے کا منصوبہ بنا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں کی تعداد بڑھتی ہی چلی گئی ــــ مچھلیاں، تتلیاں، مکھیاں، رینگنے والی مخلوق، پرندے، چوپائے اور انسان ــــ ان سب نے یہ نیا فیشن اپنا لیا۔ بعض نے اپنے لیے بلیک اینڈ وائٹ بصارت کو پسند کیا، بعض نے رنگین آنکھیں لگا لیں، بعض نے دو ابعادی اور بعض نے سہ ابعادی آنکھیں پسند کیں۔ اب گویا آنکھیں ہی اس کرۂ ارض کا نیا فیشن تھا جو دم بدم مقبول ہو رہا تھا۔ کئی بار میں نے خود سے پوچھا ہے کہ آخر "زندگی" کو آنکھوں کی ضرورت ہی کیوں پڑی؟ کیا ماحول تک رسائی پانے کے لیے دوسری حسیات ناکافی تھیں کہ اس نے باصرہ کے حصول کو ضروری سمجھا! ــــ یقیناً ایسی ہی کوئی بات ہوگی۔ مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ "زندگی" کے ہاں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ دوسروں کے علاوہ اپنا بھی نظارہ کرے اور اُس نے اپنے اندر سے ایک ایسا آلہ نکال لیا جو یہ کام بخوبی سرانجام دے سکتا تھا۔ میں جب اپنے چاروں

طرف انسانوں، پرندوں اور چوپایوں کو آنکھیں جھپکتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے ان کروڑوں اربوں آنکھوں سے وہی پُر اسرار ہستی جھانک رہی ہے جس نے قرنوں پہلے ڈرتے ڈرتے اس کرۂ ارض پر قدم رکھا تھا مگر جو اب اتنی نڈر اور بیباک ہوگئی ہے کہ کھلے بندوں نہ صرف ارض و سما کو گھور رہی ہے بلکہ اپنے آپ کو بھی دیکھنے لگی ہے۔ اس پُر اسرار ہستی کی آنکھوں میں ایک عجیب سی شرارت آمیز چمک ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ اندر سے فقیر کی طرح سب کچھ جان گئی ہو اور اب بآوازِ بلند تمسخر اڑا رہی ہو۔ سوال صرف یہ ہے کہ وہ کس کا تمسخر اڑا رہی ہے؟؟

وزیر آغا کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ جس سے
انشائیہ نگاری کی ابتدا ہوئی

خیال پارے

دوسرا ایڈیشن

قیمت ۲۵ روپے

ناشر: مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا

تسخیرِ کائنات

غلام جیلانی اصغر

آج سے بیس بائیس سال پہلے کی بات ہے کہ میں نے تسخیرِ کائنات کا پروگرام بنایا تھا۔ میری عمر بھی کوئی ایسی زیادہ نہیں تھی اور کائنات بھی اتنی بڑی نہیں تھی۔ قویٰ ابھی مضمحل نہیں ہوئے تھے، اور کائنات کی وسعت کا بھی اندازہ نہیں تھا۔ اس لیے یہ کام بہت آسان نظر آتا تھا۔ لیکن عین اُسی وقت چند خانگی مجبوریاں میرے راستے میں حائل ہوگئیں۔ چھوٹے بچے کو نرسری میں داخل کرانا تھا اور بیوی کو ہسپتال میں۔ ان حالات میں کسی بڑے منصوبے پر عمل پیرا ہونا ذرا مشکل تھا۔ اگر یہ تمام مجبوریاں ایک دو دن بعد وقوع پذیر ہوتیں، یا کائنات اُسی نقطہ پر ٹھہری رہتی، جہاں میں نے اُسے ایک دن پہلے چھوڑا تھا، تو میں یہ کام کر گزرتا۔ اور آج میرا نام بھی نیل آرمسٹرانگ اور یوری گگرین کے ساتھ ساتھ آتا، بلکہ سرِ فہرست ہوتا کیونکہ میں نے پوری کائنات کی تسخیر کا منصوبہ بہت پہلے مرتب کیا تھا۔ اور اس پر ابتدائی کام بھی کر چکا تھا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ لوگ آپ کی کامیابی کا اندازہ تکمیل کار سے لگاتے ہیں نہ کہ خواہش کی شدت سے۔ کام کا کرنا اتنا بڑا کارنامہ نہیں کیونکہ کام تو ہر وقت موجود رہتا ہے۔ ہوشیار آدمی صرف اسے دریافت کر کے اُس کا ایک معروف رُخ آپ کے سامنے کر دیتا ہے۔ اور آپ فوراً کامیابی کا سہرا اُس کے سر باندھ دیتے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے کوہ پیما بھی یہی کرتے ہیں کہ وہ موجود چوٹی پر جب چڑھ جاتے ہیں تو وہاں اپنی کامیابی کا جھنڈا گاڑھ دیتے ہیں۔ میں کسی ایسے کوہ پیما کو نہیں جانتا جس نے ناموجود چوٹی کو سر کیا ہو۔ اور نہ ہی ایسے موجد سے واقف ہوں، جس نے نہ ہونے والی ایجاد کو ایجاد کیا ہو۔ میرا ذکر اس قبیل میں آسکتا تھا۔ لیکن بات صرف اتنی ہے کہ میرا نام تسخیرِ کائنات سے منسوب نہ ہوسکا کیونکہ کچھ خانگی مجبوریاں میرے راستے کی دیوار بن گئیں۔ پھر یوں بھی خلا بازوں کی طرح میں کسی چھوٹے موٹے آوارہ سیارہ پر جانے کے تیار نہیں تھا۔ میرا پروگرام تو پوری کائنات کو اپنی پوری وسعت اور پہنائی کے ساتھ تسخیر کرنا تھا۔ منصوبہ قابلِ عمل تھا۔ مشکل صرف اتنی تھی کہ میرے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں میں کائنات کو تسخیر کرنے کے بعد رکھ سکوں۔ یہی دقت عام طور پر دنیا کے فاتحین کو ہوتی ہے۔ جب وہ ملک فتح کر لیتے ہیں تو ایک احساسِ ندامت سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ انہیں اپنی ساری کامیابی لغو اور بے مقصد نظر آتی ہے۔ وہ ملک کو اُٹھا کر لے نہیں جا سکتے۔ اور خود ٹھہر نہیں سکتے کیونکہ وہ اپنی کامیابی کو ایک مخصوص خطہٴ زمین تک محدود نہیں کرنا چاہتے۔ زیادہ سے زیادہ وہ مفتوحہ علاقہ پر اپنا کوئی نائب چھوڑ جاتے ہیں جو دو چار دن بعد اپنی آزادی کا اعلان کر دیتا ہے۔ سکندرِ اعظم کے ساتھ یہی حادثہ ہوا۔ البتہ محمود غزنوی اس لحاظ سے زیادہ عقل مند تھا، وہ ملک کو فتح کرتا، اور دوسرے حملے کے لیے اُسے ترک کر کے چلا جاتا۔ اگلے سال سردیوں میں وہ پھر آتا اور مملکتِ محروسہ کو نئے سرے سے پھر فتح کرتا۔ چنانچہ اُس نے

یہ تجربہ کئی بار کیا۔ اور آخر کار وہ بھی اِس بے کار شغل سے اُکتا گیا۔ اگر اُس کے پاس غزنی میں اتنی وافر جگہ ہوتی جہاں وہ مفتوحہ علاقے کو رکھ سکتا تو اُسے نہ اتنے حملے کرنے پڑتے اور نہ ہی اپنی حماقت پر ندامت ہوتی۔

تسخیرِ کائنات کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے جب میں نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی تو مجھے SPACE کی کمی کا اندازہ ہوا۔ ایک کمرے میں میری بیوی بچے سوتے جاگتے۔ دوسرے میں میں خود پناہ گزین تھا۔ تیسرے میں کچن اور باتھ روم تھا۔ اب میں اتنی بڑی کائنات کو کہاں رکھ سکتا تھا؟ لیکن میں نے اس منصوبہ کو بالکل ترک نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ "کر سکنے" کی سطح سے اُتر کر "کبھی کر سکوں گا" کے تہ خانے میں داخل ہوگیا تھا۔ یہ تہ خانہ میری ذات کا وہ LUMBER ROOM ہے جہاں میں نے اپنی زندگی کی متاعِ عزیز کو چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس میں میری پہلی محبت بھی ہے جس کی تسخیر میں مجھے ناکامی ہوئی۔ اس میں میری وہ نوکری بھی تھی، جس کا آخری سِرا صوبہ کی گورنری سے جا کر ملتا تھا۔ اس میں میرا وہ نکاحِ ثانی بھی تھا جس کے لیے میں نے ہیلن آف ٹرائے سے لے کر الزبتھ ٹیلر تک سب باسلیقہ خواتین کی ایک باقاعدہ فہرست مرتب کر رکھی تھی۔ پھر عمر جوں جوں بڑھتی گئی اس نہاں خانہ سے بیشتر خواتین میری عدم موجودگی میں فرار ہوگئیں۔ خواہش کی جگہ اطمینان نے لے لی۔ میں اپنی پہلی شادی سے بھی اتنا ہی مطمئن ہوگیا جتنا کہ اپنی نوکری سے، بلکہ نکاحِ ثانی کا خیال ہی میرے لیے پریشان کُن بن گیا۔ صوبہ کی گورنری سے مجھے خوف آنے لگا۔ مجھے یوں لگتا جیسے میرا اے۔ ڈی۔ سی صبح شام مجھے ڈی۔ سی کرنٹ کی طرح جھٹکے دے رہا ہو۔ اور قربانی کے بکرے کی طرح ہر لمحہ مجھے کسی سرکاری یا غیر سرکاری تقریب کے لیے تیار کر رہا ہو۔ مجھے لمحوں کے جبری تسلسل سے ڈر آنے لگا۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی نادیدہ قوت مجھ سے جبری بیگار لے رہی ہو۔ مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ وقت کی جبریت کا صرف اس وقت احساس ہوتا ہے، جب ہر لمحہ دوسرے کے ساتھ پیوست ہو کر ایک تھکا دینے والی یکسانیت میں بدل جاتا ہے۔ چوبیس گھنٹے گورنر رہنا ایک ایسا ہی عذاب ہے چنانچہ میں نے گورنر بننے کا ارادہ ترک کر دیا۔

لیکن تسخیرِ کائنات کا ارادہ پہلے سے بھی زیادہ مستحکم ہوگیا۔ ہوا یہ کہ آرمسٹرانگ چاند کی نگری سے ہو آیا۔ اس کا یہ کارنامہ کوئی ایسا معرکہ نہیں تھا کہ اس پر اتنی سرخوشی کا اظہار کیا جاتا، کیونکہ جس جگہ سے وہ ہو کر آیا تھا وہاں سے کچھ ہی پرے کہکشاں میں کوئی دو ملین سے زیادہ چاند سرگرم سفر تھے۔ یہ ہمارے چاند سے کہیں زیادہ باوقار کہیں زیادہ پُر انوار تھے۔ البتہ تسخیرِ ماہ سے یہ احساس ضرور ہوا کہ چاند بھی تیسری دنیا کی طرح انتہائی غریب اور مسکین ملک ہے۔ چنانچہ چاند کی وقتی تسخیر سے مجھے ذرا بھی دُکھ نہ ہوا۔ آخر اس سے مجھے یا میرے منصوبے کو کیا فرق پڑتا تھا کہ ایک انتہائی حقیر فرد میری کائنات کے ایک انتہائی حقیر سیارے سے ہو کر واپس آگیا تھا! البتہ فرق یہ پڑا کہ میں نے اپنے پروگرام کو UP TO DATE بنانے کے لیے اپنی کوششوں کو تیز تر کر دیا۔ اب صبح شام میں اپنی بیوی بچوں کو ان دِلوں کی نوید دیتا جب یہ ساری کائنات میرے زیرِ نگیں ہوگی۔ بچے خوش تھے کہ ان کا باپ ایک ایسا کام کرنے والا ہے جو اب سے کچھ صدیاں پہلے صرف ہمارے ہی خاندان کے ایک فرد نے کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ بس ذرا سی غلطی یہ ہوئی کہ مرحوم نے خود فراموشی کے عالم میں اپنی ٹانگ کو ذرا زور سے کھینچ کر مارا اور کائنات کا کچھ حصّہ ریزہ ریزہ ہوگیا۔ مرحوم اس راز سے نا آشنا تھے کہ تسخیرِ کائنات کے منصوبہ میں سلیقہ بقول شاعر پہلا قرینہ ہے۔ آپ جس چیز کو تسخیر کرنا چاہتے ہیں اس سے آپ کا سلوک محبت اور اپنائیت کا ہونا چاہیے۔ آپ چیزوں کو باہر سے تو صرف اُسی صورت میں مسخر کر سکتے ہیں جبکہ

آپ کا مجموعی حجم اُن سے بڑا ہو۔ لیکن اپنائیت میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ یہ پانی کی طرح پانی سے مل جاتی ہے اور پھر قطرے اور دریا کا فرق یکسر ختم ہوجاتا ہے۔ اپنائیت دیمک کی طرح اپنے مطلوب کو چاٹ جاتی ہے، اور پھر طالب اور مطلوب کا فرق ختم ہوجاتا ہے۔ کچھ لوگ جن کا شعور غیر پختہ، اور مطالعہ سرسری ہے، وہ چیزوں کو اُن کے سائز یا عیب و حضور کے حوالے سے پہچانتے ہیں۔ اگر آپ انہیں یہ بتائیں کہ ان کا فریم آف ریفرنس ہی غلط ہے تو وہ آپ سے اُلجھ پڑیں گے۔ وہ دیمک کا ذکر نہایت کراہت سے کریں گے۔ اور اس دروازے یا کھڑکی کا جو غائب ہوگئی ہے بڑی ہمدردی سے۔ حالانکہ چیزیں دوئی کے عذاب سے نکل کر یکتائی یعنی وحدت میں ڈھل گئی ہیں۔ یعنی دیمک بیک وقت دیمک بھی ہے اور کھڑکی بھی۔ کھڑکی جو ایک بے جان بے حرکت، بے احساس اور غیر مرئی مادہ تھی اب زندہ ہوکر ایک باشعور جسم میں تبدیل ہوگئی ہے۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ ایک ننھی سی جان نے اتنی بڑی کھڑکی کو اپنے اندر جذب کیسے کر لیا؟ میں نے اس حقیقت کو پالیا ہے۔

میں جب ساٹھ سال کا ہوا تو مجھے نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔ نوکری، دفتر، کلرک، کال بل، چپڑاسی یعنی سارے عارضی کھلونے مجھ سے واپس لے لیے گئے۔ اب میرے پاس وقت بھی تھا اور فرصت بھی۔ اس سے پہلے وقت ہمہ وقت گردش میں رہتا اور مجھے بھی گردش میں رکھتا تھا۔ وہ میرا آقا تھا، ایک ظالم جابر آقا۔ اب وقت میرا غلام تھا۔ جب میں چاہتا اُسے سیر پر لے جاتا، جب چاہتا اُسے چارپائی پر لٹا دیتا۔ جب وہ مجھ سے کسی کام کی فرمائش کرتا تو میں پورے تحکم سے کہتا "کل ہو جائے گا"۔ اور وہ دست بستہ میرے آگے کھڑا ہو کر کہتا۔ "بہتر حضور"! میں نے کبھی وقت کو اتنا مظلوم نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ اس صورت حالات میں تسخیر کائنات کا منصوبہ بہت آسان ہوگیا۔ ایک دن کہیں سے آواز آئی۔ "حضور والا اب تو آپ کے پاس وقت بھی ہے اور فرصت بھی"! یہ میرے اندر کی آواز تھی جو کم و بیش بائیس[۲۲] سال اصحابِ کہف کی طرح میرے اندر سوتی رہی تھی۔ اب وہ بیدار ہو کر مجھے مہم پر روانہ ہونے کی دعوت دے رہی تھی۔

میں نے مہم پر روانہ ہونے سے پہلے اپنے وجود کا تنقیدی جائزہ لیا۔ میری داڑھی کی رنگت میں نمایاں تبدیلی آچکی تھی۔ سر پر جس جگہ کبھی بال ہوتے تھے، عمرِ رفتہ کا وبال تھا۔ ٹانگیں حرکت تو کرتی تھیں، لیکن اُن میں وہ پہلے سا اعتماد نہیں تھا، آنکھوں میں بصارت کی جگہ بصیرت نے لے لی تھی، اس لیے اپنے گھر کی معروف چیزیں بھی اب غیر معروف نظر آنے لگی تھیں رشتوں پر نظر ثانی کا عمل شروع ہوچکا تھا۔ خود اپنی ذات جو مرکزی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی، اب وہاں سے اُٹھ کر عقبی نشستوں پر آگئی تھی۔ اور ایک حد تک اس تبدیلیٔ نشست سے خوش بھی تھی۔ ذات کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ وہ زمان و مکان میں ایک مخصوص نشست گاہ پر اپنا پیدائشی حق سمجھ کر قبضہ کر لیتی ہے۔ اور پھر اس پر ہمیشہ کے لیے قابض رہنا چاہتی ہے۔ یہ نشست یوں تو ہر لمحہ ڈانواں ڈول رہتی ہے لیکن بیٹھنے والے کا اعتماد اُسے استقرار بخشتا ہے۔ لیکن ایک دن یہ عجیب تبدیلی آتی ہے کہ بیٹھنے والا خود ہی اُٹھ کر پچھلی سیٹ پر چلا جاتا ہے۔ سیٹ ترک کرنے کا یہ عمل تکلیف دہ بھی ہوسکتا ہے اور پُر کیف بھی۔ اگر کوئی آدمی آپ کے نیچے سے سیٹ کو کھینچ لے تو یہ عمل آپ کی ذات کو توڑ دے گا۔ لیکن اگر آپ خود ہی خوش دلی سے اُٹھ کر ذرا پیچھے زیادہ آرام دہ سیٹ پر بیٹھ جائیں تو یہ عمل باوقار بھی ہوتا ہے اور خوشگوار بھی۔ تیاگنے کا یہ عمل اُس وقت ظہور میں آتا ہے جب آپ چیزوں کے معروضی وجود کے طلسم سے آزاد

ہو کر اُس دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں حقیقت اور پرچھائیں کے درمیان کا خطِ تقسیم آپ کو واضح طور پر نظر آنے لگتا ہے۔ چھوٹی چیزیں، چھوٹے شخص، چھوٹے واقعات جن سے انسان نے اپنی تاریخ مرتب کر رکھی ہے بے ہیئت اور بے چہرہ سے نظر آنے لگتے ہیں۔ صرف بڑی بڑی خوشیاں جیسے معصوم بچے کی مسکراہٹ۔ بڑی بچی کا روٹھنا، و۔ا۔ کی آنکھوں میں شرارت کا لشکارا۔ کوئی ایسا شعر جو زندگی سے اُس کی ساری مسخ شدہ تلخیاں لے کر ایک اَن بوجھی سی بہجت کا احساس فراواں عطا کر دے۔ ایسی ہی معصوم سی خوشیاں آدمی کو زمین کی کششِ ثقل کی قید سے نکال کر ایک ایسی کھلی فضا میں لے جاتی ہیں جہاں ساری کائنات اپنی تمام وسعت کے باوجود آدمی کی ذات کے ایک گوشے میں سما جاتی ہیں۔ میں نے تسخیرِ کائنات کی مہم سَر کر لی ہے۔ اب جب میں رات کو سونے لگتا ہوں تو وقت میرے پہلو میں آ کر لیٹ جاتا ہے۔ چاروں طرف سے کائنات میرا احاطہ کر لیتی ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ زہرہ۔ مشتری، عطارد۔ مریخ۔ بے نام کہکشائیں۔ کویسرز۔ پلسرز۔ بلیک ہولز سب ایک ایک کر کے میرے اندر اُترنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ پوری کائنات میرے اندر ڈوب جاتی ہے۔

اوراق کے مستقل خریداروں کے لئے

خاص رعائت

اگر آپ اوراق کے مستقل خریدار بن جائیں تو

- آپ کو اوراق کا سالانہ چندہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔
- اس کے بجائے آپ کو اوراق کا ہر شمارہ بذریعہ وی۔ پی ارسال ہوگا۔
- ہر شمارہ پر آپ کو ۲۵ فیصد رعائت ہوگی۔
- ڈاک کے اخراجات دفتر اوراق ادا کرے گا۔
- آپ دفتر اوراق کو محض ایک کارڈ لکھ کر مستقل خریدار بن سکتے ہیں۔

مینیجر "اوراق" چوک اُردو بازار لاہور

تسخیرِ کائنات ——— تجزیاتی مطالعہ

خیرالدین انصاری

اس انشائیہ کا عنوان پڑھ کر خیال گزرا کہ شاید یہ کوئی معلوماتی مضمون ہے جس میں سائنسی حقائق بیان کیے گئے ہوں گے۔ لیکن جونہی عنوان سے نیچے اُتر کر اس کا مطالعہ شروع کیا تو ابتدائی جملوں ہی سے معلوم ہوگیا کہ یہ کوئی سنجیدہ مقالہ نہیں ہے۔ مصنّف اپنے آپ سے باتیں کرنی چاہتا ہے۔ اس نے اپنی ذات کو کائنات سے تعبیر کیا ہے اور اپنے مَن میں ڈوب کر سراغِ زندگی پا جانے کے عمل کو تسخیرِ کائنات کا نام دیا ہے۔ یہ تحریر بظاہر بے ربط ہے لیکن اس کے بین السطور میں ایک دلکش نَے اور مسرور کُن نغمہ رواں دواں ہے۔ اس میں کوئی سنجیدہ بات نہیں کہی گئی لیکن اس کے فقروں میں وہ گہرائے معانی پائے جاتے ہیں جو کسی بھی تحریر کو بلند پایہ بناتے ہیں۔ دیکھئے بات کا آغاز کس غیر رسمی انداز میں ہوتا ہے۔

"آج سے بیس بائیس سال پہلے کی بات ہے کہ میں نے تسخیرِ کائنات کا پروگرام بنایا تھا۔ میری عمر بھی کوئی ایسی زیادہ نہیں تھی اور کائنات بھی اتنی بڑی نہیں تھی۔"

بھلا مصنّف کے کم عمر ہونے کا کائنات کی وسعت سے کیا تعلق، کائنات تو اس وقت بھی اتنی ہی بڑی تھی جتنی کہ آج ہے۔ جب مصنّف کی روح وجود کے لباس میں نظر آنے کے لیے بیقرار رہی ہوگی۔ دراصل مصنّف نے انسانی نفسیات کے ایک بڑے راز پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ انسان ہر شے کو اپنی ہی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ اگر اس کا زاویہ نظر وسیع نہیں ہے تو اسے انتہائی اہم اور بڑی چیزوں میں بھی چھوٹائی کے آثار نظر آئیں گے۔ اور اگر اس کا مشاہدہ گہرا اور مطالعہ وسیع ہے تو اس کی آنکھ قطرے میں دجلہ دیکھنے کی صلاحیت رکھ سکتی ہے۔ چونکہ آج سے بیس بائیس سال پہلے صاحبِ مضمون کا علم محدود تھا اس لیے اسے کائنات کی وسعت کا صحیح اندازہ نہ ہوسکا تھا۔ وہ اپنے مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت سے بہرہ ور نہ تھا۔ تبھی تو وہ زندگی بِتانے کو ایک سہل اور خوشگوار عمل گردانتا تھا لیکن جوں جوں اس کی عمر میں اضافہ ہوتا گیا اس کے سامنے مسائل کے انبار لگنے شروع ہوگئے۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ وہ جن چیزوں کو حقیر سمجھتا تھا وہ تو پہاڑوں سے بڑی ہیں۔ جب وہ کہتا ہے "لیکن میں اُس وقت چند خانگی مجبوریاں میرے راستے میں حائل ہوگئیں۔ چھوٹے بچے کو نرسری میں داخل کرانا تھا اور بیوی کو ہسپتال میں" تو کھلتا ہے کہ مصافِ زندگی میں بازی لے جانا کارے وارد ہے۔ اَن گنت خواہشات کو جنم دے لینا تو آسان ہے لیکن ان کو پورا کر لینا آسان نہیں ہے۔ ان کی تکمیل کی راہ میں ہر خواہش پر دم نکلنے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ اصغر صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ وہ جن عزائم کو لے کر میدانِ حیات میں اُترے تھے وہ پورے نہ ہوسکے جس کا انہیں بے حد افسوس ہے۔ لیکن یہ زندگی کا عام تجربہ ہے۔ ہر انسان کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اصغر صاحب کا کمال تو یہ ہے کہ انہوں نے اس دُکھ کو انوکھے انداز میں بیان کرکے ایک خاص چیز بنا دیا ہے۔

یہ تو ایک حقیقت ہے کہ "تسخیرِ کائنات" میں اصغر صاحب نے اپنی ذات ہی کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ لیکن کہیں کہیں ذہن کی آزاد ترنگ اپنا کمال دکھاتی ہے۔ اور وہ موضوع سے ہٹ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ان باتوں میں سنجیدگی اور استدلال کی قوت بھی موجود ہے۔ مثلاً جہاں یہ سکندرِ اعظم کی فتوحات

اور محمود غزنوی کے حملوں کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں چند ثانیوں کے لیے احساس ہوتا ہے کہ شاید ہم کوئی سنجیدہ تحریر پڑھ رہے ہیں لیکن ان کے آگے اور پیچھے جو فقرات ہیں وہ فکری گرانباری کو کم کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں جملۂ معترضہ کے بعد اصغر صاحب جلد ہی اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹ آتے ہیں اور تسخیر کائنات کی مہم سے ٹوٹا ہوا رشتہ اپنی ذات سے یوں جوڑ لیتے ہیں۔

"تسخیر کائنات کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے جب میں نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی تو مجھے SPACE کی کمی کا اندازہ ہوا۔ ایک کمرے میں میری بیوی بچے سوتے جاگتے، دوسرے میں میں خود پناہ گزین تھا۔ تیسرے میں کچن اور باتھ روم تھا۔ اب میں اتنی بڑی کائنات کو کہاں رکھ سکتا تھا؟ لیکن میں نے اس منصوبہ کو بالکل ترک نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ "کرسکنے" کی سطح سے اتر کر "کبھی کرسکوں گا" کے تہہ خانے میں داخل ہوگیا تھا۔ یہ تہہ خانہ میری ذات کا وہ LUMBER ROOM ہے جہاں میں نے اپنی زندگی کی متاعِ عزیز کو چھپا کر رکھا ہوا ہے۔"

مصنف کی ذات کی کباڑ کوٹھڑی میں جو نوادرات محفوظ ہیں ان میں سے بعض کا تعارف تو ہم سے کرا دیا گیا ہے لیکن بعض کو طوالت کے خوف سے چھوڑ دیا گیا ہے کیونکہ طوالت انشائیہ کے سڈول جسم کو بے ڈول کر دیتی ہے۔ تاہم "خواہش کی جگہ اطمینان نے لے لی" کا فقرہ بہت معنی خیز ہے۔ یہ مصنف کا نظریہ حیات ہے۔ وہ قناعت کو دولت سمجھتا ہے۔ ہمارا دین بھی تو قلبِ مطمئنہ کو حیاتِ انسانی کا شیریں ثمر کہتا ہے۔ بے جا اور لایعنی خواہشات انسان کو شیخ چلی بنا دیتی ہیں۔ جس نے خود فراموشی کے عالم میں اپنی ٹانگ کو اس زور سے مار دیا تھا کہ اس کی اپنی ساری کائنات ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔

اس انشائیہ کو اول سے آخر تک پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کا تخلیقی رجحان تصوف کی طرف مائل ہے۔ جب یہ کہتے ہیں "آپ جس چیز کو تسخیر کرنا چاہتے ہیں اس سے آپ کا سلوک محبت اور اپنائیت کا ہونا چاہیے" یا "اپنائیت میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ یہ پانی کی طرح پانی سے مل جاتی ہے اور پھر قطرے اور دریا کا فرق یکسر ختم ہو جاتا ہے۔ اپنائیت دیمک کی طرح اپنے مطلوب کو چاٹ جاتی ہے اور پھر طالب اور مطلوب کا فرق ختم ہو جاتا ہے" تو ہمارا ذہن فلسفۂ تصوف پر لکھی گئی ضخیم کتابوں کی طرف منعطف ہو جاتا ہے جہاں خالق اور مخلوق کے درمیان رابطہ، ایک میں دو اور دو میں ایک دیکھنے کا ارادہ اور اپنی اصل کی طرف لوٹنے کے تصور سے فنا کے خوف سے آزادی وغیرہ کا تفصیل سے بیان ہوتا ہے۔ لیکن ان مختصر فقروں میں بھی یہ ساری باتیں آگئی ہیں۔ مندرجہ ذیل سطور میں ان کا تصوف سے رابطہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

"صرف بڑی بڑی خوشیاں جیسے معصوم بچے کی مسکراہٹ، بڑی بچی کا روٹھنا۔ دو کی آنکھوں میں شرارت کا اشکارا۔ کوئی ایسا شعر جو زندگی سے اس کی ساری مسخ شدہ تلخیاں لے کر ایک ان بوجھی بہجت کا احساس فراواں عطا کر دے۔ ایسی ہی معصوم سی خوشیاں آدمی کو زمین کی کشش ثقل کی قید سے نکال کر ایک ایسی کھلی فضا میں لے جاتی ہیں جہاں ساری کائنات اپنی تمام وسعت کے باوجود آدمی کی ذات کے ایک گوشے میں سما جاتی ہیں۔ میں نے تسخیر کائنات کی مہم سر کرلی ہے۔ اب جب رات کو سونے لگتا ہوں تو وقت میرے پہلو میں آکر لیٹ جاتا ہے۔ چاروں طرف سے کائنات میرا احاطہ کر لیتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ زہرہ، مشتری، عطارد، مریخ، بے نام کہکشائیں، کوالیسرز، پلسرز، بلیک ہولز سب ایک ایک کرکے میرے اندر اترنے لگتے ہیں حتٰی کہ پوری کائنات میرے اندر ڈوب جاتی ہے۔"

اس انشائیہ میں وہی بات بانداز دیگر کہی گئی ہے جو علامہ اقبال کے اس شعر میں تھی۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

انشائیہ کے اختتامیہ جملے بہت خوبصورت ہیں۔ انشائیہ ختم کرتے وقت قاری کو احساس ہوتا ہے جیسے اس نے بھی کائنات کو مسخر کر لیا ہو۔ اس کی اعصابی تھکن جاتی رہتی ہے کیونکہ اس کی سوچ کے لیے لذیذ غذا مہیا کر دی گئی ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ اس کے مطالعہ نے قاری کو فکری نہج پر زندہ کر دیا ہے۔

بڑھاپا

مشتاق قمر

بڑھاپا دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس کا تعلق آپ کے داخل سے ہے اور جو خودرو پودے کی طرح آپ کی داخلی سطح پر اُگ آتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر آپ دس سال کی عمر میں دیوانِ حافظ اَزبر کر لیتے ہیں۔ بارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے شعر موزوں کرنے لگتے ہیں۔ سولہ سال کی عمر میں آپ کا تنقیدی شعور بیدار ہو جاتا ہے اور ملنے ملانے والے آپ سے کنی کترانے لگتے ہیں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں بعض نصابی کتب سے شدید اختلاف کے باعث کالج سے احتجاجاً واک آؤٹ کر جاتے ہیں۔ بیس سال کی عمر میں ورکشاپ سے روڈ ٹیسٹ (ROADTEST) کے لئے عملی زندگی کی شاہراہ پر آجاتے ہیں۔ پچیسویں سالگرہ پر آپ کو دنیا میں بدی ہی بدی دکھائی دینے لگتی ہے اور تیس سال میں قدم رکھتے ہی یا تو آپ جاپانیوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے خودکشی کر لیتے ہیں یا پھر چینی مفکر زے کی تقلید میں دنیا سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد آپ ایک بے رنگ و بُو طویل شاہراہ پر جس میں کوئی موڑ کوئی پگڈنڈی نہیں۔ عازمِ سفر ہو جاتے ہیں۔

اس قسم کا بڑھاپا آپ کا دوست نہیں، جانی دشمن ہے جو دُنیائے آب و گل میں قدم رکھتے ہی آپ کو دبوچ لیتا ہے اور پھر لمحہ بلحہ آپ پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ حیات کا ہرا بھرا درخت ٹنڈ مُنڈ ہو جاتا ہے اور پتیاں زرد ہو کر بکھر جاتی ہیں (ظاہر ہے کہ اس کے بعد بڑھاپا آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا)

دوسری قسم کے بڑھاپے کا تعلق آپ کے خارج سے ہے کیونکہ ہر چند ظاہری طور پر آپ بڑھاپے کی رِدا زیبِ تن کر لیتے ہیں۔ لیکن آپ کے داخل کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں ہوتا۔ ع

شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

یہ بڑھاپا (جسے میں اصلی اور فطری بڑھاپا کہوں گا) ماہ و سال کے پربت سے پھسلتا ہوا دُور نیچے ڈھلوان میں، دبے پاؤں، آپ کو آلیتا ہے اور ہولے سے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہتا ہے۔ "امید ہے آپ نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔" اس غیر مانوس سی آواز پر آپ جھنجلا کر نہایت بے رُخی سے جواب دیتے ہیں۔ "دُور ہو جا اپنے سرد مرجھائے ہوئے ہاتھ پرے ہٹا لے میں تمہیں نہیں جانتا تم کون ہو۔ بہروپیا کہیں کا!"

بڑھاپا زیرِ لب مسکراتے ہوئے آپ کو یوں تکنے لگتا ہے۔ گویا کہہ رہا ہو "اصل روپ یہی ہے۔ اس سے پہلے تو سبھی بہروپ تھے:
آپ اس کے ہاتھ پرے جھٹک دیتے ہیں اور پھر اکڑ تان کر "ابھی تو میں جوان ہوں" کا نعرہ بلند کرنے لگتے ہیں لیکن بڑھاپے کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر لڑکھڑاتے قدموں بھاگ اٹھتے ہیں۔ حتیٰ کہ آپ کا سانس پھول جاتا ہے اور آپ کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا سا چھا جاتا ہے مگر بڑھاپا آپ کی اس سرد مہری پر چیں بجبیں ہونے کی بجائے ایک نہایت شفیق اور مہربان دوست کی طرح آگے بڑھ کر پہلے آپ کے ہاتھ میں چھڑی تھما دیتا ہے اور پھر تن بدن کو ایک لمبے چُغے سے ڈھانپ دیتا ہے۔ آپ شکریہ کا ایک لفظ تک ادا کئے بغیر پھر سے اُچھل کود میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور جب ایک حقیقت کو تسلیم نہ کرنے کے نتیجہ میں آپ کی زندگی کو زبردست خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ (کہ کہیں آپ نشیب میں نہ لڑھک جائیں)، اس وقت بڑھاپا ایک شفیق اور فرض شناس باپ کی طرح آگے بڑھ کر گردن پر تھپکتا اور کمر کو

لات دے مارتا ہے اور پھر خود بھی آپ پر سوار ہو جاتا ہے۔ آپ جھکی ہوئی گردن اور کمر کے ساتھ گھنے درخت کی چھاؤں میں بان کی کھری چارپائی پر دراز ہو جاتے ہیں۔ آپ کی بے قرار آتما کو قرار سا آجاتا ہے اور معاً آپ کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ مشہور و معروف "زندگی" جس کا شہرہ آج تک سنتے چلے آئے ہیں وہ اس کیفیت ہی کا نام ہے۔ اس سے قبل تو آپ سطحِ حیات پر محض "سکیٹنگ" ـــــ ہی کرتے رہے تھے۔ اس کے پرت کھول کر اندر جھانکنے اور ادھر ڈٹ کر دیکھنا تو اب میسر آیا ہے۔ تب بڑھاپا آپ کی نگاہوں میں جھانکتے ہوئے کہتا ہے "جاگ رہا تھا مجھ سے۔ لے۔ جی بھر کر دیکھ لے دنیا کو۔ اب تجھے کسی مریخ سے مکھ موڑ کے کنکھیوں سے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ٹکٹکی باندھ کر دیکھ ٹٹول کر دیکھ۔ جس کا جی چاہے منہ چوم لے۔ جسے چاہے گود میں بٹھا لے۔ بڑا اس تو کیا کراماً کاتبین کو بھی تمہاری نیک نیتی پر شبہ نہیں گزر سکتا۔"

بچپن آپ کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس دور میں آپ کی حیثیت مٹی کے کھلونوں سے زیادہ نہیں ہوتی جس نے جیسا چاہا ویسا ہی کر دیا۔ لڑکپن آپ کی ناک میں نکیل ڈالے گلی گلی نچاتا پھرتا ہے۔ جوانی آپ سے آپ کا سب کچھ چھین لیتی ہے۔ آپ کے قہقہے اور آہیں دوسروں کے لئے مختص رہتے ہیں۔ یہ بڑھاپا ہی ہے جو آپ کا چھنا ہوا سارا سرمایہ مع سود لوٹا دیتا ہے۔ بڑھاپا نہ صرف آپ کے لئے ایک ڈھلا ڈھلایا بستر مہیا کر دیتا ہے بلکہ وہ تمام سنگی تزئین بھی سلب کر لیتا ہے جو آپ اور آپ کی "طرزِ شاہانہ" کے بیچ دیوار بنی ہوئی تھیں۔ آپ ایک بار پھر شجرِ ممنوعہ کا پھل چکھنے سے قبل والے پُرسکون ماحول میں لوٹ آتے ہیں۔ بڑھاپے سے قبل کی زندگی ایک ایسا گھن زدہ شجر ہے جس پر سدا کیڑوں کی یلغار رہتی ہے لیکن بڑھاپے میں ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ آپ ان تمام کیڑوں مکوڑوں کو پرے پھینک دیتے ہیں۔ اب آپ کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، سونے جاگنے کا خطِ مستقیم ایک نہایت ہی خوبصورت موڑ لیتا ہے۔ جہاں جی چاہے بیٹھ گئے۔ جب جی چاہا سو گئے۔ کوئی درشت ہاتھ اور کرخت آواز صبح سویرے آپ کو قسم زدہ مستقبل کا لالچ دے کر خوابِ استراحت سے بیدار نہیں کرتی۔ چاندنی راتوں میں آپ کے کان کسی کے قدموں کی آہٹ سننے کے لئے رات بھر جاگتے نہیں رہتے۔ نہ ہی رات کے ملگجے سے میں زہر بلا انجکشن لگا کر آپ کو مدہوش کرنے کی کوئی کوشش کی جاتی ہے۔ (سچ پوچھئے تو آپ پہلے ہی اس کے لئے تیار ہوتے ہیں) آپ کے اندر معشوقانہ حد تک بے نیازی در آتی ہے۔ جی میں آیا تو کہہ سُن لیا ورنہ بولنے والا پہروں کیوں نہ بولتا چلا جائے۔ آپ ذات کے دائرے میں دھونی رمائے اپنے ہی خیالوں میں مگن بیٹھے رہیں گے۔ بہت زیادہ مروت برتی بھی تو بس کبھی کبھار کانوں تک ہاتھ لے جا کر کہہ دیا "کیا کہا؟" اور اس کے بعد اگر بولنے والے میں مزید کہنے کی سکت باقی ہے تو وہ سو مرتبہ کہی ہوئی بات کو از سرِ نو دہرانے بیٹھ جائے گا۔ ورنہ آپ کی بلا سے۔ مرزا غالب بڑھاپے کو اعضا میں "اضمحلال" کا نام دیتا ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ مرزا جیسا جہاندیدہ اور مردم شناس انسان جو مرنے کے سو سال بعد بھی سرت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے سے باز نہیں آتا۔ اعضا میں اضمحلال کی اصطلاح کو اچھے معنوں میں استعمال نہیں کرتا۔ حالانکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ انسانی اعضا۔ ہاتھ۔ پاؤں۔ ٹانگیں۔ ناک۔ کان۔ آنکھیں وغیرہ ہی تو ہیں جنہوں نے آپ کی ذات کو اس بُری طرح خارج سے منسلک کر رکھا ہے کہ برسوں تک آپ کو اپنی یاد بھی نہیں آتی مگر یہ فطرت کا اصول ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اعضا کی طنابیں سکڑنے لگتی ہیں اور انسان آہستہ آہستہ خارج سے داخل کی طرف سکڑنے لگتا ہے۔ دراصل بچپن سے بڑھاپے تک کا سفرِ حیات انسان کے پھیلنے اور سکڑنے کی داستانِ پُرفریب کے سوا کچھ نہیں۔ بچپن میں انسان "جتنی چادر دیکھو اتنے پاؤں پھیلاؤ" کا آغاز کرتا ہے لڑکپن میں انسان پوری بستی پر پھیل جاتا ہے اور شام کو خیر سے گھر بھی آ جاتا ہے۔ جوانی میں ساری کائنات اس کا عرصۂ تگ و تاز بن جاتی ہے حتیٰ کہ ماں کی دعائے سحری اور محبوبہ کے نالے بھی اسے لوٹانے میں ناکام رہتے ہیں لیکن بڑھاپے میں وہ کسی دعا یا رقعہ کے بغیر گھر لوٹ

آتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک ایسا وقت بھی آتا ہے (جسے مرزا اطفار ہیں اضمحلال کا نام دیتے ہیں) جب انسان کانکا کے ہزار پایہ کی طرح اپنی ذات کے سنگل روم (SINGLE ROOM) میں مقید ہو کر خارج سے ذہنی جسمانی آزادی حاصل کرلیتا ہے۔ یہی وہ وقت ہے جب انسان ہر قسم کی بیرونی مداخلت کے بغیر اپنے اور اپنی ذات کی وساطت سے دوسروں کے اچھے بُرے اعمال کا کامیابی کے ساتھ محاسبہ کرنے کا اہل ہو جاتا ہے۔ دراصل کوئی انسان بڑھاپے کی پُر خم سے گذرے بغیر مکمل انسان کہلانے کا دعوے نہیں کرسکتا۔ بڑھاپے کی اس ذہنی اور جسمانی آزادی کا ہم سب کو لاشعوری احساس ہے یہی وجہ ہے کہ بڑھاپے کو نفرت آلود نگاہوں سے دیکھنے کے باوجود ہم میں سے کوئی بھی حیات کے اس ثمر شیریں کو چکھے بغیر زندگی کا بیریر (BARRIAR) عبور کرنا پسند نہیں کرتا۔

یہ مفروضہ بھی درست نہیں کہ بڑھاپا خشک اور بے رنگ ہوتا ہے۔ جن حضرات نے بڑھاپے کی رداۓ زیب تن کر رکھی ہے میرے اس دعوے کی پُر زور تائید کریں گے کہ بڑھاپا ہی درحقیقت اصل اور باتصویر زندگی کا دوسرا نام ہے۔ بڑھاپے کی روحانی فضا میں داخل ہونے سے قبل آپ کے سامنے دن کی چندھیا دینے والی روشنی پھیل رہی ہے لیکن بڑھاپے میں صبح اور شام کا درمیان پرور دھندلکا چھا جاتا ہے۔ ہر چیز دھندلی اور کُہر میں لپٹی نظر آتی ہے۔ آنکھوں کے امراض کے سپشلسٹ اس کیفیت کو نظر کی کمزوری کا نام دے کر بڑھاپے کی قدر و قیمت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر اوقات بھاری فیس بھی وصول کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مگر آپ ان کی ایک نہ سُنیئے۔ انکا مقصد دخل در معقولات کے سوا کچھ نہیں۔ آپ ٹھنڈی میز پر دراز ہو کر روعان انگیز بجلی کو اتروانے کی بجائے اس خدائی دین کو سینے سے چمٹائے رکھیے اور گھر کے در و دیوار سے فطرت کے مناظر تک ہر چیز کو ایک نئے زاویے، نئے رنگ روپ میں دیکھتے جائیے۔

بچپن سے جوانی تک انسان مختلف قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا رہتا ہے بلکہ انسانی زندگی کو اگر غلط فہمیوں کا پلندہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ لیکن بڑھاپے میں یہ تمام غلط فہمیاں از خود دُور ہو جاتی ہیں۔ اب تو کوئی مسکراہٹ آپ کو کسی غلط فہمی میں مبتلا کرسکتی ہے نہ اپالو گیارہ کی کامیاب پرواز کے باوجود آپ چاند تارے توڑ لانے کے کامیاب دعووں سے کسی دوسرے کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی جسارت کرسکتے ہیں۔ اگر پرانی عادت کے مطابق کسی انتہائی جذباتی لمحہ میں کوئی ایسا خیال ذہن میں در آئے تو بھی آپ اسے الفاظ کا لبادہ اوڑھانے میں گریز برتیں گے بڑھاپے میں زندگی اپنے اصل اور منزہ روپ میں آپ کے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے لیکن اس اصل اور منزہ زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آپ خارج کی طرح داخل پر بھی بڑھاپے کو مکمل طور پر مسلط کرلیں ورنہ تاڑنے والوں کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ ع قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔

بڑھاپا — تجزیاتی مطالعہ

سلیم آغا قزلباش

عام طور پر بڑھاپے کو ایک ایسی منجمد صورتِ حال سمجھا جاتا ہے جس میں کسی بہتری کی گنجائش باقی نہ رہی ہو، یعنی بڑھاپا وہ لمحہ ہے جو حنوط ہو چکا ہے یا بقولِ غالب

ہو گئے مضمحل قویٰ غالبؔ — اب عناصر میں اعتدال کہاں

مشتاق قمر صاحب کا زیرِ نظر انشائیہ بڑھاپے کے بارے میں اسی روایتی تنگ نظری کے خلاف ایک کھلا احتجاج ہے۔ وہ بتانا چاہتے ہیں کہ بڑھاپا کسی خاص "ذہنیت" کا نام نہیں ہے کیونکہ ایسا بڑھاپا تو مریضانہ سوچ کا شاخسانہ ہوتا ہے۔ بڑھاپا جسمانی اعضاء کے اضمحلال کا نام بھی نہیں ہے بلکہ بڑھاپا تو داستان گو کی طرح نت نئی آپ بیتیاں اور جگ بیتیاں سناتا نظر آتا ہے مثلاً یہ سطور دیکھئے:

"بڑھاپا دو طرح کا ہوتا ہے، ایک وہ جس کا تعلق آپ کے داخل سے ہے اور جو خود رَو پودے کی طرح آپ کی داخلی سطح پر اُگ آتا ہے۔ اس قسم کا بڑھاپا آپ کا دوست نہیں جانی دشمن ہے — " دوسری قسم کے بڑھاپے کا تعلق آپ کے خارج سے ہے — لیکن اس کے داخل کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ بڑھاپا (جسے میں اصل اور فطری بڑھاپا کہوں گا) ماہ و سال کے پربت سے پھسلتا ہوا دور نیچے ڈھلوان میں دبے پاؤں آپ کو آ لیتا ہے اور ہولے سے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہتا ہے اُمید ہے آپ نے مجھے پہچان لیا ہو گا۔"

مطلب یہ کہ بڑھاپا انشائیہ نگار کے نزدیک ایک دیرینہ دوست ہے جو طویل مدّت کے بعد سرِ راہ اُنہیں آ لیتا ہے، لہٰذا وہ حضرات جو اس دوست کی آمد پر جھنجلاتے ہیں یا اس کے نیاز حاصل کیے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں دراصل بڑے بدنصیب لوگ ہیں۔ یوں بھی مشتاق قمر صاحب کی اپروچ منکرانہ ہے۔ انہوں نے بڑھاپے کے خارجی اور داخلی پہلوؤں پر عمیق نظر دوڑائی ہے نیز وہ بڑھاپے کی ظاہری اور باطنی تبدیلیوں سے باخبر نظر آتے ہیں۔ اس انشائیے میں انشائیہ نگار نے بڑھاپے کو مثبت انداز میں پیش کیا ہے اور یہ بات سجھائی ہے کہ بڑھاپا تکمیلِ ذات کا دوسرا نام ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"دراصل کوئی بھی انسان بڑھاپے کی سُرنگ سے گزرے بغیر مکمل انسان کہلانے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔"

"بڑھاپے کو نفرت آلود نگاہوں سے دیکھنے کے باوجود ہم سے کوئی بھی حیات کے اس ثمرِ شیریں کو چکھے بغیر زندگی کا بیریئر BARRIER عبور کرنا پسند نہیں کرتا۔"

ان جملوں سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ "بڑھاپے کی سُرنگ" میں سے گزرنا "اندر کے آدمی" کو جاننے کے مترادف ہے اور "اندر کا آدمی" دراصل اس بوڑھے مردِ دانا کا بدلا ہوا روپ ہے جو تمام بوڑھوں کے ہاں نسل بانسل سے ایک قدرِ مشترک کی صورت میں موجود ہے اور یہ نہ صرف "اجتماعی ذہن" کا اظہار کرتا ہے بلکہ دوسری طرف انسان کے BRAIN ~~OED~~ کی اولاد بھی ہے۔ گویا بڑھاپا انسان کا وہ اجتماعی لاشعور ہے جو پہلے بدصورت اور

بے نام تھا لیکن اب جسے صُورت بھی تفویض ہو گئی ہے اور نام بھی!

بڑھاپا مشتاق قمر کے ہاں بطور علامت مختلف صورتوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک مقام پر وہ بڑھاپے کو زندگی کے سفر کی علامت کے طور پر استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"بچپن آپ کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔"

"لڑکپن آپ کی ناک میں نکیل ڈالے گلی گلی نچاتا پھرتا ہے۔"

"جوانی آپ سے آپ کا سب کچھ چھین لیتی ہے۔"

"یہ بڑھاپا ہی ہے جو آپ کا چھنا ہوا سارا سرمایہ مع سود لوٹا دیتا ہے۔"

"بچپن سے جوانی تک انسان مختلف قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ لیکن بڑھاپا میں یہ تمام غلط فہمیاں از خود دُور ہو جاتی ہیں۔" یعنی بڑھاپا آدمی کو زندگی کے متلاطم سمندر میں سے نکال کر اپنے شجر سایہ دار کے نیچے لے آتا ہے اور یوں اس کے لیے آخری پناہ گاہ ثابت ہوتا ہے۔ یہی نہیں انشائیہ نگار نے بڑھاپے کو تقدس کا سمبل بنا کر بھی پیش کیا ہے اور بڑھاپے کو نروان حاصل کرنے کی منزل بھی قرار دے ڈالا ہے مثلاً ——

"بڑھاپے سے قبل زندگی ایک ایسا گھن زدہ شجر ہے جس پر سدا کیڑوں کی یلغار رہتی ہے لیکن بڑھاپے میں ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ آپ ان تمام کیڑوں مکوڑوں کو پرے پھینک دیتے ہیں۔"

یہاں انسانی جبلتوں کو کیڑے مکوڑوں سے تشبیہہ دی گئی ہے اور یہ انتہائی لطیف اور نادر تشبیہہ ہے۔ علاوہ ازیں مندرجہ بالا سطور میں "بڑھاپا" نیکی کے دیوتا کی طرح بھی جلوہ گر ہوتا دکھائی دیتا ہے جس کے ظہور پر بدی کے کیڑے مکوڑے روپوش ہو جاتے ہیں۔ انشائیہ نگار نے بڑھاپے کو جہاں بطور سمبل استعمال کیا ہے وہاں اُس نے اسے ایک "نظریہ" کے طور پر بھی برتا ہے مثلاً ——

"دراصل بچپن سے بڑھاپے تک کا سفر حیاتِ انسانی کے پھیلنے اور سکڑنے کی داستان پُر فریب کے سوا کچھ نہیں۔"

یہاں مشتاق قمر صاحب کا اندازِ فکر فلسفیانہ روش اختیار کر گیا ہے اور یہ خیال غالباً ان کے ذہن میں اُس وقت پیدا ہوا جب انہیں زندگی بے معنی خواہشوں کے اتار چڑھاؤ کی زد پر دکھائی دی۔ علاوہ ازیں اس انشائیے میں تشبیہہ اور استعارے کی برجستگی اور تازگی بھی توجہ طلب ہے —— مثلاً ——

"حیات کا ہرا بھرا درخت ٹنڈ منڈ ہو جاتا ہے۔"

"بڑھاپے کی سُرنگ سے گزرے بغیر مکمل انسان کہلانے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔"

"جن حضرات نے بڑھاپے کی ردا زیبِ تن کر رکھی ہے۔"

"بڑھاپا ماہ و سال کے پربت پر سے پھسلتا ہوا دُور نیچے ڈھلوان میں دبے پاؤں آپ کو آلیتا ہے۔"

پھر یہ کہ اس انشائیے میں بڑھاپے کو تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے مثلاً ——

"بڑھاپا آپ کی سرد مہری پر چیں بجبیں ہونے کے بجائے ایک نہایت شفیق اور مہربان دوست کی طرح آگے بڑھ کر پہلے آپ کے ہاتھ میں چھڑی تھما دیتا ہے اور پھر تن بدن کو ایک چُغے سے ڈھانپ دیتا ہے۔"

زیرِ نظر انشائیہ میں وجودی رویّے کو بھی بروئے کار لایا گیا ہے۔ بقولِ مشتاق قمر ——

"انسان کافکا کے ہزار پایہ کی طرح اپنی ذات کے سنگی روم میں مقید ہو کر خارج سے ذہنی و جسمانی آزادی حاصل کر لیتا ہے۔ یہی وہ وقت ہے"

جب انسان ہر قسم کی بیرونی مداخلت کے بغیر اپنے اور اپنی وساطت سے دوسروں کے اچھے بُرے اعمال کا کامیابی کے ساتھ محاسبہ کرنے کا اہل ہوتا ہے۔"

گویا انشائیہ نگار کہنا یہ چاہتا ہے کہ بڑھاپے میں انسان صحیح معنوں میں "فیصلہ کرنے کی آزادی" سے ہمکنار ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ بڑھاپے میں ہی وہ پوری طرح BEING IN ITSELF بننے کی سعی کرتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ یہ کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس وجودی سوچ سے انشائیے میں مزید گہرائی کا سامان پیدا ہوگیا ہے۔ جہاں تک انشائیہ کی انشا رکا معاملہ ہے تو سارا انشائیہ ایک سانس میں پڑھ جائیے کہیں کسی قسم کا بوجھل پن محسوس نہیں ہوگا۔ یوں لگتا ہے جیسے جملے ایک دوسرے کے کندھوں سے کندھے ملائے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ اس اجمالی تجزیے کے بعد آپ یقیناً محسوس کریں گے کہ مشتاق قمر صاحب نے "بڑھاپا" جیسے انتہائی پیش پا افتادہ موضوع کو اپنی قوتِ متخیلہ نیز اپنی سوچ کی نُدرت سے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے۔ انہوں نے اپنے موضوع کو تخیلی سطح پر محسوس کیا اور اس کے پوشیدہ مفہوم کو سطح پر لانے میں کامیاب ہوئے۔ سامنے کی چیز میں پنہاں مفہوم کو طشت از بام کرنا ہی انشائیہ نگار کا اصل فن ہے اور مشتاق قمر اس میں بے حد کامیاب رہے ہیں۔

'سرگوشیاں' کے مصنف سلیم آغا قزلباش کی مرتب کردہ تازہ کتاب

منتخب انشائیے

- آغاز سے اب تک اُردو انشائیے کا ایک بلند پایہ انتخاب
- ہر انشائیہ فکر انگیز اور اعلیٰ درجے کا فن پارہ
- خوبصورت گٹ اپ
- مرتب کا مبسوط اور جامع دیباچہ

قیمت ۲۵ روپے

ناشر: مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا

الگنی | کامل القادری

آج الگنی پر نظر پڑی تو میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا!

کبھی کبھی روزمرہ نظر آنے والی چیزیں بھی اتنی اجنبی بن جاتی ہیں کہ پہچانے پہچانی نہیں جاتیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان سے ابھی ابھی تعارف ہو رہا ہے۔ یہ الگنی جسے میں بچپن سے جھولتا دیکھتا رہا ہوں اور جو ہماری حویلی کے کشادہ آنگن کو شمالاً جنوباً دو مساوی حصوں میں یوں تقسیم کرتی گزرتی ہے جیسے خطِ استوا دنیا کو دو مساوی حصوں میں تقسیم کرتا گزر جاتا ہے۔ گو اس حسنِ تقسیم کا نظارہ شاید و باید ہی نظر آتا ہے۔ جب بھی دیکھا مشرقی اور مغربی آنگن میں سرحدی جنگ چھڑی نظر آتی۔ کبھی مشرقی علاقہ اپنی سرحد بڑھانے میں سبقت لے جاتا ہے کبھی مغربی علاقہ اپنی توسیع پسند طبیعت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ بایں ہمہ نہ یہ ہارتا ہے نہ وہ جیتتا ہے۔ کشمکش جاری رہتی ہے لہو گرم رکھنے کا کچھ تو بہانہ چاہیے۔

البتہ گھڑی دو گھڑی کے لئے اس وقت صلح کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں جب پیڑوں تلے سایہ سمٹنے لگتا ہے۔ ہمارا ملک خطِ سرطان سے اوپر ہے۔ لہٰذا ہماری سمت آوری کا خورشیدِ عالم تاب ماہ مئی میں طلوع ہوتا ہے۔ یہی وہ بھاگوان مہینہ ہے جب سورج مثلِ بالِ ہُما ہمارے سروں پر سایہ گستر ہوتا ہے اور اس کی عمودی شعاعیں ہم میں جلالِ شاہی کے تیور پیدا کرتی ہیں۔

ٹھیک اس وقت یعنی بارہ بجے جب ہمارے مزاج میں برہمی و اختلال کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، مشرقی و مغربی علاقوں میں عارضی مفاہمت ہو جاتی ہے۔ آنگن کے بیچوں بیچ ایک دودھیا دھاری کی نمود ہوتی ہے جو "جنگ بندی" سے کہیں زیادہ "لام بندی" کی علامت ہے۔

یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

ماندگی کا یہ وقفہ مختصر ہوتا ہے۔ سورج بال بھر اِدھر اُدھر ہوا کہ طبلِ جنگ پر چوب پڑی اور مشرقی و مغربی آنگن میں مسابقت کی جنگ از سرِ نو شروع ہو گئی۔

سورج تھک ہار کر بستر شام پر لیٹ جاتا ہے۔ شفق کمہلا جاتی ہے مہرِ نیلگوں روشن ہوتا ہے۔ لیکن یہ کشمکش نہیں تھمتی۔ شب ماہ میں بھی گھمسان کا رن پڑتا ہے۔ کبھی مشرقی علاقہ ظفر و نصرت کے شادیانے بجاتا پیش قدمی کرتا ہے کبھی مغربی علاقہ دراتا ہلّہ بول دیتا ہے اور مشرقی آنگن کو اپنے جالے میں یوں لے لیتا ہے کہ من و تو کی تفریق مٹ جاتی ہے۔ ایک وحدت قائم ہو جاتی ہے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے گریز کا پہلو نکلتا ہے۔ فصل کی خلیج گہری اور کشادہ ہو جاتی ہے۔ جذب و گریز اور وصل و فصل کا یہ نظارہ چشمِ آدم صدیوں سے

دکھتی آ رہی ہے۔ شاید یہ زندگی کی طرح غیر مختتم اور زلفِ محبوب کی طرح لامتناہی ہے۔

اِک سلسلہ لامتناہی ہے کہ زلف

آج الگنی کو نہ معلوم کس آن میں دیکھا تھا کہ قوتِ متخیلہ کو پَر لگ گئے — الگنی نا زِ خیال بن گئی۔ نا توسِ خیال کی وسعت بڑھنے لگی۔ جو کچھ زندگی میں دیکھا تھا سب نگاہ کے سامنے تھا۔

میرے بچپن میں اپنے ہوئے مونج کی الگنی تھی جس پر طرح طرح کے لباس پڑے جھولتے تھے، کبھی کبھی دھوپ دکھانے کے لئے جب صندوق کھولے جاتے تو الگنی پر آبِ رواں، زین شکھ، گلبدن، لاہی، مشروع، گرنٹ، شبنم، وِلت، تنزیب، لاہور کے ریشمی چوڑے اور تنزاتے کے طرح طرح مردانہ و زنانہ لباس کی بہار ہوتی، نیلی پیلی، ہری گلابی، قوسِ قزحی، آسمانی دھانی۔ اگری ساریاں سرسراتی لہراتی، گنگناتی، ہوا سے اٹھکیلیں کرتی، سورج کو ٹھینگا دکھاتی، دھوپ کھاتی رہتی تھیں۔ دھانی رنگ مجھے بہت پسند تھا۔ اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے ایک دھانی آنچل لہرا رہا ہے۔

اسی آنچل کے سائے میں میری پرورش ہوئی۔ زندگی نے معنویت پائی۔ بچپن کا زمانہ بھی کیا ہوتا ہے!

دیکھتے ہی دیکھتے مونج کی جگہ سفید کپاس کی ڈوری تن گئی۔ اور جب میں سنِ تمیز کو پہنچا تو صنعتی انقلاب کی برکتیں اتنی عام ہو گئیں کہ الگنی کی بھی تقدیر پھری۔ آنگن کے بیچوں بیچ تانبے کا تار تن گیا جس کے طمطراق اور تابانی میں طلوعِ آفتاب کے بعد اور بھی اضافہ ہو جایا کرتا تھا۔ اور اب کہ میری کنپٹیوں کے بال چیونٹیوں کے انڈے کی مانند ہو چلے ہیں۔ نیلون کی الگنی نظروں میں اپنی کیگلی حسینہ کی طرح عمرِ رفتہ کو آواز دے رہی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی ابھی یہ شیک ناچ ناچنے لگے گی۔

بیسویں صدی میں کتنی صدیوں کا روپ سمایا ہوا ہے! یہ صدی اتنی تیز اور تغیرات کی حامل ہے کہ ہر آن ایک تازہ جہاں آنکھوں کے سامنے ابھرا کرتی ہے۔ علاؤالدین کا چراغ جیسی قوتِ متخیلہ کا محض افسانوی کرشمہ نہ تھا یہ حقیقت اب کھلی۔

مونج سے نیلون تک فکر و نظر کی معرکہ آرائیاں الگنی پر جھولتے کپڑوں سے بھی منکشف ہو رہی ہیں۔

اب کہاں ہے وہ ڈھاکے کی ململ، بنارس کی مشروع، اورنگ آباد کے کمخواب کشمیر کی شالیں۔ لاہور کے چوڑیے، اب سفینی کی بہار ہے آدم جی کے لون کی چہکار ہے، دھوتڑ اور پھیتو کی دھوم ہے۔ گویا حویلی کا نقشہ ہی بدل چکا ہے، صدیوں پرانی وہ حویلی جس کا جلال و جمال میرے تحت الشعور میں اہتزاز پیدا کرتا رہا ہے، اب نہ جانے کس الگنی پر ہوگا۔ رہن سہن یوں بدلے کہ ہر چیز بدل گئی — وہ جلال کیا ہوا! وہ جمال کیا ہوا! ان کے مادی آثار میں اب کاغذی اینٹوں کی چنی ہوئی چند دیواریں رہ گئی ہیں، بارہ دری ڈھ گئی۔ مہتابی ملبہ بن گئی۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا۔ یہ ایں عقل و دانش فریبِ تخیل۔ نیلون کی الگنی، اس حسنِ باطنی کا اظہار نہیں کرتی مونج کی بات ہی کچھ اور تھی۔

الگنی ہمارا بیش بہا ورثہ ہے، اس پر ہم بامعرفت و بے معرفت ہمہ صفت ہر طرح کی چیزیں ٹانگتے رہے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتی تو ہم کیسے کیسے بوجھ کے نیچے دبے ہوتے، اور ایک وقت ایسا بھی آنے کا جب ہم بھی الگنی پر ڈالنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ازل سے ابد تک ایک غیر مرئی شفاف ڈوری تنی ہوئی ہے۔ ذرا توجہ فرمائیے، اس الگنی پر دیکھی اور ان دیکھی ہر چیز ٹنگی نظر آنے لگے گی۔ بات کچھ متصوفانہ ہو گئی لیکن کیا کروں ہر علم کا آخری سرا تصوف ہی سے پیوست ہوتا ہے۔ یوں بھی مجھے میر بین۔ دیکھنے کا شوق رہا ہے کہ عالم الوان کے نظارے کا

اس سے بہتر ذریعہ اب تک مہیّا نہیں ہو سکا۔

میرے کم سن حافظے کی الگنی پر انسانی تجربات و مُہمات کے سارے معرکے جھول رہے ہیں۔ ہم کیسی کیسی چیزوں کو الگنی پر ٹانگ کر بھول جاتے ہیں، گویا الگنی نہ ہوئی طاقِ نسیاں ہوئی، آج ہم نے اپنی پوری تہذیب اور صدیوں کی ذہنی یافت کو الگنی پر لٹکا رکھا ہے۔ اور بدحواس پھر رہے ہیں، درماندہ ہیں، تلملا رہے ہیں کہ ہماری کوئی تہذیب نہیں — ہم اپنی تہذیب دریافت کرنے کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ ہماری تہذیب الگنی ہے ہینگر نہیں ہے۔

الگنی لاکھ بدل جائے، الگنی ہوگی، وہ ہینگر نہ بن سکے گی۔ الگنی اور ہینگر میں بڑا فرق ہے۔ دونوں دو مختلف پیداواری عہد کی اختراعات ہیں۔ ہینگر اور الگنی کے تلازمات عہدِ ماسبق کی طرح جُدا ہیں اور ان سے وابستہ جذبات، ذہنی اختلافات اور منطق بھی — یہ چیزیں سدا بہار ہیں، کبھی ضعیف و نحیف نہیں ہوتیں، کبھی الگنی پر ڈالنے کے لائق نہیں بنتیں۔ انہیں کون الگنی پر ڈال سکتا ہے!

الگنی سے ہمارا اٹوٹ رشتہ ہے، قلبی ارادت ہے، جگری دوستداری ہے، اُس پر نظر پڑتے ہی فانوسِ خیال جل اٹھتا ہے۔ اس کے تلازمات ہمارے گرد ایک طلسمی حصار بنا لیتے ہیں۔ زمان و مکان کی طنابیں اکھڑ جاتی ہیں اور ہم گوناگوں جلوہ فرشیوں میں کھو جاتے ہیں۔

ہینگر سے ہمارا رشتہ کچھ یونہی سا ہے، جیسے کسی راہ چلتی حسینہ پر اچٹتی نظر ڈال لی یا ازرہِ تفنن اُسے مسکرا کر دیکھ لیا یا جدید بننے کی تڑپ میں بہت بے باک بنے تو بڑھ کر خیریت پوچھ لی۔ لیکن الگنی ہماری خانہ زاد ہے۔ اس سے صدیوں کا معاملہ ہے۔ وہ ہماری دُکھ سُکھ کی رفیق ہے۔ اس پر مخمل و کمخواب بھی ٹنگا رہا ہے اور مُونجیا اور بوریا بھی — وہ ہماری محرمِ راز ہے اور سچ پوچھئے تو وہ ہماری تہذیب کی ایک جاندار علامت ہے۔ اتنی ہی جاندار، منفرد اور یکتا جیسے ہینگر ایک دوسری تہذیب کی علامت ہے۔ اپنی ذات و صفات میں ایک تہذیبی قدر کی مظہر ہے اور اپنے تلازمات و اختلافات میں اتنی ہی مختلف جتنی الگنی ہے۔

نیلون کی نیلگوں الگنی دیکھ کر تحت الشعور، شعور اور اجتماعی شعور یوں گڈمڈ ہوئے کہ الگنی کی کھونٹیاں اکھڑ گئیں۔ یاد آیا ہے الگنی کا ایک اور بھی دلچسپ مصرف رہا ہے۔ جب کوئی تقریب خوشی یا غمی، میلاد و شادی، مشاعرہ و سوز خوانی برپا ہوتی تو الگنی پر پردے لٹکا دیئے جاتے۔ آنگن دو حصوں میں بٹ جاتا، مشرقی حصے میں عورتوں کی محفل سجتی اور مغربی آنگن میں مردوئے مجلس آرائی کرتے اور ان کے درمیان محض ایک پردہ — حجابِ اکبر لیکن کبھی کبھی ہوا کا شوخ جھونکا پردہ کا کوئی کونہ الٹتا تو عجیب منظر ہوتا۔

کسی چیز کا جاندار تجربہ، احساس و جذبہ سے بھرپور ایسی ندی کے مشابہ ہے جس کا سُوتا ہمارے وجود سے پھوٹتا ہے۔ ہماری ذات و صفات کی نمائندہ و ترجمان یہ ندی کبھی تیز گام، کبھی سبک خرام بہتی ہے۔ کبھی پھیل کر جھیل بن جاتی ہے، کبھی سمٹ کر پہاڑی نالے کی شکل اختیار کر لیتی ہے، کبھی ڈھلوان سے گرجتی، چنگھاڑتی، رجز پڑھتی گزرتی ہے، کبھی میدانی علاقے سے سُکھ آنند کا خواب دکھاتی، لہلہاتی گزرتی ہے، کبھی عربدہ جو محبوبہ کی طرح رُخ پھیرتی، کتراتے کاٹتی، اپنے زور میں گرتی سنبھلتی ایک نئی راہ پر رواں دواں ہوتی ہے۔ کبھی عاشقِ ناکام کی طرح غمِ جاناں کو غمِ دوراں میں ڈبوئے کسی بند، کسی حصار، کسی ڈیم میں عزلت کا دامن تھام لیتی ہے اور کبھی بقائے دوام کی لگن میں بے خوف و ہراس اتاہ بحر کا ورد کرتی سیماب وار بحرِ فنا میں غوطہ زن ہوتی ہے ؎ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

فنا و بقا کا سارا رنگ الگنی پر لٹکا رکھئے کہ الگنی ہماری تہذیب کی علامت ہے، جس کا ایک سرا ازل اور دوسرا ابد سے بندھا ہے۔

سجاد نقوی

الگنی — تجزیاتی مطالعہ

میں نے تجزیے کے لیے کامل القادری کا انشائیہ 'الگنی' منتخب کیا ہے۔ کامل القادری اُردو انشائیہ نگاروں کے ہراول دستہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی زندگی نے وفا نہ کی ورنہ اُردو انشائیہ میں ان کی ایک منفرد آواز تھی۔ انہوں نے گنتی کے چند ایک انشائیے لکھے ہیں مگر ان میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ان کا نام اُردو ادب میں تادیر زندہ رکھے گا۔

انشائیہ نگار عموماً ایسے موضوع پر قلم اٹھاتا ہے جو بظاہر بڑا ہی معمولی ہوتا ہے لیکن جب انشائیہ نگار کے شگفتہ اسلوب اور تازہ افکار سے مَس کرتا ہے تو یہ موضوع نہ صرف غیر معمولی ہو جاتا ہے بلکہ انوکھا بھی نظر آنے لگتا ہے۔ 'الگنی' کامل القادری کا معمولی موضوع کا ایسا ہی ایک غیر معمولی انشائیہ ہے۔ الگنی سے ہم میں سے کون واقف نہیں ہے۔ گھر اور الگنی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ گھر چھوٹا ہو یا بڑا، پرانا ہو یا نیا، غریب کا ہو یا امیر کا، الگنی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ کسی گھر کی رونق یا بے رونقی اور اس طرح ثروت یا غربت کا اندازہ کرنا ہو تو آنگن میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک جھولتی ہوئی الگنی پر نظر ڈالی جائے۔ اس سے لٹکتے ہوئے کپڑوں کی کمیت اور کیفیت بتلا دے گی کہ گھر کس نوع کا ہے۔ یہ تو یہ خود الگنی بھی اپنے مالک کی سماجی حیثیت کا راز طشت از بام کر دے گی۔ وہ یوں کہ اگر الگنی مونج یا پرانی لوہے کی تار کی ہوگی تو یہ اپنے گھر کی غربت کا اعلامیہ ہوگی۔ اگر پٹ سن یا سُوت کی ہوگی تو اس سے ظاہر ہوگا کہ گھر کسی زمیندار کا ہے اور اس نے اپنے گھر کی پٹ سن یا کپاس سے اسے تیار کیا ہے۔ اس طرح اگر الگنی بجلی کی تار یا نائلون کی ہوگی تو اس سے پتہ چلے گا کہ گھر کسی تاجر اور دوکاندار کا ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ انشائیہ میں اہمیت اسلوب اور افکار کی شگفتگی اور تازگی کی ہوتی ہے۔ 'الگنی' میں یہ دونوں صفات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ کامل القادری اُردو زبان کے معاملے میں ان رجعت پسند اہلِ زبان یا زبان دانوں میں سے نہیں تھے جو اسے دہلوی یا لکھنوی روزمرہ اور محاورے تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کی وسعت کے قائل تھے لہٰذا ان کی تحریر میں جہاں کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی زبان ملتی ہے وہاں کہیں کہیں مقامی زبانوں کے الفاظ کے ساتھ ساتھ ان کا مخصوص روزمرہ بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً اپنے انشائیے فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں "بعض نقد ادیب فٹ نوٹ کو متن پر فوقیت دیتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ متن میں نفسِ موضوع کی رونمائی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس فٹ نوٹ میں مصنف کا تشخص لشکارے مارتا ہے۔" اس عبارت میں کامل القادری نے 'لشکارے' کا پنجابی لفظ استعمال کیا ہے جس کا مترادف اُردو میں ناپید ہے۔ مزید اسی انشائیے میں لکھتے ہیں کہ "انہوں نے اس ثنویت کو وحدت میں بدلنے کا بیڑا اٹھایا اور فٹ نوٹ اور متن کے مابین ایسی یگانگت پیدا کی کہ تمام "فٹ نوٹیے" ہائے افسوس کہتے رہ گئے۔" اس جملے میں کامل القادری نے فٹ نوٹ سے 'فٹ نوٹیے' کی ترکیب خالص پنجابی روزمرہ کے تحت بنائی ہے۔ اس طرح "لشکارے" اور "فٹ نوٹیے" کے الفاظ کامل القادری نے اپنے اسلوب میں بڑے فطری انداز سے شامل ہونے دیے ہیں جس سے ان کے اسلوب میں شگفتگی اور بڑھ گئی۔ ان کے انشائیے 'الگنی' کے اسلوب میں بھی شگفتگی ہے مگر اسے کامل القادری نے

خالص اُردو روزمرّہ اور محاورے میں ہلکا پیدا کیا ہے۔ "فٹ نوٹ" کے مقابلے میں "الگنی" کا موضوع کیونکہ انشائیہ نگار کے مزاج اور تجربے کے زیادہ قریب تھا لہذا اس کے اسلوب میں از خود بے تکلفی کا عنصر شامل ہو گیا ہے اور اسے اپنے اسلوب میں شگفتگی لانے کی شعوری کوشش نہیں کرنا پڑی ہے مثلاً کامل القادری "الگنی" کا آغاز ان جملوں سے کرتے ہیں:

"آج الگنی پر نظر پڑی تو میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ کبھی کبھی روزمرّہ نظر آنے والی چیزیں بھی اتنی اجنبی بن جاتی ہیں کہ پہچانے پہچانی نہیں جاتیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان سے ابھی ابھی تعارف ہو رہا ہے۔ یہ الگنی جسے میں بچپن سے جھولتا دیکھ رہا ہوں اور جو ہماری حویلی کے کشادہ آنگن کو شمالاً جنوباً دو مساوی حصّوں میں تقسیم کرتی گزرتی ہے جیسے خطِ استوا دو مساوی حصّوں میں تقسیم کرتا گزر جاتا ہے گو اس حسنِ تقسیم کا نظارہ شاید و باید ہی نظر آتا ہے، جب بھی دیکھا مشرقی اور مغربی آنگن میں سرحدی جنگ چھڑی نظر آئی۔ کبھی مشرقی علاقہ اپنی سرحد بڑھانے میں سبقت لے جاتا ہے کبھی مغربی علاقہ اپنی توسیع پسند طبیعت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ بہ ایں ہمہ نہ یہ ہارتا ہے، نہ وہ جیتتا ہے، کشاکش جاری رہتی ہے۔ لہو گرم رکھنے کا کچھ تو بہانہ چاہیئے۔"

اسلوب و فکر کی تازگی کے علاوہ انشائیہ کی خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انشائیہ نگار بعض ایسے لفظ استعمال کرتا ہے جن میں "کنایہ" کی خوبی موجود ہوتی ہے یعنی ظاہری سطح کے نیچے معنی کی ایک مخفی سطح بھی موجود ہوتی ہے۔ دراصل زبان کی یہ کنایاتی سطح ہی انشائیے کے معمولی موضوع کو معنوی اعتبار سے ایک غیر معمولی سطح پر لا کھڑا کرتی ہے۔ کامل القادری کے انشائیے "الگنی" میں ان کے دوسرے انشائیوں کی نسبت یہ خوبی بڑی نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ بالا اقتباس ہی پر نظر ڈالیں۔ انشائیہ نگار نے گھر کے آنگن کو شمالاً جنوباً تنی الگنی سے دو حصّوں مشرق اور مغرب میں تقسیم کر دیا ہے اور ان کے درمیان سرحدی جنگ چھیڑ کر آنگن کے ساتھ مشرق اور مغرب کے معنی ہی بدل دیئے ہیں، اب آنگن گھر کا آنگن نہیں رہا، دنیا کا آنگن بن گیا ہے اور مشرق براعظم ایشیا اور مغرب براعظم یورپ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ان دونوں کی آپس میں آویزش اور توسیع پسندی کا مظاہرہ آج کے انسان سے کب پوشیدہ ہے۔ اگر روس افغانستان تک اپنی سرحد بڑھانا چاہتا ہے تو امریکہ نکارا گوا تک اپنی توسیع پسندی کی الگنی پھیلانا چاہتا ہے۔

کنایاتی زبان کے علاوہ اسی انشائیے میں فکر و خیال کی تازگی کی ایک دو مثالیں بھی ملاحظہ ہوں:

"الگنی ہمارا بیش بہا ورثہ ہے۔ اس پر ہم بامصرف و بے مصرف ہمہ صفت ہر طرح کی چیزیں ٹانگتے رہے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتی تو ہم کیسے کیسے بوجھ کے نیچے دبے ہوتے اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب ہم بھی الگنی پر ڈالنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ازل سے ابد تک ایک غیر مرئی شفاف ڈوری تنی ہوئی ہے۔ ذرا توجہ فرمایئے، اس الگنی پر دیکھی اَن دیکھی ہر چیز ٹنگی نظر آنے لگے گی۔"

اس اقتباس میں الگنی وقت اور موت کی علامت قرار دی جا سکتی ہے، یہ بالکل نیا خیال ہے۔ اسی طرح کامل القادری جب الگنی اور ہینگر کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"ہینگر سے ہمارا رشتہ کچھ یونہی سا ہے جیسے کسی راہ چلتی حسینہ پر اچٹتی نظر ڈال لی یا ازراہِ تفنن اسے مسکرا کر دیکھ لیا یا جدید بننے کی تڑپ میں بہت بے باک بنے تو بڑھ کر خیریت پوچھ لی لیکن الگنی ہماری خانہ زاد ہے۔ اس سے صدیوں کا معاملہ ہے۔ وہ ہماری دُکھ سُکھ کی رفیق ہے اس پر مخمل و کمخواب بھی ٹنگا رہا ہے اور موٹیا اور بوریا بھی۔ وہ ہماری محرمِ راز ہے اور سچ پوچھئے تو وہ ہماری تہذیب کی ایک جاندار علامت ہے۔"

اس عبارت میں وہ الگنی کو ہماری تہذیب کی جاندار علامت بنا دیتے ہیں اور یہ بڑا معنی خیز اور فکر انگیز خیال ہے۔

"الگنی" میں ایک جگہ کامل القادری لکھتے ہیں کہ "کسی چیز کا جاندار تجربہ، احساس و جذبے بھرپور ایسی ندی کے مشابہ ہے جس کا سوتا ہمارے وجود سے پھوٹتا ہے۔" میں جب اس جملے پر غور کرتا ہوں تو اس میں مجھے جہاں صنفِ انشائیہ کی تمام تر روح جھلکتی نظر آتی ہے وہیں اس کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگار کی ذات بھی اپنے بھرپور احساس و جذبات کے ساتھ کسی چیز کے جاندار تجربے کو انشائیہ میں منتقل کرتی نظر آتی ہے۔ کم از کم کامل القادری نے "الگنی" کو اپنے بھرپور احساس و جذبات کے ساتھ ایک جاندار تجربہ ضرور بنا دیا ہے۔ صرف دو مثالیں دیکھئے:

"میرے بچپن میں، بٹے ہوئے مونج کی الگنی تھی جس پر طرح طرح کے لباس پڑے جھولتے تھے...... دھانی رنگ مجھے بہت پسند تھا۔ اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے ایک دھانی آنچل لہرا رہا ہے۔ اسی آنچل کے سائے میں میری پرورش ہوتی، زندگی نے معنویت پائی، بچپن کا زمانہ بھی کیا ہوتا ہے؟"

"یاد آیا ہے! الگنی کا ایک اور دلچسپ مصرف رہا ہے۔ جب کوئی تقریب، خوشی یا غمی، میلاد و شادی، مشاعرہ و سوز خوانی برپا ہوتی تو الگنی پر پردے لٹکا دیے جاتے۔ آنگن دو حصوں میں بٹ جاتا۔ مشرقی حصّہ میں عورتوں کی محفل سجتی اور مغربی آنگن میں مرد مجلس آرائی کرتے اور ان کے درمیان محض ایک پردہ۔ حجابِ اکبر! لیکن کبھی کبھی ہوا کا شوخ جھونکا پردے کا کوئی کونا الٹتا تو عجیب منظر ہوتا۔"

آخر میں میں صرف اتنا کہوں گا کہ کامل القادری ایک کامیاب انشائیہ نگار تھے اور انشائیہ میں جتنی صفات کی ہم توقع رکھتے ہیں وہ سب ان کے انشائیے میں موجود تھیں۔ کاش وہ چند سال اور زندہ رہتے اور دیکھتے کہ صنفِ انشائیہ نے کس سرعت کے ساتھ ارتقاء کی منزلیں طے کی ہیں۔ بہرحال کامل القادری کا کسی اور صنفِ ادب میں نام زندہ رہے یا نہ رہے، اُردو انشائیہ میں ان کا نام یقیناً احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔

سجّاد نقوی کے مضامین کا مجموعہ

تنقید اور تجزیہ

(زیرِ طبع)

مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا

ہارڈ بیڈ

کامل القادری

یہ خبر سنتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے دوست و دشمنوں، مجھے یاروں نے "ہارڈ بیڈ" پر لٹا دیا ہے۔ مجھے — جو ہمیشہ سوفٹ بیڈ کا عادی رہا ہوں، میری کلبلی کا یہ حال رہا ہے کہ لاہور کی شکارے مارتی گرمی میں بھی دبیز گدے کے بغیر چیٹ سیدھی ہتھیلی جیسی تختی۔ نہ جانے کھُری چارپائی اور تخت پر لوگ کیسے سوتے ہیں۔

بچپن سے اس وقت تک بستر و بالیں کا تصور آسودگی کے مفہوم سے آشنا رہا ہے۔ بستر ماں کی آغوش کی طرح آرام دہ اور نرم و گداز ہوتا ہے۔

بستر آزادی سے اور سرشاری کی علامت ہوتا ہے۔ اس پر لیٹنا، کروٹیں بدلنا، اونگھنا، خراٹے بھرنا، سونا، بیدار رہنا، اٹھنا، بیٹھنا، بستر چھوڑنا، یہ سب افعال آزاد تلازمہ اور آزاد ادراک کے تحت سرزد ہوتے ہیں۔ ان میں جبر کا کوئی جزو، کوئی امنگ کوئی رنگ و آہنگ نہیں ہوتا۔ جی چاہا لیٹ گئے، نیند آئی سو گئے، دل میں آیا، آنکھیں ملتے اٹھ بیٹھے۔ آزادی اور اختیار کا رشتہ بستر سے استوار چلا آتا ہے۔

بستر جولان ہستی کا رازداں بھی ہوتا ہے۔ بچپن میں بستر پر اُچھلنے کودنے اور قلابازیاں لگانے کی لذت کا پوچھنا کیا۔ عنفوانِ شباب کی خوابناک کیفیت، انجانی مستی کی پینگ اور بدن کی کسمساہٹ کا حال کوئی بستر سے پوچھے اور پھر چڑھتی جوانی کی سرشاری اس بھید سے آشنائی کیسے کیسے رچار بدن کی خوشبو اس میں جذب ہے۔

بستر ہجر و وصال کی ساری کیفیتوں کا آئینہ دار ہے اور ساری ناآسودگیوں اور کلفتوں کا جاذب، عہد سے لحد تک کا یار مہرباں اور ہماری دل کی دھڑکنوں کا رازداں۔ آسودگی کا گہوارہ، سختی، گرانی اور جبر کے تصور سے ناآشنا، لیکن ناکردہ گناہی کی سزا میں ابھی ابھی جس ہارڈ بیڈ پر لٹایا گیا ہوں، وہ کوئی اور شے ہے، اس کا مزہ کچھ اور ہے۔ بستر کے تلازمات سے یکسر خالی۔ حکم ہے ایک انگ لیٹے رہو۔ اسی میں عافیت ہے۔ یہ ایک نیا تجربہ ہے۔ زندگی کا ایک نیا استعارہ ہے۔

میں نہیں جانتا کہ کس قسم کے مریض کو ہارڈ بیڈ پہ لیٹے رہنے کا مشورہ دیا جاتا ہے، اس کی حقیقت ڈاکٹروں پر ہی منکشف ہونے دیجیے۔ میرا احساس تو یہ ہے کہ ہارڈ بیڈ طریقہ علاج نہیں بلکہ ایک مرض ہے، وجع مفاصل سے بھی خطرناک۔ اس کا مبتلا ہونے مرتا ہے نہ مارتا ہے، بس لیٹا رہتا ہے۔ کشمیر، فلسطین اور اب افغانستان ہارڈ بیڈ پر براجمان نظر آ رہے ہیں اور اطبا دپریشان ہیں کہ یہ طریقہ علاج کارگر کیوں نہیں ہوتا، چارہ گر خود مریض بنے جا رہے ہیں۔ چارہ گری کی لاج رکھنے کا سرے سے سوال

ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلے میں وہ جو مفاصل نہایت شاعرانہ اور خاصا رومانی مرض ہے۔ اس کی ابتدا کمر میں لوچ پڑنے سے ہوتی ہے جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ زبان کی لوچ نکل جاتی ہے۔ کبھی پٹھے بھی اتر جاتے ہیں یا ریڑھ کے تینتیس مہروں میں سے ایک آدھ اِدھر اُدھر فالتو پرزے کی طرح لڑھک جاتی ہے، یا گھس گھسا جاتی ہے اور کبھی زور آزمائی میں اپنے زور میں تڑخ یا چٹخ جاتی ہے معاف کیجئے، میں نے دونوں الفاظ لکھ دیئے ہیں کہ میں اہلِ زبان نہیں ہوں اور نہ زبان دان، ورازیٔ زبان کا حال خلقِ خدا کو معلوم ہے پھر ان پنبہ در دہاں رہتا ہوں۔ اس کا ایک فائدہ ہے کہ عیب و ہنر چھپا رہتا ہے۔

مردِ مومن کے لیے ہارڈ بیڈ کا یوں بھی تجربہ نیا نہیں ہے۔ تیرہ سو سال سے اس کا بار بار تجربہ ہوتا رہا ہے۔

گویا ہارڈ بیڈ سراسر تخلیقی عمل ہے اور انسانیت کو ارتقا کی جانب ایک بھرپور جست لگانے کے لئے ہارڈ بیڈ سے گزرنا پڑتا ہے۔ غالباً فلسفۂ تاریخ کا مفکر آرنلڈ ٹوئن بی بھی ہارڈ بیڈ پر لیٹا یا لٹایا گیا ہوگا۔ کیوں کہ اس کے کلیدی الفاظ ہی "چیلنج" اور "مدافعت" ہیں اور ان دونوں کا تعلق ہارڈ بیڈ سے خاصا استوار ہے کہ ان دونوں کے درمیان سکتے کی مدت ہی ماحصل حیات ہوتی ہے اسے ہم تیاری کی مدت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اچھی فصل اگانے کے لئے کھیت کو جوت گوڑ کر ہموار کیا جاتا ہے اور پھر کھاد دے کر کچھ دنوں چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ مٹی میں آکسیجن کے خانے بن جائیں اور اس کے بعد کہیں تخم کاری کی جاتی ہے۔ ہارڈ بیڈ غالباً اسی لمحۂ فرصت کا نام ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس لمحۂ فرصت میں ادب کو کونسا تحفہ دیتے ہیں۔ ادب کی تخلیق کے لئے بھی ایسے سکتے (کوما) کی ضرورت ہوتی ہے۔ زہے نصیب کے وہ ہارڈ بیڈ پر لیٹے ہیں، اس تصور سے بہجت کی کیفیت پیدا ہوئی اور میں اچھل کر ہارڈ بیڈ سے اپنے روایتی سوفٹ بیڈ پر آگیا۔

غزل کے نئے امکانات کا منظر نامہ

اسعد بدایونی کا شعری مجموعہ

خیمۂ خواب

شائع ہو چکا ہے

رابطہ:۔ مکتبہ جامعہ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ (بھارت)

مناظر عاشق ہرگانوی

ہارڈ بیڈ ــــ تجزیاتی مطالعہ

اس انشائیہ کا موضوع انتہائی عام اور روزمرہ سے قریب ہے لیکن نظر انداز شدہ موضوع ہے۔
ایسے ہارڈ موضوع پر مختلف دنیاوی مسائل اور واقعات پر اسی کے پردہ میں اظہار خیال کرنا کامل القادری کا ہی کام ہے۔ انہوں نے طنز کے چھینٹے جا بجا بکھیرے ہیں اس کے باوجود پورے مضمون میں ایک بزرگانہ اور سنجیدگی کو چھوتا ہوا شگفتہ انداز پایا جاتا ہے۔ آپ بیتی نما اس انشائیہ کی سیدھی اور براہ راست باتیں کچھ یوں بھی ہیں :

"میری گلبدنی کا یہ حال رہا ہے کہ لاہور کی لشکارے مارتی گرمی میں بھی دبیز گدے کے بغیر بیٹھنا سیدھی نہیں ہوتی تھی، نہ جانے کھری چارپائی اور تخت پر لوگ کیسے سوتے ہیں۔"

سماج کی بے شمار برائیوں میں سوفٹ بیڈ کے خواہاں حضرات بھی شامل ہیں۔ حالانکہ عام تجربۂ زندگی یہ بتاتی ہے کہ ہارڈ بیڈ پر سونے والے، اچھلنے، کودنے اور قلابازیاں لگانے کی لذت حاصل کرنے والے، اور انجانی مستی کی پینگ اور بدن کی رسمساہٹ کا حال جاننے والے دراصل وہ ہیں جو سختی، گرانی اور جبر کے تصور سے آشنا ہیں۔ سوفٹ بیڈ میں رچنار بدن کی خوشبو ضرور ملتی ہے مگر یہ ایک مرض ہے، کردہ گناہ ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ کشمیر ہو، فلسطین ہو، افغانستان ہو، ویت نام ہو ــــ آسام ہو ہر جگہ اسی کردہ گناہ کے شعلے نظر آرہے ہیں۔ اطباء کی پریشانی اپنی جگہ درست ہے۔ دراصل سائنسدانوں نے اس پریشانی کو بڑھانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے ــــ بستر کو آرام دہ اور نرم و گداز بنا کر آزادی اور اختیار کا رشتہ اس سے استوار کرنا کہاں کی عقلمندی ہے! سچ تو یہ ہے کہ سوفٹ بیڈ پر سونا ایک قبیح رسم ہے۔ اسے ملیا میٹ کر دینا ہی بہتر ہوگا۔ اس کے خلاف پُرزور پروپیگنڈہ کیا جانا چاہیے۔ مگر اس ہنگامی کام کے لیے پروگرام قبل سے مرتب کر لینا ضروری ہے، کیونکہ بغیر پروگرام کے آج کل کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوتی۔

کامل القادری نے بستر کے تصور کو یوں اُجاگر کیا ہے :

"بچپن سے اس وقت تک بستر و بالین کا تصور آسودگی کے مفہوم سے آشنا رہا ہے۔ بستر ماں کی آغوش کی طرح آرام دہ اور نرم و گداز ہوتا ہے۔"

ماں کی آغوش کی نرماہٹ، گرماہٹ اور وسعت کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہاں سوفٹ بیڈ اور ہارڈ بیڈ کی شرط نہیں ہے۔ سوفٹ بیڈ کو آسودگی کا گہوارہ بنانے والوں کو جب کبھی ہارڈ بیڈ پر لیٹنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے تب ہارڈ بیڈ بذاتہٖ ایک مرض ہو جاتا ہے، وجع مفاصل سے بھی خطرناک اور کامل القادری کو کہنا پڑتا ہے :

" وجع مفاصل نہایت شاعرانہ اور خاصا رومانی مرض ہے۔ اس کی ابتدا کمر میں لوچ پڑنے سے ہوتی ہے جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ زبان کی

نوچ نکل جاتی ہے۔ کبھی پیچھے بھی اتر جاتے ہیں یا ریڑھ کے تنتیس مُہروں میں سے ایک آدھ اِدھر اُدھر فالتو پرزے کی طرح ڈھلک جاتی ہے یا کھسک جاتی ہے اور کبھی زور آزمائی میں اپنے زور میں ٹوٹ یا چٹخ جاتی ہے۔"

لیکن یہ تو ایک رُخ ہوا۔ دوسرے رُخ کا بیان کامل القادری نے یوں کیا ہے:

"مردِ مومن کے لیے ہارڈ ہیڈ کا یوں بھی تجربہ نیا نہیں ہے۔ تیرہ سو سال سے اس کا بار بار تجربہ ہوتا رہا ہے۔

گویا ہارڈ ہیڈ ـــــ سراسر تخلیقی عمل ہے اور انسانیت کو ارتقاء کی جانب ایک بھرپور جست لگانے کے لیے ہارڈ ہیڈ سے گزرنا پڑتا ہے۔"

چیلنج اور مدافعت کی اس دورُخی کو بیان کرتے ہوئے کامل القادری نے آرنلڈ ٹوئن بی کا نام لیا ہے۔

ایسی برگزیدہ شخصیت کو اربابِ قضا و قدر جلد از جلد عالمِ ہستی سے عالمِ نیستی میں واپس کر دیتے ہیں۔ ایسے مثالی لوگوں کا انجام، خواہ یہ زائیدۂ قلم کار ہو یا پروردۂ قدرت، عموماً المیہ ہوتا ہے۔ مگر اپنی الم ناکی کے باوجود یہ دستِ فنا سے محروم رہتے ہیں۔ مثالی شخصیت کے المیہ کا یہی رُخ طرب ناک اور درخشاں ہے۔ تاریخ، ادب اور تہذیب کی ایسی شخصیتیں زیادہ حوصلہ مند اور فعّال ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ ان کے مزاج اور ماحول کی ہم رنگی ہے۔ اس طرح ان کے یہاں نہ صرف سوفٹ ہیڈ کی ہیئت دُور ہوتی ہے بلکہ ہارڈ ہیڈ کی جدّت اور نفاست بھی آ جاتی ہے۔ یہ مشاہدہ کی بات ہے کہ اچھی فصل مناسب فضا کا نتیجہ ہوتی ہے یا نامناسب فضا میں لہلہاتی ہے؟ عصری بحران اور انتشار کی نشو و نما کے لیے یہ نہایت سازگار ہے۔ تولید میں اس کی آمد یا آورد کا گوشوارہ بنانا اچھے اچھے دانشوروں کے لیے بھی مشکل ہے۔ جہاں تک سوفٹ ہیڈ پر اچھل کود کرنے والوں کا تعلق ہے وہ کنڈ کریلے کی بیلوں کی مانند تیزی سے بڑھتے ہیں لیکن زیادہ دن تک ہرا بھرا نہیں رہتے۔ یہ جلد اپنا رنگ بدل دیتے ہیں، توبہ استغفار کر کے زیارت کو نکل جاتے ہیں اور واپسی کے بعد شرعی بن جاتے ہیں اور فتنہ اور فتور کی دنیا سے منہ موڑ کر خیر و خدمت کی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ روایتی رسوم کے اجرا اور چلتے پھرتے عقائد کی راستی پر یقین، نہایت کامل اور پختہ ہو جاتا ہے۔

کامل القادری کا یہ انشائیہ پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مداخلت کیے بغیر محاکاتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا ہے۔ اس انشائیہ میں موضوع کا تنوع، زبان کی چاشنی، محاوروں کا لطف اور طنز کا نشتر سب کچھ موجود ہے۔

ڈاکٹر انور سدید | ذکر اس پری وش کا

ہر روز جب گھڑیال صبح کی منادی دیتا ہے اور گردشِ گردوں عمرِ عزیز کا ایک دن اور گھٹا دیتی ہے تو دفتر میرے اعصاب پہ پیرِ تسمہ پا کی طرح سوار ہو جاتا ہے۔ میری آنکھ گھڑی کی سوئی کے ساتھ گردش کرنے لگتی ہے اور جب تک ناشتہ زہر مار کر کے کپڑوں سے سلجھنے اور بیگم سے اُلجھنے کے بعد میں گھر سے رخصت نہیں ہو جاتا یہ اعصابی تناؤ اسی طرح قائم رہتا ہے۔ تشنج کا یہ لمحہ تکلیف دہ ضرور ہے لیکن زیادہ طویل نہیں۔ گھر سے رخصت ہوتے ہی اس میں بتدریج کمی واقع ہونا شروع ہو جاتی ہے اور جونہی دفتر کی کرسی پر بیٹھ کر میری نظر فائیلوں کی انجمن پر پڑتی ہے میرا اعصابی تناؤ یکسر ختم ہو جاتا ہے۔ آنکھوں میں سرمئی ڈورے سجائے اور کمر میں سُرخ ریشمیں ربن باندھے یہ خوبصورت پریاں قطار اندر قطار میرے سامنے مؤدب سربزانو پیش ہونے لگتی ہیں اور میں ان پر سُرخ، سبز اور سیاہ روشنائی سے عرضیاں لگانے لگتا ہوں۔

میری حکمرانی کا یہ منظر دیدنی ہوتا ہے۔ میں اپنے آپ کو اس خوبصورت اکھاڑے کا راجہ اِندر تصور کرتا ہوں۔ کسی من موہنی صورت کو اپنے پہلو میں جگہ دیتا ہوں، کسی کبیدہ رُو کو جھٹک کر پرے پھینک دیتا ہوں اور کسی عالی وضع سے خوش ہو کر خود کورنش بجا لاتا ہوں اور جب تک وہ خراماں خراماں میرے کمرے سے رخصت نہیں ہو جاتی، میں سر جھکائے اس کے سامنے مؤدب کھڑا رہتا ہوں اور کبھی کبھی تو اپنی مسند سمیت اس کے سامنے سرنگوں بھی ہو جاتا ہوں۔

زندگی کے گذشتہ چالیس برس میں نے انہیں فائیلوں کے درمیان گزارے ہیں۔ یہ فائیلیں میرا حلقۂ احباب ہیں، یہ میری خلوت کی محرم اور دُکھ سُکھ کی شریک ہیں۔ ان کی انجمن میں مَیں نے اپنے آپ کو کبھی تنہا محسوس نہیں کیا۔ عام طور پر میرے بارے میں لوگوں کا تاثر کچھ اچھا نہیں۔ بیشتر لوگ مجھے مردم بیزار اور چڑچڑا قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں حسِ لطیف سے عاری ہوں اور لطفِ انجمن اُٹھا نہیں سکتا۔ اس لئے دنیا کی محفلوں سے جلد ہی اکتا جاتا ہوں۔ عوام الناس میرے قریب آنے سے ہچکچاتے ہیں اور تکمیلِ مقاصد کے لئے رابطے کا کوئی اور وسیلہ تلاش کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشکل کشائی کی یہ عمدہ اہلیت میرے چپڑاسی کو عطا کر رکھی ہے اور وہ اس پر بے حد نازاں ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ چپڑاسی دنیا کی ایک ایسی مخلوق ہے جس کی عملداری میں دفتر، افسر اور فائیل سب شامل ہیں اور وہ اس اقلیم کا واحد اور مستقل حکمران ہے۔ بظاہر وہ کمرے کے باہر پڑے ہوئے چوبی بنچ پر دن بھر اونگھتا رہتا ہے لیکن جونہی میرے کسی اجنبی ملاقاتی کی شکل دیکھ لیتا ہے تو اس کا سارا وجود ایک داخلی مسرت سے جھنجھنا اُٹھتا ہے اور وہ اس کی پذیرائی کیلئے اس کے آگے بچھ بچھ جاتا ہے لیکن جونہی ملاقاتی میرے کمرے کی طرف لپکتا ہے تو چپڑاسی اس کے سامنے سدِ سکندری بن جاتا ہے اور میری شدید ترین

مصروفیت کی آڑ لے کر اُسے آرام گاہ میں انتظار کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

دنیا کے تمام عقلمند لوگ ٹیلی سے رابطہ بڑھانے سے قبل ٹیلی کی پالتو مخلوق سے پیار پیدا کرتے ہیں۔ میرا ملاقاتی بھی دنیا کے ان معدودے چند زیرک لوگوں میں شمار ہوتا ہے جو افسر سے ملنے سے قبل چپراسی سے رابطۂ محبت استوار کرتے ہیں۔ چنانچہ بیشتر لوگوں کا ایقان ہے کہ چپراسی نہ ہو تو افسر کا عوام الناس سے مؤثر رابطہ پیدا کرنا محال ہو جائے۔ بعض اوقات تو میں خود یہ محسوس کرتا ہوں کہ افسر اور دفتر ندی کے دو متوازی کناروں کی صورت اگرچہ ایک ہی سمت میں رواں ہیں لیکن اپنے درمیان بہتی ندی کا فاصلہ ہمیشہ قائم رکھتے ہیں۔ چپراسی ان نہ ملنے والے کناروں کو ایک معلق پل کی صورت ملاتا ہے۔ اس پل کا فائدہ نہ صرف عوام الناس اُٹھاتے ہیں بلکہ دفتر کی تمام فائیلیں بھی اس پل کو عبور کر کے ہی دوسرے کنارے تک پہنچتی ہیں۔

عام لوگ سمجھتے ہیں کہ چپراسی اُردو کی زیرِ اضافت کی طرح ہے اور اس کی ذاتی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ مفروضہ نہ صرف غلط ہے بلکہ سراسر بے معنی بھی ہے۔ حقیقت میں افسر تو چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ آج یہاں، کل وہاں، آئے روز کے تبادلوں نے اس کے پاؤں میں چکر ڈال رکھا ہے۔ اس لئے دفتر پر افسر کے اثرات دائمی نہیں ہوتے، اور دفتر ہر نئے افسر کی آمد کے ساتھ ہی اپنی ہیئت کذائی میں تبدیلیاں پیدا کر لیتا ہے اور اس کی یاد صرف ایک تصویر رہ جاتی ہے جسے آثارِ قدیمہ کی صورت دفتر کی دیوار کے ساتھ لٹکا دیا جاتا ہے اور چپراسی اگر اس کی گرد نہ جھاڑے تو شاید پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہ جائے۔ اس کے برعکس چپراسی دفتر کا مستقل ملازم ہے۔ دفتر کی آرائش اور زیبائش میں اس کی کہنہ مشقی اور طویل تجربہ شامل ہے۔ فائیل سے اس کی دوستی دیرینہ اور پختہ ہے، چنانچہ جس فنکارانہ انداز میں فائیل کے بندِ قبا چپراسی کھولتا ہے یہ انداز کسی بڑے سے بڑے مشتاق افسر کو بھی نصیب نہیں ہوا، ہر چند وہ کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں لیکن اس کی چھٹی حس بہت مضبوط ہے۔ وہ فائیل کو دیکھتے ہی بتا سکتا ہے کہ اس کے اندر کون سے افادی راز نہاں ہیں۔ فائیل چپراسی کی محبوبہ ہے اور اس سے کوئی راز پوشیدہ نہیں رکھتی، اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کرتے ہی فائیل اپنا سینہ بنات النعشِ گردوں کی طرح اس کے سامنے بلا توقف عریاں کر ڈالتی ہے۔

بلاشبہ چپراسی سے فائیل کا یہ رشتہ کسی حد تک غیر اخلاقی ہے لیکن اب اسے قبولِ عام کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اور میں اس کا رقیب ہرگز نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ افسر، فائیل اور چپراسی معاشرے کی ایک ایسی خوبصورت طلائی تثلیث کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے ثبات سے دنیا کا امن و سکون قائم ہے۔ یہ تثلیث ٹوٹ جائے تو نظامِ کائنات لرزہ براندام ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف اس تثلیث کو خود اپنا وجود قائم رکھنے کے لئے اپنے خطوط کو ایک دوسرے سے حادہ زاویے پر ملائے رکھنا بے حد ضروری ہے۔ جب کبھی یہ زاویہ قائمہ یا منفرجہ ہونے کی کوشش کرتا ہے تو تثلیث ٹوٹ جاتی ہے اور فائیل کے علاوہ دفتر اور افسر کا شیرازہ بھی بکھر جاتا ہے۔ ہر زیرک افسر اس تثلیث کو مضبوطی سے قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور یوں اپنی اور کائنات کی فلاح کی راہ ہموار کر لیتا ہے۔

بعض ناسمجھ لوگ فائیل کو بے جان تصور کرتے ہیں حالانکہ فائیل اپنا ایک منفرد نامیاتی وجود بھی رکھتی ہے، اور اس کے ساتھ ایک پاپی پیٹ بھی لگا ہوا ہے۔ فائیل کے پیٹ کو بھرنے کے لئے دفتر کا تمام عملہ، چپراسی اور افسر دن بھر مشقت اٹھاتا ہے۔ فائیل کا پیٹ نہ بھرے تو شاید افسر کو بھی روٹی نصیب نہ ہو۔ مناسب غذا مہیا ہو جائے تو فائیل کا مادی وجود بتدریج پھولتا اور پھیلتا

چلا جاتا ہے۔ غذا میسر نہ آئے تو فائیل مُردہ چوہے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ کسی کونے کھدرے میں مدقوق مریض کی طرح پڑی رہتی ہے اور دنیا کی بے ثباتی کا عبرت ناک منظر پیش کرتی ہے۔

فائیل کے پاؤں نہیں ہوتے تاہم اسے رینگنے والا جانور قرار دینا بھی مناسب نہیں۔ فائیل کی فطری حرکت داخلی ابال کا نتیجہ ہے اور یہ دائرے کی حرکت کے مماثل ہے۔ اس میں مرکز مائل اور مرکز گریز قوتیں ہمہ وقت آپس میں برسرِ پیکار رہتی ہیں، دائرہ مکمل ہو جائے تو یہ پیکار بھی ختم ہو جاتی ہے تاہم جب مرکز گریز قوت غالب آجائے تو فائیل کی حرکت جست کے تصور کے مطابق ہو جاتی ہے اور مینڈک کی طرح ایک میز سے دوسری میز تک کا فاصلہ زقند لگا کر طے کرتی ہے اور راستے کے پتھروں، رکاوٹوں اور گڑھوں کو خاطر تک میں نہیں لاتی۔

فائیل کا پیٹ بھرا ہوا ہو تو دنوں کا فاصلہ گھنٹوں میں اور گھنٹوں کا فاصلہ منٹوں میں طے کرتی ہے۔ تاہم فائیل غذا کی کمی کا شکار ہو تو اس کے لئے چھوٹی سی زقند لگانا بھی ممکن نہیں ہوتا۔ بعض لوگ اس قسم کی فائیل کو چلانے کے لئے اس کے ساتھ پہیہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن پہیہ اپنی حرکت زمین کے ساتھ قائم رکھتا ہے اور راہ میں چھوٹی سی کھائی بھی آ جائے تو اسے عبور کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس عالم میں بالعموم اضافی محنت درکار ہوتی ہے۔ پرانے پہیے کے ساتھ نئے پہیے لگانے یا رکاوٹ والا راستہ تبدیل کرنے کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں حسبِ مرضی نتائج حاصل ہونے کی توقع کچھ زیادہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عقلمند لوگ پہلے فائیل کا پیٹ بھرتے ہیں اور پھر ازراہِ احتیاط اس کے ساتھ پہیے بھی لگا دیتے ہیں۔ چنانچہ فائیل ہموار سطح پر پہیوں کے سہارے اور رکاوٹوں والی زمین پر اپنی داخلی قوت کے بل بوتے پر سفر جاری رکھتی ہے اور صلح و آشتی سے منزلِ مراد تک پہنچ جاتی ہے۔ اس قسم کے عقلمند لوگوں کی تعداد خاصی کم ہے، لیکن دنیا ان سے یکسر خالی نہیں، ڈھونڈنے والی آنکھ انہیں تلاش کر ہی لیتی ہے اور سچ پوچھیے تو دنیا اس قسم کے معدودے چند لوگوں پر ہی قائم ہے جو معاملے کی گتھی کو پہیے کی دائروی حرکت سے سلجھانے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ یہ نہ ہوں تو زمانے کا ارتقا رک جائے اور تغیر بھی بے ثبات ہو جائے۔

یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ فائیل کا خارج اس کی شکل و صورت کو منعکس کرتا ہے لیکن اس کا باطن فائیل کے اپنے داخل کو ظاہر نہیں کرتا۔ فائیل معاشرتی حقیقتوں پر عمر عیار کے انداز میں کمند ڈالتی ہے اور انہیں اپنے باطن میں جذب کرتی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے فائیل لاشعور کے عمیق سمندر کے مترادف ہے کہ ہر واقعے کو اپنی تہہ میں چھپا لیتی ہے اور صرف اس وقت منظرِ عام پر لاتی ہے جب فائیل کے سکون کو شکایت کے چھوٹے سے کنکر سے متزلزل کر دیا جائے۔ فائیل چونکہ بڑا لطیف مزاج رکھتی ہے اس لئے وہ چھوٹی سی شکایت پر بھی برہم ہو جاتی ہے، پھر وہ پھنکارتی ہے، کف اڑاتی ہے اور بعض اوقات مضبوط کرسیوں کو اُلٹانے میں بھی کامیاب ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے جابر اور غیور حکمران بھی فائیل سے خوف کھاتے ہیں اور اس کا پیٹ اس کی خواہشاتِ نفسانی کے مطابق بھرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سے ہمہ وقت موانست بھی قائم رکھتے ہیں۔ انسان ہونے کے ناتے میری خواہش بھی یہی ہے کہ فائیل سے میری محبت کا رشتہ کبھی نہ ٹوٹے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنی بیوی سے اُلجھنے اور کبھی کبھی اسے جھڑکنے کی جرأت تو کر لیتا ہوں لیکن فائیل کو ناراض کرنے کی کوشش کبھی نہیں کرتا۔

ذکرِ اُس پَری وَش کا — تجزیاتی مطالعہ

ریاض صدیقی

تخلیقی ادب کے ممکن موضوعات میں "فائل" جیسے موضوع کے ساتھ علمی و ادبی اور فکری برتاؤ TREATMENT ان لوگوں کے لیے دیدنی ہے جو ادبی لسانیات و جمالیات اور تخلیقی بیانیہ کی قلمرو سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے صنفِ انشائیہ کی شرطِ اوّل کو کہ وہ کسی بھی غیر ادبی معروض کے بطن سے ایک مکمل ادبی و تخلیقی اور جمالیاتی و فکری عالم کشید کر سکتا ہے۔ "فائل جیسی چیز کو" "ذکر اس پری وش کا" جیسا عنوان دے کر پورا کر دیا ہے۔ اس خوبصورت انشائیے کا مخاطب وہ "فائل" ہے جو دفتری نظام میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتی ہے لیکن اس کی نامحسوس معنویت کی تہہ دار پرتوں کو کھولنا انشائیہ نگار کے کمالِ فن کی دلیل ہے۔ ایک ایسے ریختہ موضوع کو ادبی پیکر میں ڈھال کر انہوں نے اس حقیقت پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے کہ کائنات میں تمام موجود موضوعات اور سائنسی و ٹیکنیکی صورتیں ادب کے نقوش میں خود کو پیش کر سکتی ہیں اور اپنے عام و رواجی معنوں کے باوجود ادیب کے گھر آنگن میں پہنچ کر نئے مفاہیم سے قارئین کو آگہی و آسودگی کی سوغات فراہم کر سکتی ہیں۔ لسانی فلسفی وٹجنسٹائین اسی صورت حال کی توضیح کرتے ہوئے لفظ کے لغوی معنوں کو ثانوی اور استعمالی معنوں کو حقیقی قرار دیتا ہے گویا "ذکر اس پری وش کا" میں لفظ اپنے نئے نئے معنی اور حسی حدود متعین کرتے ہیں۔ اس طرح یہ انشائیہ ساختیاتی معنوی (SEMANTIC) اور علامتی (SEMIOTIC) تجربے کا ایک جامع حوالہ بھی بن جاتا ہے۔ اگر ہم اس حقیقت کو مان لیں کہ انشائیہ علامت و استعارے کی تخلیقِ مکرر اور لسانی ترتیب میں توسیع و ارتقا کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے تو تجزیاتی مطالعہ کی ابتدا عنوان کی ترکیبی ساخت سے کی جا سکتی ہے کیونکہ "ذکر اس پری وش کا" موضوع کی ساری حدود اور اس کے پھیلاؤ کو جس کا کینوس لکھنے والے کی تخلیقی رَو نے تیار کیا ہے اپنے اندر اس طرح بند کر لیتا ہے جس طرح کوزے میں دریا کو بند کر دیا گیا ہو۔ عنوان کی یہ ترکیبی ساخت ہی قاری کو ایک وسیع مطالعاتی میدان تک لے آتی ہے۔ لکھنے والے نے تخلیقی سطح سے "فائل" جیسے موضوع کو چھو کر اس کو ایک پری پیکر کردار بنا دیا ہے اور اس کو نامیاتی لمس دے کر اس میں غمزہ و عشوہ و ادا کی ایک پُر اسرار اور حسن آلود فضا تراش دی ہے۔ اس عنوان سے "فائل" کی وہ شخصیت کردار کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جس کی گہرائیوں اور خارجی و داخلی معمولات کا ہیولیٰ پڑھنے والے کے ذہن میں سائے اور شکلیں بناتا ہے اور وہ ایک اظہاری تجربے میں نہ آنے والی مسرت و آسودگی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

"ذکر اس پری وش کا" اپنی درونی سطح سے جن فکری و خیالی سمتوں کو منظرِ عام پر لاتا ہے ان کی اثباتی اور تعمیری ظاہر کے اوٹ میں ایک نقاب پوش طنز کروٹ لیتا ہے البتہ وہ بیان کے تخلیقی اسلوب اور تخیل کے گہرے بادلوں میں خود کو چھپائے ہوئے ہے۔ وہ اپنے ہونے کا اعلان کیے بغیر چور دروازے سے اپنے اثرات کی روشنی بکھیرتا ہے۔ انشائیہ نگار کہتا ہے۔

"میری حکمرانی کا یہ منظر دیدنی ہوتا ہے۔ میں اپنے آپ کو اس اکھاڑے کا راجہ اندر تصور کرتا ہوں۔"

"بعض اوقات مضبوط گرہیں کو الٹنے میں بھی کامیاب ہو جاتی ہے۔" وغیرہ

ڈاکٹر انور سدید کی تخلیقی جینئس جو کہ ایک سچے اور واقعی ادیب کو عام بیانیہ و صحافیانہ عبارت آرائی سے ممیّز کرتی ہے، "فائل" کو ایک انجمن کی صورت میں حسی تجربے کا حصّہ بنا کر ایک تازہ ذہنی کیفیت اور نفسیاتی اندازِ نظر کا اظہار اس طرح کرتی ہے کہ یہ بے سروپا سی شے جمالیاتی تناظر میں ڈھل کر نظارہ اندر نظارہ پریوں کی داستانی دنیا کو حقیقت کے رُوپ میں پیش کر دیتی ہے۔ انسان کو اعصابی سکون کے ایک نئے احساس سے روشناس کراتی ہے اور اس جذبۂ حکمرانی کی چھپی ہوئی نفسیات کو اجاگر کرتی ہے جو کم ترقی یافتہ ملکوں کے لوگوں کی ذہنی حدود میں کروٹ لیتا ہے۔ طنز کے ایسے لطیف و مہذب پیرائے نے اس اثباتی رویّے میں ایک عام لیکن غیر صحت مند اجتماعی رویّے کو بے نقاب کیا ہے۔ خیال کا ارتقائی سفر "فائل" کے تعلق سے چپراسی، دفتر اور افسر کے ان نفسیاتی و کرداری محرکات کی نشاندہی کرتا ہے جس کی ہر تہہ میں دفتری ذہنیت اور طریقۂ کار کے پُراسرار گوشے بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں اور ہم اس باطنی احساس سے آشنائی پاتے ہیں جو عام حالت میں خواب و خیال سے بھی پرے ہوتا ہے۔ "فائل کی نامیاتی وجود اور لاشعور سے وابستگی انسانی زندگی سے تعلق اور آگہی کی نئی جہت کو منکشف کرتی ہے۔ اسی تسلسل میں ارتقا، تغیّر اور دائروی حرکت کی تعبیر و تشریح کا فلسفیانہ انداز رونما ہوتا ہے اور ادراک کے نئے امکانات کو راستہ دیتا ہے۔

مجموعی طور پر "ذکر اس پری وش کا" لکھنے والے کی ذات اور اس کے اندر پھوٹتی ہوئی کونپلوں کی طرح موجزن خیالات کی رَو کو منعکس کرتا ہے۔ بنیادی مقصد نہ تو انشائیے کی ضرورت ہے اور نہ لکھنے والے کے شعور میں اس کا کوئی وجود ہے لیکن مضمون اپنے اندر سے ایک آزادانہ انداز میں مقصد اور پیغام کی ترسیل کرتا ہے زبان کے تخلیقی استعمال، محاوروں کی موزوں ترتیب اور مرکب استعاراتی جملوں کی خودکار تشکیلات کے لسانی عمل نے اسلوب کو تازگی و شگفتگی اور انفرادیت کا وہ جوہر دیا ہے جس کے بغیر ایک اچھے انشائیے کا وجود محال ہے۔ یہ تشکیلات بجائے خود ایک جہانِ معنی پیش کرتی ہیں۔ لسانی تجزیے کی رُو سے یہ تشکیلات قابلِ ذکر ہیں۔

"افسر اور دفتر ندی کے دو متوازی کناروں کی صورت اگرچہ ایک ہی سمت میں رواں ہیں لیکن اپنے درمیان بہتی ندی کا فاصلہ ہمیشہ قائم رکھتے ہیں۔ چپراسی ان نہ ملنے والے کناروں کو ایک معلق پُل کی صورت ملاتا ہے۔"

ڈاکٹر انور سدید نے بعض لفظوں اور مروّجہ محاوروں کی اکائیت میں موجود حسی لمس (STIMULUS) سے معنوی وسعت پیدا کر کے بیان کی اسلوبی جہت میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ بلیوم فیلڈ نے اسی طرزِ ادا کو (STIMULUS-RESPONSE) کے ضابطے میں بند کیا ہے۔ اکثر الفاظ اکائی ہونے کے باوجود پوری منظری کیفیت اور کرداری عمل کی ایک واضح متحرک تصویر قاری کے ذہن پر مرتب کرتے ہیں مثلاً۔

"جب تک ناشتہ زہر مار کر کے کپڑوں سے مُلجھنے اور بیگم سے اُلجھنے کے بعد گھر سے رخصت نہیں ہو جاتا۔"

"جب مرکز گریز قوت غالب آ جائے تو فائل کی حرکت جست کے تصوّر کے مطابق ہو جاتی ہے اور مینڈک کی طرح ایک میز سے دوسری میز تک کا فاصلہ زقند لگا کر طے کرتی ہے۔"

انشائیہ کا لہجہ براہِ راست بیانیہ (FREE DIRECT SPEECH) اور بیانیہ رپورتاژ کے ابلاغی عمل (NARRATIVE REPORT SPEECH ACT) سے عبارت ہے۔ ایک اچھے انشائیہ کے لیے جہاں کردار آفرینی سے بچنا ضروری ہوتا ہے یہ موزوں طرزِ اظہار ہے جس میں لفظوں اور ترکیبوں کی صوتیات (PHONETIC) مرتب آہنگ کا اضافہ کرتا ہے ——— بنیادی موضوع "فائل" کی اپنی اصل صورت کھو دینے کے باوجود ایک کے سوا دوسرے تمام پیراگرافوں میں تکرار اس کی نمایاں مرکزیت کا دفاع کرتا ہے۔ چوتھے پیراگراف میں البتہ "فائل" کا حوالہ چپراسی کے وجود اور اس کی معنویت کے تلے دب کر تھوڑی دیر کے لیے نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور بیانیہ تسلسل میں ایک چھوٹی سی مزاحمتی رکاوٹ کا احساس اُبھرتا ہے لیکن اس اتفاقی انحراف و گریز کے باوجود تسلسل و آہنگ کی زنجیر مجروح نہیں ہوتی ہے۔

"ذکر اس پری وش کا" ایک مکمل ساختیاتی لسانی رویّے کی نشاندہی کرتا ہے اور موجود لمحوں کو تاریخیت (DICHRONIC) سے بچا کر متعیّن زمانی (SYNCHRONIC) حدود میں خود کو ظاہر کرتا ہے۔

آمنا سامنا

سلیم آغا قزلباش

زندگی میں کوئی چھوٹا موٹا حادثہ یا واقعہ ہمیں متحرک کرنے کا سبب بن جاتا ہے یا پھر ہوتا یہ ہے کہ وہ مخصوص حادثہ یا واقعہ ہمیں شخصیت یا کردار کا لبادہ عطا کر دیتا ہے۔ دراصل شخصیت یا کردار واقعہ یا حادثہ کا بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا جس واقعہ یا حادثہ کی شخصیت جتنی متنوع یا کردار جتنا جاندار ہوگا اتنی ہی شہرت یا رسوائی اُس فرد کی جھولی میں ڈال دی جائے گی۔ یہ تو خیر ایک خاص صورتِ حال سے جنم لینے والی شخصیت یا کردار کی داستان ہے جو فی الحقیقت اتنی جاذبِ نظر اور پہلو دار نہیں ہوتی جتنی کہ بظاہر ہم سب کو دکھائی دیتی ہے۔ لیکن جب سے ہربرٹ ریڈ کی یہ بات میری نظروں سے گزری ہے کہ کردار انسانی زندگی کا وہ واقعہ ہے جو اس کی شخصیت پر عمر بھر حاوی رہتا ہے تو مجھے یوں لگا ہے جیسے ایک ایک کر کے لاتعداد پردے میرے ذہن پر سے ہٹتے جا رہے ہیں اور ہر پردہ اُٹھنے پر ایک بالکل نیا منظر میرے سامنے جلوہ گر ہو گیا ہے ورنہ اس سے قبل شخصیت اور کردار کے فرق پر کبھی بھولے سے بھی میری توجہ مرکوز نہیں ہوئی تھی اور اب یہ عالم ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بات شروع کہاں سے کی جائے لیکن یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ بات میں سے بات کچھ اس طرح نکل آتی ہے جس طرح پلک جھپکنے میں جادوگر رومال میں سے گورا چٹا کبوتر برآمد کر لیتا ہے۔ یہ سوچتے ہی میرے ذہن نے ایک زبردست قلابازی کھائی اور دوسرے ہی پل مجھے یوں لگا کہ کردار والا آدمی تو عملی دنیا کا کھلاڑی ہے جس کے ہر فعل میں دنیاداری اور معاملہ فہمی صاف طور پر دکھائی دے جاتی ہے۔ وہ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتا ہے اور کسی قیمت پر بھی کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس شخصیت والا آدمی ایک ایسا مردِ آزاد ہے جس میں آزادانہ سرفروشی رچی بسی ہوتی ہے اور وہ اس جہانِ حرص و آز کو بہ نظرِ تحقیر دیکھنے کا انداز کچھ اس چاؤ سے اپناتا ہے کہ ایک پُرباش قسم کا گہرا اطمینان ہر دم اُس کے چہرے مُہرے سے ٹپکتا رہتا ہے جو بعد میں اس کے انگ انگ میں جذب ہو کر ایک درویشانہ بے خودی میں اُسے دن رات مبتلا کیے رکھتا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ "صاحبِ شخصیت" کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ اُس نے اپنے آپ کو کسی ایسی جھوٹی انا کے خول میں بند نہیں کیا ہوتا کہ جس کا حالات کی ایک ہی ضرب سے تڑخ جانے کا احتمال ہو۔ اس کے برعکس "صاحبِ کردار" شخص میں ایک خاص قسم کی انانیت پائی جاتی ہے جو اکثر اوقات خود ستائی اور کبھی کبھی نرگسیت کا روپ دھار لیتی ہے یوں صاحبِ کردار کسی جن کی طرح اپنے آپ کو ایک ایسی تنگ منہ والی بوتل میں بند کر لیتا ہے کہ جس میں اس کا اپنا دم بھی اُلجھنے لگتا ہے۔

وہ قومیں جو کردار کا روپ دھار لیتی ہیں ان میں دوسروں سے اعلیٰ و ارفع ہونے کا احساس جارحانہ رویّہ پیدا کر دیتا ہے جو کبھی کبھی جنگ پر بھی منتج ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف وہ اقوام جو شخصیت کا لبادہ زیبِ تن کرتی ہیں جیو اور جینے دو کے مسلک کو حرزِ جاں بناتی ہیں۔ ان میں فنونِ لطیفہ فروغ پاتے ہیں، روایات مستحکم ہوتی ہیں اور بھائی چارے کو جلا ملتی ہے۔ شاید اسی لیے شخصیت رکھنے والی قوموں میں مادرانہ رویّہ از خود نمو پذیر ہو جاتا ہے اور وہ ہر کُھٹے مسئلے پر یوں غور و خوض کرتی ہیں جیسے کوئی ماں اپنے لختِ جگر کے بدن کو سہلا رہی ہو جبکہ کردار والی اقوام میں پدرانہ مزاج دَر آتا ہے اور وہ ہر قسم کے مسائل کو

چھڑی یا عصا کی مدد سے حل کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ جس سماج میں کردار کی اجارہ داری قائم ہو جائے وہاں شخصی حکومتیں جنم لیتی ہیں اور جہاں شخصیت کو پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا جائے وہاں عوامی حکومتیں پاؤں پسارنے لگتی ہیں۔ یوں بھی کردار والے معاشرے میں اندرونی اور بیرونی طور پر متصادم ہونے کا خطرہ ہمہ وقت موجود ہوتا ہے وجہ یہ کہ کردار کی آبیاری زندگی کے بے لگام طوفانوں سے ہوتی ہے گویا کردار ہمیشہ حالات کی سنگینی کی بنا پر جنم لیتا ہے یا یوں کہیے کہ کردار وہ زرہ بکتر ہے جو فرد اپنی آن بان اور کرّوفر کے اظہار کے لیے پہنتا ہے چاہے اس کے بارِ گراں تلے اُسے خود ذہنی اور جسمانی اذیت ہی کیوں نہ جھیلنی پڑے۔ اس کے مقابلے میں شخصیت ہمیشہ ایک ایسا ڈھیلا ڈھالا لباس پہنتی ہے، جس سے نہ صرف جسم و جان کو کشادگی کا احساس ہوتا ہے بلکہ پاس بیٹھنے والوں کو اس کے جسم کی بوالعجبیوں کا نظارہ کرنے کا موقعہ بھی مل جاتا ہے۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ شخصیت کے پھلنے پھولنے کا عمل یکلخت تھم جاتا ہے اور اس کے اندر سے کردار کے نوکیلے پنجے نکل آتے ہیں، یہ ایک انتہائی خطرناک موڑ ہے کیونکہ ایسی صورتِ حال میں کسی لمحے بھی کردار شخصیت پر شب خون مار کر اُسے مکمل طور پر مغلوب کر سکتا ہے گویا کایا کلپ کا دھڑکا سائے کی طرح ساتھ ساتھ لگا رہتا ہے اور اگر یہ دھڑکا واقعی سچ ثابت ہو جائے تو جان لیجیے کہ شخصیت کردار کی زنجیروں میں بُری طرح جکڑی جا چکی ہے اور فرار کی تمام راہیں تقریباً مسدود ہو گئی ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں شاذ و نادر ہی کوئی شخصیت کردار کی زنجیروں کو توڑ کر نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ مگر وہ شخص جو توانا شخصیت کے سائے میں پل کر جوان ہوا ہو اگر کردار کے شکنجے میں پھنس بھی جائے تو وہ مفلوج ضرور ہو جاتا ہے مگر جاں بحق کبھی نہیں ہوتا۔

شخصیت انفرادی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی، دوسری طرف کردار عموماً ہر جگہ ایک سا رہتا ہے گویا کردار ایک ایسا وجود ہے جس میں تبدیلی شاذ ہی آتی ہے وہ چاہے منفی ہو یا مثبت اس میں کمل پن بہر طور موجود رہتا ہے۔ پھر ایک اور بات یہ بھی ہے کہ کردار کی اپنے بارے میں جو رائے ہوتی ہے وہ اٹل قسم کی ہٹ دھرمی پر استوار ہوتی ہے۔ وہ خوجی کی طرح چاہے کیسی ہی حماقت کا ارتکاب کیوں نہ کر بیٹھے اپنے ہر فعل کو بہر حال جائز اور مستحسن ہی متصور کرتا ہے یعنی کردار میں کوئی روزن یا پوشیدہ در نہیں ہوتا وہ چاروں طرف سے سربمہر قلعہ ہوتا ہے جبکہ شخصیت میں رومانوی ادھورا پن ہوتا ہے، بھول بھلیوں ایسی انوکھی کیفیت اس میں مضمر ہوتی ہے کہ جہاں تحیر اور تجسس سے دوچار ہونے کی حس ہم اپنے آپ میں ہمہ وقت موجود پاتے ہیں۔ شخصیت تو لاجونتی کے پودے کی طرح لمس کی گرمی سردی کے مطابق ہی پھیلتی یا سمٹتی ہے جبکہ کردار کیکر کے درخت کی طرح جامد ٹھوس اور کانٹے دار ہوتا ہے مطلب یہ کہ شخصیت میں تغیر موجود ہے اور کردار میں ثبات پایا جاتا ہے اور یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ زمانے میں ہمیشہ تغیر کو ہی ثبات حاصل رہا ہے۔

کردار میں خیرہ کر دینے والی چکا چوند ہے اور شخصیت میں سکون پہنچانے والی دودھیا روشنی! ان دونوں کے مقابلے میں "فرد" کی اپنی کوئی چمک دمک نہیں کیونکہ فرد تو اصل میں چکنی مٹی ہے جس کو سانچے میں ڈھال کر کردار یا شخصیت کا رنگ و روپ دیا جاتا ہے اور یہ کوئی اتنا آسان کام نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ فرد کی انفرادیت اُسی صورت میں نمایاں ہوتی ہے جب وہ کردار کی کج کلاہی میں مبتلا ہوتا ہے یا پھر شخصیت کی چادر اوڑھ لیتا ہے۔ بصورتِ دیگر اس کی اپنی کوئی پہچان نہیں بن پاتی بلکہ اگر بغور دیکھا جائے تو کردار بننا فرد کا ایک ایسا فطری میلان ہے جس میں چند ایک جذباتی محرکات دبا دیئے گئے ہوں، بالفرض وہ نہ دبائے جاتے تو پھر آج شخصیت کا حصّہ ہوتے لہٰذا یہ بات برملا کہی جا سکتی ہے کہ کردار شخصیت کے مقابلے نسبتاً محدود چیز ہے ـــــ کیا واقعی ایسا ہے؟ میرے نزدیک تو شخصیت تشبیہہ کی طرح یک جان و دو قالب کی مثال ہے کیونکہ یہ دل جیتنا جانتی ہے۔ اس میں بوقلمونی بھی ہے اور دوسروں کو ہمنوا اور متاثر کرنے کا حوصلہ بھی بلکہ اس میں ایک نسوانی گداز پن پایا جاتا ہے جس کی بنا پر یہ غیروں کو بھی حلقۂ یاراں میں بآسانی شامل کر لیتی ہے۔ اس کے برعکس کردار تو استعارہ کی طرح یک قالب و یک جان کی مثال ہے اس میں یک رنگی اور اکہرا پن ہے اور ساتھ ہی حتی دوسرے وجود پر مکمل غلبہ پانے کی شدید خواہش بھی۔ اس کے علاوہ اس میں ایک خاص قسم کا مردانہ اکھڑ پن موجود ہوتا ہے اور خود کفیل ہونے کا احساس

بھی۔ اس سے ہم مرعوب یقیناً ہو سکتے ہیں مگر متاثر ہرگز نہیں، زیادہ سے زیادہ ہم اس کے ظاہری طور طریقوں کو اپنا سکتے ہیں مگر اس کے من میں نقب لگا کر اس کے چھپے ہوئے خزانوں کا سراغ لگانے سے قاصر رہتے ہیں کیونکہ اس نے اپنے چاروں طرف دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ اس کے مقابلے میں صاحبِ شخصیت ایک ایسا باغ ہے جہاں "یہ شارعِ عام نہیں" ہے کی کوئی تختی آویزاں نہیں ہوتی۔ آپ جب چاہیں صدر دروازے سے گزر کر اس کی روشوں پر محوِ خرام ہو سکتے ہیں۔

صاحبِ کردار تو کسی سپر مین کی طرح بڑی آسانی سے دوسروں کو ایک شدید احساسِ کمتری میں مبتلا کر سکتا ہے جبکہ شخصیت دوسروں کا اعتماد بحال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، اس میں اکڑ نہیں بلکہ لچک پائی جاتی ہے لہٰذا شخصیت کی خوبی اسی بات میں ہے کہ یہ مڑ سکتی ہے مگر ٹوٹ نہیں سکتی جبکہ کردار ٹوٹ کر پاش پاش ہو سکتا ہے مگر جھک نہیں سکتا۔ پھر ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ کردار اس فاسٹ باؤلر کی طرح ہے جو عمر بھر صرف فاسٹ باؤلنگ ہی کرتا ہے مگر شخصیت ایک ایسا آل راؤنڈر ہے جو ضرورت پڑنے پر بیٹنگ، باؤلنگ، حتیٰ کہ وکٹ کیپنگ بھی کر لیتا ہے۔

کردار تو عموماً خارج ہی میں ہوتا ہے دوسری طرف شخصیت بیک وقت دروں میں بھی ہوتی ہے اور خارج میں بھی گویا شخصیت میں ہمہ جہتی پائی جاتی ہے اور یہ چیز اس کے اندر کی تڑپ اور بے قراری کا ثمر ہے۔ جہاں تک کردار کا تعلق ہے تو وہ اس معاملہ میں منفعل ہوتا ہے۔ اکہرا پن اس کے مزاج کا خاصہ ہے جس سے مفر نہیں!

شاعری کہ امّ الاصناف ہے اس میں شخصیت اور کردار کے پہلو الگ الگ نظر آتے ہیں۔ ایک اچھا شاعر اپنے کلام میں کردار کے غلبے سے بچنے کی حتی المقدور کوشش کرتا رہے تو بات بنے گی ورنہ اس کی ذات بہت جلد بھوتنی "میں" میں منتقل ہو کر اس پر پیرِ تسمہ پا کی طرح سوار ہو جائے گی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب کبھی میں شخصیت کے محل وقوع کو جاننے کی سعی کرتا ہوں تو غالب کا متبسم چہرا میرے سامنے اچانک ابھر آتا ہے اور پھر دوسرے ہی پل وہ میرے کان کے پاس اپنا منہ لا کر سرگوشی کے انداز میں کہتا ہے۔

~ اب میں ہوں اور ماتم یک شہرِ آرزو — توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

بات یہ ہے کہ نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان پر سے کردار کا سخت خول ٹوٹا تو اندر سے غالب برآمد ہوا تھا۔ اگر وہ خود داری اور انا کے خول میں عمر بھر مقید رہتا تو غالب نہ بن پاتا، ذوق کی طرح ایک تمثال دار آئینہ ہی بنا رہتا!

مکتبہ ہم زبان کی فخریہ پیشکش

علمی، ادبی اور تاریخی کتب کی خریداری پر ۱۰ سے ۳۵ فی صد تک رعایت، ڈاک خرچ بھی مکتبہ ہم زبان ادا کرے گا۔ آج ہی خط لکھ کر فہرست منگوائیے۔

مکتبہ ہم زبان، پوسٹ بکس ۱۱۵۳۳ کراچی ۵

آمنا سامنا — تجزیاتی مطالعہ

اکبر حمیدی

سلیم آغا نے یوں تو بہت سے موضوعات پر انشائیے لکھے ہیں مگر گزشتہ کچھ عرصے سے وہ مشکل علمی موضوعات پر انشائیے لکھ کر انشائیے کی نئی جہتوں میں بھی سفر کر رہے ہیں۔ یہاں میں خصوصیت سے ان کے انشائیہ "آمنا سامنا" کا حوالہ دوں گا۔

"آمنا سامنا" میں کردار اور شخصیت کا موازنہ کیا گیا ہے۔ کردار اور شخصیت کا تقابلی مطالعہ دراصل نفسِ انسانی کی گہرائیوں میں جھانکنے کی کوشش ہے۔ اس تقابلی مطالعہ میں کردار اور شخصیت کا ایک دوسرے سے بھی آمنا سامنا ہوتا ہے اور اس آئینے میں خود ہمارا اپنی ذات سے بھی آمنا سامنا ہو سکتا ہے۔ اس طرح ہم اس انشائیے کی موضوعی معنویت کو بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔ یہ انشائیہ اس موڑ سے آگے کا انشائیہ ہے جہاں طنز و مزاح کا روایتی اسلوب اور چیزوں کو دیکھنے کا سرسری اندازِ نظر کام دے جاتے تھے۔ اس انشائیے کا اسلوب سنجیدہ اور اندازِ فکر سائنٹیفک ہے اور یہی اس موضوع کا تقاضا تھا۔ تاہم اس میں فکری شگفتگی کا احساس برابر ہوتا رہتا ہے۔

اس انشائیے میں ایسے مشاہداتی، تجرباتی اور علمی حقائق کو بیان کیا گیا ہے جنہیں پڑھ کر ہم فوراً کہہ اٹھتے ہیں کہ "یہ بھی میرے دل میں تھا"۔ انشائیہ نگار نے بعض جگہوں پر محض ایک جملے سے زندگی کا ایک ایسا منظر نامہ بے نقاب کر دیا ہے جو پتہ نہیں کیوں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ مگر ذرا ٹھہریئے پہلے میں یہ بتا دوں کہ انشائیہ نگار نے کردار اور شخصیت کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"کردار عموماً ہر جگہ ایک سا رہتا ہے گویا کردار ایک ایسا وجود ہے جس میں تبدیلی شاذ ہی آتی ہے۔ وہ چاہے منفی ہو یا مثبت اس میں مکمل پن بہر طور موجود رہتا ہے .... کردار کی اپنے بارے میں جو رائے ہوتی ہے وہ اٹل قسم کی ہٹ دھرمی پر استوار ہوتی ہے .... صاحبِ کردار تو کسی ٹیچر مین کی طرح بڑی آسانی سے دوسروں کو ایک شدید احساسِ کمتری میں مبتلا کر سکتا ہے جبکہ شخصیت دوسروں کا اعتماد بحال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس میں اکڑ نہیں بلکہ لچک پائی جاتی ہے۔ لہٰذا شخصیت کی خوبی اس بات میں ہے کہ یہ مڑ سکتی ہے مگر ٹوٹ نہیں سکتی جبکہ کردار ٹوٹ کر پاش پاش ہو سکتا ہے مگر جھک نہیں سکتا۔ پھر ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ کردار اس فاسٹ باؤلر کی طرح ہے جو عمر بھر صرف فاسٹ باؤلنگ ہی کرتا ہے مگر شخصیت ایک ایسا آل راؤنڈر ہے جو ضرورت پڑنے پر بیٹنگ، باؤلنگ حتیٰ کہ وکٹ کیپنگ بھی کر لیتا ہے۔"

اس اقتباس کے ذریعے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ انشائیہ نگار نے کردار کو قوت اور شخصیت کو تہذیب کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ جس طرح قوت جھکنا نہیں جانتی اسی طرح کردار ٹس سے مس ہونا نہیں جانتا۔ یہی اس کی عظمت ہے اور یہی اس کی مضرت۔ جبکہ شخصیت میں اتنی نرمی ہے کہ وہ بیرونی دباؤ کے مطابق لچک سکتی ہے اور اس طرح ٹوٹ پھوٹ سے اپنے آپ کو بچا سکتی ہے۔ کردار اور شخصیت ایک ہی انسان کے دو روپ

ہیں۔ کردار میں انفرادیت، قوت اور سختی ہے جسے انشائیہ نگار نے "پدرانہ رویہ" کہہ کر بیان کیا ہے۔ شخصیت میں پھیلاؤ، نرمی، محبت و شفقت اور برداشت کا رویہ ہے جسے انشائیہ نگار نے "مادرانہ رویہ" کہہ کر بیان کیا ہے۔ انہی دونوں رویوں کو اجتماعی سطحوں پر انشائیہ نگار نے "شخصی حکومتیں" اور "عوامی حکومتیں" معرض وجود میں لانے کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ یہاں اگر ہمیں کردار کی وہ بھیانک صورت دکھائی دیتی ہے جسے دیکھ کر پورا معاشرہ احساس عدم تحفظ کا شکار ہو جاتا ہے۔

کردار اتنا جامد ہوتا ہے کہ وہ خود کو کبھی بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا جبکہ شخصیت مسلسل حالات و واقعات کے سانچے میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ کردار کا اپنے آپ کو مکمل بلکہ اکمل خیال کرنا اور ہمیشہ دوسروں کو اپنے مطابق تبدیل کرنے پر کمربستہ رہنا ایک انتہائی جارحانہ رویہ ہے۔ کردار دراصل ایک آئیڈیل کا نام ہے۔ جب کہ شخصیت کوئی آئیڈیل متعین کرنے کی بجائے مسلسل تجربات سے گزرتی چلی جاتی ہے۔ کردار سے "جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے" کی صدا آتی رہتی ہے جب کہ شخصیت سے "دمادم صدائے کن فیکون" بلند ہوتی رہتی ہے۔ تاہم اس جامد صورت حال میں بھی انشائیہ نگار نے زندگی کے امکانی رویوں کو پیش کیا ہے۔ اس کے خیال میں کردار اگر اپنی شکست و ریخت کا اثبات کرے تو وہ شخصیت میں ڈھل سکتا ہے مثلاً

"نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان پر سے کردار کا سخت خول ٹوٹا تو اندر سے غالب برآمد ہوا تھا۔ اگر وہ خود داری اور انا کے خول میں عمر بھر مقید رہتا تو غالب نہ بن پاتا ذوق کی طرح ایک تمثال دار آئینہ ہی بنا رہتا۔"

یہ تو تھی کردار کے شخصیت میں ڈھلنے کی صورت۔ انشائیہ نگار نے اس کا دوسرا رخ بھی پیش کیا ہے۔ یعنی یہ بھی ممکن ہے کہ شخصیت کی نشو و نما رک جائے اور اس کے بطون سے کردار نمودار ہو جائے۔

"کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ شخصیت کے پھلنے پھولنے کا عمل یکلخت تھم جاتا ہے اور اس کے اندر سے کردار کے نوکیلے پنجے نکل آتے ہیں یہ ایک انتہائی خطرناک موڑ ہے۔"

میرے دل میں ایک مرتبہ خیال پیدا ہوا کہ ہمارے اندر جو کوئی ایک مرتبہ پیدا ہو جاتا ہے پھر وہ ہمیشہ موجود رہتا ہے، انشائیہ نگار نے ہربرٹ ریڈ کے حوالے سے اس سے ملتی جلتی بات کہی ہے دیکھئے

"کردار انسانی زندگی کا وہ واقعہ ہے جو اس کی شخصیت پر عمر بھر حاوی رہتا ہے۔"

مراد یہ ہے کہ ہر تجربہ کسی نہ کسی حالت میں ہماری شخصیت میں شامل رہتا ہے یعنی یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی واقعہ ہم پر گزرا ہو اور ہم اس واقعہ کے اثرات سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ کرلیں۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس واقعہ کی بازگشت کا کوئی لمحہ کسی وقت ہم پر مکمل قبضہ کرے خواہ یہ قبضہ کتنا ہی عارضی کیوں نہ ہو۔

کردار اور شخصیت کی آویزش کے بارے میں انشائیہ نگار نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے۔

"اگر بغور دیکھا جائے تو کردار بننا فرد کا ایک ایسا فطری میلان ہے جس میں چند ایک جذباتی محرکات دبا دیئے گئے ہوں۔ بالفرض وہ نہ دبائے جاتے تو پھر آج شخصیت کا حصہ ہوتے۔"

میرے خیال میں دبائے جانے والے جذباتی محرکات بھی شخصیت کا حصہ بنتے ہیں خواہ وہ حصہ منفی ہی کیوں نہ ہو۔
کردار اور شخصیت کے فرق کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ کردار وہ رویہ ہے جسے ہم شعوری طور پر اختیار کرتے ہیں لیکن شخصیت ہماری

ذات کا غیر شعوری اظہار ہے کسی بھی شخص کو دیکھ کر، کسی بھی واقعہ یا منظر کو دیکھ کر جو اثرات از خود ہمارے دل و دماغ پر مرتسم ہوتے ہیں ان کو ہم اس شخصیت کا اظہار سمجھ سکتے ہیں۔ یہاں یزید اور حضرت امام حسینؓ کے رویّوں کی مثالیں بڑی مناسب ہوں گی۔ یزید کا رویّہ ان معنوں میں بھی کردار کی شکل میں سامنے آتا ہے کہ اس نے اپنے جاہ و جلال کا شعوری اظہار کیا جبکہ حضرت امام حسینؓ کا رویّہ شخصیت کہلائے گا کیونکہ ان کے رویّے سے حُسن و جمال کا غیر شعوری اظہار ہوتا ہے۔ کردار کی ساری کمزوری اس کی سختی ہی ہوتی ہے جبکہ شخصیت کی ساری طاقت اس کی نرمی میں ہے۔ "آمنا سامنا" کا یہی موضوع ہے جسے انشائیہ نگار نے بڑے سلیقے سے واضح کیا ہے۔

یہ انشائیہ سلیم آغا قزلباش کے علمی موضوعات سے گہری دل بستگی کا آئینہ دار ہے۔ اور صنفِ انشائیہ کے زندگی سے پوری طرح مربوط ہونے کی دلیل بھی۔ کردار اور شخصیت کا فاصلہ واضح کرنے کے لیے انشائیہ نگار نے بڑا کیمرہ استعمال کیا ہے جس کے باعث فاصلہ میگنا فائی ہو کر جزئیات سمیت دکھائی دینے لگا ہے۔

اکبر حمیدی کے دلکش انشائیوں کا مجموعہ جس سے اردو انشائیہ نگاری
کے ایوان میں ایک نیا دریچہ کھُلے گا

جزیرے کا سفر

(زیرِ طبع)

کاٹتا جا رہا ہے بحر جسے
اس جزیرے کا بھی سفر کرتا

پیش لفظ: ڈاکٹر وزیر آغا

مکتبہ فکر و خیال لاہور

میں سوچتا ہوں

اکبر حمیدی

سوچنا ایک ایسا عمل ہے جسے میں اپنے باقی اعمال کی طرح کا ایک عمل خیال کرتا ہوں۔ میں کیا سوچتا ہوں؟ اس کا دارومدار میرے ذاتی معیار پر ہے۔ میں اپنے معیار کا اندازہ اپنی سوچوں کے معیار سے کر سکتا ہوں۔ میں کیا ہوں؟ میں کیا کر رہا ہوں؟ میں کیا کرنا چاہتا ہوں؟ میں کیا سوچتا ہوں؟ میں کہاں تک سوچتا ہوں؟ یہ سب وہ بامعنی سوالات ہیں جو میں اپنے آپ سے پوچھ سکتا ہوں۔ یہ ایسا مقدمہ ہے جس میں میں خود ہی مدعی ہوں، خود ہی ملزم ہوں۔ خود ہی گواہ ہوں اور خود ہی منصف! ۔ بھلا مجھ سے بہتر مجھے کون جان سکتا ہے!

سوچ ایک ایسا داخلی عمل ہے جو سچے لوگوں کو خارجی ظلم و ستم سے محفوظ رکھتا ہے۔ انہیں نہ صرف زندہ رکھتا ہے بلکہ زندۂ جاوید بناتا ہے۔ سوچ ہی وہ قوت ہے جو انسانوں سے کارہائے نمایاں کرواتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ سوچ ہی وہ زہر ہے جو اندر ہی اندر انسان کے رگ و پے میں پھیلتا رہتا ہے اور آخر انسان اس سطح پر آجاتا ہے کہ یا تو خود اپنے آپ کو ہلاک کر دیتا ہے یا دوسروں کی ہلاکت کا باعث بنتا ہے۔ یہ دو مختلف ردِ عمل ہیں۔ کس شخص پر کون سا ردِ عمل ہوتا ہے؟ اس کا انحصار اس کی شخصیت پر ہے۔ اگر وہ پڑھا لکھا، مہذب، بلند حوصلہ، وسیع الظرف اور اپنے سے زیادہ دوسروں کو عزیز رکھنے والا ہے تو اُس کے ہاتھوں میں اپنا ہی گریبان ہوگا اور اگر وہ کم تعلیم یافتہ، غیر مہذب، کم حوصلہ، خود غرض، کم ظرف اور خود پسند ہوگا تو دوسروں کی لاشوں پر اپنی زندگی کی بساط پھیلاتا چلا جائے گا۔ شخصی زندگی سے لے کر عالمی سطح تک آپ سوچتے چلے جائیں۔ جوں جوں آپ کی سوچ کا دائرہ وسیع ہوگا میری سوچ کی صداقت واضح تر ہوتی چلی جائے گی۔ یہ صداقت زندگی کے ہر شعبہ میں آپ کو دکھائی دے گی۔

میں نے کئی بار محسوس کیا کہ میری عدالت میرے اندر لگتی ہے جہاں سے میں حکمِ حیات یا سزائے موت سنتا ہوں۔ مجھ سے باہر کی عدالتیں میرے لئے غیر اہم ہیں کیوں کہ انہیں حقیقتِ حال کا براہِ راست علم نہیں ہوتا۔ میرے اندر کی عدالت حقائق کو براہِ راست جانتی ہے۔ وہ ساری باریکیوں اور تفصیلات کا ذاتی علم رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے اندر کی عدالت کے فیصلے کو بسر و چشم تسلیم کرتا ہوں۔ میری سزاؤں اور جزاؤں کے حقیقی فیصلے تو اسی عدالت میں ہوتے ہیں۔ جب میں خودکشی کرتا ہوں تو در اصل اس وقت میری عدالت سے مجھے موت کی سزا مل چکی ہوتی ہے اور جب میں ہنستے مسکراتے زہر کا پیالہ ہونٹوں سے لگا لیتا ہوں، تو حقیقت میں اُس وقت مجھے باعزت رہا کر دیا گیا ہوتا ہے۔ چنانچہ ادھر میں غروب ہو رہا ہوتا ہوں تو اُدھر میں دلوں کے آفاق پر طلوع بھی ہو رہا ہوتا ہوں ۔ کبھی غروب نہ ہونے کے لئے!

سوچ انسانی شعور کا سب سے پہلا غیر شعوری عمل ہے۔ مجھے آج بھی یاد ہے میرے بچپن کا ابتدائی زمانہ تھا مجھے یاد نہیں اس سے پہلے بھی میں نے کچھ سوچا تھا یا نہیں۔ البتہ یہ اچھی طرح یاد ہے میں سوچا کرتا تھا کہ کاش ہم اپنے مکانوں کو بسوں اور کاروں کی طرح ڈرائیو کر کے جہاں

چاہیں لے جاسکیں۔ پھر میں چشمِ تصور سے دیکھتا کہ میں اپنے آبائی کچے پکے مکان کو ڈرائیو کر کے لئے جا رہا ہوں اور اپنے مکان کو اُن مکانوں کے قریب پہنچا رہا ہوں جن کے قریب میں رہنا چاہتا ہوں۔ اس سوچ میں مَیں نے بڑا لطف اٹھایا۔ پھر جب میں لڑکپن کی حدود میں داخل ہوا تو میں نے سوچا کاش یہ ساری دنیا ایک ہی ملک ہو جہاں ایک ہی قوم رہتی ہو اور اسی ایک قوم کی اس پر ہمیشہ ہمیشہ حکومت رہے۔ جب میں جوان ہوا تو سوچوں پر خوابوں نے غلبہ پایا۔ مجھے یاد ہے میں نے ایک ہی خواب تھوڑی تھوڑی تبدیلی کے ساتھ ہمیشہ دیکھا ہے۔ ہمارے خواب ہماری بیداروں کی سوچیں ہیں۔ اس لئے میں نے ہمیشہ خوابوں کو سوچوں سے ملانے کی کوشش کی۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ میرے اس خواب کا مرکز و محور ہمیشہ پانی، کھلے اور غیر محدود پانی رہے ہیں۔ بارشیں، پانی، چاندنی، گلاب، پیڑ اور ان میں رقص کرتی ہوئی لڑکیاں۔ کئی بار خوابوں میں مَیں نے ان پانیوں کو عبور کرنے کی کوششیں کیں۔ میرے راستے میں پانی ہی کی دیواریں کھڑی ہوتیں۔ میں ایک ایک دیوار کو عبور کرتا چلا گیا — اور پھر کوئی دیوار ٹوٹ کر مجھ پر گر پڑتی — میں اب سوچتا ہوں میں اِن دیواروں کو عبور کر کے کہاں جانا چاہتا تھا — کیوں جانا چاہتا تھا؟ اور یہ دیواریں کیسی تھیں؟

نوجوانی کے دنوں میں مَیں کتنے ہی لوگوں کے بارے میں سوچتا تھا۔ حسین و دلکش لوگوں کے بارے میں۔ اپنے آئیڈیلز کے بارے میں۔ اپنے حریفوں کے بارے میں۔ بعض کو میں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بعض سے میں آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ یہ کتنے طاقتور لوگ تھے جن کی کشش نے مجھے برسوں اپنے سحر میں گرفتار رکھا۔ میں ان کو اپنی کامیابی یا ناکامی کا معیار سمجھتا تھا۔ میں سوچتا تھا کاش میں اُس شخص کو پالوں جس کے تصور سے خیال کی ساری رعنائیاں وابستہ ہیں — کاش میں اپنے آپ کو اپنے آئیڈیلز کی طرح بنا سکوں! — اُن آئیڈیلز کی طرح جو عظمت کے میناروں کی طرح شب و روز میری آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں۔ کاش میں اپنے حریفوں سے بازی لے جاؤں! اُن حریفوں سے جن کے ہاتھ ایسا لگتا ہے جیسے کامیابی کا اسمِ اعظم آگیا ہو۔

آج جب وہ زمانہ گذرے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی میں سوچتا ہوں اگر میں اُسے حاصل کر لیتا — وہ سب کچھ حاصل کر لیتا جو میں حاصل کرنا چاہتا تھا — تو آج میں کیا ہوتا — میں کیا ہوتا؟؟

ابھی یہ زمانہ گذرے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ ابھی طوفان کی ساری خوفناک آوازیں میرے اندر گونج رہی ہیں۔ ابھی ناؤ اُلٹنے کا منظر میری آنکھوں میں ہے۔ ابھی ابھی میں سمندر کے کنارے گھٹنوں پانی میں اُٹھ کر سیدھا کھڑا ہوا ہوں — ابھی سمندر کی طرف مُڑتی ہوئی وہ ساری لہریں مجھے دکھائی دے رہی ہیں جو مجھے کنارے پر پھینک گئی ہیں اور میرا سب کچھ — سب کچھ — اپنے ہمراہ بہا کر لئے جا رہی ہیں — میں سوچتا ہوں کاش میں ان لہروں سے سب کچھ واپس لے سکتا۔ چھین سکتا۔!

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں اگر یہ طوفان نہ آتا؟ اگر میں صحیح سالم ساحل پر اُتر جاتا؟ — تو پھر کیا ہوتا۔ پھر کیا ہوتا؟

زندگی کے وہ لمحے مجھے کبھی نہیں بھولتے جب میری چھوٹی سی غلطی نے مجھے بہت بڑی ناکامی سے دوچار کر دیا تھا — وہ لمحے — وہ ساعتیں کتنی بڑی ہوتی ہیں جو پھیل کر پوری زندگی کے لئے امر بیل بن جاتی ہیں — امر بیل!!!

سوچنا ایک بے حد تلخ کام ہے۔ کبھی کبھی مجھے وہ لوگ یاد آتے ہیں جو مجھے کچل کر آگے نکل سکتے تھے۔ مگر نہیں۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ صرف آگے نکل گئے — پھر مجھے وہ لوگ یاد آتے ہیں جو مجھے بغیر کسی جُرم کے بغیر کسی قصور کے سنگین سزائیں دیتے ہیں — اور میں — میں نہیں کچھ نہیں کہہ سکتا — کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ ان سے بھی زیادہ سنگین سزائیں دینا ان کے اختیار میں ہے!

کئی بار میں سوچتا ہوں کہ میں تلواروں کو پھولوں پر روک رہا ہوں۔ اِس یقین کے ساتھ کہ پھول تلواروں کو کُند کر دیتے ہیں ——

مگر بہت دیر کے بعد!!

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔ دوستیاں کیوں ترک کی جاتی ہیں؟ دشمنیاں کیوں اختیار کی جاتی ہیں؟ اپنے پرائے کیوں ہو جاتے ہیں؟ مصلحتیں، مفادات، خوف ہمیں اندر ہی اندر کیوں کھا جاتے ہیں؟ ہم اپنے اصل سے کیوں مختلف ہو جاتے ہیں؟ ہم وہ سب کچھ کیوں نہیں کرتے جو ہم کرنا چاہتے ہیں اور وہ سب کچھ کیوں کرتے رہتے ہیں جو ہمیں ناپسند ہے اور جسے ہم نہیں کرنا چاہتے؟ آگے بڑھنے کے لئے ہم منزلوں پیچھے کیوں چلے جاتے ہیں؟ اُبھرنے کی خاطر ہم دبتے کیوں چلے جاتے ہیں؟ بڑا بننے کے لئے ہم چھوٹا بننا کیوں قبول کر لیتے ہیں؟ یہ ہم کیسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہماری مثال اُس آدمی کی سی ہے جسے مشرق کو جانا ہو مگر وہ مشرق ہی کو نہ جا رہا ہو۔ میں سوچتا ہوں ہمیں مشرق کو جانے سے کون روک رہا ہے۔ کون روک رہا ہے؟ شائد ہمارے اندر کا وہ چھوٹا سا آدمی۔ وہمی — بزدل — خود غرض — مگر عیار جس نے ہم پر قبضہ جما رکھا ہے!!

میں سوچتا ہوں وہ سارے نظریات جو انسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے پیش کئے گئے تھے انسانی برادری میں تفرقہ بازی کے لئے کیوں استعمال ہو رہے ہیں؟ ایک انسان کا دوسرے انسان سے جو ازلی ابدی رشتہ معرضِ وجود میں آیا تھا کیوں پس پشت ڈال دیا گیا ہے؟

سمندر کو جزیرے کیوں نگلتے جا رہے ہیں؟

سوچیں سطحِ سمندر پر چلنے والی لہروں کی مانند ہیں۔ کیا آپ سمندر کی لہروں کو گن سکتے ہیں؟ کیا آپ ان کو روک سکتے ہیں؟ جب سے میں نے سوچنا شروع کیا ہے سوچوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ ان سوچوں کا میری زندگی سے وہی رشتہ ہے جو لہروں کا سمندر سے ہوتا ہے۔

ایک معمولی ذرّے سے لے کر انسان تک اور پھر خدا کے بزرگ و برتر تک میں نے سب کے بارے میں سوچا ہے۔ اپنی ابدی زندگی سے لے کر آپ کی حیاتِ مستعار تک۔ اپنے دکھوں سے لے کر آپ کی خوشیوں تک میں نے ہر چیز کو سوچا ہے۔ مگر میری سوچیں ہمیشہ ایک مشرقی کی سوچیں رہی ہیں۔ بے حد سنجیدہ، اُداس، تاریک، غمگین، سوگوار۔ ایسا کیوں ہے؟ میں نے اس پر بھی غور کیا ہے۔ ہم صدیوں سے جو سوگوار زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ سوچیں اسی سوگوار زندگی کی پیدا کردہ ہیں۔ اس صورتِ حال میں اچھے دنوں کی امید لگائے صدیوں سے زندگی کرتے چلے جانا ہی ہماری عظمت کی دلیل ہے۔ ہم صدیوں سے ایسے سورج کے طلوع کا انتظار کر رہے ہیں جو سب کے لئے ہو اور جسے دستار میں چھپا کر نہ لے جایا جا سکے۔

میں سوچتا ہوں وہ سورج کب نکلے گا؟ میں صدیوں کے اندھیروں میں اپنے گھر سے باہر بیٹھا ہوں اور دُور افق پر نظریں جمائے ہوئے ہوں۔ مگر پھر یکدم سوچتا ہوں کہ وہ سورج تو کبھی کا طلوع ہو چکا۔ میری یہ سوچ، شعاعیں بکھیرتی، روشنی دیتی ہوئی یہ سوچ سورج نہیں تو اور کیا ہے؟

رشید قیصرانی

مَیں سوچتا ہوں ــــ تجزیاتی مطالعہ

اکبر حمیدی کا انشائیہ "مَیں سوچتا ہوں" میرے سامنے ہے۔ اس سے پہلے کہ مَیں اس کا تجزیہ پیش کروں، صنفِ انشائیہ کی چند خصوصیات کا ذکر ضروری ہے۔ انشائیہ انتہائی گہری، عمیق اور وسیع سوچ کا مظہر ہوتا ہے۔ اگرچہ سوچ کی اس گہرائی اور وسعت کا اظہار ہلکے پھلکے اور رواں انداز میں کیا جاتا ہے۔ اس میں شعور سے زیادہ تحت الشعور کے مظاہر سامنے آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ لکھنے والے کے اندر کی دنیا کے وہ پہلو جو نفسِ مضمون سے کسی نہ کسی صورت میں وابستہ ہوتے ہیں جابجا اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ ان جھلکیوں سے بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ انشائیہ نگار عنوان سے ہٹ کر بات کر رہا ہے۔ لیکن دراصل ایسا نہیں ہوتا۔ یہ گریز اصل نفسِ مضمون کی طرف ایک جست کی حیثیت رکھتا ہے۔ یوں انشائیہ نگار ایک ڈگر کو چھوڑ کر دوسری ڈگر پر چلنا شروع کر دیتا ہے، لیکن سمت نہیں بدلتا۔ اگر انشائیہ نگاری کے سارے عمل کو ایک تمثیل کے ذریعے پیش کیا جائے تو صورت کچھ یوں بنتی ہے۔ انشائیہ نگار کی اپنی ذات ایک سمندر ہوتی ہے جس میں وہ غوطہ لگاتا ہے۔ اس غوطہ زنی کے دوران اُسے کبھی تو کوئی موتی نظر آتا ہے، کبھی کوئی خالی سیپی، کبھی کوئی خوبصورت مچھلی اور کبھی کوئی مگرمچھ، کبھی کوئی چٹان اور کبھی کوئی مدتوں کا ڈوبا ہوا زنگ خوردہ جہاز۔ ان تمام اشیا کو وہ چھوتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ وہ کنارے پر بیٹھے ہوئے اپنے ہمزاد کو اپنے تاثرات اور تجربات بھی منتقل کرتا رہتا ہے۔ یہی روداد ایک انشائیہ بن جاتی ہے۔ لیکن غوطہ زنی کا یہ سارا عمل وہ ایک محقق کی حیثیت سے تحقیق کے انداز میں نہیں بلکہ ایک سیاح کے انداز میں اختیار کرتا ہے۔ غوطہ وہ بہت گہرا لگاتا ہے، انکشافات بھی متنوع ہوتے ہیں لیکن اپنے تجربے میں آنے والی ہر چیز پر تحقیق کرنے نہیں بیٹھ جاتا بلکہ ہلکے پھلکے لیکن جامع الفاظ میں اپنے تاثرات کو بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ اور یوں اس ساری روئداد میں تنوع تو ہوتا ہے لیکن یہ ساری حکایت ایک ہی ہوتی ہے۔ اس طرح نفسِ مضمون سے انشائیہ نگار کا ناطہ نہیں ٹوٹتا۔

اکبر حمیدی کا یہ انشائیہ "مَیں سوچتا ہوں" سوچ سمندر میں گہری غوطہ زنی کا حاصل ہے۔ اس غوطہ زنی کے دوران اُس پر مختلف انکشافات ہوئے جنہیں وہ بیان کرتا چلا گیا ہے۔ اپنی ذات کے حوالے سے اُس نے سوچ کی مختلف پرتیں قاری کے سامنے پیش کی ہیں اور ہر پرت اور ہر نہج پر اُس نے رواں تبصرہ کیا ہے یہ تبصرہ اپنے اختصار کے باوجود انتہائی جامع ہے اور قاری کے ذہن کے لیے انگیخت کا کام کرتا ہے۔ یہی ایک اچھے انشائیہ کی خاصیت ہے۔ اس انشائیہ میں ظلم کے خلاف سوچ کی مدافعانہ قوت کا بھی اظہار کیا گیا ہے اور سوچ کے زہریلے پن کا بھی۔ اس ذہنی عمل میں سوچ کی ایک اور نہج اُس کے سامنے آئی۔ اُس نے محسوس کیا کہ سوچ ایک عدالت ہے جو اس کے اپنے اندر لگتی ہے۔ جب وہ خودکشی کرتا ہے تو اس عدالت سے اُسے موت کی سزا مل چکی ہوتی ہے۔ اور جب ہنستے مسکراتے زہر کا پیالہ ہونٹوں سے لگا لیتا ہے تو حقیقت میں اُسے باعزت بری کر دیا گیا ہوتا ہے۔ یہ سب کتنی گہری باتیں ہیں۔ اور ہر ایک بات کے پیچھے مفاہیم کا کتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ پھر اُس پر اپنے بچپن کے تجربات کے حوالے سے یہ بھی منکشف ہوتا ہے کہ سوچ انسانی شعور کا سب سے پہلا غیر شعوری عمل ہے۔ اسی انشائیہ میں آگے چل کر وہ لکھتا ہے:

"زندگی کے وہ لمحے مجھے کبھی نہیں بھولتے جب میری چھوٹی سی غلطی نے مجھے بہت بڑی ناکامی سے دوچار کر دیا تھا۔"

اس تجربے پر کتنا جامع تبصرہ اس نے پیش کیا ہے۔

"وہ ساعتیں کتنی بڑی ہوتی ہیں جو پھیل کر پوری زندگی کے لیے امر بیل بن جاتی ہیں ——"

ذات کے اسی سفر کے دوران ایک اور تجربے کا نچوڑ ملاحظہ فرمائیں۔

"کئی بار سوچتا ہوں کہ میں تلواروں کو پھولوں پر روک رہا ہوں، اس یقین کے ساتھ کہ پھول تلواروں کو کند کر دیتے ہیں۔"

تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالنے سے، ہمیں ہزاروں ایسے واقعات ملتے ہیں جب محبت نے نفرت پر فتح پائی۔ جب ظالم نے مظلوم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ جب صبر نے بالآخر ظلم اور جبر کو ہانپنے، کانپنے پر مجبور کر دیا۔ تاریخ کے حقائق کا ادراک اکبر حمیدی کو اپنی ذات کے سفر کے دوران ہوا اور اس نے اس تاریخی حقیقت کو صرف ایک جملے میں بیان کر دیا۔ انشائیہ نگار نے اس ایک جملے کے ذریعے نہ جانے تاریخ کے کتنے اوراق الٹ دیئے ہیں۔ پھر اسی سورج کے سفر میں اس پر ایک اور انکشاف ہوا۔

"ہم صدیوں سے ایسے سورج کے طلوع کا انتظار کر رہے ہیں جو سب کے لیے ہو اور جسے دستار میں چھپا کر نہ جایا جا سکے"

کلاہ و دستار کی داستان بھی بہت پرانی ہے۔ دستار کے طرہ کے ذریعے اپنے قد کو اونچا کرنے۔ روشنیوں کے تمام ذرائع کو صرف اپنی مسند کو سجانے، سچائیوں کے تمام پھریروں کو اپنی دستار میں اڑس لینے کے لیے کوشاں رہنے کی داستان بھی انسانی تاریخ کا ایک حصہ ہے انشائیہ نگار کی یہ حسرت کہ تمام روشنیاں، تمام سچائیاں، تمام سچائیاں سب کے لیے ہوں کتنی قیمتی ہے۔ اکبر حمیدی نے ایک وسیع مضمون کو کتنی آسانی سے اپنی ذات کے حوالے سے صرف ایک جملے میں ادا کر دیا ہے۔ سورج کے حوالے سے اس نے کتنے حقائق کی نشاندہی کی ہے۔ اس مضمون کی کتنی پرتیں قاری پر کھولی ہیں اور اسے سوچنے پر مجبور کیا ہے، کتنی گہری باتیں وہ کس رواں اور سہل انداز میں کہتا چلا گیا ہے۔ یہی ایک اچھے انشائیے کی خاصیت ہے اور اس لحاظ سے "میں سوچتا ہوں" ایک خوبصورت اور مکمل انشائیہ ہے۔

وزیر آغا
کے
خطوط
انور سدید کے نام

ضخامت: ۲۰۸ صفحے خوبصورت گٹ اپ
قیمت: ۳۰ روپے

ناشر: مکتبہ فکر و خیال، ۲/۱، استلج بلاک، اقبال ٹاؤن لاہور

جُمعہ

سلمان بٹ

جو حیثیت آج کل جمعے کو حاصل ہے، وہ چند سال پیشتر اتوار کو حاصل تھی۔ لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے ہر کمالے را زوالے، تو آخر اتوار کو بھی کسی نہ کسی روز زوال آنا ہی تھا۔ چنانچہ راتوں رات اتوار کو جمعے کے لئے جگہ خالی کرنی پڑی۔ اور چھٹی کا تاج اتوار کے سر سے اُتار کر جمعے کے سر پر رکھ دیا گیا۔ اگرچہ دنیا کے اکثر ممالک میں اب بھی اتوار ہی کی حکومت ہے۔ لیکن ہمیں تو اپنے مُلک سے غرض ہے جہاں اتوار کو ریٹائر کر دیا گیا ہے۔ ہر مُلک کا اپنا نظام ہوتا ہے اور تمام ترجیحات اِسی نظام کی رُوح کے مطابق متعین ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر بعض مُلکوں میں پارلیمانی ہفتہ وار نظام ہے یعنی وہاں اتوار کو صدر کا مقام حاصل ہے اور ہفتے کو وزیرِ اعظم کا درجہ دیا گیا ہے۔ چنانچہ وہاں ہفتہ اور اتوار دو چھٹیاں ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں پہلے اِسی نظام سے ملتا جلتا نظام تھا۔ تمام اختیارات اتوار ہی کے پاس نہ تھے۔ بلکہ جمعے کو بھی اقتدار میں شریک کیا جاتا تھا۔ یعنی جمعے کو آدھی چھٹی کر دی جاتی تھی۔ یہ نظام مغربی جمہوریت اور اسلام کا مرکب تھا۔ لیکن ہم مرکبات کے قائل نہیں۔ ہمیں تو خالص چیز چاہیئے۔ چنانچہ جب ہم نے اتوار سے چھٹی کا حق چھینا تو جمعے کو بلا شرکتِ غیرے آرام اور چھٹی کا دن قرار دے ڈالا۔ سو اب ہم جمعے کے روز سوائے کام کے، وہ تمام حرکات کرتے ہیں، جو پہلے اتوار کو کیا کرتے تھے۔ جمعے کے روز ہم پکنک مناتے ہیں، شادیاں کرتے اور کرواتے ہیں، محفلِ موسیقی منعقد کرتے ہیں، دعوتیں دیتے اور کھاتے ہیں، ادبی محافل میں افسانے، غزلیں، نظمیں اور مقالے پڑھتے ہیں، ان پر اندھا دھند تنقید کرتے ہیں، اپنی اپنی لیلاؤں کو پھانسنے کی تراکیب آزماتے ہیں، بچوں کی پٹائی کرتے ہیں۔ غرض ہفتے بھر کے رُکے ہوئے "کام" اب جمعے کو کرتے ہیں۔ چنانچہ اب نمازِ جمعہ کے لئے اتنا وقت نہیں ملتا جو پہلے ملتا تھا۔ بعض اوقات تو ان جھنجھٹوں میں پڑ کر جمعے کی نماز بھی چھوڑنی پڑ جاتی ہے۔ بہر حال پڑھنے والے کسی نہ کسی طرح نمازِ جمعہ پڑھ ہی لیتے ہیں مگر وہ پہلے والا سکون اور فراغت اب نصیب نہیں۔

جمعے کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن جمعرات کو بھی ایک نوع کی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ جمعرات، جمعے کی پیش رَو ہے۔ یعنی اگر جمعرات نہ آئے، تو جمعے کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جمعہ ہمیشہ جمعرات کے بعد آتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ منگل یا بُدھ کے بعد اچانک جمعہ آ گیا ہو۔ جمعرات کی اِسی اہمیت کے پیشِ نظر لوگ جمعے سے پہلے جمعرات کا انتظار کرتے ہیں۔ جب یہ روزِ سعید آجاتا ہے، تو دفاتر میں "کام" کی رفتار انتہائی سُست پڑ جاتی ہے۔ ہر سائل کو ہر دفتر میں یہی جواب ملتا ہے کہ "اب تو یہ کام ہفتے ہی کو ہو سکتا ہے"۔ گویا جمعرات کو دفتروں میں کام تقریباً معطل ہو جاتا ہے۔ صرف اشد ضروری کام کئے جاتے ہیں یعنی وہ کام جن کا تعلق "لین دین" سے ہوتا ہے۔

جمعرات کو زیادہ تر وقت جمعہ منانے کے سلسلے میں سوچ و بچار اور پروگرام سازی میں گزرتا ہے۔ اُستاد سوچتا ہے کہ کل طالب علموں کی بک بک سے نجات ملے گی۔ طالب علم سوچتے ہیں کہ اُستادوں سے آزادی نصیب ہوگی، جی بھر کر کرکٹ کھیل جائے گی۔ میری طرح بنکوں میں کام

کرنے والے سوچتے ہیں کہ کل بچوں سے ملاقات کریں گے اور بیگم کو جی بھر کر دیکھیں گے۔

ایک جمعے کے بعد دوسرا جمعہ کب آتا ہے؟ یہ ایک مشکل سوال ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ جمعے سے جمعے تک کا وقفہ تقریباً چھ صدیوں پر محیط ہے۔ لیکن اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ کہنا ناممکن ہے۔ کیونکہ یہ وقفہ چاند کی طرح گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ مثلاً لمبی تعطیل کے دوران یہ وقفہ محض چند گھنٹوں کا رہ جاتا ہے۔

میں اکثر جمعرات کے روز دفتر میں بیٹھا بیٹھا سوچتا ہوں کہ اگر جمعہ نہ ہوتا تو زندگی کتنی تکلیف دہ اور دکھی ہوتی۔ خدا بھلا کرے اس شخص کا جس نے ہفتے میں سات دن کی گنجائش رکھی اور وہ ہفتے میں سات کی بجائے صرف چھ دن رکھتا تو کوئی اس کا کیا بگاڑ لیتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ ہم ہفتے کی بجائے ششتہ کا لفظ استعمال کرتے۔ لیکن لفظوں میں کیا دھرا ہے، اصل بات تو چھٹی کی ہے جو جمعے کے روز ہوتی ہے۔

جمعہ "ہفتے" کا ساتواں دن ہے۔ کہتے ہیں کہ خداوند خدا نے پورے چھ روز بے پناہ مصروفیت میں گزارے اور کائنات کی تخلیق کی۔ البتہ ساتویں روز آرام کیا۔ جمعہ کی تعطیل بھی اس آرام کے دن ہی کا بہروپ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہم باقی دن بھی زیادہ تر آرام ہی فرماتے ہیں۔ اس لئے جمعہ کی چھٹی سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ جمعہ صرف ان لوگوں پر ہی خود کو منکشف کرتا ہے جو چھ روز تک کاروبارِ حیات میں بُری طرح منہمک رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے جمعہ ایک جہانِ نو لے کر وارد ہوتا ہے۔ وہ سارا دن "کچھ نہ کرنے" کے دلفریب تجربے سے گزرتے ہیں۔ تماشے سے خود کو منقطع کر کے وہ تماشائی کی مسند پر آ بیٹھتے ہیں بلکہ لیٹ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے جمعہ کا روز انکشاف و عرفان کا روزِ سعید ہے۔ باقی چھ روز تو وہ بھیڑوں کے گلے کی صورت ہوتے ہیں جسے وقت کا گڈریا اپنی لاٹھی سے ہانکتا پھرتا ہے۔ جمعے کے روز وہ گڈریے سے اس کی لاٹھی چھین کر اسے اپنے گھر سے باہر دھکیل دیتے ہیں اور پھر اندر سے کنڈی لگا کر اطمینان سے اپنے بستر پر دراز ہو جاتے ہیں۔ اب "وقت" لاکھ ان کے گھر کے دروازے پر دستک دے وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ یہی جمعہ کا سب سے بڑا وصف ہے کہ وہ ہمیں وقت کی دستبرد سے بچاتا ہے۔ جو لوگ جمعہ کے روز بھی باقی چھ دنوں کی طرح سرگرداں رہتے ہیں، جمعہ ان سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ بلکہ انہیں دیکھتے ہی وہ اپنے گھر کے دروازے اندر سے مقفل کر لیتا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ یا تو باہر سے دروازے پر مسلسل دستک دیتے رہیں یا پھر مایوس ہو کر جمعہ بازار کی سیر کو نکل جائیں۔ دونوں صورتوں میں وہ جمعہ کی معیت میں چھٹی کا دن گزارنے کی سعادت سے بہر حال محروم رہ جاتے ہیں۔

سجاد نقوی | جمعہ — تجزیاتی مطالعہ

انشائیہ نگار سلمان بٹ اب ہمارے درمیان نہیں ہے مگر 'جمعہ' اور 'ایش ٹرے'، ایسے انشائیوں کو پڑھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ سلمان مرگیا ہے۔ صنفِ انشائیہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دیگر اصنافِ ادب کے مقابلے میں مصنف کو اس صنف میں اپنی شخصیت کے بھرپور اظہار کا موقع ملتا ہے۔ وہ لوگ جو سلمان کو ملتے رہے ہیں، ان انشائیوں کو اگر پڑھیں تو انہیں صاف محسوس ہوگا کہ تحریر کے ہر جملے سے سارے کا سارا سلمان بٹ بولتی آنکھوں اور ہنستے لبوں کے ساتھ جھانکتا نظر آتا ہے۔ سلمان بٹ کا انشائیہ 'جمعہ' پڑھتے ہوئے مجھے تو ایسا ہی محسوس ہوا ہے کہ خود سلمان مجھ سے محوِ کلام ہے مثلاً وہ اس انشائیے کی ابتدا ہی ان بے تکلفانہ جملوں سے کرتا ہے:

"جو حیثیت آج کل جمعہ کو حاصل ہے، وہ چند سال پیشتر اتوار کو حاصل تھی۔ لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے 'ہر کمالے را زوالے'، تو آخر اتوار کو بھی کسی نہ کسی روز زوال آنا ہی تھا چنانچہ راتوں رات اتوار کو جمعہ کے لیے جگہ خالی کرنی پڑی۔ اور چھٹی کا تاج اتوار کے سر سے اتار کر جمعہ کے سر پر رکھ دیا گیا۔"

اس تمہید کے بعد جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اس کی گفتگو میں مجھے زیادہ سے زیادہ اپنائیت اور اپنا ہم نوا بنانے کی سحر گری محسوس ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جب وہ سابقہ ہفتہ وار چھٹی کے نظام کا ذکر کرتا ہے تو ان الفاظ میں مجھے اپنا ہمنوا بنا لیتا ہے:

"ہمارے ہاں پہلے اس نظام سے ملتا جلتا نظام تھا۔ تمام اختیارات اتوار ہی کے پاس نہ تھے بلکہ جمعہ کو بھی اقتدار میں شریک کیا جاتا تھا یعنی جمعہ کو آدھی چھٹی کر دی جاتی تھی۔ یہ نظام مغربی جمہوریت اور اسلام کا مرکب تھا لیکن ہم مرکبات کے قائل نہیں۔ ہمیں تو خالص چیز چاہیئے۔ چنانچہ جب ہم نے اتوار سے چھٹی کا حق چھینا تو جمعہ کو بلا شرکتِ غیرے آرام اور چھٹی کا دن قرار دے ڈالا۔"

آگے چل کر سلمان بٹ مجھ سے اور بے تکلف ہو جاتا ہے اور کہتا ہے:

"میں اکثر جمعرات کے روز دفتر میں بیٹھا بیٹھا سوچتا ہوں کہ اگر جمعہ نہ ہوتا تو زندگی کتنی تکلیف دہ اور دکھی ہوتی۔ خدا بھلا کرے اس شخص کا جس نے ہفتے میں سات دن کی گنجائش رکھی اور وہ ہفتے میں سات کی بجائے صرف چھ دن رکھتا تو کوئی اس کا کیا بگاڑ لیتا۔ زیادہ سے زیادہ ہم ہفتے کی بجائے ششتہ کا لفظ استعمال کرتے، لیکن لفظوں میں کیا دھرا ہے، اصل بات تو چھٹی کی ہے جو جمعہ کی روز ہوتی ہے۔"

جناب مظفر بخاری (سلمان بٹ کے انتہائی قریبی دوست) نے سلمان بٹ کا خاکہ لکھتے ہوئے ایک بے حد بلیغ جملہ لکھا ہے۔ وہ یہ کہ "سلمان بٹ کے ہاں ڈاکٹر وزیر آغا کی متانت اور کنھیا لال کپور کی ظرافت کا ملاپ ہو گیا تھا۔" میں اس جملے میں صرف ایک ہی لفظ کا اضافہ کروں گا۔ وہ یہ کہ جہاں بخاری صاحب نے وزیر آغا سے متانت کو منسوب کیا ہے وہاں اس کے ساتھ شگفتگی کے لفظ کا اضافہ کر دیا جائے تو آغا صاحب کی شخصیت اور اسلوب دونوں کی کماحقہ ترجمانی

ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ سلمان بٹ کی تحریر میں ان دونوں اکابرینِ ادب کے اسالیب کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ متانت اور شگفتگی کا عنصر سلمان بٹ نے وزیر آغا سے اور طنز کی بے تحاشا کاٹ ـــــ کنہیا لال کپور سے لی ہے۔ مثلاً زیرِ تجزیہ انشائیہ کے یہ چند جملے صاف پتہ دیتے ہیں کہ ان میں کنہیا لال کی طنز کا رنگ پایا جاتا ہے:

"جب یہ روزِ سعید آ جاتا ہے تو دفاتر میں 'کام' کی رفتار انتہائی سست پڑ جاتی ہے۔ ہر سائل کو ہر دفتر میں یہی جواب ملتا ہے کہ اب تو یہ کام ہفتے ہی کو ہو سکتا ہے۔ گویا جمعرات کو دفتروں میں کام تقریباً معطل ہو جاتا ہے۔ صرف اشد ضروری کام کیے جاتے ہیں یعنی وہ کام جن کا تعلق 'لین دین' سے ہوتا ہے۔"

اس طرح اس انشائیے کے وہ چند جملے ملاحظہ کیجیے جو وزیر آغا کی سی متانت اور شگفتگی رکھتے ہیں:

"جمعہ صرف ان لوگوں پر ہی خود کو منکشف کرتا ہے جو چھ روز تک کاروبارِ حیات میں بری طرح منہمک رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے جمعہ ایک جہانِ نو لے کر وارد ہوتا ہے۔ وہ سارا دن "کچھ نہ کرنے" کے دلفریب تجربے سے گزرتے ہیں۔ تماشے سے خود کو منقطع کر کے وہ تماشائی کی مسند پر آ بیٹھتے ہیں بلکہ لیٹ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے جمعہ کا روز انکشاف و عرفان کا روزِ سعید ہے۔"

ہاں تو میں سلمان بٹ کے انشائیے 'جمعہ' کی وساطت سے اس کی بے تکلف گفتگو سے محظوظ ہو رہا تھا کہ درمیان میں جناب مظفر بخاری کے تاریخی جملے کا ذکر آ گیا اور میں اس کی توضیح کی طرف چلا گیا۔ اسے جملۂ معترضہ کہنے کو بھی جی نہیں چاہتا کہ اس کا تعلق بھی سلمان بٹ کے انشائیے ہی سے بنتا ہے۔ بہر حال میں دوبارہ ـــــ سلمان بٹ سے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھنے کی استدعا کرتا ہوں۔ وہ بڑا شہزادہ ہے، بچوں کی طرح روٹھ بھی جاتا ہے۔ پھر بھی میرے اصرار پر بادلِ ناخواستہ یہ جملے سناتا ہے:

"جمعرات کو زیادہ تر وقت جمعہ منانے کے سلسلے میں سوچ بچار اور پروگرام سازی میں گزرتا ہے۔ استاد سوچتا ہے کہ کل طالب علموں کی بک بک سے نجات ملے گی۔ طالب علم سوچتے ہیں کہ استادوں سے آزادی نصیب ہو گی، جی بھر کر کرکٹ کھیلی جائے گی۔ میری طرح بنکوں میں کام کرنے والے سوچتے ہیں کہ کل بچوں سے ملاقات کریں گے اور بیگم کو جی بھر کے دیکھیں گے۔"

پہلے جملوں میں تو سلمان بٹ نے بڑے شگفتہ انداز میں میرے پیشے کے حوالے سے جمعہ کی چھٹی کی اہمیت دلا کر مجھے اپنے اور قریب کر لیا ہے مگر آخری جملے میں بین السطور اپنے پیشے کی بے طرح مصروفیت کا احساس دلانے کے بعد یہ حیرت انگیز الفاظ "کہ کل بچوں سے ملاقات کریں گے اور بیگم کو جی بھر کے دیکھیں گے۔" کہہ کے اس منحوس وقت کی نشاندہی بھی کر دی ہے جب اس کی بیگم اور بچے اس جمعہ کے انتظار میں زندگی گزار دیں گے جو اب کبھی نہیں آئے گا۔ کاش سلمان بٹ نے یہ جملہ نہ کہا ہوتا یا پھر میں نے تجزیہ کے لیے 'جمعہ' کا انتخاب نہ کیا ہوتا۔ اس جملے سے تو مجھے یہی نظر آتا ہے کہ سلمان بٹ جب تک زندہ رہا اس نے جمعہ کا روز ہمیشہ اسی خیال سے اپنے بیوی بچوں میں بھرپور طریقے سے گزارا کہ کیا خبر اگلا جمعہ میسر آئے یا نہ آئے۔ بہر حال سلمان بٹ کا یہ انشائیہ بھی اس کے دوسرے انشائیوں کی طرح ہمیشہ زندہ اور تر و تازہ رہے گا۔ سلمان بٹ سے ملاقات کے لیے اس کے انشائیے سب سے بڑا وسیلہ ہیں اور میرے لیے اس کا انشائیہ 'جمعہ' اس لیے سب سے اہم ہے کہ اس کے لفظ لفظ میں میں نے سلمان بٹ کو بولتی آنکھوں اور ہنستے لبوں کے ساتھ دیکھا ہے، اس کی باتیں سنی ہیں اور اپنے بے حد قریب محسوس کیا ہے، اس سے بڑھ کر زندہ اور کون سی تحریر ہو سکتی ہے!

چرواہا!

وزیر آغا

پچھلے ہفتے کی بات ہے۔ میں حسبِ معمول کھیتوں کا طواف کر رہا تھا کہ میری ملاقات ایک چرواہے سے ہوئی جو اپنی بھیڑوں کا ریوڑ لیے قریبی پہاڑیوں کی طرف جا رہا تھا۔ میں اُسے پہلے بھی کئی بار صبح سویرے جاتے اور شام کو گھر لوٹتے دیکھ چکا تھا اور حیران تھا کہ وہ سنگلاخ پہاڑیوں میں صبح سے شام تک یکہ و تنہا کیسے وقت کاٹ لیتا ہے! سو میں نے اس سے پوچھا: بھائی چرواہے! تم پہاڑیوں کی مہیب تنہائی میں پہاڑ ایسا دن کیسے گزار لیتے ہو؟ میری بات سن کر وہ بے اختیار ہنسا۔ کہنے لگا: کون سی تنہائی آغا جی! میرے ساتھ بھیڑیں ہوتی ہیں۔ پھر وہاں پہاڑیاں ہیں۔ پہاڑیوں پر جھاڑیاں ہیں۔ جھاڑیوں میں چڑیاں ہیں۔ میں تنہا کب ہوتا ہوں! میں نے کہا: وہ تو ٹھیک ہے مگر وہاں نہ بندہ ہوتا ہے نہ بندے کی ذات! آخر تم باتیں کس سے کرتے ہو؟ وہ پھر ہنسا۔ کہنے لگا: جی باتوں کا کیا ہے۔ وہ تو میں خود سے کر لیتا ہوں۔ اپنی آواز کو سننے میں بڑا لطف آتا ہے! —— یہ کہہ کر چرواہا تو چلا گیا مگر میں تا دیر سوچتا رہا کہ واقعی تنہا وہ نہیں، ہم ہیں کیونکہ وہ تو ہمہ وقت اپنے ساتھ رہتا ہے جب کہ ہم دوسروں کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہ اپنی آواز کا خود ہی سامع ہے جب کہ ہم اپنی آواز دوسروں کو سناتے ہیں۔ آغازِ کار میں انسان بالکل اکیلا تھا۔ پھر اُس کے بدن سے ایک نازک سی پسلی ٹھنک کر علیحدہ ہوئی اور اُس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی۔ اس کے بعد جب پسلی نے پَر پُرزے نکالے اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گُل افشانیٔ گفتار کا مظاہرہ کرنے لگی تو دونوں میں مغائرت کی خلیج ابھر آئی اور وہ پھر سے خود کو بھری پُری دنیا میں یکہ و تنہا محسوس کرنے لگا۔ چرواہا انسانی زندگی کے اُن ایام کی یادگار ہے جب وہ کسی دوسرے سے نہیں بلکہ خود سے ہم کلام تھا اور ہمہ وقت خوش باش رہتا تھا۔

مگر یہ بات تو میں نے پچھلے ہفتے سوچی تھی۔ آج مجھے چرواہے کی بات میں ایک جہانِ معنی نظر آ رہا ہے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ تاحال انسانی تہذیب صرف تین ادوار سے آشنا ہوئی ہے —— پہلا "چرواہے کا دور" جو گزر چکنے کے باوجود ابھی تک نہیں گزرا۔ دوسرا "کسان کا دور" جو اپنی عمرِ طبعی گزار چکنے کے بعد اب جاں بلب ہے اور تیسرا "بنیے کا دور" جو ابھی ابھی شروع ہوا ہے۔ بنیے کی ساری قوت "زر" میں ہے۔ وہ اس ہتھیار کی مدد سے نہ صرف ہر قسم کے زنگ آلود تالوں کو کھولنے پر قادر ہے، نہ صرف انسانوں اور سلطنتوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا مجاز ہے بلکہ دنیا کے ساتھ عقبیٰ کے لذائذ اور اثمار کی بھی گارنٹی دے سکتا ہے۔ دوسری طرف کسان کی ساری قوت "زمین" میں ہے۔ مگر زمین بے چاری ایک مدت سے بیمار ہے۔ اس میں بڑی تیزی سے شور پھیل رہا ہے۔ علاوہ ازیں بنیے نے اب اس پر فصلوں کے بجائے شہر اُگانے شروع کر دیئے ہیں اور یہ شہر لمحہ بہ لمحہ اپنی جڑوں کو پھیلا کر زیادہ سے زیادہ جگہ گھیر رہے ہیں۔ ہر شہر ہلدی کے پودے کی طرح ہے جس کی گانٹھیں زیرِ زمین پھیلتی ہی چلی جاتی ہیں۔ سو کسان کا زمانہ اب محض ایک آدھ رات کا افسانہ ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں

گے کہ بنیا اپنے لیے خوراک زمین کے بجائے سمندر سے حاصل کرے گا یا اپنی فیکٹریوں میں تیار کرے گا اور کسان بے چارہ نقلِ مکانی بلکہ نقلِ زمانی پر مجبور ہو جائے گا مگر بنیا اپنی تمام تر قوت اور چالاکی کے باوجود چرواہے کا شاید کچھ نہ بگاڑ سکے۔ کیونکہ چرواہے کی قوت زر یا زمین میں نہیں بلکہ اس کی "چھڑی" میں ہے اور یہ چھڑی جادو کی وہ چھڑی ہے جو کبھی برق بن کر لہراتی ہے، کبھی شبنم بن کر اترتی ہے، کبھی خیال بن کر اڑتی ہے، کبھی خوشبو کی طرح چاروں طرف پھیل جاتی ہے اور کبھی دوبارہ چھڑی بن کر ریوڑ کو ہانکنے لگتی ہے۔ بنیا ہزار کوشش کے باوجود اس چھڑی پر قابض نہیں ہو سکتا کیونکہ قبضہ تو صرف مرئی چیزوں پر کیا جا سکتا ہے۔

چرواہے کی چھڑی دراصل ہوا کا ایک جھونکا ہے اور ہوا کے جھونکے کو مٹھی میں بند کرنا ممکن نہیں۔ اسے تو دیکھنا بھی ممکن نہیں۔ البتہ جب وہ آپ کے بدن کو مس کرتے ہوئے گزرتا ہے تو آپ اس کے وجود سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ وجود ہی سے نہیں آپ اس کی صفات سے بھی آگاہ ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ بنیادی طور پر ہر جھونکا ایک پیغام بر ہے۔ وہ ایک جگہ کی خوشبو کو دوسری جگہ پہنچاتا ہے۔ یہی کام چرواہے کا بھی ہے۔ تمام لوک گیت چرواہوں کے ہونٹوں پر لرزتے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے رہے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ بہت قدیم زمانے میں قبائل نے جو نقلِ مکانی کی، اس کے بارے میں تاریخی کوائف ناپید ہیں البتہ جن راستوں سے یہ قبیلے گزرے اور جن خطوں میں چند روز ٹھہرے وہاں انہوں نے اپنے نقوشِ پا چھوڑ دیئے جنہیں آج بھی "پڑھا" جا سکتا ہے۔ یہ نقوشِ پا وہ منور الفاظ ہیں جو ان کے ہونٹوں سے ٹپکے اور پھر راستوں اور خطوں میں بولی جانے والی زبانوں کے دامن پر کہیں نہ کہیں موتیوں کی طرح اٹک کر رہ گئے اور صدیوں تک اپنے بولنے والوں کے سفر کی داستان سناتے رہے ـــــ مگر لوک گیتوں کا قصہ دوسری نوعیت کا ہے۔ لوک گیت قبیلوں کے نہیں بلکہ چرواہوں کے نقوشِ پا ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ کسی خطے کا چرواہا کہاں کہاں پہنچا کیونکہ وہ جہاں کہیں گیا اپنے ساتھ گیت کی لَے اور خوشبو اور تمازت بھی لے گیا۔ پھر وہ خود تو وقت کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکا اور مآل کار زمین کا رزق بن گیا مگر اس کا گیت ایک لالہ خود رو کی طرح عہد بہ عہد اس خطے کی زمین سے برآمد ہوتا اور خوشبو پھیلاتا رہا۔ بس یہی چرواہے کا وصفِ خاص ہے کہ وہ جگہ جگہ گیتوں کے بیج بکھیرتا پھرتا ہے ـــــ بیج جو اس کے نقوشِ پا ہیں، جنہیں وقت کا بڑے سے بڑا سیلاب بھی نابود نہیں کر سکتا۔

ویسے عجیب بات ہے کہ چرواہے کے مسلک کو آج تک پوری طرح سمجھا ہی نہیں گیا۔ مثلاً اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ گلّے کا رکھوالا بھی ہے اور پولیس مین بھی! یعنی وہ اپنی چھڑی کی مدد سے ہر اس زمینی یا آسمانی بلا پر ٹوٹ پڑتا ہے جو اس کے گلّے کو نظرِ بد سے دیکھتی ہے اور اسی چھڑی سے وہ گلّے سے بھٹکی ہوئی ہر بھیڑ کو راہِ راست پر لانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ مگر کیا چرواہے کا مقصدِ حیات صرف یہی ہے! ـــــ غالباً نہیں! وجہ یہ کہ جب چرواہا گلّے کو لے کر روانہ ہوتا ہے تو اُسے مجبوراً اِسے سیدھی لکیر پر چلانا پڑتا ہے تاکہ ریوڑ بحفاظت منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔ واپسی پر بھی اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اپنی تمام بھیڑوں کو سمیٹ کر یک مشت کر دے تاکہ وہ بغیر کسی حادثے کے اپنے گھر پہنچ جائیں۔ مگر یہ تو سفر کے بالکل عارضی سے مراحل ہیں۔ اصل اور دیرپا مرحلہ وہ ہے جب چرواہا اپنے گلّے کو کسی سرسبز و شاداب میدان، جھاڑیوں سے اٹے ہوئے صحرا یا کسی پہاڑ کی ڈھلوان پر لا کر آزاد کر دیتا ہے۔ جس طرح تسبیح کا دھاگا ٹوٹ جائے تو منکے فرشِ خاک پر گرتے ہی لڑھکنے اور بکھرنے لگتے ہیں بالکل اسی طرح جب گڈریا اپنے ریوڑ کو آزاد کرتا ہے تو وہ دانہ دانہ ہو کر بکھر جاتا ہے۔ معاً ہر بھیڑ کی ایک اپنی منفرد شخصیت وجود میں آ جاتی ہے۔ گلّے کے شکنجے سے آزاد ہوتے ہی ہر بھیڑ محسوس کرتی ہے کہ بے کنار آسمان اور لامحدود زمین کے عین درمیان وہ اب یکہ و تنہا کھڑی مرکزِ دو عالم بن گئی ہے۔ مگر بات

محض بھیڑوں ہی کی نہیں خود چرواہے کو بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے بدن کے حصار سے باہر آ کر چاروں طرف بکھرنے لگا ہے، جیسے اس کے ہاتھ یکایک اتنے لمبے ہو گئے ہیں کہ وہ اپنی جگہ سے جنبش کیے بغیر ہی درخت کی پھننگ، پہاڑ کی چوٹی اور ابر پارے کی جھالر کو چھو سکتا ہے بلکہ پتھروں، پودوں اور پرندوں حتیٰ کہ رنگوں اور روشنیوں سے بھی ہم کلام ہو سکتا ہے۔ کسان بے چارے کو تو زمین نے جکڑ رکھا ہے اور بنیے کو زر نے مگر چرواہا ایک مردِ آزاد ہے۔ وہ اپنے گلے کا بھی مطیع نہیں۔ وہ میدان یا پہاڑ کی ڈھلوان پر پہنچتے ہی اپنی مٹھی کھول دیتا ہے اور سارا گلا اس کی انگلیوں کی جھریوں سے دانہ دانہ ہو کر ہر طرف بکھر جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ خود بھی بکھرنے لگتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے خاک و افلاک پر ایک رداسی بن کر چھا جاتا ہے۔ مگر چرواہا آخر چرواہا ہے۔ اس کا کام محض بکھرنا ہی نہیں سمٹنا بھی ہے چنانچہ شام ہوتے ہی وہ پہلے اپنی چھڑی کو جسم عطا کرتا ہے، پھر خود کو تنکا تنکا جمع کرتا ہے۔ اس کے بعد اپنی بھیڑوں کو ڈھلوان یا میدان میں سے چُن چُن کر دھاگے میں پروتا ہے اور خطِ مستقیم پر سفر کرتا واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔ مجتمع ہونے، بکھرنے اور دوبارہ جڑ جانے کا یہ عمل جس سے چرواہا ہر روز گزرتا ہے، پوری کائنات کے طرزِ عمل سے مشابہہ ہے۔ مگر یہ دوسرا قصہ ہے۔!

چرواہے کئی طرح کے ہیں۔ ایسے چرواہے بھی ہیں جو محض مزدوری کرتے ہیں۔ سارا دن مویشیوں کو ہانکنے کے بعد رات کو تھکے ہارے واپس آتے ہیں اور کھاٹ پر گرتے ہی بے سُدھ ہو جاتے ہیں۔ ایسے چرواہوں کو چرواہا کہنا بھی زیادتی ہے۔ پھر ایسے چرواہے بھی ہیں جو چناب کنارے یا جمنا تٹ پر بھینسوں یا گائیوں کو چراتے پھرتے ہیں مگر یہ لوگ بھی چرواہے کم اور پریمی زیادہ ہیں۔ گائیوں بھینسوں سے ان کا سارا لگاؤ محض ایک بہانہ ہے۔ وہ در اصل ان کی وساطت سے زیادہ نازک اور خوبصورت گائیوں بھینسوں تک رسائی پانے کے آرزو مند ہوتے ہیں، چنانچہ جب عشق کے انتہائی مراحل میں ان کے گرد چراہنوں یا خوشیوں کا حلقہ تنگ ہو جاتا ہے تو انہیں یاد بھی نہیں رہتا کہ ان کی اصل گائیں بھینسیں نجانے کب سے ان کی راہ تک رہی ہیں —— میں اس قسم کے چرواہوں کا ذکر کر کے آپ کا قیمتی وقت ضائع کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میں تو صرف اُن چرواہوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو مویشیوں کے ریوڑ چراتے چراتے ایک روز انسانوں کے ریوڑ چرانے لگتے ہیں۔ تب ان کی چھڑی عصا میں بدل جاتی ہے۔ ہونٹوں پر اسمِ اعظم تھرکنے لگتا ہے۔ وہ انسانی ریوڑوں کو پہاڑ کی چوٹی پر لا کر یا صحرا کے سینے میں اُتار کر یا دریا کے کناروں پر بکھیر کر اس بات کا انتظار کرتے ہیں کہ یہ ریوڑ اپنی کہنگی اور بیوست کو گندی اُون کی طرح اپنے جسموں سے اتار پھینکیں۔ پھر جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایسا ہو گیا ہے تو وہ انہیں واپس ان کے گھروں تک لے آتے ہیں۔ اس کے بعد وہ خود تسبیح کے دانوں کی طرح پوری کائنات میں بکھر جاتے ہیں۔ یہ جو بساطِ فلک پر ہر رات کروڑوں ستارے چمکتے ہیں، کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ سب انہی تسبیح کے ٹوٹے ہوئے دانے ہیں؟؟

ذوالفقار احمد تابش

چرواہا — تجزیاتی مطالعہ

وزیر آغا کے لکھے ہوئے بیشتر انشائیے میں نے پڑھے ہیں، کچھ ان سے سننے کا اتفاق بھی ہوا ہے۔ ان میں سے بسنت، کھڑکی، آنکھیں، بارھواں کھلاڑی اور چرواہا مجھے خاص طور پر پسند ہیں۔

ان سطور میں اظہار کے لیے میں نے "چرواہا" کا انتخاب کیا ہے۔

"چرواہا" بنیادی طور پر تاریخی اور تہذیبی شعور کے زیرِ اثر لکھا ہوا انشائیہ ہے۔ چنانچہ اس انشائیے کی ساری بُنت، اس کے مختلف پہلو اور پرتیں اسی حوالے سے زیرِ بحث آئی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ تاریخ، تہذیب، تمدن اور ثقافت وزیر آغا کی خصوصی دلچسپی کے موضوعات ہیں۔ ان کی شاعری، تنقید اور انشائیے میں ان کے نہ صرف حوالے ملتے ہیں بلکہ یہ موضوعات تخلیقی سطح پر بھی ان کے ہاں بنیادی عناصر کا کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اور دوسرے کام رومانوی ہونے سے بچ گئے ہیں جو ان کے عہد کے بہت سارے لکھنے والوں کے ہاں ایک نمایاں رویّہ ہے۔

"چرواہا" کے حوالے سے وزیر آغا پوری انسانی تہذیب ہمیں ایک نظر میں یوں دکھاتے ہیں کہ دُور تک پھیلا ہوا منظر ایک بار پھر روشن ہو جاتا ہے اور اس میں اپنے ریوڑ کے ساتھ عصا ہاتھ میں لیے ہوئے، چرواہا ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ صدیوں کا سفر اس پر کوئی اضمحلال طاری نہیں کر سکا۔ وہ وقت کے تمام شدائد کے سامنے اسی طرح سینہ سپر کھڑا ہے اور مصنف کے کہنے کے مطابق ہمیشہ یونہی نگہداشت کی ذمہ داری پوری کرتا رہے گا۔ تاریخی عمل کے ساتھ سب کچھ بدل گیا ہے، بدل رہا ہے مگر چرواہے کا کردار اور منصب ابھی تک وہی ہے۔

وزیر آغا نے چرواہے کے عام کردار کو تصوّر کی آنکھ سے دیکھا ہے اور اسے ایک علامتی رُخ دے کر اس کی حیثیت، کردار اور اہمیت کو جس طرح لازوال بنا دیا ہے اس سے نہ صرف ان کی فنکارانہ مہارت کا پتا چلتا ہے بلکہ ان کے فکری جوہر کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

اس انشائیے کا آغاز انہوں نے بہت ہلکے پھلکے انداز میں کیا ہے۔ مشاہدے کو گفتگو کا رُخ دے کر انہوں نے بتدریج اپنی فکر کو سنجیدگی کی طرف موڑا ہے اور جس طرح کہ انشائیے کی تکنیک ہے، انہوں نے چرواہے کے عمل اور کردار کے مختلف پہلوؤں، پرتوں اور جہتوں کو اپنی سوچ کا موضوع بنایا ہے۔ تاریخ، تہذیب معاشرہ، ثقافت اور انسانی فکر کے ارتقاء کے پس منظر میں رکھ کر انہوں نے چرواہے کی حیثیت کو ایک دلآویز ندرت عطا کی ہے بلکہ یوں لگتا ہے جیسے ان سارے حوالوں کو پس منظر بنا کر انہوں نے چرواہے کے کردار کو پینٹ کیا ہے اور پینٹنگز کا ایک سلسلہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔

انشائیہ نگار کا ایک کمال یہ بھی ہوتا ہے، اور یہ ایک مشکل کام ہے کہ وہ ایک معمولی سی شے، تصوّر، فرد یا مظہر کو اپنے فن کے سہارے ایک مجرّد حیثیت سے اٹھا کر آفاقی اور غیر معمولی حیثیت عطا کر دیتا ہے۔ اسے علامتی رُخ دے کر امر کر دیتا ہے۔ "چرواہا" میں وزیر آغا نے یہی تکنیک استعمال کی ہے۔ انہوں نے چرواہے جیسے کردار کو، جو ہمارے معاشرے کا شاید انتہائی غیر اہم کردار ہے اور فن اور فنکاروں کا تو کجا آج تک کسی عمومی گفتگو تک کا موضوع نہیں بن سکا

پیغمبرانہ شان عطا کردی اور اسے دوام بخش دیا۔

"چرواہا" ہماری مشرقی تہذیب کا ایک ایسا لازوال کردار ہے جس نے قوموں کی تقدیروں کو بدلا ہے، عظیم الشان اور زمانوں پر محیط تہذیبوں کی بنیادیں رکھی ہیں، تاریخ کے دھاروں کے رُخ موڑے ہیں۔ ویرانوں کو آباد کیا ہے اور ایک پیغمبرانہ شان سے بنی نوع انسان کو امن، ہدایت اور ایمان کے تحفے عطا کیے ہیں۔ وزیر آغا صاحب نے اپنے اس نہایت خوبصورت انشائیے میں چرواہے کی ان ساری حیثیتوں اور کرداروں کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔

اس انشائیے میں وزیر آغا نے ایک نہایت مشکل موضوع کو خوبصورت شعری زبان میں لکھا ہے اور اسے کہیں بھی بوجھل، ثقیل یا فلسفیانہ نہیں ہونے دیا حالانکہ اس موضوع میں ایسا ہو جانا بے حد قرین قیاس تھا۔

وزیر آغا کے اسلوب اور ان کی زبان نے اس انشائیے کو مزید وقعت دی ہے۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ آغا صاحب کی شاعری اور انشائیے کی زبان میں ایک گہرا رشتہ ہے جبکہ ان کی تنقید کی زبان بڑی حد تک مختلف ہے۔ اس کا سبب بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ شاعری اور انشائیے میں جتنی قریبی رشتے داری ہے اتنا ہی اثر بھی اس پر ہے چنانچہ انشائیہ نثر ہونے کے باوجود شعری اسلوب کی پرچھائیں تلے سفر کرتا ہے۔ یہی چیز اسے لطافت اور حسن عطا کرتی ہے۔ وزیر آغا کا یہ انشائیہ ان کے اسلوب، زبان اور بیان کے اعتبار سے بھی ان کا نمائندہ انشائیہ کہا جا سکتا ہے اور ان کے فن کی ایک بے حد خوبصورت مثال بھی!

غلام الثقلین نقوی کے افسانوں کا تازہ مجموعہ

لونگ والی

- روایت اور جدت کا خوبصورت امتزاج
- علامت اور تجرید کا انوکھا سنگم
- ہر افسانہ ایک خاص لمحے کی بصیرت کا حامل
- ایک ایک افسانہ سچی اُجلی اور بانکی تصویروں کا البم

اور

- پاکستان کی مٹی کی بُوباس ہر افسانے میں رچی بسی

(زیرِ طبع)

ناشر:۔ پولیمر پبلی کیشنز اُردو بازار لاہور

بارھواں کھلاڑی

وزیر آغا

کل ٹیلی ویژن پر کرکٹ میچ دیکھتے ہوئے میرے ایک دوست نے اپنی آنکھوں میں ایک شریر چمک اور ہونٹوں پر ایک مکروہ سی پان زدہ مُسکراہٹ سجاتے ہوئے دفعتاً مجھ سے سوال کیا: "آغا جی! اگر آپ کو قومی کرکٹ ٹیم میں شامل ہونے کی دعوت ملے تو کیا آپ اُسے قبول کر لیں گے؟"
میں نے فوری طور پر اس غلیظ سوال کا جواب دینے کے بجائے ایک اچٹتی سی نگاہ اپنے ہاتھوں پر ڈالی جس پر وقت اپنی لکیریں چھوڑ کر جا چکا ہے بعینہٖ جیسے سمندر پیچھے کو ہٹ جائے تو اُس کے ریتلے ماتھے پر برہم سی سلوٹیں باقی رہ جاتی ہیں۔ پھر میں نے ایک لمبی سانس لی اور چاہا کہ سانس چند لمحے میرے سینے میں مہمان رہے لیکن اُس نے اندر جاتے ہی جانے کس مہنجوڈرو کے آثار دیکھ لئے کہ پل بھر بھی نہ رُکی اور نتھنوں کے راستے باہر آگئی۔ تب میں نے ایک آہ سرد کھینچی اور پُورے اعتماد کے ساتھ اپنے دوست کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"ایک شرط پر"

"وہ کیا؟" دوست نے حیران ہو کر پُوچھا

"وہ یہ" میں نے ڈراما پیدا کرنے کے لئے قدرے توقف کیا اور پھر زور دے کر کہا "وہ یہ کہ مجھے بارھویں کھلاڑی کا منصب جلیل عطا کیا جائے۔ بصورت دیگر میں قومی مفاد کی پرواہ کئے بغیر ٹیم میں شامل ہونے کی دعوت کو مُسترد کر دوں گا۔"

میرا یہ جواب سُن کر میرے دوست کی آنکھوں سے شرارت کی رمق اور ہونٹوں سے تبسم کی نمی آنِ واحد میں رُخصت ہو گئی۔ غالباً وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس شخص کو بارھویں کھلاڑی کی حیثیت میں بھی شامل کیا گیا تو ٹیم کو یقینی شکست سے کوئی نہ بچا سکے گا۔ مگر دوسری طرف میں مطمئن تھا کہ میں نے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جس میں ہزاروں انسانی نسلوں کا تجربہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا مگر جس تک میرے دوست کے گیند نما سر کی رسائی قیامت تک بھی ممکن نہیں تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اس بھلے آدمی کو تو یہ تک معلوم نہیں کہ ٹیم کے گیارہ کے گیارہ کھلاڑی دراصل "مشقتی" ہیں جو بارھویں کھلاڑی کی تفریح طبع کے لئے میدان میں اُترتے ہیں۔ وہ سارا عرصہ میدان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑتے ہیں اور دوڑ دوڑ کر نڈھال ہو جاتے ہیں۔ محض اس لئے کہ دو کوڑی کے اس بدنما گیند کو دبوچ سکیں جسے مخالف ٹیم کے کسی بددماغ بلا باز نے ہوا میں اُچھال دیا تھا یا پورا ایک فرلانگ سرپٹ دوڑنے کے بعد گیند کو اس طرح پھینکیں کہ لکڑی کی تین بدوضع تکلیوں میں سے کم از کم ایک اس کی زد میں ضرور آجائے یا بلے کی مدد سے گیند کو خلق خدا کے سروں کے اوپر سے گزارنے کا اہتمام کریں۔ سوچئے کس درجہ مضحکہ خیز حرکات ہیں۔ مگر بارھواں کھلاڑی ایک بڑی حد تک ان جملہ حرکات سے محفوظ اور قعرِ دریا کے درمیان "تختہ بند" ہونے کے باوجود ہوشیار رہتا ہے اور اپنا دامن تر نہیں ہونے دیتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ طبعاً محض ایک تماشائی ہے۔ وہ کرکٹ کے میدان میں ضرور اُترتا ہے مگر اُس وقت جب کسی کھلاڑی کو پیر اسیٹا مول کی

ایک آدھ گولی پہنچانا درکار ہو یا اُسے تیز باؤلنگ سے بچاؤ کی وہ ترکیب بتانا مقصود ہو جو خاندانی نسخے کی طرح صرف ہاکپتان ہی کو معلوم ہے۔
لیکن جس پر خود کپتان کو اپنی باری میں عمل کرنے کی توفیق نہ ہو سکی تھی یا جب کپتان محسوس کرے کہ اگر بارھواں کھلاڑی میدان میں جاکر دو چار
بے معنی دوڑیں نہیں لگائے گا تو اس کی صحت بالکل برباد ہو جائے گی۔ باقی تمام عرصہ یہ "مردِ مجاہد" کھلاڑیوں کی گیلری میں براجمان بڑے مزے
سے بازیچۂ اطفال کو دیکھتا ہے، مونگ پھلی کھاتا ہے یا اُچک اُچک کر ٹیلی ویژن کیمرے کی زد میں آنے کی کوشش کرتا ہے تاہم اس کی اصل حیثیت
ایک تماشائی ہی کی رہتی ہے اور کسی بھی کھیل میں یہی بنیادی اور مرکزی حیثیت ہے۔

ممکن ہے آپ سوچیں کہ بارھویں کھلاڑی کو تماشائی قرار دینا تماشائیوں کے جمِ غفیر سے ناانصافی کے مترادف ہے مگر آپ یقین کریں کہ ایسا
ہرگز نہیں کیونکہ تماشائی "تماشائی" ہوتے ہی کب ہیں۔ وہ تو اپنی اپنی ٹیم کے غیر حاضر کھلاڑی ہیں جو میچ کے دوران سارا وقت باؤلروں کے ساتھ
باؤلنگ اور بلا بازوں کے ساتھ بیٹنگ کرتے ہیں اور کبھی جب طبیعت ذرا گدگدائے تو وکٹ کیپنگ بھی کر لیتے ہیں۔ جب مخالف ٹیم کے بلا باز
کی گیند ہوا میں اُچھلتی ہے تو اُسے دبوچنے کے لئے ہزاروں نادیدہ ہاتھ از خود ہوا میں اُٹھ جاتے ہیں اور جب ٹیم کے سب سے ہونہار اور
خوبصورت کھلاڑی کے دونوں ہاتھوں میں موجود کسی مستقل سوراخ سے گیند پھسل کر زمین پر آ رہتی ہے تو انہیں یوں لگتا ہے جیسے گیند خود ان
کے ہاتھوں سے پھسلی ہے۔ پھر جب کبھی ان کی اپنی ٹیم کا بلا باز چھکا لگاتا ہے تو ان کے ہزارہا بازوؤں کا زور بلا باز کے بازو میں سمٹ آتا ہے
وہ اپنی ٹیم کی فتح و شکست میں اس درجہ "مبتلا" ہوتے ہیں کہ اگر ٹیم جیتے تو یہ ان کی ذاتی جیت ہے اور اگر ٹیم ہارے تو یہ ان کی ذاتی شکست ہے۔
کھیل دیکھنے والوں کا یہ مجمع حقیقتاً "ایک ایسی ہستی" ہے جس کے ہزاروں سر اور بازو ہیں جس کی لاتعداد آنکھیں اور اَن گنت کان ہیں اور جو
بیک زبان اپنی خوشی، غمی یا برہمی کا برملا اظہار کرتی ہے اور کھیل میں بھرپور شرکت سے یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ بیچ میدان کھڑی ہے نہ کہ
کرچ کرچ ہو کر گراؤنڈ کے چاروں طرف کی نشستوں پر بکھری پڑی ہے یہ "ہستی" بیک وقت اپنی ٹیم کی ہم راز، ساتھی، منصف اور ضمیر کی آواز
ہے۔ لہٰذا جب کوئی کھلاڑی میدان میں کسی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس ہستی کی طرف دادطلب نگاہوں سے دیکھتا ہے اور جب اُس
سے کوئی حماقت یا کوتاہی سرزد ہوتی ہے (جو اکثر ہوتی ہے) تو یہ ہزار پا یہ ہستی اُس کی طرف گھور کر دیکھتی ہے اور وہ اس کی برہم آنکھ کی تاب
نہ لا کر فوراً ہلمٹ میں اپنا منہ چھپا لیتا ہے گویا ان دونوں میں "گفتگو" ہمہ وقت جاری رہتی ہے۔ اگر گفتگو کا یہ سلسلہ کسی وجہ سے ٹوٹ جائے تو میچ
قطعاً بے معنی اور بے لطف ہو کر رہ جائے۔ بلکہ میں تو یہ تک کہوں گا کہ گیارہ افراد کی ٹیم اس ہزار پا یہ اوکٹوپس (OCTOPUS) سے ایک جذباتی
رشتے میں منسلک ہوتی ہے، خوشی، غم، غصہ اور ہیجان ــــ ان سب میں یہ دونوں ایک ساتھ شرکت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی تلافی قرار پاتے
ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کوئی بھی "تماشائی" نہیں۔ دونوں مبتلائے عشق ہیں۔

دوسری طرف بارھواں کھلاڑی ایک مردِ آزاد ہے۔ اُس کی بلا سے اگر ٹیم ہارے یا جیت سے سرفراز ہو۔ اگر ٹیم خدانخواستہ جیت گئی تو اس
کے گلے میں کوئی ہار پہنانے نہیں آئے گا اور اگر ٹیم ہار گئی تو کوئی اس سے باز پرس نہیں کرے گا۔ اُسے دیکھ کر "شیم شیم" کے نعرے نہیں لگائے
گا اور اس پر سنگترے کے چھلکے نہیں پھینکے گا۔ یہ شخص ٹیم کی فتح و شکست ہی سے بے نیاز نہیں بلکہ اپنی کارکردگی کے بارے میں بھی کسی خوش فہمی
کا شکار نہیں۔ اُسے معلوم ہے کہ کوئی سرپھرا اُسے "مین آف دی میچ" کا اعزاز نہیں دے گا اور کوئی اخبار اس کی صحت یا علالت کے بارے میں
اپنے قارئین کو مطلع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا۔ بارھواں کھلاڑی راہ و رسمِ عاشقی کے ان جملہ نازک مقامات سے قطعاً محفوظ ہے۔ وہ
میچ کے پانچوں دن اپنی نیند سوتا اور اپنی نیند جاگتا ہے۔ خوش خوراکی کے معاملے میں بھی اُسے کسی احتیاط کی ضرورت نہیں۔ کپتان کی تعریف

یا سرزنش سے بھی اُسے سروکار نہیں۔ غرضیکہ بارھواں کھلاڑی کہلانے کے باوجود اپنی ٹیم کی تمام تر ذمہ داریوں سے سبکدوش اور اس کی تمام تر دھڑکنوں سے بے نیاز ہے۔ یہی تماشائی کا اصل منصب بھی ہے کہ وہ تماشہ میں شریک ہونے کے باوجود تماشہ سے الگ بھی رہے!

بارھویں کھلاڑی کی لوحِ دل ہر قسم کے نقش اور نام سے بھی محفوظ ہے۔ وہ کمال بے نیازی سے اُن خوش وضع کھلاڑیوں کو دیکھتا ہے جو نازک سی بیاضوں پر کلکِ گوہریں کا جادو جگاتے ہیں اور جن کے خود نوشت دستخطوں پر مچلتی ہوئی اُن کی مسکراہٹ لمحہ بہ لمحہ دکھیں گراتی چلی جاتی ہے۔

بارھویں کھلاڑی کو اپنی آنکھوں کے سامنے شب و روز ہونے والے اس بے ہودہ ناٹک سے کوئی سروکار نہیں۔ بعض اوقات تو وہ اس ساری کارگزاری کو بھی میچ ہی کا حصّہ سمجھتا ہے۔ اور پھر اس کی طرف سے منہ موڑ کر دوبارہ مونگ پھلی کھانے لگتا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ بیاض پر دستخط کا حصول تو محض ایک بہانہ ہے۔ اس کے پیچھے وہی کاروباری تجسس ہوتا ہے جو میچ دیکھنے کو میچ میکنگ کے لئے ایک زینہ بنانے کا متمنی ہے اور وہی جبلت کارفرما ہے جو بقائے بہترین کے لئے موزوں انتخاب کو ناگزیر قرار دیتی ہے۔ اُسے محسوس ہوتا ہے کہ شکاری خود شکار ہو رہا ہے۔ بے چارہ شکاری!

بارھواں کھلاڑی اصلاً ایک صوفی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ دُنیائے رنگ و بُو، یہ ہر لحظہ صورت بدلتا ہوا جنون، یہ شادیانے، پٹاخے، چیخیں اور قہقہے یہ سب کچھ بے معنی ہے۔ یہ کرکٹ کے میدان میں بنائی جانے والی اور بعد ازاں نامۂ اعمال میں لکھی جانے والی وکٹیں، کیچ اور سنچریاں محض ایک فریبِ نظر ہے۔ کھیلنے والوں کے علاوہ دیکھنے والوں کو بھی اس بات کا پُوری طرح احساس نہیں کہ پانچ روز پر پھیلی ہوئی مہابھارت کی یہ جنگ ایک بے نتیجہ بیکار ہے۔ اس میں نہ کسی کا کچھ بگڑتا ہے اور نہ کسی کو کچھ حاصل ہوتا ہے۔ اگر کچھ حاصل ہوتا ہے تو فقط سانس رُکنے کا وہ لمحہ جب آسمان سے اُترتا ہوا سنہری گیند کھلاڑی کے دست بردعا ہاتھوں کی طرف آتا ہے اور پھر جیسے ہوا میں معلق سا ہو کر رہ جاتا ہے اور دیکھنے والوں کے دل چند لمحوں کے لئے دھڑکنا بھول جاتے ہیں۔ مگر بارھواں کھلاڑی کوئی تارک الدنیا نہیں اور نہ اُسے رہبانیت کا مبلغ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ اُس شخص کی طرح نہیں جو اپنے گھر بار کو خدا پہ چھوڑ کر کسی درخت کے نیچے دھونی رما کر اپنے تئیں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اُس نے دُنیا کو ترک کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ دُنیا کو ترک کر بھی دے تو دُنیا اُسے ترک نہیں کرتی۔ دُنیا کا سب سے بڑا ایجنٹ یعنی جسم، خواہشات کے ہتھیاروں سے لیس اُس پر ہر وقت پیرِ تسمہ پا کی طرح سوار ہے۔ وہ چند دنوں یا مہینوں اس پیرِ تسمہ پا کو چکمہ دینے میں کامیاب ہو بھی جائے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ آخر آخر میں اُس پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ اِس بارھویں کھلاڑی سے جان چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسی لئے ایک سچا صوفی کبھی ترکِ دنیا کا منصوبہ نہیں بناتا۔ وہ ترکِ دُنیا کے عمل کو نفرت کی نظروں سے دیکھتا ہے اور اُسے احساسِ شکست پر منتج قرار دیتا ہے۔ سچا صوفی تو بیچ منجدھار ایک لائٹ ہاؤس کی طرح بالکل شانت کھڑا رہتا ہے یعنی ہیم موج سے آشنا تو ہوتا ہے مگر موج کو نوکِ پا سے ٹکراتے ہیں لذت بھی محسوس کرتا ہے۔ بس یہی اصل بات ہے کہ آپ انبوہ میں رہتے ہوئے بھی اکیلے ہوں مطلب یہ کہ آپ ایک سچے تماشائی کے منصب کو اپنائیں جو تماشے کو کبھی زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں بناتا بلکہ ہمیشہ اسے ذرا فاصلے ہی سے دیکھتا ہے۔

بارھواں کھلاڑی ایک ایسا ہی سچا صوفی ہے۔ وہ بیک وقت اپنی ٹیم سے منسلک بھی ہے اور جُدا بھی۔ وہ میدان میں پہلی کے چاند کی طرح آتا ہے جو دوسرے ہی لمحے رخصت بھی ہو جاتا ہے۔ وہ کرکٹ کے کھیل کا نباض، منتظم، کارکن اور جاسوس ہونے کے باوجود اپنے دامن کو تر نہیں ہونے دیتا۔ ہونٹوں پر ایک عارفانہ مسکراہٹ سجائے وہ قلبِ مطمئنہ کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ متسلسل کی طرح سرپٹ دوڑنے کا قائل نہیں بلکہ مردِ میداں کی طرح مسلسل حرکت کے باوجود ٹھہراؤ کے ایک مستقل عالم میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ میچ کو دیکھتا ہے، اونگھتا ہے اور خوش رہتا ہے۔

میں نے ٹیلی وژن کی طرف نظریں اُٹھائیں جہاں ایک ہی لمحہ پیشتر ہماری ٹیم کے ایک خوش شکل کھلاڑی سے تیسری بار کیچ چھُوٹا تھا اور پھر مجمع

کی طرف دیکھا جیسے گویا سانپ سونگھ گیا تھا اور تب اپنے دوست پر ایک نظر ڈالی جس کا چہرہ ہلدی ہو گیا تھا۔ میں مسکرایا۔ وہی عارفانہ مسکراہٹ جو صدی کا واحد اثاثہ ہے اور پھر میں نے چھکے سے بارھویں کھلاڑی کی سفید براق "مُرف" سے دھوئی ہوئی وردی پہنی اور بڑے اطمینان سے پلنگ پر دراز ہو کر مونگ پھلی کھانے لگا۔

انشائیہ کی تاریخ و تنقید پر پہلی مبسوط کتاب

انشائیہ اُردو ادب میں

چند آرا ——

"اُردو تنقیدی ادب میں انور سدید کی کتاب —— "انشائیہ اُردو ادب میں" ایک وقیع اضافہ ہے۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ

"یہ کتاب مرعوب کن حد تک انور سدید کے تحقیقی مزاج اور تنقیدی بصیرت کی مظہر اور محنتِ شاقہ کا ثبوت ہے۔"

ڈاکٹر معین الدین عقیل — کراچی یونیورسٹی

"یہ کتاب اپنے موضوع پر نہ صرف پہلی سنجیدہ، وقیع اور جامع تصنیف کا درجہ حاصل کرے گی بلکہ نئے انشائیہ نگاروں کی فکری رہنمائی کے لیے منارۂ نور بھی ثابت ہوگی۔"

ڈاکٹر انور محمود خالد

"حقیقت یہ ہے کہ اُردو میں انشائیہ کی یہ پہلی ذمہ دارانہ تنقید ہے ——"

ریاض احمد ریاض

قیمت چالیس روپے

ناشرین —— مکتبہ فکر و خیال ۔ ۲-۱۷ ستلج بلاک، اقبال ٹاؤن لاہور

ملنے کا پتہ —— فیروز سنز مال روڈ لاہور — مکتبہ عالیہ اُردو بازار لاہور — مکتبہ اسلوب پوسٹ بکس ۲۱۱۹ کراچی

آئینہ ادب، چوک انار کلی لاہور — کاروان بک سنٹر ملتان صدر — مکتبہ "ہم زبان" پوسٹ بکس ۱۱۵۳۳ کراچی ۵

بارھواں کھلاڑی — تجزیاتی مطالعہ

ابرار احمد

'بارھواں کھلاڑی' کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے وہ کرکٹ میچ یاد آگیا جب ایک نامور بلّے باز کا کیچ سلپ میں کھڑے ہوئے ایک فیلڈر نے پکڑ لیا بلّے باز نے اعتراض کیا کہ یہ کھلاڑی ایسا کرنے کا مجاز نہیں۔ ایمپائروں نے اس کیچ کو اس لیے مسترد کر دیا کہ گیند جس شخص کے ہاتھوں میں گئی وہ بارھواں کھلاڑی تھا۔

کرکٹ کا کھیل ہو، یا کوئی اور تماشہ۔ عمومی طور پر ایسے مقابلوں کی معنویت نہ صرف مشکوک ہوتی ہے۔ بلکہ ان کا وجود بھی ایک بے جواز مصروفیت دکھائی دیتا ہے، اور ایک CONSCIOUS فرد کو اس سچائی کا ادراک بھی ہوتا ہے اور دُکھ بھی — اور ہر ایسا فرد کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی اپنے آپ کو بارھواں کھلاڑی محسوس کرتا ہے، جس کے ہاتھوں میں کچھ نہیں ہوتا اور اس کے باوجود جھولیاں بھر بھر داد وصول کرنے والوں کے لیے فرشِ راہ بن کر زندگی کرتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ ہزارہا افراد کی مکمل جذباتی وابستگی کیوں کسی دوسرے فرد کو اپنے ساتھ شامل کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ کوئی بھی شخص، کسی بھی موڑ پر اکیلا رہ سکتا ہے، اکیلا رہ جاتا ہے اور اُسے پھر بھی ایسی تنہائی نصیب نہیں ہوتی جس میں کوئی گروہ، پان زدہ مسکراہٹ اُس کے صوفیانہ عجز کا امتحان نہ لیتی رہے۔

ہمارے معاشرے میں، جو کہ ایک مجموعۂ اضداد ہے، افراد کے رویّوں میں ابہام اور بے معنی تناؤ کی کیفیت پائی جاتی ہے، جو اُن کی اپنی زندگیوں کے اُلجھاؤ اور بے سمتی کی پیداوار ہے۔ اس غیر واضح صورتِ حال میں مبتلا افراد جب ایک جمِ غفیر کی صورت کسی اجتماعی عمل میں شریک ہوتے ہیں تو ان کی حرکات بعض اوقات کتنی عجیب اور مضحکہ خیز ہو جاتی ہیں۔ خاص طور پر ایسے فرد کے لیے جو اس تماشے سے علیحدہ، اس زاویے سے ایسے حقائق کشید کر رہا ہوتا ہے جو اس میں شریک افراد کو دکھائی نہیں دیتے۔ فرد کی علیحدگی اور تنہائی جسے معاشرے کی PRIME MOVE سے عاق کر دیا گیا ہو۔ اور پھر مجموعی تناظر میں اس کے غیر مؤثر ہونے کا احساس، اس انشائیہ میں نہایت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

کسی موضوع کی شناخت اس کے ظاہری معانی میں نہیں مصنّف کے نقطۂ نظر سے ہوتی ہے۔ اور اس نقطۂ نظر کی شناخت اس کے اسلوب کو سمجھے بغیر ممکن نہیں۔ وزیر آغا نے لفظیات کے انتخاب میں شاعرانہ رعایت کے ساتھ ساتھ یہ جو جا بجا پھبتی سے کام لیا ہے، اسے خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ آغاز ہی میں جب اپنے دوست کی طرف سے، اُسے کرکٹ ٹیم میں شمولیت کی پیش کش ہوتی ہے تو وہ اُسے ایک غلیظ سوال کہہ کر رد کر دیتا ہے۔ اُس نے اسے لایعنی، یا مضحکہ خیز کیوں نہ کہا اور خصوصیت کے ساتھ غلیظ کا لفظ کیوں استعمال کیا۔ یہی وہ رویّہ ہے، جو ہمیں اس کائنات میں آدمی کی سماجیاتی اُچھل کود کی مضحکہ خیزی تک پہنچنے میں مدد دے سکتا ہے۔ اس سے آگے اس طرح کے لفظوں کی زنجیر ہے۔ بلّے باز ایک بد دماغ آدمی ہے۔ گیند بدنما ہے۔ اور زیادہ یہ کہ گیارہ کے گیارہ کھلاڑی مشقتی ہیں!

ایک کھیل ہے جس میں درجہ بندی ہے۔ افراد کا کردار ہے۔ کپتان ہے۔ باؤلر اور بلّے باز ہے۔ پھر تماشائیوں کا انبوہ ہے جو عملی طور پر عدم

شرکت کے باوجود اس کھیل سے اپنے اپنے حساب و مقام سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ لیکن کوئی ایسا بھی ہے جس کے لیے یہ سب کچھ "بازیچۂ اطفال" ہے۔ اور وہ اسے ایک سچے تماشائی کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ اور یہ بارہواں کھلاڑی۔ مرد مجاہد۔ کھلاڑیوں کی گیلری میں براجمان ہے۔ گویا کھیل میں شامل ہونے سے بہتر یہ ہے کہ یونیفام اوڑھ۔ بستر پر دراز ہوکر مونگ پھلی کھائی جائے۔

بارہواں کھلاڑی، اشیا میں معانی کی تلاش کا عادی ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ ایسے کھیلوں میں نہ جیت ہے، نہ ہار۔ اور اگر کہیں ہے بھی تو غیر حقیقی اور بے معنی۔ کوئی بھی اس قسم کی مصروفیت، اُسے اپنے اندر جذب نہیں کرسکتی۔ اور یہ علیحدگی، اُسے ایسا شاندار عرفان ذات عطا کرتی ہے کہ وہ اداس مگر آسودہ حال شخص کی صورت، اپنی انفرادیت کو محفوظ اور بامعنی بنا دیتا ہے۔ بات "بازیچۂ اطفال" سے نکل کر۔ "ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!" تک پہنچ جاتی ہے۔

کسی بھی ہنگامی لیکن لایعنی اور بے سمت عمل میں، فرد دو طرح سے مزاحمت کرتا ہے۔ ایک پُر شعور اور غیظ و غضب سے بھرپور احتجاج کی شکل میں۔ اور دوسرے ایک صوفیانہ خاموشی اور علیحدگی۔ وزیر آغا نے مزاحمت کا دوسرا انداز اختیار کیا ہے۔ بات کرکٹ کے میدان سے نکل کر ہمارے پورے موجود کا احاطہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔

بارہواں کھلاڑی میں ایک شگفتگی کا احساس ملتا ہے جس کی خوشبو بیک وقت دل کو بھانے والی اور تکلیف دہ ہے۔ مجموعی فضا، اُداسی کی فضا ہے، دل پر اوس کی صورت گرتی ہوئی اُداسی جس میں سے فہم و ادراک کی رنگت اُبھرتی دکھائی دیتی ہے۔

مجید امجد کی نظم "آٹوگراف" بھی اس انشائیہ کے مطالعے کے دوران یاد آتی ہے لیکن ایک فرق کے ساتھ کہ اس میں ایک اور طرح کی اداسی، تنہائی اور احساس محرومی ہے اور یہاں وزیر آغا کے الفاظ میں۔

"بارہویں کھلاڑی کو اپنی آنکھوں کے سامنے شب و روز ہونے والے اس بے ہودہ ناٹک سے کوئی سروکار نہیں۔"

وہ اس ناٹک سے اُکتایا ہوا ہے اور تنگ آچکا ہے۔ لیکن اس اُکتاہٹ سے اس نے ایک ایسی آسودگی کشید کی ہے جو اُسے اپنے حال میں مست اور اپنی ذات میں خوش رکھ سکتی ہے۔

ناسمجھ کا عمل، جو ہمارے اردگرد ہمیشہ جاری و ساری رہتا ہے اور وہ معاشرتی تضاد جو اس عادت سے جنم لیتا ہے، وزیر آغا نے کھلاڑیوں کی کارکردگی کے حوالے سے اُسے ابھارا ہے۔ دراصل کھیل اور کھلاڑی ایک ایسا وسیع استعارہ ہے جس کے ذریعے انشائیہ نگار نے ایک پورے قبیلے کو علیحدہ کرکے تماشائیوں کے ہجوم میں سے ایک سچے تماشائی کو اس کے مد مقابل آئینہ دکھانے کے کام پر مامور کردیا ہے۔ جو بذات خود ایک فرد نہیں، ایک جدا شناخت اور حیثیت والے اجتماع کا حصہ ہے۔ ان کا تخلیق کردہ "بارہواں کھلاڑی" اس منصب پر پورا اترتا ہے۔ کہ وہ خود صلاحیتوں سے مالا مال ہے، کسی بھی کھلاڑی سے بہتر کارکردگی کا اہل اور اس کے باوجود کھیل میں شریک نہیں ہوتا۔ کہ وہ اس قسم کی مصروفیات کی اصل کا ادراک رکھتا ہے اور ان کی بے معنویت کی وجہ سے ان سے رابطہ استوار رکھنے سے احتراز کرتا ہے۔

مونتین اپنے انشائیوں میں آدمی کی فردیت میں غم کو تلاش کرتا ہے، وزیر آغا بھی فرد کے غم کو بیان کرتے ہیں، لیکن یہ فرد اور، اس کا غم، تنہا نہیں بلکہ افراد کا ایک قبیلہ ہے جو اپنی علیحدگی میں ایک جدا نقطۂ نظر رکھتے ہوئے، اپنے اس غم کی تنظیم کرتا ہے۔ معاشرے میں اپنے کردار کا تعین الگ طریق سے کرتا اور اپنے ڈھنگ سے زندگی گزارتا ہے ______ وزیر آغا کے مخصوص انداز تحریر کی خوبصورتی سے مزین یہ انشائیہ اُن کی فن انشائیہ پر کامل دسترس کا احساس دلاتا ہے اور یہ بھی کہ اظہار کا سلیقہ آسانی سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ نئے انشائیہ نگار "بارہواں کھلاڑی" کو ایک نہایت عمدہ اور اعلیٰ مثال کے طور پر سامنے رکھ سکتے ہیں۔

اُردو انشائیے کا مارکوپولو

جمیل ملک

اُردو انشائیہ لڑکپن اور بلوغت کی منزلیں طے کرتے کرتے اب پختگیٔ عمر کے مدار میں داخل ہو چکا ہے۔ جمیل آذر نے انشائیے سے اپنی دوستی کا آغاز اس وقت کیا تھا جب وہ عمر کے ساتھ ساتھ ذہنی بلوغت کے دَور میں بھی قدم رکھ چکا تھا۔ مگر ابھی لڑکپن کی معصوم اور سہانی یادیں اور نرم و ملائم خواب بھاگتے ہوئے اُس کے تعاقب میں آرہے تھے۔ چنانچہ اُس نے بڑی کشادہ دلی کے ساتھ عہدِ طفولیت کے اِن خوابوں اور سرابوں کو اپنی طبعی اور فکری بلوغت اور بلاغت کا حصّہ بنا لیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس نے ادب کی ایک ایسی صنف کا انتخاب کیا جس میں لڑکپن اور جوانی ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر انتہائی قربت اور محبت کے ساتھ ہنستے مسکراتے ہوئے پختگیٔ عمر اور پھر انتہائے زندگی کا سفر طے کرتے چلے جاتے ہیں مگر تھکتے نہیں اور تا دمِ آخر اپنی شگفتگی اور شادابی کو زندہ و برقرار رکھتے ہیں۔ میری مُراد انشائیے کی صنفِ ادب سے ہے جو بظاہر ایک صنفِ نثر ہے مگر اپنے باطن میں خیرِ کثیر کے خزانے چھپائے پھرتی ہے اور پھر ایک معصوم و دلآویز، بلیغ و لطیف مُسکراہٹ کے یہ خزانے اِس طرح بانٹی جاتی ہے، جیسے کوئی خود مست اور خدا مست درویش دریائے زندگی کے کنارے چلتا ہوا، نیکیاں بھی کرتا جاتا ہے اور انہیں نہایت سکون و طمانیت سے دریا میں بھی ڈالتا چلا جاتا ہے۔ جمیل آذر بھی مجھے ایک ایسا ہی درویش نظر آتا ہے، سنجیدہ اور باذوق، جس کے لبوں پر قہقہہ بھی آجائے تو وہ اُس کی مہذب سنجیدگی کی دیواروں سے ٹکرا کر بے شمار مُسکراہٹوں کے ریزوں میں بکھر بکھر جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے اندر ایک شائستہ اور نفیس فنکار چھپا ہوا ہے جو اُس کی شخصیت کو ہر لحظہ قہقہوں کے چھچھورپن سے اِس طرح بچا بچا کر رکھتا ہے کہ اِس فنکار کی رفاقت میں اُس کی ذات اُس کے انشائیوں میں آپ ہی آپ استحکام و سلامتی کی منزلیں طے کرتی چلی جاتی ہے۔ اُس نے شاخِ زیتون کے آخری انشائیے کے آخری فقرے میں اپنے آپ سے ایک سوال کیا ہے۔

— "تو کیا میں اپنی ذات کے سفینے کو طوفانوں اور تھپیڑوں سے بچانے کے لیے لکھتا ہوں ؟"۔ جمیل آذر نے اپنے جس بنیادی سوال کو اپنی کتاب کا نقطۂ آخر بنایا ہے میرے خیال میں یہ استفہامیہ کلمہ اُس کے فن کا نقطۂ آغاز ہے اور وہ اپنے فن کے لڑکپن اور بلوغت کے باہمی ملاپ اور ہم آہنگی ہی کے زمانے سے اِس سوال کی اُنگلی تھامے ہوئے پختگیٔ عمر اور پختگیٔ فن کی موجودہ منزل تک پہنچا ہے۔ اور پھر اپنے اِس سارے فنّی و فکری سفر میں وہ اپنی عمر کے مختلف ادوار ہی کو نہیں بلکہ انسانی تاریخ و تہذیب کے مختلف ادوار کو بھی اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلا ہے۔ مارکوپولو یوں تو جمیل آذر کا ایک انشائیہ ہے مگر درحقیقت یہ جمیل آذر کی تہہ در تہہ ذات میں چھپا ہوا وہ فنکار ہے جو درونِ ذات اُس کی شخصیت کے کوہِ بے ستون کو تیشۂ فن سے کھود کھود کر بالآخر بیرونِ ذات دودھ کی ایک شیریں نہر بہانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ فرہاد کی طرح اس کا قصّہ تمام اِس لیے نہیں ہوتا کہ انشائیے کا فنِ لطیف و بلیغ اُس کے تیشے کی ہر ضرب کو قلم کی ہر ضرب سے ہم آہنگ کر کے اُس کے المیے میں طربیے کا اِس طرح پیوند لگاتا جاتا ہے کہ ایک "طربیہ المیہ" تو وجود میں آجاتا ہے مگر اُس کا فن قسمتِ فرہاد کی طرح المیے کا شکار ہو کر نہیں رہ جاتا۔ اور جب وہ یوں کہتا ہے تو دراصل اپنے اندر کے چھپے ہوئے فنکار یا مارکوپولو ہی سے ہمکلام ہوتا ہے :-

"دراصل مارکوپولو ایسا پُراسرار تحقیق پسند شخص ہے جو دبے پاؤں آپ کے صحنِ گلستان میں داخل ہوتا ہے اور نہایت شفقت کے ساتھ آپ

کے بائیں ہاتھ میں سُرخ گلاب کا پھول اور دائیں ہاتھ میں قلم تھما دیتا ہے اور پھر سرگوشی کے انداز میں آپ کو شوقِ آوارگی کے ساتھ مشاہدۂ فطرت کی حسین ترغیب دیتا ہے آپ کے اندر ایکسپلوریشن کی روح بیدار کر دیتا ہے اور پھر آپ بے اختیار ہو کر اُس کی اُنگلی پکڑ کر گھر سے باہر نکل پڑتے ہیں۔"

جمیل آذر کے انشائیوں کا یہ شوقِ آوارگی اُس کی فنکارانہ ذات سے نکل کر اُس کے باہر پھیلی ہوئی وسیع کائنات تک پھیلتا چلا جاتا ہے۔"مارکو پولو" "نام کے بغیر"، "بھولے بسرے نغمے"، "کچھ لکھنے کے بارے میں" ایسے انشائیے ہیں جن میں اس کی ذات کا انسانی سفر، تخلیقِ کائنات سے بھی پہلے لوحِ محفوظ سے شروع ہو کر انسان کی ہر لحظہ نیم پلیٹ کی رنگا رنگ شکلوں میں ظاہر ہو کر بالآخر لوحِ محفوظ کی نقل بمطابق اصل کی طرح ہمیشہ کے لیے اس کے اندر کے فنکار کی قبر کا کتبہ بن کر اُس کے فن کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں نام ایک بے جان کتبے کو ماورائیت سے ہم آہنگ کر کے اسے ابدیت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں کسی غالب، اقبال، شیکسپیئر اور گوئٹے کا کلام اُن کے نام کے بغیر بھی ابدیت کا وہ مقام حاصل کر لیتا ہے جس کا ذائقہ نام و مرتبے سے الگ اپنی ایک لازوال اجتماعی اور انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ فن اب فنکار کا بھی محتاج نہیں رہتا بلکہ کائنات کے رگ و ریشے میں خونِ گرم کی طرح اس طرح جاری و ساری رہتا ہے کہ ماضی، حال اور مستقبل سارے زمانے کمالِ فن کی انتہا پر ہم آہنگ و مربوط ہو کر بھولے بسرے نغموں کی طرح انسان کی نظروں کے سامنے اُس کی انفرادی اور اجتماعی تاریخ کے پردے اٹھاتے چلے جاتے ہیں کہ انفرادیت اجتماعیت میں گھل مل کر کہیں اقبال کو مسجدِ قرطبہ کی فضا سے ہم آہنگ کر دیتی ہے اور کہیں شاہ حسین کی ہیر رانجھے کا ورد کرتے کرتے یوں کہنے لگتی ہے ؎

رانجھا رانجھا کر دی نیں مَیں آپے رانجھا ہوئی

یوں جمیل آذر انسانی ذات کا تخلیقی خواب انفرادی و اجتماعی رنگوں کی ہم رنگی میں دیکھتا ہوا اپنی شخصیت میں چھپے ہوئے مارکو پولو یا فنکار کا رُخ حُسنِ فطرت کے اُس بسیط تناظر کی طرف بھی موڑ دیتا ہے جہاں لڑکپن سے پختگیٔ عمر تک اُس کے فکر و فن نے قدم قدم چلنا سیکھ کر، اور جست بھرنے تک کے عمل سے گزر کر اپنی ذات کے حوالے سے کائنات کے خال و خد ابھارنے کا سلیقہ سیکھا تھا۔ "منی پلانٹ"، "پکنک" اور "مچھلی کا شکار" جمیل آذر کے وہ انشائیے ہیں جن میں انسان اپنے ہونے نہ ہونے کی کشمکش سے گزر کر انسانی پیکر میں اُبھر آنے اور اپنے وجود کی اکائی کو مستحکم کر لینے کے باوجود تخلیقِ فن کے ماورائی لمحوں میں دنیاوی زندگی کی قید و بند کی دیواریں پھلانگ آن کی آن میں پھر اسی آغوشِ فطرت میں جا پہنچتا ہے جہاں سے اُس کی اوّلین نمود ہوئی تھی۔ یوں پکنک انسان کی ابتدائی زندگی کی طرف مراجعت کرنے کا وہ استعارہ بن جاتی ہے جب انسان مصنوعی زندگی کے داغدار لبادے اُتار کر آغوشِ فطرت کی طرف رجوع کرتا ہے تو کبھی کسی پیڑ کے نیچے تپسیا کرتے کرتے مہاتما بُدھ کی طرح نروان کی روشنی سے ہمکنار ہو جاتا ہے اور کبھی موسیٰؑ کی طرح کوہِ طُور پر جلوۂ نور کی چکا چوند سے اپنا سینہ روحانی روشنی سے بھر لیتا ہے۔ منی پلانٹ میں پیڑ، عورت یا دھرتی ماں کی زرخیزی کا ایسا استعارہ بن کر اُبھرتی ہے جو اُن کی تخلیقی علامت بھی ہے اور ہمارے زرعی معاشرے کی شناخت کا اوّلین حوالہ بھی۔ عورت اور منی پلانٹ کا یہ ربطِ باہم تلاش کر کے جمیل آذر زندگی کی آتی جاتی ہوئی بہاروں کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے خوشبو کا سفر، بہار ہو یا خزاں ہر موسم میں جاری رہتا ہے اور کہیں بھی قیام نہیں کرتا۔ مچھلی کے شکار میں منی پلانٹ کے برعکس جمیل آذر تھامس ہارڈی کی طرح صورتِ واقعہ کے ایسے وطیرے کے سنگم پر پانی کی گہرائیوں سے سنہری چانس کی مچھلیاں پکڑنے کی کوشش میں گرفتار نظر آتا ہے۔ انسان کی زندگی میں کوئی سنہری موقع یا چانس اُس کی جھولی کو گوہرِ مُراد سے بھی بھر سکتا ہے اور اُس کو کنگال بھی کر سکتا ہے۔ کامیابی یا ناکامی کا انحصار سارا سارا دن، ساری ساری عمر ان سنہری مچھلیوں کے ہاتھ میں آنے یا کانٹے سے نکل جانے پر ہے اور یہی انسان کے ہونے نہ ہونے کا قضیہ بھی ہے کہ ایک ثانیے سے پہلے مچھلی پانی میں ہوتی ہے تو زندگی کی علامت بن جاتی ہے اور ایک منٹ بعد مچھلی پانی سے باہر آ جائے تو موت کی علامت بن کر اُبھر آتی ہے۔ مگر جمیل آذر کا فنکارانہ دل تو اتنا

نرم و گداز ہے کہ وہ سنہری چانس کی خوبصورت مچھلیاں پکڑ کر بھی زیادہ دیر اُن کے تڑپنے کا تماشا نہیں دیکھ سکتا اور دوسرے ہی لمحہ ان کی آخری ہچکی سے پہلے ہی انہیں زندگی کے بے پایاں سمندر میں رقصاں و خنداں دیکھنے کے لیے واپس بھیج دیتا ہے۔ یوں وہ ایسے فنکار کے رُوپ میں سامنے آتا ہے جسے امن محبت سے پیار ہے اور جو مچھلیوں کی طرح انسان کو بھی خنداں و جولاں دیکھنا چاہتا ہے۔ جمیل آذر کے فن کا یہ رُخ اُس کے انشائیوں کا مرکزی اور روشن نکتہ ہے جس کی جوت کسی نہ کسی زاویے سے اُس کے تمام انشائیوں پر پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور بعض انشائیوں میں لطافت سے گھمبیرتا کی طرف سفر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور بعض انشائیوں میں گھمبیرتا سے لطافت کی طرف اُس کا فکری و فنی محور گھوم جاتا ہے۔ اخبار پڑھنا، تمباکو نوشی، مانگے کی سگرٹ اور کچھ فیشن پر، جیسے انشائیوں میں وہ آسانی سے مشکل کی طرف سفر کرتا ہے اور پھر اس ــــــــ مشکل کو بھی آسان بنا دیتا ہے۔ واشنگ مشین، شاخِ زیتون، جنگ کرنا، بھوک ہڑتال، اور سنہری شاخ، میں اس کا رُخ مشکل سے آسان کی طرف ہے۔ مگر یہ آسانی نتیجہ خیز ہوتے ہوئے بھی انسان کے سامنے ابھی تک وہ سوال بنی ہوئی ہے جس کا جواب اُس کو اپنی تمام تر تہذیبی ترقی اور ارتقائی نشو و نما کے باوجود نہیں مل سکا۔ اب دیکھئے "اخبار پڑھنا" مصنف کے نزدیک ثقافتی غواصی کی علامت ہے تو کتاب پڑھنا ورق ورق پر کسی نئی نویلی دلہن کا گھونگھٹ اٹھانے کے مماثل ہے۔ ثقافتی غواصی کوئی سہل کام نہیں مگر جمیل آذر کا کمال یہ ہے کہ وہ ثقافتی غواصی کا عمل چائے کی پیالی میں ڈبکی لگا کر ہی طے کر لیتا ہے۔ اُدھر نئی نویلی دلہن کا گھونگھٹ سرکانا بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے مگر کتاب کو ورق ورق پڑھ کر ختم کرنے اور دلہن کا گھونگھٹ اٹھانے تک ہزار پاپڑ بیلنے اور جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اسی طرح فیشن بظاہر انسان کی خواہشات کے اظہار کا نام ہے جو اُس کی زندگی میں رنگ بھرتا ہے مگر فیشن کا یہ چھکتا بولتا ہوا لہو ایک نظریۂ حیات اور اسلوبِ زندگی بننے تک ایک لمبا سفر طے کرتا ہے مگر جب کوئی فیشن ہمارے گلے کا ہار ہو جاتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ہمارے لیے اور ہم اس کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ اسی طرح "مانگے کی سگرٹ" جنت اور دوزخ کے درمیان ایک بفر سٹیٹ کے مماثل ہے مگر مانگے کا سگریٹ ہو یا مانگے کی سگریٹ کی طرح غیر ملکی خرمنوں پر انحصار کا معاملہ ہو اگر اس کی سطح سگریٹ کی طرح انفرادی ہے تو یہ صرف سر درد اور متلی ہی پیدا کرے گا اور اگر اس کی سطح بیرونی امداد کی طرح قومی اور اجتماعی ہے تو یہ قومی ضعف اور لاغری کی علامت بن کر اُبھر آتا ہے۔ اسی طرح حقہ ایک طبقاتی معاشرے میں تھرڈ کلاس، سگرٹ سیکنڈ کلاس اور پائپ فسٹ کلاس یا جدید ثقافت و آمریت کی علامت بن کر سامنے آتا ہے مگر سگریٹ درمیانے طبقے اور دانشور حلقے کا وہ اشاریہ ہے جو اس افراط و تفریط کے عمل میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرتا ہے۔ عرفِ عام میں انشائیہ نگاروں سے سادہ اور سہل موضوعات پر لکھنے کی توقع کی جاتی ہے جمیل آذر کا رویّہ بھی مختلف نہیں ہے مگر وہ آسان اور عام فہم موضوعات سے اتنے تہہ دار اور بلیغ نتائج اخذ کرتا چلا جاتا ہے کہ قاری کو ان موضوعات کی سنگینی و سنگلاخی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ مگر بعض اوقات وہ ایسے موضوعات پر بھی قلم اٹھاتا ہے جو بظاہر انشائیہ نگاری کے موضوعات نظر نہیں آتے مگر اُس کی دسترسِ فن میں آ کر ان دقیق مسائل کی گرہیں آپ ہی کھلتی چلی جاتی ہیں۔ اب دیکھئے جمیل آذر سماجی انقلابی عمل کی بات کرنا چاہتا ہے۔ قاری کو اس عمل کے مختلف مراحل سے ہو کر گزارنا چاہتا ہے۔ کام مشکل ہے مگر اس مشکل کام کو سہل بنانے کے لیے اُس نے معاشرتی گلی ہی میں واشنگ مشین کا وہ استعارہ چن لیا ہے جو انسان کے ظاہر و باطن، داخل و خارج کی علامتی توسیع کرتے کرتے گھر سے باہر تک پورے معاشرے کے سماجی انقلابی عمل پر محیط ہوتا چلا جاتا ہے۔ "بھوک ہڑتال" انشائیے کے لیے ایک بظاہر ثقیل عنوان ہے مگر بھوک ہڑتال کو مصنف نے انفرادی و اجتماعی سطح پر انسان کے تخلیقی ابال اور زندہ اور پُر وقار قوموں کی عزتِ نفس اور خودی کے اظہار سے مماثل قرار دے کر اسے خارج سے داخل اور داخل سے خارج تک گردش میں رہنے والے ایک ایسے کائناتی دائرے سے منسلک کر دیا ہے کہ "بھوک ہڑتال" انسان کی صدیوں کی تہذیبی اور سماجی اور طبعی بھوک کا علاجِ شافی بن کر اُبھر آتی ہے۔ اسی طرح جنگ کرنے کا عمل جب بھوک، بیماری اور محکومیت کے خلاف ہو تو یہ زندگی کے بنیادی محرک یعنی تضاد اتی تصادم کا مظہر بن جاتا ہے جس کی کوکھ سے امن و آشتی کی کلیاں پھوٹتی ہیں مگر یہی جنگ جب جارحیت میں بدل جائے تو پھر کوئی برٹرنڈرسل امن کا مبلغ

ہوتے ہوئے بھی امن کے تحفظ کے لیے جنگ کو ناگزیر سمجھتے ہوئے پسِ زنداں جانے سے بھی گریز نہیں کرتا ۔ وہ سنہری شاخ پر بیٹھے ہوئے سونے کے پرندوں کے مقابل جن کے بدن پر اقتدار، دولت، طاقت، شہرت اور ہلاکت کے پَر نکل آتے ہیں، اُگ رہی ہوئی مساموں کے درمیان بھی امن کے نغمے بکھیرنے والی فاختاؤں کو موج در موج، دائرہ در دائرہ مائلِ پرواز کر دیتا ہے۔ شاخِ زیتون جمیل آذر کی کتاب کا نام ہی نہیں بلکہ اس کے نقطۂ نظر، اُس کے انشائیوں کی اُس جہت کا سنگِ میل بھی ہے جو اُس کے فکر و فن کو امن و محبت کے سرور میں ڈوبی ہوئی اُن سرزمینوں کی طرف بھی لے جا رہی ہے جہاں وہ حال کے لمحۂ انتشار سے نکل کر زیتون کے ہر شہر شجر کی زرد بیلی دنیا میں اس طرح سفر کرتا ہے کہ اُس کے شعور و آگہی کی کرنیں اُس کی اجتماعی ذات اور لامتناہی کائنات تک پھیلتی چلی جاتی ہیں تا آنکہ جرسِ کاروانِ زندگی کی صدا اُسے امن و محبت کی اس خوابناک تخلیقی فضا سے بیدار کرتی ہے اُسے کارِ جہاں کی ہمہمی کی طرف واپس بلاتی ہے جہاں وہ پھر اپنی انشائیہ نگاری کی جوت جگا کر اپنے فکر و فن کی ہلکی پھلکی شعاعوں سے گھٹا ٹوپ اندھیروں کا سینہ روشن کرنے لگتا ہے۔

جمیل آذر کی چوکور فنکارانہ شخصیت کے اِس تجزیاتی جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے مارکو پولو نے انشائیے کی مخصوص آب و ہوا میں رہتے ہوئے اپنی ذات کو بنیاد بنا کر کائنات کے اسرار و رموز کی شناخت کر کے اپنی مخصوص شناخت بھی پیدا کر لی ہے۔ جمیل آذر انشائیے کا آغاز غیر رسمی طریقِ کار ہی سے کرتا ہے۔ وہ کسی خطیب کی طرح منبر پر کھڑا ہو کر خطابت کے جوہر بھی نہیں دکھاتا۔ ہلکی پھلکی مسکراہٹوں سے قاری کا استقبال بھی کرتا جاتا ہے۔ قاری کی انگلی پکڑ کر جب اُسے مارکو پولو کا ہمسفر بناتا ہے تو نئی نئی حیرتوں کے دروازے بھی وا کرتا چلا جاتا ہے مگر اُس کے فنِ انشائیہ نگاری کی کلید اُس کے فکری عنصر علامت ہے جو انشائیے کے بڑے دروازے کے اندر سے ہو کر گزرتی اور کھل جا سم سم کہہ کر آنِ واحد میں اُسے کھولتی چلی جاتی ہے۔ فکری عنصر کی یہ کلید بظاہر ہلکی پھلکی مگر درحقیقت ایک بوجھل ہتھیار ہے جو کند ہو جائے یا زنگ آلود ہو جائے تو انشائیے کے دوسرے اہم اوصاف کے تمام دریچے بھی بڑے دروازے کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔ اگر فکری عنصر کی یہ کلید کارگر ہو جائے تو بڑے دروازے کے کھلتے ہی تمام دریچے بھی بیک وقت کھل جاتے ہیں اور چاروں طرف سے روشنی، ہوا اور خوشبو کی لپٹیں انشائیے کے گھر کو آباد کر دیتی ہیں۔ مجھے جمیل آذر کا فن جدید غزل سے مشابہ نظر آتا ہے۔ اُس کے انشائیے کی ہر صفت اپنی جگہ غزل کے شعر کی طرح مکمل بھی ہے اور الگ بھی مگر اُس کے ہاتھ میں فکری عنصر اُس دھاگے کی طرح ہے جو غزل کی مانند اُس کے انشائیے کی ریزہ خیالی کو تلازمۂ خیال کی لڑی میں پرو کر اِسے وحدت فی الکثرت کے جلوے سے ہمکنار اور مربوط کرتا چلا جاتا ہے تا آنکہ وہ نروان کی منزل کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اب دیکھیں جمیل آذر اس مہذب شخص، اس مارکو پولو کو نروان کی سعادت کب نصیب ہوتی ہے!

وزیر آغا کا نیا شعری مجموعہ

"گھاس میں تتلیاں"

(زیرِ طبع)

مکتبہ فکر و خیال، ۱۷۲ ستلج بلاک اقبال ٹاؤن لاہور

جمیل آذر | انشائیہ ـــ انفرادی سوچ کا محرّک

ادب کی ہر صنف زمانے کے تابع ہے اور زمانہ ساکت و جامد نہیں۔ یہ ہر دم رواں پیہم رواں ہے۔ نیرنگیٔ وقت کے ساتھ کوئی صنفِ ادب دم توڑ دیتی ہے اور کوئی عالمِ وجود میں آکر اپنا سکہ بٹھا لیتی ہے۔ جب دورِ شہنشاہیت تھا تو شعرائے کرام دربار تک رسائی حاصل کرنے کے لیے پُر شکوہ قصیدے لکھا کرتے تھے اور اپنے فن کا مظاہرہ کر کے نہ صرف دادِ سخن پاتے بلکہ اپنا منہ موتیوں سے بھی بھر لیتے۔ لیکن وقت نے کروٹ لی اور شہنشاہیت نے اپنی بساط لپیٹی اور اس کے ساتھ ہی فنِ قصیدہ گوئی دنیائے ادب سے رخصت ہوا۔ اب اگر کوئی شاعر کسی حاکمِ وقت کی مدح سرائی میں قصیدہ لکھتا ہے تو اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ قصیدے کی طرح داستان گوئی کا رواج بھی اب نہیں۔ ایک وقت تھا زندگی ٹھہری ہوئی تھی لوگوں کے پاس وقت کی فراوانی تھی رات گئے تک لوگ داستانوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اب نہ وہ وقت ہے اور نہ داستان گوئی ہے۔ یہ سب اجتماعی ٹھہرے ہوئے معاشرے کی اصنافِ ادب تھیں جو اب تاریخ کا حصۂ پارینہ بن کر رہ گئی ہیں۔

عالمی جنگِ اوّل اور جنگِ دوم کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز انقلاب آیا اور اس کے ساتھ ہی کاروانِ حیات کُلّی طور پر جدید دَور میں داخل ہو گیا۔ زندگی کی رفتار بیل گاڑی اور گھوڑا گاڑی سے نکل کر ریل گاڑی اور ہوائی جہاز کے ساتھ قدم ملانے لگی۔ اس تیز رفتاری کے ساتھ وقت کی قلت اور عدیم الفرصتی کا احساس ہونے لگا، داستان کی جگہ ناول نگاری نے لے لی اور پھر اس کے ساتھ ہی افسانہ نگاری نے جنم لیا۔ افسانہ نگاری کے ارتقاء میں جہاں اور بہت سے عوامل ہیں وہاں وقت کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تھوڑے سے وقت میں بہت کچھ بیان کرنے کے رجحان نے افسانہ نگاری کو خاصا عروج بخشا۔ یہی خوبی غزل کی ہے جو تا حال وقت کے ساتھ چل رہی ہے۔ اس صنفِ سخن کی مخالفت کے باوجود اس کی پذیرائی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ یہ اپنے مخصوص اختصار، ایجاز، مزاج اور تاثر کے اعتبار سے اس برق رفتار دَور کا ساتھ بطریقِ احسن دے رہی ہے۔ مجھے یہاں ہر صنفِ ادب کے بارے میں بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ وقت اور صنفِ ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کوئی صنفِ اظہار نہ تو بے وقت جنم لیتی ہے اور نہ زندہ رہتی ہے۔ اس زاویہ نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو انشائیہ اپنے زمانے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر معرضِ وجود میں آیا ہے ـــــ دورِ شہنشاہیت یا غیر جمہوری دَور میں انشائیہ کے وجود میں آنے اور فروغ پانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا قطع نظر کسی انفرادی مثال کے۔ انشائیہ تو صرف جمہوری ماحول ہی میں فروغ پا سکتا ہے، چونکہ جمہوری ماحول میں انفرادی سوچ، انفرادی رویّہ اور انفرادی مشاہدہ و مطالعہ پنپتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیہ (LIGHT ESSAY) نے جتنا فرانس، انگلینڈ اور امریکہ میں فروغ پایا اتنا کسی اور ملک میں پھل پھول نہ سکا۔ انشائیے نے پاکستان کے عالمِ وجود میں آنے کے بعد اس سرزمین میں اپنا وجود تسلیم کروایا، وجہ یہ کہ پاکستان بنیادی طور پر جمہوریت کی پیداوار ہے اور یہاں کے افراد ذہنی طور پر جمہوری اقدار کے حامل ہیں۔

ہم کسی صنفِ ادب کو اس کی قوم کے مزاج سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ چونکہ آزادیٔ فکر ہمارے مزاج میں ہے اس لیے انشائیہ کا پاکستان میں نشوونما پانا بالکل فطری امر تھا۔ لہٰذا گزشتہ بیس سالوں میں اس صنفِ ادب نے حیرت انگیز ترقی کا مظاہرہ کیا۔ انشائیہ اپنے مزاج، اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے انفرادی سوچ کا محرک ہی نہیں بلکہ مظہر بھی ہے۔ ہمارے ہاں سوچ کا اجتماعی اسلوب ہمیشہ سے فعال رہا ہے چنانچہ محاورے اور ضرب الامثال جو ایک طرح کی WISDOM CAPSULES تھیں ہمارے ہاں زیادہ مقبول رہی ہیں۔ اس طرح ہم نے بابہ سے بنے بنائے نظریات اور امثالِ فکر (THOUGHT PATTERNS) قبول کر لیے ہیں اور ہماری سوچ کھائیوں میں چل رہی ہے۔ اس سے تقلیدی روش عام ہوئی ہے اور تخلیقی اُپج کے راستے مسدود ہو گئے ہیں۔ انشائیہ کی اہمیت اور وصفِ خاص اس بات میں ہے کہ اس نے بنے بنائے فکری سانچے سے ہٹ کر شخصی سطح پر سوچ کی انفرادیت کا مظاہرہ کیا یوں ایک طرف تو اس نے تسلیم شدہ حکیمانہ گولی (WISDOM CAPSULE) کو تشکک کی نظروں سے دیکھا ہے تو دوسری طرف بظاہر معمولی اور سامنے کی اشیاء اور باتوں کو نئی معنویت سے لبریز کیا ہے۔ انشائیہ ہمارے فکری رویّہ کو اس قدر متاثر کر رہا ہے کہ بالآخر یہ ہماری دوسری اصناف میں خون کی کمی کے عارضے کو ختم کرنے کا موجب ثابت ہوگا۔

انشائیہ نگار بنیادی طور پر منفرد رویّہ، منفرد مزاج اور منفرد سوچ کا حامل ہوتا ہے۔ وہ کبھی تو اشیاء اور مظاہر کو صوفی کی نظر سے دیکھتا ہے اور کبھی فلاسفر کے سبھاؤ میں ان پر گہری نظر ڈالتا ہے۔ کبھی وہ جمالیاتی فکر میں ڈوب کر زندگی کے مختلف گوشوں میں حُسن و رعنائی تلاش کرتا ہے۔ کبھی اپنے مثبت رویّہ اور عارفانہ بصیرت سے زندگی کی تلخیوں، پریشانیوں اور دشوار راہوں کو آسان اور خوشگوار بنا دیتا ہے۔ انشائیہ اپنے مزاج میں سب کچھ ہو سکتا ہے مگر قنوطی ہرگز نہیں۔ قنوطی ذہن کا حامل فرد نہ تو انشائیہ کو سمجھ سکتا ہے اور نہ انشائیہ تخلیق کر سکتا ہے۔ انشائیہ کے لیے غیر متعصب ذہن ہی درکار نہیں بلکہ آزاد منش (LIBERAL MINDED) ہونا بھی ضروری ہے۔ انشائیہ زندگی کے بندھے ٹکے نمونوں، اصولوں اور مقرر راستوں سے ہٹ کر نئے پیکروں اور تمثیلوں کو تخلیق کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انشائیہ نگار اپنا انشائیہ تخلیق کرتا ہے تو وہ زندگی کو ازسرِنو تخلیق کرتا ہے۔ تخلیق کا یہ عمل دلکش بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ انشائیہ میں خاص نکتہ یہ ہے کہ یہ اجتماعی بنی بنائی سوچ کے پیٹرن کے برعکس شخصی سطح کی سوچ کو بروئے کار لاکر مظاہرِ حیات کے نئے گوشے، نئے پہلو اور نئے معنی پیش کرتا ہے۔ مثلاً اگر کلیہ یہ ہے کہ عالم کی فراست (WISDOM OF THE LEARNED) انسان کا قیمتی سرمایہ ہے تو انشائیہ نگار اپنی فکری بصیرت سے عالم کی جہالت (IGNORANCE OF THE LEARNED) کو موضوع بنا کر تصویر کا دوسرا رُخ پیش کر دیتا ہے۔ یاد رہے کہ وہ ہر بار مخالف رُخ ہی پیش نہیں کرتا۔ بعض اوقات مروّج سوچ کے پیٹرن کو نئے زاویے سے پیش کر کے اس کی دلکشی توسیع کا بھی اس طور سے اہتمام کرتا ہے کہ اس میں تازگی اور نکھار ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ زیادہ نمایاں اور ممتاز ہو جاتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ شاہراہ پر سفر کرتے کرتے ــــــ اچانک شاہراہ کو چھوڑ کر ایک ضمنی راستہ (BY-PASS) اختیار کر لیں اور قوس میں سفر کر کے دوبارہ شاہراہ پر آ جائیں اس طور کہ باہر سے دیکھنے والوں کو محسوس یہ ہو کہ ضمنی راستہ کے شامل ہو جانے سے شاہراہ مزید کشادہ ہو گئی ہے۔ انشائیہ نگار ہمیں وسعت آشنا کرتا ہے اور وہ ایک مدار سے نکال کر ہمیں نئے مدار میں لاتا ہے۔ یہاں بے ساختہ وزیر آغا کا خوبصورت انشائیہ "چھڑا" مجھے یاد آ گیا جو شعور کو نئے مدار میں پہنچانے کی عمدہ مثال ہے۔ اس انشائیہ سے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"چھڑا ہے کی چھڑی در اصل ہوا کا ایک جھونکا ہے اور ہوا کے جھونکے کو مٹھی میں بند کرنا ممکن نہیں۔ اسے تو دیکھنا بھی ممکن نہیں۔ البتہ جب وہ آپ کے بدن کو مَس کرتے ہوئے گزرتا ہے تو آپ اس کے وجود سے آگاہ ہو جاتے ہیں وجود ہی سے نہیں آپ اس کی صفات سے بھی آگاہ ہو جاتے ہیں، کیونکہ بنیادی طور پر ہر جھونکا ایک پیغام بر ہے۔ وہ ایک جگہ کی خوشبو دوسری جگہ پہنچاتا ہے۔ یہی کام چھڑا ہے کا بھی ہے

تمام لوک گیت چرواہوں کے ہونٹوں پر لرزتے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے رہے ہیں......"

اسی انشائیہ کا ایک دوسرا اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیں:

"میں تو صرف اُن چرواہوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو مویشیوں کے ریوڑ چراتے چراتے ایک روز انسانوں کے ریوڑ چرانے لگتے ہیں۔ تب اُن کی چھڑی عصا میں بدل جاتی ہے۔ ہونٹوں پر اسمِ اعظم تھرکنے لگتا ہے۔ وہ انسانی ریوڑوں کو پہاڑ کی چوٹی پر لاکر یا صحرا کے سینے میں اُتار کر یا دریا کے کناروں پر بکھیر کر اس بات کا انتظار کرتے ہیں کہ یہ ریوڑ اپنی گنگی اور یبوست کو گندی اُون کی طرح اپنے جسموں سے اتار پھینکیں...."

اس انشائیے کی کئی پرتیں اور تہیں ہیں بہر صورت ہمیں ایک مدار سے نکال کر دوسرے مدار میں لے جاتی ہے۔ وہ عام چرواہے سے بات کا آغاز کرتے ہیں۔ پھر اچانک ایک زقند کے ساتھ وہ ہمیں اُن چرواہوں تک لے جاتے ہیں جو ہماری لوک ثقافت کے امین ہیں پھر وہ ہمیں ایک اور ذہنی اڑان عطا کرتے ہیں اور اُن چرواہوں تک پہنچا دیتے ہیں جو ہماری روحانی اور تہذیبی اقدار کے امین ہیں اور جو خود "تسبیح کے دانوں کی طرح پوری کائنات میں بکھر جاتے ہیں۔"

یہ انشائیہ مروّجہ سوچ کے مدار سے نکل کر دوسرے مدار میں پہنچنے کی خوبصورت تصویر پیش کرتا ہے۔ اس انشائیہ میں وہ موضوع کے ساتھ سفر کرتے ہیں پھر گریز اور واپسی کے عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایسا خوبصورت انشائیہ وہی شخص لکھ سکتا ہے جس کا مشاہدہ تیز، مطالعہ گہرا اور ذہن طباع ہو۔

انشائیہ نگار کے فن کا مظاہرہ اس وقت بھی ہوتا ہے جب وہ اجتماعی مروّجہ سوچ سے ہٹ کر اپنی انفرادی سوچ سے تصویر کا دوسرا رُخ پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر زندگی میں عام رویّہ گالی دینے کے خلاف ہے ہم اس فعل کو اپنی سماجی زندگی میں نہایت معیوب اور اخلاق سوز تصور کرتے ہیں اور ایسا تصور کرنا بھی چاہیئے کیونکہ یہ ہماری تہذیبی، معاشرتی اور تمدنی زندگی کے خلاف ہے۔ لیکن جب گالی دینے کا فعل انشائیہ نگار کی انفرادی فکر کی زد میں آتا ہے تو اس کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ وہ اسے نفسیاتی کیفیت قرار دے کر یوں پیش کرتا ہے:-

"گالی کے قومی فوائد کا میں نے ابھی ذکر نہیں کیا۔ جس طرح پردے کے کچھ قومی فائدے ہیں مثلاً آدمی بدصورت عورتیں دیکھنے سے بچ جاتا ہے اسی طرح آدمی گالی دینے سے نیوراتی کیفیات سے بچ جاتا ہے۔ اگر گالیاں عام ہو جائیں تو پاگل خانے کی بنیاد میں خلل پیدا ہو جائے۔ مزید برآں گالی دینے سے جمہوریت کو فروغ ملتا ہے، آمریت صرف اسی دور میں پنپ سکتی ہے جب گالیوں پر قدغن لگا دی جائے۔ اس لیے ایک اچھے جمہوری نظام میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ اسمبلی کی کاروائی میں نکتۂ اعتراض کا آغاز اور انجام گالی پر ہوتا ہے۔ اقتصادی توازن کو برقرار رکھنے کے لیے گالی کا وجود ناگزیر ہے۔ جب مارکیٹ میں قیمتوں میں اضافہ کا رجحان پایا جائے تو آدمی اسی تناسب سے گالیوں میں اضافہ کرتا جائے۔"

(گالی دینا - غلام جیلانی اصغر)

آپ نے غور فرمایا کہ گالی جیسی مکروہ چیز کو انشائیہ نگار نے اپنے منفرد زاویۂ فکر سے PSYCHIATRY (دماغی امراض کے علاج) کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ منفرد سوچ اور رویّہ ہی کا کرشمہ ہے کہ انشائیہ نگار نے زندگی کے مروّجہ پیٹرن سے ہٹ کر ایک نیا پیٹرن ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ غلام جیلانی اصغر کا یہ انشائیہ اپنی ہیئت و اسلوب کے اعتبار سے نہ صرف منفرد ہے بلکہ تازگی و توانائی سے بھرپور ہے۔

انشائیہ نگار کبھی اشیا، مظاہرِ فطرت اور افراد کو عارفانہ نظر (MYSTIC VISION) سے دیکھتا ہے۔ یہ رویّہ بھی اس کی سوچ کی انفرادی سطح کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس کی خوبصورت مثال ہمیں وزیر آغا کے انشائیہ "بارھواں کھلاڑی" میں ملتی ہے۔ کرکٹ کی ٹیم میں بارھواں کھلاڑی کسمپرسی کے لیے وقف ہوتا ہے۔ لیکن انشائیہ نگار جب اسے عارفانہ بصیرت سے دیکھتا ہے تو اس کھلاڑی کی قلب ماہیت کچھ اس طرح ہو جاتی ہے۔

بارھواں کھلاڑی ایک ایسا ہی سچا صوفی ہے۔ وہ بیک وقت اپنی ٹیم سے منسلک بھی ہے اور جُدا بھی۔ وہ میدان میں پہلی کے چاند کی طرح آتا ہے جو دوسرے ہی لمحے رخصت بھی ہو جاتا ہے۔ وہ کرکٹ کے کھیل کا نباض، منتظر، نگران اور جاسوس ہونے کے باوجود اپنے دامن کو تر نہیں ہونے دیتا۔ ہونٹوں پر ایک عارفانہ مسکراہٹ سجائے وہ قلبِ مطمئنہ کا مظاہرہ کرتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

(بارھواں کھلاڑی —— وزیر آغا)

آپ نے دیکھا انشائیہ نگار کی نظر کرکٹ کی ٹیم کے اس کھلاڑی پر مرکوز ہو جاتی ہے جسے عام تماشائی کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے لیکن انشائیہ نگار کی انفرادی نظر نے اُسے ہی فوکس میں لیا۔ اس انشائیہ میں بارھواں کھلاڑی ایک کلچر ہیرو کے رُوپ میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ یہی انشائیہ نویس کا کمال ہے کہ وہ ہمیں انبوہِ کثیر میں سے چند ایسے چھپتے ہوئے مناظر دکھاتا ہے کہ ایک طرف ہماری بصیرت وسعت آشنا ہو جاتی ہے تو دوسری طرف ہمیں حیرت و مسرت سے ہمکنار ہونے کا موقعہ مل جاتا ہے۔

انفرادی سطح کی سوچ کی ایک عمدہ مثال ہمیں ڈاکٹر انور سدید کے دلکش انشائیہ "دسمبر" میں ملتی ہے۔ عام طور پر دسمبر کا مہینہ سردی کے آغاز کا مہینہ سمجھا جاتا ہے اور یہی اجتماعی خیال یا رائے بھی ہے۔ لیکن انشائیہ نگار اجتماعی روش سے ہٹ کر اپنی انفرادی فکر کو بروئے کار لاکر اسے مشخص (PERSONIFY) کرکے مردانہ پن کی علامت قرار دیتا ہے اور اسے نہایت تزک و احتشام سے اپنے ڈرائنگ روم میں وارد ہوتے ہوئے دکھاتا ہے۔

"دسمبر آتا ہے تو کسی مہمان کی طرح کال بیل (CALL BALL) کو دبا کر اپنی آمد کا اعلان نہیں کرتا بلکہ ایک شریر بچے کی طرح پائیں باغ کی دیوار پھاند کر پہلے گھر کے صحن میں آتا ہے پھر برآمدے میں پلاسٹک سے بنی ہوئی کرسی پر اکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ میری بیوی اُس کے مخصوص قدموں کی چاپ پہچانتی ہے۔ وہ جلدی سے آتش دان میں آگ جلا کر کرسیوں کو اس کے گرد نصف دائرے میں ڈال دیتی ہے۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی میز رکھ دیتی ہے۔ اس میز پر بھاپ اگلتی نوبیاہتا لیڈی لپٹن، ٹی کوزی کا گھونگھٹ اوڑھے ہمہ تن اشتیاق بنی منتظر ہوتی ہے۔ سامنے چاندی کی چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں پستہ، بادام اور کشمش آجاتے ہیں۔ ہم سب افرادِ خانہ جو گزشتہ گرمیوں میں جزواً جزواً اکائیوں میں بٹ گئے تھے اب ایک دوسرے کے اتنے قریب آجاتے ہیں جیسے کٹی ہوئی پھانکیں دوبارہ تربوز میں سما گئی ہوں۔"

(دسمبر —— انور سدید)

ملاحظہ کیجئے کہ دسمبر کس طرح بے تکلف دوست کی طرح انشائیہ نگار کے برآمدے میں براجمان ہوتا ہے اور پستہ بادام کشمش اور چائے سے لُطف اندوز ہوتا ہے۔ یہ انشائیہ ہمیں کیٹس (KEATS) کی شہرہ آفاق نظم خزاں (ODE TO AUTUMN) کی یاد دلاتا ہے جس طرح کیٹس موسمِ خزاں کو کھیتوں میں، کھلیانوں میں، انگوروں کے رَس نکلنے کے عمل میں اور شیریں پکّے پھلوں میں مشخص صورت میں دکھاتا ہے اسی طرح انور سدید موسمِ سرما کو دسمبر کا نام دے کر مشخص صورت میں پستہ و بادام میں چائے کے گرم گرم گھونٹ میں، دہکتے کوئلوں کی تمازت و حرارت میں دکھاتا ہے۔ دسمبر کو انشائیہ نگار نے واضح طور پر اپنے ذہن میں تشکیل کیا اور اپنی رگ رگ میں محسوس کرکے اس کے حُسن و رعنائی سے لطف اندوز ہی نہیں ہوا بلکہ نہایت ذوق و شوق کے ساتھ اسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا۔ یہی انشائیہ نویس کی سوچ کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے۔ بے جا نہ ہوگا اگر اُردو انشائیہ نگاروں کے انشائیوں میں سے چند نمونے یہاں پیش کر دوں جن سے ایک طرف تو ان کی انفرادی سوچ کی غمازی ہوتی ہے اور دوسرے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کس طرح انشائیہ نگار موضوع کا نیا رُخ پیش کرتا ہے اور وہ کس طرح مروجہ اجتماعی فکری پیٹرن سے ہٹ کر انفرادی فکری پیٹرن پیش کرتا ہے۔

"فٹ نوٹ پر حقارت کی نظر نہ ڈالیے، نہ جانے کب کاگ اڑے، کب اس بوتل میں بند جن باہر نکل آئے۔ تن کے زیرِ سایہ بظاہر بے ضرر سا،

پاؤں سمیٹے ڈُنڈے نوٹ پھیلاوے کے تمام اوصافِ حَسنہ رکھتا ہے۔ اُس میں بلا کی قوتِ نمود و بالیدگی ہوتی ہے۔ بڑھتے بڑھتے وہ تن پر امر بیل کی طرح چھا جاتا ہے۔"

(نَنھ نوٹ ـــــ کامل القادری)

"بے ترتیبی زندگی میں ترتیب کا شعور عطا کرتی ہے۔ میں کتنے لوگوں کو روزانہ حواس باختہ دیکھتا ہوں۔ اُن کی کوئی چول بھی سیدھی نظر نہیں آتی، لیکن جب اُن کے گھر جایئے تو حیرت میں پڑ جایئے کہ وہ کتنی باقاعدہ، سجی سجائی، دُھلی دھلائی، مکلف اور ڈرائی کلین زندگی گزار رہے ہیں۔"

(بے ترتیبی ـــــ احمد جمال پاشا)

"پوسٹ کارڈ بہت مسکین طبیعت کا مالک ہوتا ہے، لیکن کبھی کبھی اسے شرارت سوجھ جاتی ہے۔ پھر وہ سفر کرنے کی سوچتا اور میز پر سے کھسک کر دوسرے تھیلے میں چلا جاتا ہے......"

(پوسٹ کارڈ ـــــ رام لعل نابھوی)

"دھوتی غالباً واحد لباس ہے جس کا نہیں اُلٹا سیدھا۔ آپ آنکھیں مُوند کر خود اعتمادی سے اس کے حلقہ بگوش ہو جائیں آپ پر نہ ہی کسی کی انگلیاں اُٹھ سکتی ہیں اور نہ ہی آپ کسی کا نشانہ تضحیک ہو سکتے ہیں۔ جیسا کسی دوسرے لباس کو الٹا پہن کر ہونا پڑتا ہے۔"

(دھوتی ـــــ ارشد میر)

"اگر آپ کو کبھی کمبل اوڑھنے کا تجربہ ہوا ہے (اور مشرق میں یہ تجربہ ناگزیر ہے) تو آپ یقیناً مجھ سے اتفاق کریں گے کہ پہلی نظر میں بالکل غیر ارادی طور پر کمبل میں لپٹے ہوئے شخص پر ایک ایسے قلعہ بند جنرل کا گمان ہوتا ہے جس کے سپاہی عین معرکہ میں تنخواہیں وصول کرنے چلے گئے ہوں اور جو تن تنہا فصیل کا دفاع کرنے میں مشغول ہو۔"

(اقبال کی ایک تصویر ـــــ مشتاق قمر)

"ہر دکاندار 'مکڑی' کی طرح اشیاء کا جال پھیلا کر اس کے عین درمیان مجسم آنکھ بنا آنے والے کا انتظار کرتا ہے اور جب آنے والا ایک بار قریب آجاتا ہے تو پھر اس کی چکنی چپڑی باتوں کے جال سے باہر نہیں جا سکتا......"

(جال ـــــ سلیم آغا قزلباش)

"دُور اندیشی دراصل ہوا سے لڑنے کا نام ہے، اُس ہوا سے جس کا رُخ ابھی متعین نہیں ہوا۔"

(دُور اندیشی ـــــ اکبر حمیدی)

"بدصورتی آپ کو دعوتِ فکر دیتی ہے اور آپ کی سوچ کے لیے نئی نئی راہیں کھول دیتی ہے جب کہ خوبصورتی آپ کو اپنی خوشبو کے حصار میں قید کر لیتی ہے۔"

(بدصورتی ـــــ سلمان بٹ)

"مَیں عنقریب عمر کے اس نقطۂ اتصال پر پہنچنے والا ہوں جہاں دونوں وقت گلے ملتے ہیں۔ گویا آئندہ چند سالوں میں مَیں اس عالمِ برزخ میں پہنچ جاؤں گا جس کے ایک جانب جوانی کی جنت اور دوسری جانب بڑھاپے کا دوزخ ہوگا، جہاں نوجوان مجھے بزرگ سمجھ کر مجھ سے شرمائیں گے

اور بزرگ مجھے نوجوان جان کر مجھ سے کترائیں گے اور میں ایک کٹی پتنگ کی طرح اس عالم رنگ و بو میں ڈولتا پھروں گا۔"

(برزخ ـــــ بشیر سیفی)

"میری نگاہ سے دیکھا جائے تو ارض و سما کی ہر جاندار اور بے جان شے ایش ٹرے کا روپ دھارے ہوئے ہے یا کم از کم اس سے تعلق خاص رکھنے کی بنا پر زندۂ جاوید ہو کر رہ گئی ہے۔ انسان ہی کو لیجئے ایک اچھی بھلی ایش ٹرے ہے جس کے ظرف میں عمر کا ہاتھ ماہ و سال کی راکھ سانس کی صورت میں گراتا رہتا ہے گویا انسان ایک چلتی پھرتی متحرک ایش ٹرے ہے جو راکھ کے دم قدم سے زندہ ہے ....."

(ایش ٹرے ـــــ جان کاشمیری)

انگریزی ادب تو انشائیوں سے مالا مال ہے۔ وہاں تو انفرادی رویہ ہی انشائیوں کی روح ہے۔ لی ہنٹ (LEIGH HUNT) اپنے معرکتہ الارا انشائیہ دریچہ (WINDOW) میں ایسی خوبصورت فکری لہریں پیش کرتا ہے کہ قاری ارضی پستیوں سے بلند ہو کر آسمانی رفعتوں کو چھونے لگتا ہے۔ اپنے انفرادی رویّہ کے تحت وہ قطرے میں کائناتِ کبریٰ کا مشاہدہ کرتا ہے اور دریچے کو اپنے لیے ایک تصویر کے فریم سے مشابہت دے کر اس میں چلتی پھرتی تصویروں کا نظارہ کرتا ہے۔ دریچہ اس کے لیے ایک ایسا تصویری فریم ہے جس میں وہ کبھی اُڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھتا ہے کبھی بادلوں کے بجروں کو آسمان پر تیرتے دیکھتا ہے۔ مصنّف کی انفرادی سوچ نے دریچہ کو اُس کے لیے جہانِ معنی کا استعارہ بنا دیا ہے اسی طرح ـــــ اے۔ پی۔ ہربرٹ (A. P. HERBERT) اپنے ایک لطیف فکر انشائیہ "باتھ روم کے بارے میں" (ABOUT BATHROOM) ایسے غسل خانہ کا تصور پیش کرتا ہے کہ جس میں وہ نہ صرف نہا سکے بلکہ ورزش بھی کر سکے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ایسی تصویریں بھی اُس میں آویزاں کرنا چاہتا ہے جن میں فوجی دستوں کو خندقوں کی طرف بھاگتا ہوا، بارش میں بھیگتے قطار میں کھڑے بس کا انتظار کرتے ہوئے لوگ اور ہوائیں چلتی ہوئی برف باری کے مناظر ہوں۔ کیونکہ اُس کے نزدیک ایسے ہی غسل خانے میں غسل کرنے کا لطف آتا ہے۔

انشائیہ نگار ایک ذی فہم تماشائی اور حساس دل کا مالک ہوتا ہے۔ وہ زندگی کا تماشا کھلے ذہن اور روشن آنکھ سے کرتا ہے۔ وہ روزمرّہ کے معمولات میں غیر معمولی بات اور بیش بہا اقدار دو اشیاء میں چھپا ہوا انوکھا پہلو پا لیتا ہے۔ انشائیہ نگار عام لوگوں سے اس لیے مختلف ہوتا ہے کہ عام لوگ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی آنکھ کے لینز (LENS) کو کیمرہ میں کی طرح استعمال نہیں کرتے جبکہ انشائیہ نگار اپنی آنکھ کے لینز کو کیمرہ مین کی طرح استعمال کرتا ہے اور یوں وہ زندگی کا مشاہدہ، مطالعہ، تجزیہ، ترجمانی اور عکاسی اپنی شخصی سطح کی سوچ کے مطابق کرتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح وہ چرواہے میں پیغمبرانہ صفات کا دیدار کرتا ہے، گالی میں دافع امراض کے عناصر (THERAPEUTIC ELEMENTS) تلاش کرتا ہے۔ دسمبر کے مہینہ میں بے تکلف دوست کی جلوہ آرائی کا دیدار کرتا ہے یوں وہ اپنی انوکھی سوچ اور حیرت و تجسس سے مملو روشن آنکھ سے زندگی کی بوقلمونی کا نظارہ کرتا ہے۔ انشائیہ نگار روزانہ کے ملنے والے دوستوں میں، معمول میں آئی ہوئی اشیاء میں، روزمرّہ کی عادات میں، ماضی کے گزرے ہوئے حادثات و واقعات میں، حال کے خلفشار میں اور مستقبل کے سنہری خواب میں اپنی فکری بصیرت کو بروئے کار لا کر نئے دلآویز پہلو ڈھونڈ نکالتا ہے۔ اس طرح وہ ہمیں ذہنی آسودگی (INTELLECTUAL RELIEF) عطا کرتا ہے۔ شاعری کی مزاجاً اپروچ جذبے اور خلوص کی صداقت سے ہوتی ہے، اس لیے شاعری ہمیں جذباتی آسودگی (EMOTIONAL RELIEF) عطا کرتی ہے۔ اس لیے ہم اس شاعری سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں جو ہمارے جذبہ و احساس کی تسکین کرتی ہے۔ شاعری کے علی الرّغم انشائیہ کی اپروچ زیادہ تر ذہنی ہوتی ہے، وہ ہمیں ذہنی آسودگی بخشتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جذبات سے منقطع ہو جاتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ یہاں جذبہ زیریں سطح میں چلا جاتا ہے اور بالائی سطح پر فکر کی ضوفشانی ہوتی ہے یوں ہمیں انشائیہ جمالیاتی حظ بھی بہم پہنچاتا ہے لیکن زیادہ تر یہ ہمیں ذہنی آسودگی بخشتا ہے۔ انشائیے کی اس خصوصیت کے پیشِ نظر ڈاکٹر جانسن نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ یہ ـــــ

A LOOSE SALLY OF MIND یعنی ذہن کی آوارہ خرامی ہے ۔ ہمارے سوچ اور فکر کو جتنی آزادی اس صنفِ ادب میں ملتی ہے شاید ہی کسی اور صنفِ اظہار میں اتنی آزادی ملتی ہو ۔ دیکھئے اس فکری آزادی کا اظہار انشائیہ نگاروں کے ہاں کس خوبصورتی سے ہوا ہے :

"کبھی کبھار جب میں ڈرائی کلینر DRY CLEANER سے رجوع کرتا ہوں تو اُسے کہتا ہوں میرے ان گنہگار روحوں جیسے میلے کچیلے کپڑوں کو بپتسمہ دے دے مگر انہیں آتشیں پریس کے ذریعہ سماجی جاندار بنانے کی زحمت نہ اٹھا ۔"

(محمد اسد اللہ ——— پریس کئے ہوئے کپڑے)

"تکلف کا ایک تعلق اس شخص سے ہے جو تکلف برت رہا ہے اور ایک اس شخص سے جس سے تکلف برتا جا رہا ہے ۔ تکلف برتنے والا اگر کبھی تکلف سے پیش نہیں آتا اور گھر آئے ہوئے مہمان کو بلا تکلف کہہ دیتا ہے کہ جناب مہینہ کی آخری تاریخیں ہیں ، ملازمت پیشہ آدمی ہوں ، روکھی سوکھی ہی پیش کر سکوں گا ، اور پھر واقعی روکھا سوکھا ہی حاضر کر دیتا ہے تو اس کی سفید پوشی اور عزت و وقار کا جو بھی بھرم ہو گا کھل جائے گا ۔"

(حامد برگی ——— تکلف)

"یہ کال بیل اگر کسی تماش بین کے ہاتھ میں ہو تو من چلوں کے لیے پیغامِ رقص بن جاتی ہے ، سپہ سالار کے ہاتھ میں ہو تو نقارۂ جنگ کہلاتی ہے ، اہلِ قافلہ کے ہاتھ میں ہو تو نالۂ جرس اور کسی مفکر کے ہاتھ میں ہو تو بانگِ درا ۔"

(کال بیل ——— محمد اقبال انجم)

"یاد انسان کی دوست اور تنہائی کی ساتھی ہے ۔ یہ وہ منصف ہے جو بیتے دنوں کی اچھی بُری باتوں کی جزا سزا دیتی ہے ۔ حسین اور خوبصورت یاد ہونٹوں کے گلاب کھلا دیتی ہے تو تلخ یاد آنسوؤں کے سیلاب لے آتی ہے جو اندر کی کچی یادوں کو گرا دیتا ہے ۔"

(یاد ——— محمد یونس بٹ)

خدا کا فرمان یاد آتا ہے " ہم نے ساری کائنات کو سات دنوں میں تخلیق کیا ہے " میں سوچ رہا ہوں کہ جب پوری کائنات سات کے ہندسے کی اسیر ہے تو آخر ان سات سُروں کی اس سے کوئی نہ کوئی مشابہت تو ضرور ہے ۔ لیکن یہ کیسی مشابہت ہے اس کا مجھے علم نہیں !"

(رُوح کی غذا ——— راجہ محمد ریاض الرحمٰن)

"خوشامد وہ لوری ہے جو انسان کے وحشی پن کو سُلا دیتی ہے اور صبح کی پہلی کرن بن کر سوئی ہوئی معصومیت کے گلابی گالوں کو چھوتی ہے اور اسے بیدار کر دیتی ہے ۔"

(خوشامد ——— اظہر ادیب)

"دراصل سارے موسم ہمارے اندر ہیں ۔ وہ جرثوموں کی طرح شریانوں کے اندر دبکے پڑے رہتے ہیں ۔ جب کبھی ہمارا مدافعتی نظام کچھ کمزور پڑتا ہے تو وہ لپک کر باہر آتے ہیں اور ہم پر سوار ہو جاتے ہیں ۔"

(امجد طفیل ——— موسم)

یہ تمام انشائیے ہمیں ذہنی آسودگی عطا کرتے ہیں ۔ یہ ہمارے راہوارِ فکر کو مہمیز لگاتے ہیں اور مزید نکات کی طرف اشارہ کرنے والے (POINTERS) کا سرانجام دیتے ہیں ۔ ل ہنٹ کا دریچہ ، وزیر آغا کا چرواہا ، غلام جیلانی اصغر کا گالی دینا ، انور سدید کا دسمبر ، مشتاق قمر کا اقبال کی ایک تصویر ،

اور سلیم آغا قزلباش کا جال۔ ہماری فکر کے مزید دریچے وا کرتے ہیں۔ اور یوں یہ ہمیں ایک ذہنی اور جمالیاتی طمانیت سے شرف یاب کرتے ہیں۔ اس اضطراب انگیز دَور میں ادب کی یہ صنفِ اظہار نہایت موثر کردار ادا کر رہی ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں متعدد نئے انشائیہ نگار آسمانِ ادب پر طلوع ہوئے ہیں جس سے ایک طرف تو انشائیہ کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ فن کار انفرادی سطح پر اپنے موڈ، اپنے خیال اور اپنے مشاہدے کا اظہار کرنے کے لیے کس درجہ بے تاب تھا۔ اُسے جونہی اپنے ذاتی پیرایۂ اظہار کے لیے انشائیہ کا فارمیٹ (FORMAT) ملا اُس نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ موجودہ دَور میں جسے جمہوری سائنسی دَور کہنا صحیح ہوگا۔ فرد کی آزادی اور اس کی سوچ کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ آج اجتماعی آزادی کے ساتھ انفرادی آزادی کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دَور میں انشائیہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اس کی ترقی کے امکانات مستقبل میں روشن تر نظر آ رہے ہیں۔

بشیر سیفی ان شاعروں میں سے ہے جو زندگی کی انتہائی مایوسیوں میں بھی
تازہ ہوا کے لیے روشن دان کھلا رکھتے ہیں۔ (رشید امجد)

بشیر سیفی کی منتخب غزلوں کا پہلا مجموعہ

مطلع

آفسٹ طباعت ۹۶ صفحات قیمت دس روپے

ناشر: شاخسار پبلشرز۔ پوسٹ بکس ۱۰۶۰ راولپنڈی

جِنّ

جمیل آذر

میرے ایک ناول نگار نوجوان دوست نے گزشتہ چند دنوں سے عجیب و غریب رویّے کا اظہار کر رکھا ہے۔ مثلاً اگر وہ کسی موضوع پر گفتگو کر رہا ہو تو وہ سب کو جاہل قرار دے کر یہ ثابت کرتا ہے کہ جو وہ جانتا ہے کوئی بھی نہیں جانتا اور جتنا اُس نے پڑھا ہے کسی نے بھی نہیں پڑھا ہے۔ جب سے اُس کا علامتی ناول شائع ہو کر ریلوے بک سٹالوں کی زینت بنا ہے اس وقت سے تو اُس کے پاؤں زمین پر ہی نہیں رہے۔ ایک مرتبہ تو ٹی ہاؤس بحث میں اُس نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کر دیا کہ علامتی فکشن کا وہ واحد ادیب ہے باقی لوگ تو بس جھک مارتے ہیں۔ اِس نوجوان دوست سے جب چند سال پہلے ملاقات ہوئی تھی تو اُس نے ادب کی پُر اسرار و دشوار راہوں میں نیا نیا قدم رکھا تھا۔ اُس وقت اس کے چہرے پر ایک دلکش معصومیت کی چمک اور انداز میں عجز و نیاز کا بانکپن تھا۔ لیکن جوں جوں اُس نے اربابِ علم و ادب کی تنقیدی بحثوں میں حصہ لینا شروع کیا توں توں اُس کے بال و پر نکلنا شروع ہو گئے اور اب تو اُس کی پرواز اتنی بلند ہو گئی ہے کہ کسی کو اپنے برابر سمجھتا ہی نہیں۔ اُس کی گردن میں اب ایک خاص طرح کا احساسِ تفاخر ہے، پیشانی پر نخوت کے بل، آنکھوں میں برتری کا جلال اور بھنوؤں میں رعونت کا تناؤ ہے۔ اس نوجوان ادیب کو دیکھ کر مجھے وہ تمام لوگ یاد آنے لگتے ہیں جنہوں نے جوانی کی پُر فریب وادی میں قدم رکھتے ہی دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔ دنیا تو خیر وہ کیا فتح کرتے البتہ خود بے نیلِ مرام اِس جہانِ رنگ و بُو سے رُخصت ہو گئے۔

فی الحقیقت جب انسان جوانی میں قدم رکھتا ہے تو ایک خوفناک جِن دبے پاؤں اس پر حملہ آور ہوتا ہے اور جب وہ اس پر اپنا تسلط جما لیتا ہے تو پھر جس طرح چاہتا ہے اس سے کام لیتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ جِن نوجوان کے ذہن میں یہ بات ڈال دیتا ہے کہ تُو ہی دنیا کا سب سے طاقتور، ذہین اور خوبصورت نوجوان ہے باقی لوگ تو محض چیونٹیاں ہیں انہیں مسل ڈال۔ اور پھر خواہشات کی لاتعداد پھلجھڑیاں اس کے دل میں چھوڑتا رہتا ہے۔ اگر کہیں یہ نوجوان زحمتِ زر سے لطف اندوز ہونے لگ گیا ہو پھر تو دنیا کو اپنے قدموں تلے روندنے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔ شاید ایک ایسی ہی مخلوق کا کرشمہ تھا کہ سکندرِ اعظم نے جو پیٹر دیوتا کا بیٹا ہونے کا اعلان کر دیا اور دنیا کو فتح کرنے کا عزمِ صمیم کر ڈالا۔ بے چارے نے ابھی ایشیا کے چند علاقے ہی فتح کیے تھے کہ اس کی اپنی فوجوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ اس کا محبوب گھوڑا بوسے فیلوس زخموں کی تاب نہ لا کر مر گیا جسے اس نے جہلم کے قریب بڑی عقیدت سے دفن کر دیا اور پھر خود بھی بخار میں مبتلا ہو کر جوانی ہی میں راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ نپولین بھی اسی بدبخت جِن کے ہاتھوں مجبور ہو کر دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ یورپ کے چند ممالک کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد روس کے برف زاروں میں پہنچتے ہی اس کی فوجوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور ایسی شرمناک شکست کا سامنا کیا کہ پھر کبھی سر نہ اٹھا سکا اور اپنے ہی ہم وطنوں کے ہاتھوں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا دنیا سے رُخصت ہو گیا۔ اِس جِن کے جال میں پھنسا ہوا آدمی کبھی دوسروں کے عبرتناک انجام سے سبق حاصل نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی ہی تازہ اور نئی

غلطیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہٹلر نے بھی جوانی کے نشہ میں چُور ہو کر نسلی تفاخر کا نعرہ بلند کیا اور دنیا کو فتح کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ یورپ میں چند سال تباہی و بربادی مچانے کے بعد نہ صرف اپنے ملک کا بلکہ اپنے ہی ہاتھوں اپنا کام بھی تمام کر لیا۔

اس جن کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ پہلے تو وہ نوجوان کے دماغ پر قبضہ کر کے اس سے خطرناک و حیرتناک کام کرواتا ہے جسے عرفِ عام میں "کارہائے نمایاں" کا غلط نام دیا جاتا ہے اور پھر یا تو اس سے ہیرا کیری کرواتا ہے یا دوسروں سے اُسے مروا ڈالتا ہے البتہ اس نوجوان کا انجام ہوتا عبرت ناک ہے۔ لیکن جب کوئی شخص جوانی میں اس خوفناک جن کو اپنے قبضے میں کر لیتا ہے اور اس پر لگام ڈال لیتا ہے تو پھر وہ قلندرانہ آن اور فقیرانہ شان کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ وہ دنیا کو فتح کرنے کے نہ تو سنہری خواب دیکھتا ہے اور نہ بیڑا اُٹھاتا ہے بلکہ دنیا خود بخود اُس کے دستِ تصرف میں آنے کے لیے بے قرار ہو جاتی ہے جب وہ علم و فن کی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو حیرت و استعجاب سے اس کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ جاتی ہیں۔ جوں جوں وہ علم حاصل کرتا جاتا ہے توں توں اس کی تشنگی بڑھتی جاتی ہے۔ نیوٹن نے ایسے ہی لمحے میں کہا تھا کہ اس کی مثال اس بچے کی سی ہے جو ساحلِ سمندر پر کھڑا چند پتھر چُن رہا ہو اور ابھی علم کا سمندر اس کے سامنے ٹھاٹھیں مار رہا ہو۔ آئن سٹائن بھی حیران تھا کہ لوگ اس کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں حالانکہ اُس نے تو کچھ بھی نہیں کیا صرف چند چیزیں دریافت کر لیں جو پہلے ہی سے موجود تھیں۔ دراصل یہ لوگ جن کے قبضے میں نہیں تھے بلکہ جن ان کے قبضے میں تھا اسی لیے ان کی سمتیں درست تھیں اور وہ بہت کچھ ہونے کے بعد بھی کچھ نہ ہونے کا احساس رکھتے تھے۔

بچپن معصومیت کا دَور ہوتا ہے، جوانی غلطیوں کا اور بڑھاپا ندامت کا۔ یہ خوفناک جن نہ تو بچپن میں انسان کی زندگی میں آتا ہے اور نہ بڑھاپے میں۔ یہ تو صرف جوانی کے حسین ایام ہی میں اپنا نزولِ اجلال کرتا ہے۔ اسی لیے ہوشیار سیاستدان نہ تو بچوں کو اپنی پارٹی میں شامل کرتے ہیں اور نہ بوڑھوں کو بلکہ وہ تو نوجوانوں کو اپنا تختۂ مشق بناتے ہیں اور ان سے حسبِ منشا کام لیتے ہیں۔ جوانی میں ذہن لچک دار اور صورت پذیر ہوتا ہے اسی لیے شاطر سیاستدان انہیں جس طرح چاہتے ہیں اپنے سانچوں میں ڈھال لیتے ہیں۔ سیاستدانوں ہی پر کیا موقوف! کالجوں کے اساتذہ، مانے ہوئے پیر، بزرگ، خلیفہ قسم کے ادیب و شاعر انہیں اپنے سحرِ بلا خیز میں گرفتار کر لیتے ہیں اور اپنا نام بلند کرنے کے لیے ان سے خوب خوب کام لیتے ہیں۔ لہٰذا بے چارہ نوجوان جس کی حالت پر مجھے اکثر رحم آتا ہے اندرونی طور پر جن کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے اور بیرونی طور پر کہنہ مشق دانشوروں اور سیاستدانوں کے ہتھے چڑھا کٹھ پتلی بنا رہتا ہے۔ میں نے ایک ایسے ہی نوجوان کو دیکھا جو ایک سیاسی راہنما کی محبت میں بلکہ عشق میں اس قدر گرفتار تھا کہ اس کی تصویر ہمہ وقت اپنے سینے سے لگائے رکھتا تھا اور جب اس کا ستارا ڈوبا تو اس کے عشق میں اس قدر دیوانہ ہوا کہ حکومتِ وقت تک سے ٹکرا بیٹھا جس کے نتیجہ میں کئی سال قیدِ بامشقت کی چکی پیستا رہا اور اس وقت تک رہائی نصیب نہ ہوئی جب تک دیوانگی کا بھوت سر سے نہ نکلا۔

جوانی اگرچہ غلطیوں کا دَور ہے لیکن ہے زندگی کا حسین ترین تحفہ! جوانی کا عرصۂ حیات اگرچہ بہت کم ہوتا ہے لیکن ہوتا شاندار ہے۔ اس تحفہ کو بعض لوگ بے دریغ مٹھیاں بھر بھر کے لٹاتے ہیں اور قبل از وقت اس عظیم ترین تحفے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو اس تحفہ کی قدر کرتے ہیں عظیم انسانوں کے رُوپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو جن کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے جس روز میرا ناول نگار دوست اس جن پر غلبہ پالے گا اس روز رازِ درونِ کائنات اس پر آشکارا ہو جائے گا اور اسے نروان مل جائے گا تب وہ کوئی عظیم شاہکار تخلیق کر سکے گا، ایک ایسا شاہکار جسے منوانے کے لیے نہ تو اُسے اربابِ تنقید کا سہارا لینا پڑے گا اور نہ ٹی ہاؤس بحث میں اعلان کرنا پڑے گا۔ یہی نہیں بلکہ کسی انٹرنیشنل فائیو سٹار ہوٹل میں کسی اربابِ وزارت کی صدارت میں تقریبِ رونمائی کی زحمت بھی نہیں اٹھانا پڑے گی!۔

ڈرائنگ روم میں گھوڑا

جمیل آذر

میری بیٹی نے سفید چار سوتی کپڑے پر فنی مہارت کے ساتھ سُرخ، پیازی، ہلیٹی، سفید اور سیاہ رنگ دھاگوں کے دلکش تال میل سے ایک جوکی اور گھوڑے کی شبیہہ اس طرح کراس سٹیچ کی ہے کہ جوکی برق رفتاری سے دوڑتے ہوئے گھوڑے کی باگ کو بڑی چابکدستی سے کھینچے ہوئے ہے اور گھوڑا پوری طاقت کے ساتھ اپنی دونوں اگلی ٹانگوں کو اس خوبصورتی سے اٹھائے ہوئے ہے کہ دونوں سُم پیچھے کی جانب مُڑ گئے ہیں اور گھٹنے تقریباً گردن تک پہنچ گئے ہیں۔ اس کی عقبی ٹانگیں بھی زمین سے اس طرح اٹھی ہوئی ہیں جس طرح کوئی ماہر غوّاص پانی میں غوطہ لگاتے وقت اپنی ٹانگیں پیچھے فضا میں سیدھا کر لیتا ہے۔ گھوڑے کی سیاہ دُم عقبی رانوں پر لہراتی ہوئی شہابِ ثاقب کی سی دبیز لکیر بنا رہی ہے۔ یوں گھوڑا مکمل طور پر فضا میں تیرتا ہوا سامنے لگے چوکور چوبی جنگلے کو جو چند فٹ بلند دو متوازی ڈنڈوں پر مشتمل ہے چھلانگ لگا کر پار کرنے کے تخیل گرفت عمل میں نظر آتا ہے۔ گھوڑے کے نتھنے گہرے سانس لینے کی وجہ سے پھولے ہوتے ہیں۔ جوکی جس کے سر پر سیاہ شیڈ والی کوزہ نما ٹوپی ہے پاؤں کو رکاب میں جمائے چرمی کاٹھی پر پُشت کو اٹھائے آگے کی طرف جھکا ہوا ہے گویا گھڑ سوار اور گھوڑا دونوں ذہنی اور جسمانی طور پر ہم آہنگ ہو کر چوبی جنگلے کو عبور کر رہے ہیں۔ اس حسین فن پارے کو فریم کرا کر میں نے اپنے ڈرائنگ روم میں سجا رکھا ہے۔ جب میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا ہوں تو میری نظریں غیر ارادی طور پر اس تنو مند خوبصورت مُشکی گھوڑے پر پڑتی ہیں تو مجھے ایک نامعلوم سی مسرت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ میرے ذہن میں کیٹس کی شہرہ آفاق نظم جو اس نے یونانی ناک دان پر لکھی تھی گردش کرنے لگتی ہے اس دلآویز نظم میں شاعر نے فن کو ابدیت کا حامل قرار دیا ہے اور حُسن کو حق اور حق کو حُسن کے طور پر پیش کیا ہے۔ میں جب اس تصویر اور کیٹس کی نظم پر غور کرتا ہوں تو میری خوشی دو چند ہو جاتی ہے۔

چند برس ہوئے جب میرے ایک افسانہ نگار دوست نے اپنے تازہ افسانوں کے مجموعہ کا نام گھوڑوں کے حوالے سے رکھا تھا تو مجھے قدرے حیرت ہوئی تھی لیکن آج جب میں اس کتاب کے نام اور اپنے ڈرائنگ روم میں رکھی گھوڑے کی تصویر کو دیکھتا ہوں تو گھوڑے کی پوری شخصیت تاریخی، ثقافتی اور سماجی اعتبار سے میرے سامنے جاتی ہے۔ کس طرح گھوڑا انسانی زندگی میں ابتدائے آفرینش ہی سے داخل ہو گیا تھا۔ گھوڑا اپنی ہیئت و ساخت کے لحاظ سے مجھے دنیا کا حسین ترین جانور نظر آتا ہے۔ اس کی قوت و توانائی تو اب ضرب المثل کی طرح مشہور ہے۔ یہاں تک کہ ہم کاروں کے انجنوں کی قوت کے پیمانے کو ہارس پاور کے نام سے ناپتے ہیں۔ انسان نے اپنی سواری کے لیے اگرچہ موٹر سائیکلیں، کاریں، ریلیں اور ہوائی جہاز وغیرہ ایجاد کر لیے ہیں مگر جو بات گھوڑے میں ہے وہ کسی اور میں نہیں۔ گھوڑا اپنے سوار سے پیار کرتا ہے اس کا احترام کرتا ہے۔ اس کے جذبات و احساسات کو سمجھتا ہے۔ اس کے خیالات، ارادوں اور اشاروں کو ایک مدبّر انسان کی طرح پا لیتا ہے۔ جنگ میں کیسے لڑنا ہے، نازک وقت میں سوار کو کیسے بچانا ہے، جنگل میں کس طرح چلنا ہے، صحرا میں کیسے دوڑنا ہے، دریاؤں کو کس طرح عبور کرنا ہے، آندھیوں اور طوفانوں میں سوار کو لے کر کیسے گزرنا ہے۔ یہ گھوڑے کی ایسی خصوصیات ہیں جو ہمیں کسی اور جانور میں نہیں ملتیں۔ یوں اگر دیکھا جائے تو گھوڑا حُسن و صداقت، خلوص و محبت، پاکیزگی و صفائی، صبر و رضا، نظم و ضبط، دانش و وفاداری، قوت و استقامت

چستی و رفتار کی علامت بن کر ہماری زندگی میں نمودار ہوتا ہے۔ سکندر سے لے کر نپولین تک کا سفر دراصل گھوڑے ہی کا سفر ہے۔ انسان کی زندگی میں اگر گھوڑا نہ ہوتا تو یقین کیجئے حضرت انسان اپنے اپنے علاقہ ہی میں ایڑیاں رگڑتا رہتا۔ یہ واحد جانور ہے جس نے ابتدا ہی سے انسان کو حرکت پذیر بنا دیا ہے۔ "دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے" والا سارا معاملہ گھوڑے کا ہی رہینِ منت ہے۔ یہ جانور زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ صحراؤں، دریاؤں، کوہستانوں اور جنگلوں سے لے کر آفاق تک کی وسعتیں اس کی ٹاپوں سے گونجتی ہیں۔ گھوڑے کی ٹاپ میں ایک موسیقی ہے، ایک جادو ہے، یہ اپنی ٹاپوں سے ہماری زندگی میں سرور لاتا ہے۔ یہ جانور بیک وقت ارضی بھی ہے اور سماوی بھی۔ خانہ بدوشوں سے لے کر محل نشینوں تک کا ہمرکاب ہے۔ اس کے منہ اور پسینے سے مکروہ بو نہیں آتی۔ ظالم و جابر نہیں، کسی جانور پر حملہ کر کے اس کا خون نہیں پیتا۔ مہاتما بدھ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے چیونٹی تک کو مارنا پسند نہیں کرتا البتہ کسی کی نازیبا حرکت پر دولتی مارنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ خود دار ہے، محنت و خدمت کے صلے میں مالک سے اپنا حق حاصل کرتا ہے۔ شادی بیاہ کا ہنگامہ ہو، شاہی جلوس کا دمدمہ ہو، میلہ مویشیاں کا شو ہو یا ماتمی جلوس کا منظر ہو ان سب میں گھوڑا اپنی شخصیت کے مختلف انگ اور روپ کی جلوہ نمائی کرتا ہے، وہ انسان کی خوشی میں رقص کناں ہوتا ہے تو اس کے دکھ میں غم کے آنسو بہاتا ہے۔ وہ امیر سے غریب تک کا ساتھ دیتا ہے اس طرح وہ طبقاتی آویزش سے ماورا ہے۔ اس کی ذات میں شاہ و گدا کا حسین امتزاج ہے۔ گھوڑا حسن و رعنائی کی علامت بن کر ہماری زندگی میں ابھرتا ہے اسی لیے کراس سٹیچ سے بنے گھوڑے کی شبیہہ کو فریم کرا کر میں نے اسے اپنے ڈرائنگ روم کی زینت بنا دیا ہے۔ یقین کیجئے اس میں میری سنابری کا کوئی دخل نہیں۔ یہ میری باطنی تمثیل کا آئینہ دار ہے۔

اسے اتفاق کہیے کہ گزشتہ ہفتے میرا دوست "س" مجھے ملنے آیا۔ میں نے حسبِ معمول اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اس نے فریم کیے ہوئے اس گھوڑے کو دیکھ کر کلمۂ خیر کی بجائے بڑے تلخ انداز میں کہا "یار یہ تم نے کس جانور کی تصویر لگا رکھی ہے؟" میں نے جواب دیا "دیکھتے نہیں گھوڑے کی ہے اور کس کی ہے؟" اس پر اُس نے مشورہ دیتے ہوئے کہا "کہ بھئی اگر تم نے جانور کی ہی تصویر لگانا ہی تھی تو کسی ایسے جانور کی تصویر آویزاں کرتے جو اس دھرتی کے حوالے سے ہوتی مثلاً بیل، بھینس، گدھا وغیرہ۔ دیکھئے نا ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے آثارِ قدیمہ میں جن جانوروں کی شبیہیں ملتی ہیں ان میں بیل اور گائے سرِفہرست ہیں۔ یہ گھوڑا تو غیر ملکی جانور ہے۔ آریاؤں کے طفیل یہاں پہنچا ہے۔" میں نے کہا کہ تم مجھے آریائی ہی سمجھ لو۔ بہرکیف یہ میرا پسندیدہ جانور ہے۔" اس پر اُس نے اپنے پسندیدہ جانوروں کے نام بتائے۔ اور ثقافتی حوالوں سے دلیل دیتے ہوئے بتایا کہ یہ جانور کس طرح ہماری دھرتی کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔ مثلاً اس کا پہلا پسندیدہ جانور سؤر ہے اور یہ برصغیر کے ابتدائی دور کا جانور ہے اور آج تک موجود ہے۔ اپنی فطرت میں انارکسٹ ہے۔ وہ ہر منضبط معاشرے اور مہذب نظام کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ وہ قطار در قطار کھڑے گنے کے کھیتوں کو اپنی سخت مضبوط تھوتھنی سے تہس نہس کر دیتا ہے۔ وہ اتھارٹی کو چیلنج کرتا ہے۔ اور پھر نہایت راز دارانہ انداز میں سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا "اور تم نے سُنا نہیں ہمارے بزرگ ہر اس لڑکے کو جو باپ کی مرضی کے خلاف کام کرتا ہو "سؤر دا پتر" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ اور پھر مسکرا کر بولا "دیکھا نا سؤر بنتا ہے نا اس دھرتی کا جانور؟" اس کا دوسرا پسندیدہ جانور بھیڑیا ہے۔ بھیڑیا بھیڑ بکریوں کے ریوڑ پر رات کو حملہ کرتا ہے اور صرف ایک بھیڑ اٹھا کر لے جاتا ہے اور اپنے غار میں بیٹھ کر کھاتا ہے کسی کو اپنے مارے ہوئے جانوروں میں سے نہ کوئی حصہ دیتا ہے اور نہ کسی کے مارے ہوئے جانور سے کوئی حصہ لیتا ہے۔ یہ بھی اپنے مزاج کے اعتبار سے انارکسٹ ہے کسی کو اپنے اوپر حکومت کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ بھیڑوں کے ریوڑ پر اسی طرح حملہ کرتا ہے جس طرح سؤر گنے کے کھیتوں پر کرتا ہے۔ اجتماعی منظم معاشرے کے خلاف یہ دونوں جنگ کرتے ہیں۔ یہ کسی حکومت، کسی قانون اور کسی نظام کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے اپنے نظام ہیں، اپنے قانون ہیں۔ یہ اپنے مزاج کے مطابقت زندگی بسر کرتے ہیں اور یہی فطری اسلوبِ حیات ہے اور یہی جانور جاری

علامت بنتے ہیں نہ کہ گھوڑا۔ اور پھر اپنی بات پر زور دے کر بولا۔ تصویر لگائی ہی تھی تو ان جانوروں کی لگاؤ نا یار!" اس نے یہ تمام گفتگو دس تیقن اور تاریخی حوالوں سے کی کہ میں بہت دیر تک اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا، سنتا رہا۔

میرا دوست جو مارکزم کا علمبردار ہے ایک طویل اور مدلل گفتگو کے بعد رخصت ہو جاتا ہے اور میرے دماغ کے ریشوں کو خاصا درہم برہم کر جاتا ہے۔ میں بوجھل دماغ کے ساتھ خالی کافی کی پیالیوں کو سمیٹتا ہوں۔ رات کافی گزر چکی ہوتی ہے۔ سرد کمرے میں میرے دوست کے سگرٹ کے ادھ جلے ٹکڑوں میں سے نکلے ہوئے دھوئیں سے فضا آلودہ سی ہو جاتی ہے۔ اپنی طبیعت میں پراگندگی اور انتشار سا محسوس کرنے لگتا ہوں۔ معاً میری نظریں فریم میں لگے حسین مُشکی گھوڑے پر پڑتی ہیں۔ اور پھر مدھر موسیقی میں اس کے ہنہنانے کی آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ میری جانب بڑھتا ہے اور اپنے اگلے کُھر مین میرے قریب آکر زمین پر مارتا ہے۔ اشارہ پاتے ہی میں اپنا بایاں پاؤں رکاب میں ڈال کر اس پر سوار ہو جاتا ہوں۔ وہ سرپٹ دوڑنے لگتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اُس کے پاؤں زمین سے اُٹھ کر آسمانی رفعتوں کو چھونے لگتے ہیں۔ میں ستاروں اور بھیڑیوں کی خوفناک آوازوں کو پیچھے بہت پیچھے چھوڑ جاتا ہوں!

مناظر عاشق ہرگانوی کی تین نئی کتابیں

"امتزاج"

۲۰ روپے

تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ

"فن تنقید اور تنقیدی مضامین"

۶ روپے

انتقادی ادب میں اضافہ

"تنقیدی دبستان"

۱۲ روپے

دبستانِ تنقید پر مکمل کتاب

پتہ: مکتبہ کوہسار، برہ پورہ، بھاگلپور (بہار)

جمیل آذر

جمیل آذر اُردو انشائیہ نگاروں کی صفِ اوّل میں شامل ہیں۔ تاریخی اعتبار سے بھی انہیں یہ اہمیت حاصل ہے کہ جب انشائیہ اور انشائیہ نگاری میں بہت کم لوگ دلچسپی لے رہے تھے تو انہوں نے مشتاق قمر کے ساتھ مل کر انشائیہ کے چراغ کو تا دیر جلانے کا اہتمام کیا اور ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کئے بغیر بڑی خاموشی لیکن بڑی لگن کے ساتھ انشائیے لکھتے چلے گئے تا آنکہ قارئین کے اذہان پر جمی ہوئی برف پگھلی اور انہیں احساس ہوا کہ جس اُردو کے ایک گمنام سے گوشے میں جو ننھا سا پودا نظر آیا کرتا تھا وہ اب پھولوں سے لد گیا ہے۔

جمیل آذر کے انشائیوں کو پڑھتے ہوئے قاری کو سب سے پہلے ان کے اسلوب کی کھلی کھلی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ پھر اُسے محسوس ہوتا ہے کہ جمیل آذر روزمرّہ کی چھوٹی چھوٹی اشیاء، واقعات اور تجربات میں ایک جہانِ معنی دریافت کرنے پر پورے طرح قادر ہیں۔ جمیل آذر کے انشائیوں کا ایک اور وصف یہ ہے کہ ان میں خیال کی تازگی کو بوجھل مقصدیت پر فوقیت حاصل ہے۔ ہمارے ادب کا ایک مقبول نعرہ ہے کہ ادب کو عصر کے معاملات کا آئینہ دار ہونا چاہیئے۔ بڑا خوبصورت نعرہ ہے اور بعض حلقوں نے اسے ادب کی پرکھ کے سلسلے میں ایک میزان بھی قرار دیا ہے۔ مگر انشائیہ نگار کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ چند لمحوں کے لیے اُسے اتنی بڑی اور بھاری ڈیوٹی سے سبکدوش کر دیا جائے اور اُسے وہ "لمحۂ آزادی" عطا کیا جائے جس میں روح اپنے زندان سے باہر آ کر اُڑنے کے لئے پَر تولتی ہے۔ چنانچہ جمیل آذر کے انشائیوں کا یہ وصف قابلِ ذکر ہے کہ ان میں لمحۂ آزادی کا کوندا اپنے سارے بانکپن اور آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوا ہے۔ نتیجتہً انشائیہ نگار کی شخصیت انبوہ سے بالکل الگ اور منفرد دکھائی دینے لگی ہے۔

(و - ا)

نیم پلیٹ

جمیل آذر

......نیم پلیٹ پڑھنا میری محبوب ترین ہابی ہے۔" یہ بات جب میں نے ایک انٹرویو میں صاحبِ صدر سے کہی تو وہ ایک طنز آمیز ہنسی برلب وہن لاکر بولے "بھئی یہ تو کوئی ہابی نہیں!......" ان کا خیال تھا کہ نیم پلیٹ پڑھنے کا شغل ایک غیر دانشمندانہ اور احمقانہ فعل ہے۔ مگر میرا آج بھی یہ خیال ہے کہ اس سے بڑھ کر دلچسپ فکر انگیز اور مفید شغل اور کوئی نہیں کہ بغیر افراد کو ملے ہم ان کی شخصیت سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ان کے شعور اور تحت الشعور میں تیراکی کی مشق کر سکتے ہیں۔ ان کے حمام میں جھانک سکتے ہیں۔ صاحبِ صدر نے مجھے کیوں منتخب نہیں کیا اس کا مجھے ہرگز افسوس نہیں ویسے مجھے آج تک کسی انٹرویو میں کامیاب ہونے کا شرف ہی کب حاصل ہوا ہے؟

یقین جانیے کہ اپنے شہر کی قریب قریب تمام کوٹھیوں، مکانوں اور دکانوں کی نیم پلیٹوں اور سائن بورڈوں کے حروف منہ زبانی یاد ہیں اگر یونیورسٹی میں کبھی ایسا شعبہ قائم ہو گیا جس کا تعلق نیم پلیٹوں اور سائن بورڈوں سے ہو اور جیسا کہ مجھے امید ہے ایسا شعبہ مستقبل قریب میں ضرور قائم ہوگا، تو میں نہ صرف اس کا طالب علم ہونے کا اعزاز حاصل کروں گا بلکہ یقیناً اس فن میں گولڈ میڈل پانے کی بھی کوشش کروں گا۔ سائن بورڈ اور نیم پلیٹ میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ اگر سائن بورڈ، ادویات و ملبوسات یا مشروبات و ماکولات کا اشتہار ہے تو نیم پلیٹ صاحبِ خانہ کی شخصیت اور ذہنیت کا۔ مقصد دونوں کا ایک ہی ہے یوں سمجھ لیجئے کہ کسی کوکا کولا کا اشتہار ایک لمبے چوڑے سائن بورڈ پر کسی چوک کی زینت یا کسی عظیم اور بلند قامت بلڈنگ کے اوپر اس طرح لگا ہوتا ہے کہ دن میں ایک میل کے فاصلے سے اور رات کو کئی میل کے فاصلے سے نظر آجاتا ہے۔ خدا بھلا کرے ان موجدوں کا جنہوں نے نیون لائٹ کی ایجاد سے اشتہار بازی یا سازی کے شوق کو اتنا فروغ بخشا کہ رات کی گمبھیر تاریکی میں جگمگ جگمگ کرتے سائن بورڈ راہگیر کی توجہ اس طرح اپنی جانب منعطف کرتے ہیں جس طرح کوئی حسین اور چنچل دوشیزہ اپنے اندازِ دلربائی سے۔ بس بازاروں کے یہی دلفریب اور جاذبِ نظر سائن بورڈ محلوں اور بستیوں کے مکانوں اور کوٹھیوں کی پیشانی پر نیم پلیٹوں کی صورت اختیار کر کے جلوہ نما ہو جاتے ہیں۔

چند روز سے میرے پڑوس میں ایک صاحب نے اپنے نو تعمیر شدہ مکان کے باہر بڑی فنکاری سے ایک نیم پلیٹ آویزاں کر رکھی ہے۔ پلیٹ پر لکھے ہوئے حروف کو حوادثِ روزگار سے محفوظ کرنے کے لیے اس پر ایک شیشہ چڑھا دیا گیا ہے جیسے کوئی تصویر فریم میں لگا دی گئی ہو اور ملکم لیٹر کے سائن بورڈ پر عمل کرتے ہوئے شیشے کے اندر ایک عدد چھوٹا سا بلب بھی نصب

کر دیا گیا ہے۔ بات کرتے وقت عجب عشوہ و انداز سے آنکھ مچولی کرتا ہے اور پھر راہ رو سے کچھ اس طور سے نظرِ التفات کی درخواست کرتا ہے کہ آپ صاحبِ خانہ کے نام کو پڑھنے پر خود کو مجبور اور بے بس پاتے ہیں۔ ان صاحب کی قوتِ اختراع کی داد دینا پڑتی ہے اور وہ وقت دور نہیں جب اور باذوق حضرات ان کی تقلید میں ایسے ہی اعجازِ پُر کمالات کا مظاہرہ کریں گے فی الحال تو میرے خیال میں یہ صاحب تمام اہلِ ذوق حضرات پر سبقت لے گئے ہیں اگر میں کسی پرائز ٹریبونل کا ممبر ہوتا تو انہیں اس سال کا پہلا انعام دلوانے کے لیے تمام ہتھکنڈے استعمال کرتا۔

کسی نے یہ بات بالکل غلط کہی ہے کہ چہرہ شخصیت کا آئینہ ہے۔ میں کہتا ہوں نیم پلیٹ شخصیت کا آئینہ ہے۔ اگر فرائیڈ زندہ ہوتا تو وہ میری رائے سے ضرور متفق ہوتا کیونکہ تحت الشعور کی لہروں کی دریافت کا سہرا اُس کے سر ہے۔ آپ کسی کی ظاہری شکل و صورت سے دھوکا کھا سکتے ہیں جیسا کہ محاورہ عام ہے۔ لیکن نیم پلیٹ تو ایک منہ بولتی تصویر ہے۔ تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد کے مصداق نیم پلیٹ کے حروف آپ سے سرگوشی کے انداز میں کچھ کہتے ہیں اور صاحبِ خانہ کی شخصیت کے مستور اور لطیف گوشے آپ پر اس طرح منکشف کرتے ہیں جس طرح کوئی مریض کسی ماہرِ نفسیات کے سامنے اپنے خبثِ باطن کو۔

جونہی میں کسی نیم پلیٹ کو پڑھتا ہوں تو مجھ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو بہت جلد محبت یا نفرت دوستی یا دشمنی میں بدل جاتی ہے۔ جب میں اس قبیل کی کوئی نیم پلیٹ دیکھتا ہوں جس پر اسمِ گرامی یوں لکھا ہوتا ہے!

"جناب ح ع صاحبزادہ یا نوابزادہ یا پیرزادہ"

تو مجھے اُن صاحب کی کم مائیگی اور تہی دامانی پر ترس آنے لگتا ہے کہ بے چارے خود تو کوئی کمال حاصل نہ کر سکے اور اب بزرگوں کے نام سے شہرت کے طلبگار ہیں اور جب میں کسی مبارک نام کے ساتھ القابات و خطابات، تمغہ جات و انعامات کی ایک طویل فہرست پڑھتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میکیاولی یا چنگیز آنجہانی کی روح کو مزید ایصالِ ثواب ہو رہا ہو کہ ان جہاندیدہ بزرگوں کے زریں اصولوں پر چل کر بیسویں صدی کے سیاستدانوں نے کما حقہٗ فائدہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ ان میں سے کسی نام نامی کے ساتھ اگر تعلیمی ڈگریاں زرِ جمع بھی بیشتر آویزاں ہوتی ہیں اچھیاں دیکھتا ہوں تو اپنی ایم اے کی اکلوتی ڈگری سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں اور پھر تادیر اپنے ان دوستوں کی راہ دیکھتا رہتا ہوں جو مجھے سمجھا بجھا کر اس خطرناک ارادے سے باز رکھیں۔

ایک صاحب کی نیم پلیٹ برسوں میرے زیرِ مطالعہ رہی۔ میں نے ان کی پلیٹ کی "سطحِ مرتفع" پر کئی انقلابات رونما ہوتے دیکھے۔ ان خارجی انقلابات کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے بارے میں میری رائے میں بھی خوشگوار اور ناخوشگوار تبدیلیاں آتی رہیں۔ ان انقلابات کا ظہور "سطحِ مرتفع" پر کچھ طرح ہوتا رہا کہ کبھی نیم پلیٹ کے حروف سے ان کے خاندانی تفاخر کا اظہار جلی الفاظ میں ہوا کبھی تعلیمی برتری کا پرچار ہوا اور کبھی اعلیٰ ملازمت کے حصول پر عظمت کا علم بلند ہوا۔ لیکن عرصہ دراز کے بعد ایک ایسا انقلاب پلیٹ کے حروف سے لے کر رنگ و روغن تک میں رونما ہوا کہ میری ناپسندیدگی پسندیدگی میں، نفرت محبت میں اور دشمنی دوستی میں مبدل ہو گئی۔ اب نیم پلیٹ پر نہ تو طویل و دراز القابات تھے اور نہ خاندانی جاہ و حشمت کا دمدمہ اور نہ شوخ اور بھڑکیلے رنگ و روغن کی تہ۔ بس صاف و شفاف سطح پر ان کا مختصر نام "ط ق م" مرقوم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب انہوں نے تمام رسمی اور دنیوی لوازم اور فروعات سے ایک ذہنی [illegible]

کرب کے بعد نجات حاصل کر لی تھی اعصاب وہ فتح و نصرت، عزم و استقلال اور انسانیت کی معراج پر پہنچ گئے تھے چنانچہ اب میرے دل میں ان کے لیے محبت اور عقیدت کے پھول ہیں۔ جن کا علم انہیں آج تک نہیں ہوا۔

تعجب ہے کہ افلاطون نے اپنے فلسفہ اعیان نامشہود میں نیم پلیٹ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ویسے مجھے افلاطون کے نظریۂ نقل پر مکمل اعتقاد ہے۔ فی الواقع ہم اصل کی نقل نہیں تو اور کیا ہیں اور یہ نیم پلیٹ لوحِ محفوظ کی ایک نقل ہی تو ہے۔ پس جو تبدیلی نیم پلیٹ پر ظہور میں آتی ہے وہ پہلے لوحِ محفوظ میں پیدا ہوتی ہے۔ تغیر و تبدل ایک فطری اور لازمی امر ہے۔ یہ تغیر و تبدل کا خوف ہی تو ہے جس نے مجھے آج تک یہ موقع نہیں دیا کہ میں بھی گھر کی چار دیواری کے باہر کوئی خوبصورت نیم پلیٹ آویزاں کر دوں۔ ویسے میں نے ابھی تک نیم پلیٹ آویزاں کرنے کی کوئی خاص ضرورت محسوس بھی نہیں کی۔ میرے مکان پر میونسپل کمیٹی نے بڑے اہتمام سے ایک ٹین کی سیاہ مربع نما مختصر سی پلیٹ پر جلی حروف میں نمبر لگا رکھا ہے جو ڈاکیہ کی راہ نمائی کے لیے کافی ہے۔ میرے خطوط پر اگر میرا نام نہ بھی لکھیں تو وہ محض مکان کے نمبر کا سہارا لے کر منزل تک پہنچ جاتے ہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ میرا نام اتنا ضروری نہیں جتنا میرے مکان کا نمبر۔ دوستوں اور عزیزوں کو میرا مکان شاید اپنے مکان سے بھی زیادہ یاد ہے اب رہا ناواقف حضرات کا سوال تو انہیں میری پروا نہیں مجھے ان کی فکر کیوں دامنگیر ہو لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مجھے نیم پلیٹ پسند ہی نہیں۔ اگر میں نیم پلیٹ پسند نہ کرتا تو یہ میری ہابی کیونکر بنتی۔ مجھے اپنی نیم پلیٹ سے اتنی ہی محبت ہے جتنی اپنی ذات سے۔ نیم پلیٹ بنوانے کا شوق تو میرے دل میں اس روز سے چٹکیاں لینے لگا تھا۔ جب میں نے ایک مرتبہ ٹیکسلا کے عجائب گھر میں اشوک کے کتبے دیکھے تھے۔ عجیب ماہر نفسیات تھا یہ راجہ جس نے ڈھائی ہزار سال قبل سنگ میں پرچار کا وہ طریق ایجاد کیا جسے بیسویں صدی کے دانش ور اب اختیار کرنے لگے ہیں۔ میں نے اشوک کے مستطیل نما مختصر سے کتبہ کی نقل میں ایک نہایت دیدہ زیب نیم پلیٹ ایرانی سنگِ مرمر کی بنوا کر اسے ایک وصیت کے ہمراہ اپنے چوبی بکس میں مقفل کر رکھا ہے۔ وصیت یہ ہے کہ میرے مرنے کے بعد یہ نیم پلیٹ میری قبر کے سرہانے جڑ دی جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نیم پلیٹ یا کتبہ کا اصل مقام وہی ہے کیونکہ قبر میں پہنچنے کے بعد مجھ میں کسی شخصی تبدیلی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ ویسے احباب و اقرباء کی سہولت کے لیے بھی قبر پر نیم پلیٹ کا ہونا ضروری ہے لیکن نیم پلیٹ وہی ہوگی جو مجھے پسند ہے مجھے یہ بات ہرگز گوارا نہیں کہ مرنے کے بعد عزیز و اقارب اپنی پسند کی نیم پلیٹ میری قبر پر لگائیں۔

تقی حسین خسرو

نیم پلیٹ — تجزیاتی مطالعہ

خالی خولی مکان اپنے مکین کے بارے میں کسی قسم کا کوئی کلیو (CLUE) نہیں دیتا۔ سوائے اس کے کہ یہ چونے اور گارے سے عبارت عمارت اگر خوش وضع اور ڈھنگ کی بنی ہوئی ہو تو خیال ہوتا ہے کہ اس مکان کا مکین یقیناً کوئی خوش ذوق آدمی ہوگا۔ بس —— اس کے آگے مکان کے مکین کا کوئی تصور قائم نہیں ہوتا۔ اس طرح مکین کی شخصیت پس منظر میں چلی جاتی ہے اور مکان اپنے رنگ و روغن کے ساتھ اُبھر کر سامنے آکھڑا ہوتا ہے — برخلاف اس کے وہ مکان جس کی پیشانی پر نیم پلیٹ آویزاں ہو اپنی تمام خوش وضعی کے باوجود ایک ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اُس کے مکین کی شخصیت جو نیم پلیٹ پر احتیاط سے لکھے نام کے پردے میں کسی اسرار کی طرح پوشیدہ ہوتی ہے اپنے تمام امکانات کے ساتھ اُبھر کر سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ مگر —— نیم پلیٹ کی اس اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے ایک انشائیہ نگار کی نظر چاہیئے کہ وہ بظاہر معمولی چیزوں کا غیر معمولی پہلو نہ صرف دیکھنے پر قادر ہوتا ہے بلکہ دکھانے پر بھی! جمیل آذر نے اپنے خوبصورت انشائیے "نیم پلیٹ" میں اپنی اسی ہنر مندی کا بڑی کامیابی سے اظہار کیا ہے۔

جمیل آذر جب اپنے انشائیے کے ابتدا ہی میں "نیم پلیٹ پڑھنا میری محبوب ترین ہابی ہے" کہتے ہیں تو ہابی کے حوالے سے ذہن میں خوبصورت اور ہلکے پھلکے تجربوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور ہم زندگی کے بوجھل پن کو بھول کر تھوڑی دیر کے لیے ایک ایسی فضا میں سانس لینے لگتے ہیں جو تتلی کے رنگوں کی طرح خوبصورت اور ڈاک کے ٹکٹوں کی طرح دلآویز ہے۔ اور جہاں فرصت ہی فرصت ہے۔ اور پھر یہ ہلکی پھلکی فضا مستحکم ہوتی چلی جاتی ہے جب انشائیہ نگار کو کسی چوک کے نکڑ پر لگے ہوئے کولا کے اشتہار میں یا سڑک کے کنارے لگے ہوئے سائن بورڈ میں اور نیم پلیٹ میں ایک تعلق سا نظر آتا ہے۔

جمیل آذر نیم پلیٹ کے حوالے سے شخصیت کو سمجھنے کی بڑی دلچسپ کوشش کرتے نظر آتے ہیں کہ نیم پلیٹ اُن کے لیے کہیں شخصیت کا آئینہ ہے اور کہیں منہ بولتی تصویر! چنانچہ بظاہر بے جان نیم پلیٹ اُن سے سرگوشی کرنے پر مجبور نظر آتی ہے۔ اور صاحب خانہ کے بارے میں بہت سی گفتنی اور ناگفتنی باتیں انہیں بتاتی ہے۔ اور یہ باتیں ایک حساس آدمی کی طرح اُن میں بھی محبت یا نفرت، دوستی یا دشمنی کے جذبات بیدار کرتی ہیں۔ مگر جو معیار اُن کے پیش نظر ہیں وہ اُن کے طرزِ تحریر ہی کی طرح پسندیدہ ہیں کہ اُنہیں خاندانی تفاخر اور دنیاوی وجاہت کا اظہار ناپسند ہے۔ اس سلسلے میں جب وہ بعض معروف فلسفیوں کا حوالہ دیتے ہیں تو اُن کی بات زیادہ واضح اور مؤثر ہو جاتی ہے۔ وہاں انشائیہ نگار کے لہجے میں کسی قدر کاٹ پیدا ہو گئی ہے جہاں وہ نیم پلیٹ پر درج اُن ری ڈگریوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر ایک مشاق انشائیہ نگار کی طرح وہ انشائیے کی فضا کو بوجھل نہیں ہونے دیتے۔ اور محبوب ترین ہابی والی فضا کو کامیابی سے برقرار رکھتے ہیں۔

انشائیے کا وہ حصّہ زیادہ متاثر کرتا ہے جہاں انشائیہ نگار نیم پلیٹ کی سطح مرتفع پر انقلابات زمانہ کا ذکر کرتا ہے اور اس سے شخصیت میں رونما ہوتی تبدیلیوں کا اندازہ لگاتا ہے۔ شخصیت میں پیدا ہونے والا عمق انسانی زندگی کے مختلف ادوار کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔

انشائیہ نگار کی فکرِ رسا کی اُس وقت داد دینے کو جی چاہتا ہے جب وہ افلاطون کے نظریۂ نقل کے زیرِ اثر نیم پلیٹ سے لوحِ محفوظ تک جا پہنچتا ہے ۔ اب دیکھیے کسی مکان پر لگی ایک معمولی سی نیم پلیٹ کیا سے کیا ہو گئی ہے ۔ اور اس طرح انشائیہ نگار نے ایک معمولی چیز کا غیر معمولی پہلو دکھانے میں کس عمدگی سے کامیابی حاصل کی ہے ۔

نیم پلیٹ کو پرچار طریقہ کہہ کر جمیل آذر نے ایک تاریخی واقعے کی طرف بڑی عمدگی سے اشارہ کیا ہے ۔ یہاں وہ پہلے ـــــ بہت عارضی طور پر سہی مگر محسوس حد تک تغیّر و تبدّل کے قانون کے پیشِ نظر نیم پلیٹ سے اپنی بے زاری کا اظہار کرتے محسوس ہوتے ہیں ۔ اس چھوٹی سی سیاہ مربع نما ٹین کی پلیٹ کی موجودگی میں جس پر جلی ہندسوں میں مکان کا نمبر لکھا ہے نیم پلیٹ انہیں غیر ضروری سی لگتی ہے کہ ڈاکیے کے لیے اور عزیزوں، دوستوں کے لیے مکان کا نمبر ان کے نام سے زیادہ اہم ہے ۔ مگر پھر ـــــ اُنہیں کبھی عجائب گھر میں دیکھے ہوئے اشوک کے کتبے یاد آتے ہیں اور خیال آتا ہے کہ نیم پلیٹ بنوانے کا شوق تو ان کے دل میں اُسی دن سے چٹکیاں لیتا رہا ہے ۔ اور اُسی دن سے نیم پلیٹ اُن کی ہابی رہی ہے ۔

انشائیے کا وہ حصہ بھی خوبصورت اور متاثر کُن ہے جس میں انشائیہ نگار تغیّر و تبدّل کے قانون کے تحت نیم پلیٹ سے متعلق اپنی آرزو کا ذکر کرتا ہے اور یہاں ناگزیر طور پر اُسے قبر کا کتبہ یاد آتا ہے جو اس قانون سے ماورا ہوتا ہے ۔ مگر یہاں ایسا لگتا ہے جیسے انشائیہ نگار نے غلام عبّاس کے مشہور افسانے 'کتبہ' یا شاید تصدق حسین خالد کی نظم "ایک کتبہ" کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کی ہے ۔

دو بھگوڑے سَرن اور عاصم کی کہانی ۔ جنہوں نے تقسیم کے بعد ڈبل ہجرت کی ۔ انڈیا ، پاکستان ، جرمنی ، ہالینڈ اور انگلینڈ کے پس منظر میں دِل کو چھُو جانے والی داستان ۔

ہرچرن چاولہ کا نیا ناول

بھٹکے ہوئے لوگ

ناشر

سیمانت پرکاش

۹۲۲ روہیلا سٹریٹ ، تراہا بہرام ۔ دریا گنج ۔ نئی دہلی ۔ بھارت

احمد جمال پاشا

ایک موضوع — تین زاویے

(موضوع: بور BORE)

مضمون

ہمارے سماج میں بیشتر لوگ آپ کو ایسے ملیں گے جو ترقی نہیں کر سکتے۔ ایسے پچھڑے ہوئے لوگوں کا کام بس یہی رہ گیا ہے کہ وہ گزرے ہوئے زمانے اور اپنے بزرگوں کے اچھے وقتوں کو یاد کرتے رہیں۔ وہ اس سے بالکل لاعلم رہتے ہیں کہ دنیا کتنی ترقی پر ہے۔ انسان کہاں سے کہاں پہنچ گیا، زمانے کا رُخ اور تقاضے کیا ہیں؟ پرانے زمانے میں نہ اتنی آبادی تھی نہ اتنے مسائل تھے۔ بس سیدھی سادی زندگی بے فکری سے کم آمدنی میں بسر ہو جاتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کی بھی بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی۔ اس لیے اس ترقی کے تیز رفتار زمانے میں ایسی بے وقت کی شہنائی بجانے والوں کو ہم بور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

بور اُس آدمی کو کہا جاتا ہے جو بے موقع، بے مطلب گفتگو کرتا اور تہذیب و شرافت کے خلاف، ہماری توقعات کے خلاف نامناسب حرکتیں کیا کرتا ہے۔

بور میں بہت سی اور بھی کمزوریاں اور خامیاں ہوا کرتی ہیں جیسے کہ سماجی طور پر اپنے سے بڑے اور بااثر یا باحیثیت لوگوں، امیروں اور افسروں کی خوشامد اور اپنے برابر والوں یا اپنے سے کمزوروں کے سامنے اکڑنا، اُن سے اپنی خوشامد کروانے کی کوشش کرنا، شیخی مارنا، غرور اور گھمنڈ سے کام لینا، چغلی، غیبت اور منافقت کرنا پدرم سلطان اور اپنے منہ میاں مٹھو بننا جیسی ناپسندیدہ حرکتیں اور دل آزاری کے گناہ کا مرتکب ہوتا رہتا ہے۔ بور ایسی ہی بے شمار غلطیاں کرتا رہتا ہے جن کا ذکر آگے آئے گا۔ بس فی الحال یوں سمجھ لو کہ بور ایسا بیوقوف ہوتا ہے جو اپنے آپ کو سب سے زیادہ عقلمند اور کوے سے زیادہ چالاک سمجھتا ہے۔ لوگ مروتاً یا محض رفع شر کی خاطر اسے کسی نہ کسی طرح برداشت کرتے ہیں۔ اس لیے اگر کسی کا سابقہ اس زمانے میں کسی معقول آدمی سے پڑے جو تہذیب اور شرافت کے دائرے میں رہتا ہے تو اسے خوش قسمت سمجھا جاتا ہے۔

بور سے اتنا فائدہ تو ضرور ہے کہ ہمیں اس سے پرانے زمانے کی یا غیر متعلق باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ اور ہماری تھوڑی بہت تفریح کا سامان ہو جاتا ہے اسی لیے بور ہمارے ارد گرد منڈلانے دیا جاتا ہے مگر چونکہ یہ ہزماسٹرز وائس کے ریکارڈ کی طرح ایک ہی طرح کی باتوں کو بار بار دہراتا رہتا ہے، اور اس کے دماغ کے ریکارڈ کی سوئی ایک ہی جگہ پھنسی رہتی ہے اسی لیے سننے والوں کو اس سے بڑی اُلجھن اور وحشت ہوا کرتی ہے۔

اچھے بھلے قابل اور معقول لوگ بڑھاپے میں بور ہو جاتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ عمر طبعی پر پہنچنے کے بعد اعصاب کمزور ہو جایا کرتے ہیں۔ یادداشت خراب ہو جاتی ہے نسیان کا عارضہ ہو جاتا ہے، موجودہ زمانے سے وہ اپنے حالات اور پسند کی وجہ سے غیر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اس لیے صرف گزرے ہوئے زمانے کی خاص خاص باتیں اُنہیں یاد رہ جاتی ہیں جنہیں وہ اپنے ملاقاتیوں سے دن رات دہراتے رہتے ہیں۔ ایسی باتیں جو اب مذاق معلوم ہوتی ہیں اُن کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ جو لوگ بڑھاپے میں پڑھنے کی عادت قائم نہیں رکھ سکتے وہ اپنے آپ کو اس لیے دہرانے لگتے ہیں کہ نہ پڑھنے کی وجہ سے اُنہیں نئی نئی باتیں معلوم نہیں

ہو پاتیں۔

بور ہم اُن کو بھی کہتے ہیں جو وقت بے وقت اپنے ملاقاتیوں کا وقت برباد کرتے رہتے ہیں۔ انہیں یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ دوست یا کسی دوسرے کے گھر پر جانے کے کیا آداب ہیں؟۔ آدمی کو کسی کے یہاں کس وقت جانا چاہیے، کتنی دیر کسی کے یہاں بیٹھنا چاہیے، اُس کے جانے سے دوسرے کے وقت یا کاموں میں حرج واقع نہ ہو۔

بور کے نام سے اکثر شاعر لوگوں کو یاد کیا جاتا ہے اوّل تو یہ کہ ہم یہ حکم تمام شاعروں کے لیے نہیں لگا سکتے دوسرے شاعر بھی بڑے معقول ہوا کرتے ہیں لیکن کسی حد تک مقامی شعراء میں بور کرنے کی خاصی صلاحیت پائی جاتی ہے کیونکہ شاعر کا مسئلہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا کلام سُنانا ہوتا ہے۔ ایسے شاعر جن کے یہاں سامع کا مسئلہ ہے، وہ زبردستی کلام سنانے کی کمزوری میں مبتلا اکثر دیکھے گئے ہیں۔ مشاعروں میں نہ بلوائے جانے اور ناقدری کی صورت میں بالعموم شاعر بور ہو جاتا ہے۔ اور صرف اپنی شاعری اور اپنے بارے میں باتیں کرنے میں بہت زیادہ وقت دوسروں کا برباد کرنے لگتا ہے۔ اور بہ حیثیت بور کے آزارِ خلق کا باعث ہوتا ہے۔ ایسے مقامی شاعر خواہ اُستاد کا کلام پڑھتے ہوں یا دوسروں کا۔ خواہ موزوں مصرعہ لگانے کی صلاحیت سے آزاد ہوں ہر بات ہمیشہ نکروفن سے شروع کرتے ہیں۔ اور آپ اگر ان کا کلام یا ان کی باتیں سننے سے انکار کر دیں تو وہ تشدد پر اُتر آتے ہیں۔

بور تو وہ لوگ بھی ہوتے ہیں خواہ وہ بچے ہوں یا بوڑھے جن کی باتوں میں تکرار ہوا کرتی ہے۔ اور ہمیشہ ایک سی باتیں دُہرا کر یکسانیت اور تکرار سے بوریت پیدا کیا کرتے ہیں۔

بور وہ لوگ بہت زیادہ ثابت ہوتے ہیں جو دوسروں کا فضول وقت برباد کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کو خوش کرنے کے لیے دوسروں کی بُرائی کرتے اور غیبت کی کیچڑ میں ہاتھ دھوتے ہیں اور منافقت کی گندگی پھیلاتے ہیں۔ ان کے دل حسد اور کینہ کی تاریکی میں بھٹی کی طرح کھولتے رہتے ہیں۔ وہ معاف کرنے پر بدلہ لینے کو ترجیح دیتے ہیں اور دنیا کے ساتھ عاقبت بھی خراب کر لیتے ہیں۔

بور تو وہ بھی ہوتا ہے جو اپنا کام نکالنے کے لیے آپ کی طرح طرح سے خوشامد کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے کہا گیا ہے کہ چڑھی یار کس کے دم لگا کھسکے۔ ایسے لوگ تو سفر کے ساتھی ہوا کرتے ہیں۔ اِدھر کام بننے کی منزل آئی اور غائب ہو لیے۔ مگر ہر شخص کہیں نہ کہیں دوسروں کو بھی بور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور وہ اپنے افسر کو خوش کرنے کے لیے طرح طرح کی خوشامدانہ حرکتیں کیا کرتا ہے۔ پہلے دوسروں کی مصاحبت کرتا ہے پھر چاہتا ہے کہ لوگ اُس کی مصاحبت کریں۔

بور کو برداشت کرنا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ فرض کیجیے کہ کوئی بور آپ کو اپنا تازہ ترین ناول سُنا رہا ہو۔ ناول سُنتے سُنتے آپ اُونگھنے لگیں مگر وہ ناول سُناتا رہے۔ آپ سو جائیں مگر وہ سناتا رہے یا جگا جگا کر سنائے تو آپ اس کے اس فعل کو بور کرنا قرار دیں گے۔ کچھ لوگ ناول سُناتے ہیں کچھ دیوان، مگر کچھ جب اپنی داستان چھیڑتے ہیں تو طلسم ہوشربا کے دفتر کو بھی مات دے دیتے ہیں۔ ایسے لوگ سراسر بور ہوا کرتے ہیں۔ جب کسی انسان کا کسی ایسے عاقبت نا اندیش بور سے سابقہ پڑتا ہے تو اُس کو سخت اُلجھن اور گھٹن محسوس ہوا کرتی ہے پھر اُسے اختلاج ہونے لگتا ہے۔ جماہیاں آنے لگتی ہیں۔ بور کا شکار بے ہوش ہو جاتا یا سو جاتا ہے۔ مگر بور اپنا غیر دلچسپ قصّہ جاری رکھتا ہے۔

بور کرنا اس لیے بُرا سمجھا جاتا ہے کہ ایسے لوگ افواہیں پھیلاتے، فضول کے لڑائی جھگڑے پیدا کرتے ہیں۔

بور کو جمود کی علامت اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ اُس کی موجودگی میں وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ یہ آدمی کی سمجھداری ہے کہ وہ کسی بھی بور سے ٹکراتا نہیں بلکہ اُسے خوش اسلوبی سے ٹالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر ایسا تو سمجھدار اور پڑھے لکھے لوگ کرتے ہیں۔ جاہل تو گُدّی میں ہاتھ دے کر اُسے نکال باہر کرتے ہیں اس لیے فی زمانہ بور کی گنجائش صرف پڑھے لکھوں اور عورتوں میں باقی رہ گئی ہے۔ علم کے متلاشی اور خواتین کو نئی نئی باتوں اور تیرے میرے کی زیادہ کھوج ہوا کرتی ہے۔

اس لیے صحیح طور پر وہی بور کے قدر داں بھی ہوا کرتے ہیں۔ شریف آدمی ہی خراب آدمی کو زیادہ برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے بور بھی اچھوں ہی میں زیادہ پایا جاتا ہے۔

زندگی کا کوئی ایسا میدان ابھی دریافت نہیں ہو سکا ہے جس میں بور نہ پایا جاتا ہو۔ اسی لیے بور کرنے کے طریقے بھی مختلف ہوا کرتے ہیں کسی کی لیڈری اور طول طویل بے مغز تقریر سے ہم بور ہوتے ہیں تو کسی اہلِ قلم کی تحریر سے کسی کی باتوں سے تو کسی کی بے جا حرکتوں سے۔

بور جس طرح آپ کو بور کرتا ہے وہ خود ایک فن ہے۔ کس طرح وہ بور کرنے کی تمہید باندھتا ہے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے ساری دنیا چلاتی رہ جائے مگر وہ آپ کو کسی نہ کسی طرح بور کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس لیے میرے نزدیک بور ایک معصوم، بے ضرر اور کامیاب انسان ہی نہیں بہت بڑا فنکار بھی ہے۔ جس کا فن بور کرنا ہے جس میں وہ ہمیں سب سے زیادہ کامیاب نظر آتا ہے اسی لیے فی زمانہ بور سب سے بڑا فنکار ہے۔

طنزیہ مزاحیہ مضمون

سماج جس میں ہم جینے کے لیے مرتے ہیں، اس میں اکثریت تو ضرورت سے زیادہ عقلمند حضرات ہی کی ہے جس کے خوشگوار نتائج سے مجھ سے زیادہ آپ دوچار ہوں گے اسی لیے اگر کوئی بھلا آدمی آپ سے ٹکرا جائے اور آپ کو بور نہ کرے تو اس مہنگائی اور بے مروتی کے دور میں آپ بہت سستے چھوٹے، اس کو غنیمت جانیے کہ آدمی نہ ملا، آپ کی قسمت کی لاٹری کھل گئی۔ ورنہ یقین جانیے کہ صبح سے شام تک ہم سے ایک سے ایک جلندر بور ٹکراتا رہتا ہے۔ جیسے دیکھیے صبح صبح آنکھیں ملتا، عذر کے بستے بغل میں دبائے، عذابِ قبر کی طرح نازل ہونے لگتا ہے۔

دور کیوں جائیے۔ آج ہی کی بات ہے ہم کو مونگ پھلی ٹونگتے دیکھ کر ایک صاحب پہلے تو اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس امکان پر غور کرتے رہے کہ آدمی بھی جگالی کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے؟ پھر بولے

"ارے واہ صاحب! واہ واہ! واہ! آپ اور مونگ پھلی؟ آپ کے دادا جان قبلہ عرش آشیانی تو جیبوں میں بادام بھرے رکھتے۔ بادام۔!"

دوسرے قبر رسیدہ بزرگ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے فرمایا۔

"میاں پچھلے زمانے تو کب کے ہوا ہو گئے!۔ اب وہ اگلی سی بات کہاں؟ میرے نانا مرحوم کو تو کبھی پتہ بھی نہ چل سکا کہ اُن کے گاؤں کے باہر بھی کچھ ہے! اُن کی دنیا تو چوپال تھی آخر وقت تک گن کر نہ بتا سکے کہ ایک روپے میں پیسے کتنے ہوتے ہیں۔"

دونوں بزرگ گھنٹوں ہمیں ماضی کی کھائیاں پھلانگتے اور کنوئیں جھنکواتے رہے ہماری بوریت وحشت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اُلجھن سے دل میں پنکھے لگے ہوئے تھے کہ اگر اب بھی یہ دونوں دفعان نہ ہوئے تو اُس "علامہ اقبال سیمینار" کا کیا ہوگا جس کے ہم کنوینر ہیں۔ کہیں بلا دولہا کی برات والا معاملہ نہ ہو جائے! ہماری موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک صاحب مزے لے لے کر دوسرے صاحب کو پرانے لکھنؤ کی سیر کرانے میں مصروف تھے۔

ایک دفعہ احاطہ مرزا علی خاں کے اوپر سے تلنگوں کا ہوائی جہاز محلے کی چھتوں کے اوپر سے گزر گیا، تو بادشاہ نواب نے بڑے لاٹ صاحب کے پاس جا کر دہائی دی۔ "سرکار بہادر ہم لٹ گئے محلے بھر کی بہو بیٹیوں کی بے پردگی ہو گئی!۔"

بلکہ صاحب کا زمانہ تھا۔ انہوں نے کہا۔

"ویل نواب تم اطمینان رکھو۔ اگر اب اُس نے اُدھر کا رُخ بھی کیا تو ہم اُسے پھانسی پر چڑھا دیں گے۔!" تب صاحب بڑے لاٹ بہادر کے سمجھانے بجھانے پر تشفی ہوا، ورنہ چل گئے تھے گے۔"

مَیں سب سے زیادہ بور اُن لوگوں سے ہوتا ہوں جو میرا وقت برباد کرنے کے لیے بلا کسی ٹائم ٹیبل کے میرا گھیراؤ کرتے رہتے ہیں۔ اُن میں ایک صاحب بڑے ہی دُبلے پتلے لمبے سینگ سلائی، سفید ٹوپی، سفید شیروانی کے اندر گردش کرتا ہوا سفید خون، سفید مفلر، سفید پاجامہ، سفید موزہ، سفید ناگرہ، سر تا پا سفید پوش، محلے کے لونڈوں نے اُن پر کیا خوب "نہر فرات کا بگلا" کی پھبتی کسی مگر شہرت انھوں نے "علامہ بال کمانی" کے نام سے پائی۔ وہ گھڑی کی دوکان کھول کر شاعری کرتے۔ شعر سُناتے اور مشاعرے اُکھاڑنے کے لیے پابندی سے دوکان بند کرتے جو کسی اگلے سے اگلے مشاعرے یا شعری نشست تک بند رہتی۔ مخاطب سے دورانِ خود کلامی اپنے دستی تکیۂ کلام "ہاں آں! ہاں آں ہاں!" کو حرکت میں لانے کے لیے بجلی کے پنکھے کے پروں کی طرح دورانِ گفتگو دونوں ہاتھوں کو گردش میں لا کر مخاطب کو خاموش رکھنے کے لیے اُس کے حلق میں بہ دستِ خود داخل ہونے کی مسلسل کوشش کرتے۔ صرف اپنی بات کرتے، صرف اپنے بارے میں گفتگو برداشت کرتے۔ اپنا قصیدہ سُناتے۔ مخاطب کو اپنی مُسلسل تعریف پر مجبور کرتے۔ مخاطب بلکہ حریف کو منہ کھولنے کا موقع دینے سے پہلے اپنی تعریف میں اُس کی برملا تذلیل کا ہنگامہ گرم رکھتے۔ اُن کی مختصر تقریر دو مدح خود گھنٹوں میں بھی بلا کاما، فل اسٹاپ کے ادھوری رہ جاتی۔ عموماً صحیح لفظ کے غلط معنی پر اصرار اور ایجادِ بندہ پر فخر کے دوران بطورِ شہادت بابائے اُردو کی لُغت درمیان میں لاتے۔ خلافِ قیاس معنی برآمد ہونے پر دو ہنٹر مار کر (جو عموماً مخاطب کے پڑتے) اظہارِ افسوس کرتے۔

"بہت تیرے کی! یہاں بابا بھی چُوک گئے ہاں آں! ہاں آں ہاں!"

علامہ بال کمانی کی لبالب علمی گفتگو ہمیشہ پُر از غیر علمی بلکہ لاعلمی ہوا کرتی اُن کے طرفداروں کا خیال تھا کہ اُن کے یہاں نہ صرف جہالت بلکہ جہالت میں گہرائی کی فضیلت پائی جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ لاہور کے ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اور علی گڑھ کے شیخ محمد عبداللہ (بابائے تعلیم نسواں) کے سلسلے میں زمین کج بحثی بلکہ غلط بیانی سے بھی کام لیتے۔ جب ایک زمانہ ان کے بور ڈم کا معترف ان کے زبانی ہاتھوں سے پناہ کا طالب ہوا تو ماہرین بلکہ مفسدین سے رجوع کیا، پانی پلا پلا کر اُن کی غیبت کے بعد علامہ کے فتنے سے نجات کا واسطہ دیا تو چند مُصلحین نے آزارِ وقت علامہ بال کمانی سے ایک تحریری معاہدہ کیا جس پر ہم بھی دستخط کے گناہ گار ہیں۔ انھوں نے باتوں کی جھونک میں بلا آگا پیچھا دیکھے اور سوچے سمجھے اس طرح دستخط کر دیے جیسے انگریزوں کے ساتھ شاہ عالم نے معاہدے پر دستخط کر دیئے تھے اور شہنشاہِ ہندوستان عالم تا پالم ہو کر بادشاہت سے خلاص ہو گیا تھا۔ اِسی طرح یہ دوستوں کی قلمرو سے جلا وطن ہو گئے۔ جس کی رو سے :

"کسی سے بھی ان کی ملاقات صرف اُسی وقت تک جاری رہ سکتی ہے جب تک کہ مخاطب اور متکلم میں سے کوئی بھی فریق اپنے منہ سے اپنی تعریف کی سنگین غلطی کا مرتکب نہ ہوگا۔ اگر ہوگا تو فوراً سختی سے ٹوک دیا جائے گا۔ علامہ یا کوئی دوسرا ہرگز ہرگز اپنے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کرے گا جس سے کسی کونے سے بھی اُس کی تعریف یا دوسرے کی مذمت کا کوئی بھی پہلو نکلتا ہو اور نہ فریقِ اوّل فریقِ دوم کو اپنی تعریف کرانے پر مجبور کرے گا۔"

اگلی ملاقات بلکہ زیادہ صحیح یہ کہنا ہوگا کہ آخری ملاقات کے دوران اِدھر انھوں نے قصیدۂ خود بہ زبانِ خود کی تمہید باندھنے کے لیے اپنے منہ سے "مَیں" نکالا اور مَیں نے ٹوک کر اُس شدنی معاہدے کی یاد دلائی جس کی روشنائی تک ابھی خشک نہ ہونے پائی تھی۔ بغرض تیس چالیس طویل مختصر "مَیں" کے وقفوں کے بعد وہ آستین چڑھا کر ہم پر گرجتے برستے، شجرہ خوانی کرتے، حیوانات سے ہمارا سلسلۂ نسب ملاتے، بور کا سرٹیفکیٹ عطا کرتے، دیرینہ باہمی تعلقات کو عاق کرتے، اونٹ کی طرح بلبلاتے رخصت ہو گئے۔

اسی قسم کے میرے کم سِن اور مُسن احباب بڑی پابندی سے اپنی باتوں اور موضوعات کی یکسانیت اور تکرار سے بور کرتے ہیں۔ وہ بھی اس شان، پابندی اور وضعداری کے ساتھ کہ اگر پہلی ملاقات میں انھوں نے اپنے بچپن میں پہلی بار گولر کے پھول کھانے، پودینے کے لٹو اور مٹی کے چاقو چلنے کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا تھا، تو ہزار ملاقاتوں کے بعد بھی اُسی داستان کو اُسی وضاحت کے ساتھ ہمارے حافظے کو ازبر کرتے بلکہ یادداشت پر تکرار کی جونک لگاتے رہتے۔

اُن میں وہ آدم خور احباب بھی شامل ہیں جو نہ صرف وضعداری نبھانے کے لیے خود ہی چلے آتے، آتے تو خیال کی رفتار سے پر جانے کا نام تک نہ لیتے۔ ہمیں ایسے ہی دو تین از کار رفتہ ریٹائرڈ احباب کا داغِ جدائی سہنا پڑا جن کا قصہ اتنا طویل اور زندگی اتنی مختصر تھی کہ قبل اس کے کہ اُن کا قصہ ختم ہوتا ان کی زندگی ختم ہو گئی۔ بقیہ زندہ بزرگ اب تک اپنی یادوں کو ہم سے کا مدعا دلوا رہے ہیں۔

جو تکلیفیے پروگرام بنا کر بور کرنے آتے ہیں اور مجھے شیشے میں اُتارنے کے لیے اپنی زبانوں سے اپنے گڑے مُردے اُکھیڑا کرتے ہیں۔ آخر میں اُن پر کیوں ان سب کا بُخار اُتاروں۔؟ جو عہدے، حیثیت، منافقت اور سیاست میں مجھ سے بھی بڑے ہیں، وہ تو ان بے چاروں سے کہیں زیادہ بور ہیں جن کی ہر تازہ بوریت نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ نہ صرف قبول کرنی ہوتی ہے بلکہ باس کو خوش کرنے کے لیے اُسی سے اُس کے پسندیدہ لطیفے کی فرمائش کی جاتی ہے۔ باس کمانی دار جاپانی بُوتے کی طرح جھوم جھوم کر شروع ہو جاتا ہے۔ بھئی میں تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ بور کرنے کے بہانے کم از کم دو چار آدمی میرے بھی آگے پیچھے گھومتے، مصاحبت کرتے، دل ہاتھ میں لینے کے لیے کم از کم کام نکلنے، اُلّو سیدھا ہونے سے اُڑنچھو ہونے تک ہماری ہاں میں ہاں ملاتے رہتے۔

بور سے ملاقات سے زیادہ مشکل اُسے برداشت کرنا ہوتا ہے۔ وہ تو بس اپنی بے تکی ہانک رہا ہے۔ اُڑا رہا ہے ایران توران کی۔ اِدھر وحشت اُلجھن اور پھر غنودگی میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ بے اختیار دل چاہتا ہے کہ جس طرح گاما پہلوان نے ذبسکو کو اُٹھا کر اکھاڑے کے باہر پھینک دیا تھا، اسی طرح میں بھی اس ہاتھ آئے بور کو باہر سڑک پر پھینک دوں۔ مگر اس خوف سے کہ میری اس گستاخی کے بعد یہ میرے خلاف محاذ بنا کر نہ ختم ہونے والی ایک اور قبائلی جنگ کا آغاز کر دے گا۔ اِسے انگیز کرتا ہوں کہ اس بوریت کے دَور میں کسی بھی بور کو برداشت کرنا عین کامیابی ہے۔ کم از کم اِسی بہانے بور پروف ہو جاؤں گا۔

گر بور نہ ہو تو بھلا افواہیں کون پھیلائے؟ گرما گرم چیزیں کہاں سے ملا کریں؟ تیرے میرے فتنے کیسے بیدار ہوں؟ لہو کو گرم رکھنے کے بہانے کیسے ہاتھ آئیں۔

ہمارے زمانے میں تو صاحب سبھی ایک دوسرے کو بور کرتے ہیں۔ بس اس کے لیے دم ہونا چاہیئے۔ پڑھے لکھے سے جاہل تک — دانشور سے لیڈر تک اُمیدوار سے کنوینر تک سبھی بور کرتے ہیں۔

میرے خیال میں بور کرنا بھی ایک فن ہے۔ جو بور کرتا ہے فی زمانہ وہ سب سے بڑا فنکار ہے۔

انشائیہ

ہمارے سماج میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو زندگی کی دوڑ میں تھک کر پیچھے رہ چکے ہیں وہ تو اب گردِ لیس کا رواں ہیں۔ حال سے اُن کا رشتہ کٹ چکا ہے اب وہ ماضی کی خوشنما وادی میں اسیر ہیں۔ اُن کا شمار تو اُن معصوموں میں ہے جو جانتے ہی نہیں کہ دنیا میں ہو کیا رہا ہے؟ یہ دنیا جا کدھر رہی ہے؟ دنیا کی چال اور رفتار کیا ہے؟ وہ تو بس ماضی کی قدروں کو سینے سے لگائے گزرے ہوئے لمحات کا چلتا پھرتا قصیدہ ہیں۔ وہ تو اُس دنیا کے باسی ہیں جس میں بہت تھوڑی آبادی تھی۔ سب ایک دوسرے کی سات پشتوں کی خبر رکھتے، ساتھ جیتے اور مرتے۔ بچے جیبوں میں کشمش، بادام اور چلغوزے بھرے پھرتے۔ بزرگ شطرنج اور چوسر کی بازیوں میں مصروف زمانے کی قیامت کی چال سے بے پروا شہہ دینے اور مات کھانے میں مصروف رہتے۔ بھری پُری جوانیاں۔ ایک بیوی ایک گھر، ایک گاؤں یا محلّے میں فصل کی طرح کٹ جاتیں۔ محلّے یا گاؤں پر سے اگر ہوائی جہاز گزر جاتا تو ہفتوں حسبِ توفیق قیاس و پرواز میں گزر جاتے۔ جب لوگ کنوئیں کے مینڈک ہوا کرتے گھروں میں پکوان پکتے ڈیوڑھیوں اور چبوتروں پر بیٹھکیں جما کرتیں۔ اگر کسی کو شہر جانا ہوتا تو وہ باچشمِ نم سب سے قصور

معاف کرالیتا، جانے والے پر لوگ فاتحہ پڑھ کر پھر اپنی دنیا میں مست ہو جاتے۔ خوشی یا غمی جو کچھ بھی ہوتی، ہوتی بڑی زبردست! ہر بزرگ ولی کامل اور لٹیا چور سلطانہ ڈاکو ہوا کرتا۔ ہر شُدنی و ناشُدنی واقعہ وقت کی ربڑ کے ساتھ کھینچ کر عالمی جنگ جتنا بڑا ہو جاتا۔

اُن نوشی نما ماضی کے امین آج بھی ہمارے ارد گرد بکھرے ہوئے روزانہ ہمارے تعاقب میں مصروف رہتے ہیں۔ ایسے تمام لوگ مجھے اس لیے عزیز ہیں کہ یہ ہمارے ماضی کی چلتی پھرتی، ہنستی بولتی دستاویز ہیں، انہیں تو آپ ماضی کی روشن کتاب کی طرح کہیں سے بھی کھول کر پڑھ سکتے ہیں۔ آپ کو شاید اس کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ یہ تو خود بخود شروع ہو جائیں گے۔

گراموفون یا ریکارڈ پلیئر پر فلمی گانوں کے ریکارڈ سننے کا تو آپ کو بھی شوق ہوگا؟ تو پھر آپ کو یہ بھی تجربہ ہوگا کہ اگر گانا ہو رہا ہے ـــ

پیا من کو جاتا ہے

اس گھسے پٹے ریکارڈ پر کہیں گراموفون کی سوئی پھنس گئی تو بس اُسی کو ریکارڈ دہراتا رہے گا ـــ "جاتا ہے..... جاتا ہے..... جاتا ہے..... جاتا ہے۔" یہاں تک کہ آپ سوئی اُٹھا کر آگے بڑھا دیں گے اور تکرار ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر آپ اپنے دادا جان مرحوم کے کسی زندہ دوست سے ملنے جائیں اور وہ غلطی سے آپ کو "بلاقی" کے بجائے "خیراتی" کا پوتا سمجھ لیں اور جب آپ انہیں سمجھا کر اتہ پتہ بتا دیں اور اپنی پوزیشن صاف کر لیں کہ آپ خیراتی نہیں بلاقی کے پوتے ہیں۔ تو پھر انشاءاللہ جب تک آپ کے دادا جان کے دوست زندہ رہیں گے وہ ہر بار آپ کو اُسی تفصیل کے ساتھ بتا کر معذرت خواہ ہوں گے کہ وہ غلطی سے آپ کو خیراتی کا پوتا سمجھے تھے۔ اسی طرح میں ایک قبر رسیدہ بزرگ کی عیادت کے لیے گیا تو وہ بڑی دیر تک مجھے اپنا پرائیویٹ سکریٹری سمجھ کر مجھ سے راز و نیاز میں مصروف رہے۔ ایک صاحب کی مداخلت پر جب اُنہیں معلوم ہوا کہ وہ مجھے پہچان نہیں سکے تھے کہ میں اُن کا پرائیویٹ سکریٹری نہیں ہوں بلکہ مداخلت کرنے والے خود اُن کے پرائیویٹ سکریٹری ہی ہیں، تو انہوں نے مجھ سے بڑی معذرت کی اور راز و نیاز کو سربستہ رکھنے پر زور دیا۔ اس کے بعد جب بھی میرا، اُن کا سامنا ہوتا تو وہ سلام کا جواب اس معذرت کے ساتھ دیتے کہ "معاف کیجئے گا میں اُس دن آپ کو پہچان نہ سکا۔ غضب خدا کا میں آپ کو اپنا پرائیویٹ سکریٹری سمجھ بیٹھا؟" یہ سلسلہ انہوں نے اپنی آخری سانس تک جاری رکھا۔

اسی لیے میں کبھی کسی بھی بور سے بور نہیں ہوتا۔ بور تو میرے نزدیک ایک قابلِ رحم انسان ہے، جو آپ سے ایک چٹکی وقت کی بھیک مانگتا ہے تاکہ وہ آپ کو یقین دلا سکے کہ وہ ایسا بھی گیا گزرا نہیں جیسا کہ آپ اُسے دیکھ یا سمجھ رہے ہیں۔ وہ تو ماضی بعید کے شاندار دَور کا ہیرو ہے۔ گزرا ہوا وقت تو تاریخ ہے۔ جب آپ کو تاریخ عزیز ہے، گزشتہ تہذیب و تمدن میں دلچسپی ہے تو آخر اس تاریخ پارے کو آپ سینے سے کیوں نہیں لگا لیتے؟ یہ بھی تو ماضی کے صحیفے کا ریکارڈ ہے جس کی سوئی پھنسنے پر آپ باآسانی سوئی اُٹھا کر موضوع تبدیل کر سکتے ہیں۔

تکرار تو اس رنگا رنگ زندگی میں پھیکا پن اور اُکتاہٹ پیدا کر کے آپ کو بور کر دیتی ہے لیکن آپ اس سے بچ نہیں سکتے کیونکہ اس دنیا کو تو آپ کو جھیلنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ کہاں کہاں بچیئے گا؟ اگر آپ کا باس آپ کو ہر بار اپنا پسندیدہ لطیفہ سُنائے تو اس پر آپ کو نہ صرف قہقہہ لگانا ہوگا، بلکہ چہرے اور حرکات و سکنات سے بھی ظاہر کرنا ہوگا کہ آپ بے حد محظوظ ہوئے ہیں۔ بور تو وہ ہے جو سُنائے اور رونے نہ دے۔ جبکہ یہ تو صرف سُنانے کے لیے جاں بخشی کا طالب ہے۔ اس کی بے رنگی میں تو آپ ہی کو کیف و سرور پیدا کرنا ہے۔

میں اُس وقت بے تحاشہ اِدھر اُدھر چھپنے کی کوشش کرتا ہوں جب کوئی فدوی قسم کا انسان میرے سامنے اگر اس طرح مؤدب کھڑا ہو جاتا ہے جیسے میں کوئی دیوتا ہوں۔ وہ اثبات کا پیکر بن کر اپنی ذات کی اس طور پر مسلسل اپنے عمل سے نفی کرتا ہے کہ میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگتا ہوں۔ ہاں میں ہاں ملانے کا سلسلہ وہ کچھ اس طور پر شروع کرتا ہے، جیسے مکڑی اپنا جال بُنتی ہے۔ میں اپنے آپ کو ایک بے بس پتنگا محسوس کرتا ہوں جسے وہ

آخر شکار کر ہی لے گی۔ مکمل سپردگی کے اس عمل سے میری اَنا کو ناقابلِ یقین حد تک تسکین پہنچتی ہے۔ اور ایسے ہی کسی مسحور کن لمحے میں وہ اپنا کام نکال کر چلتا بنتا ہے فدوی تو اپنی خاکساری سے بور کرتا ہے، یہ تو ایک ایسا شکاری ہے جس کا حربہ سپردگی ہے۔ وہ تو بس خوشامد سے کام نکالنا جانتا ہے۔ سارے قاعدے قانون، اصول ضابطے سب اس کی فدویت کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ مَیں کن باتوں سے خوش ہوتا ہوں؟ میری کیا پسند ہے؟ میری کیا کمزوریاں ہیں؟ وہ سب کچھ جان لیتا ہے۔ فدویت تو ایک ایسی کتاب ہے جس میں سب کچھ لکھا ہوا ہے۔ وہ کتاب میرا چہرہ ہے۔ جسے وہ باآسانی پڑھ لیتا ہے۔ میرے ہر اشارے اور ارادے وہ سمجھ لیتا ہے۔ اُس کی فدویت کے آگے میرا سارا رعب و دبدبہ، ساری سوجھ بوجھ، خفگی و ناراضگی سب اُس کے ایک ہی منتر میں بھوت کی طرح غائب ہو جاتے ہیں میں اُس کی خاطر تواضع اور ناز برداری میں مصروف ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ وہ شاد کام و شادماں، مؤدب رخصت ہو جاتا ہے۔

بور تو جمود کی علامت ہے۔ جب کبھی مجھ پر کوئی بور مسلط ہوتا ہے تو مَیں اپنے اندر ایک شدید گھٹن محسوس کرنے لگتا ہوں۔ میرے دماغ میں فکر کی لہریں ساکت ہونے لگتی ہیں۔ ایک ایسی اندرونی اُلجھن جیسے دل میں پنکھے لگ گئے ہوں۔ جو گھبراہٹ کی ہوا کو تیز تر کرنے میں مصروف ہوں۔ اُس کی بوریت کا جواب میری جانب سے اُس روایتی خوش اخلاقی سے دیا جاتا ہے۔ جو میری داخلی بزدلی کا نچوڑ ہوتی ہے۔ جیسے کہ میں صدیوں کا دبا اور کچلا ہوا انسان ہوں جو صدائے احتجاج کی قوت سے محروم ہو چکا ہو۔ جب میں اُس سے کھل کر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ "آپ بے وقت کیوں تشریف لائے ہیں؟" تو میرے مُنہ سے نکلتا ہے کہ — "آپ ٹھنڈے سے شوق فرمائیں گے یا گرم سے — ؟" اور مَیں اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جاتا ہوں کیونکہ بیرونی خطرات سے بچانے والی جبلتیں دماغی روک تھام کے ذریعہ مجھے کسی بھی نئے خطرے کو مول لینے سے روکتی رہتی ہیں۔ اور بور میرے قیمتی وقت پر ڈاکہ ڈال کر رخصت ہو جاتا ہے۔

بور کو انگیز کرنا عین شرافت ہے۔ ایسی نیکی جس میں مروّت بھی شامل ہو۔ اگر مروّت دنیا سے رخصت ہو جائے تو ہم کسی کو بور کرنے کی جرأت بھی نہ کر سکیں اس کے دم سے اعلیٰ انسانی قدریں قائم ہیں۔ بور کو برداشت کرنا سب سے بڑی نفس کشی ہے۔ جو ایسا کرتے ہیں وہ صوفی ہیں۔ ترکِ لذات کی منزل پر ہیں۔ ترک کے ترک کی راہ پر گامزن ہیں۔ اگر کسی گھر میں آپ کو کوئی بور نظر آئے تو پھر آپ اُس گھر کے مکینوں کی شرافت کی قسم کھا سکتے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ مَیں نے ہمیشہ بھلے مانسوں کے درمیان ہی بور کو پایا ہے۔ بور کو تو اگر شبہ بھی ہو جائے کہ آپ معقول اور فرشتہ سیرت نہیں ہیں تو وہ اپنا سایہ بھی آپ کی طرف سے نہ گزرنے دے۔ بور تو اس بات کی علامت ہے کہ ابھی یہ دنیا رہنے کے لائق ہے۔ ابھی اس میں نیک لوگ موجود ہیں۔ خراب آدمی تو ایک منٹ بھی اسے انگیز نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ قوتِ برداشت سے محروم ہوتا ہے۔ وہ تو ایک کاروباری انسان ہوتا ہے۔ دانش اور حکمت سے محروم جس کی نظریں تعلقات کے تناظر میں نفع و نقصان کے ترازو پر رہتی ہیں۔ وہ تو گھاٹے کے ہر سودے پر ڈنڈی مار دیتا ہے۔

ہر انسان کو فطری طور پر دنیا جہان کی خبروں میں دلچسپی ہوا کرتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ تیری میری باتوں میں جس کے لیے آدمی اخبار اور رسالے پڑھتا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر خبریں سُنتا ہے۔ لیکن بہت سی خبریں پھر بھی فراہم نہیں ہو پاتیں خصوصاً پاس پڑوس کی خبریں۔ جن کا ٹھیکہ بور نے لیا ہے۔ یہ اُس کی مہربانی ہے کہ آپ کو گھر بیٹھے معلوم ہو جاتا ہے کہ پڑوسن اگر دال نہ جلاتی تو اُس کے یہاں کھانے پر جھگڑا نہ ہوتا۔ محلے کے تازہ ترین اسکینڈل اور گرما گرم خبریں۔ بور تو میرے نزدیک سب سے بڑا صحافی ہے جو اُس چھوٹی سی دنیا کی خبروں کو فلیش کرتا، گرماتا اور دباتا ہے۔ جس میں ہم سانس لیتے ہیں۔ وہ تو محلے کا ریڈیو اور ہمسائے کا ٹیلی وژن ہے۔ اگر بور نہ ہو تو ہم اپنے ماحول سے کٹ جائیں۔ اپنے ارد گرد کے لیے اجنبی ہو جائیں۔ ہم کو وہاں کی خبر ہی نہ رہے جہاں ہم ہوں۔ مجھے تو ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم سماج کے جس طبقے سے بھی تعلق رکھتے ہوں، زندگی کے جس میدان سے بھی وابستہ ہوں

اُس سے ہمیں کوئی نہ کوئی بور جوڑے ہوئے ہے۔ اور آؤٹ سائیڈر بننے سے روک رہا ہے۔ ہمیں اپنی دنیا کی شہریت عطا کر رہا ہے۔ اور نہایت ہی باخبر شہری بنا رہا ہے۔

بور کرنا تو ایک فن ہے۔ جس کے بغیر خود شناسی کا عمل مکمل نہیں ہو سکتا۔ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے یہ انسان کتنے چولے بدلتا ہے۔ کبھی لیڈر کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ کبھی شعلہ بیان مقرر کی صورت میں کبھی ادیب یا دانشور کا رُوپ دھار کر نمودار ہوتا ہے مگر بور نہ کوئی نقلی چہرہ لگاتا ہے، نہ کوئی پالیسی یا پروگرام بناتا ہے۔ وہ تو بے ساختہ فطری انداز سے بس مشینی تکرار کا منظر دکھاتا ہے۔ تکرار درد کا جوہر ہے اور درد سے ارتکاز مکمل ہوتا ہے۔ اندر کی دنیا کے پٹ کھلتے ہیں اور انسان اپنی ذات کی سیاحت پر روانہ ہو جاتا ہے۔ بور نہ ہو تو انسان باہر کی دنیا ہی میں مصروف رہے، مگر خود سے تعارف حاصل نہ کر سکے۔ سو بور کا ہونا فرد اور معاشرہ دونوں کے لیے رحمتِ باراں سے کم نہیں ہے۔ ایک اچھے بور کی یہ نشانی ہے کہ وہ آپ کی آنکھوں میں نیند بھر دیتا ہے مگر آپ کے مَن کو جگا دیتا ہے۔ اس لیے میرے نزدیک بور سب سے بڑا فنکار ہے۔

جمیل آذر کے خوبصورت انشائیوں کا مجموعہ

شاخِ زیتون

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ اُردو زبان — سرگودھا

انور سدید

یورپ میں انشائیہ کی روایت

بلادِ مغرب میں انشائیہ ایک لالۂ خود رو کی صورت میں پروان چڑھا ہے۔ یورپ میں یہ اصطلاح اس صنفِ نثر کے لیے مخصوص ہے جسے مونتین نے "ایسائی" (ESSAI) کا عنوان دیا اور جس کے لیے بعد میں انگریزی کا متبادل لفظ "ایسے" (ESSAY) استعمال کیا گیا۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے لکھا ہے کہ

"ایسائی (ESSAI) عربی لفظ "السعی" کی فرانسیسی شکل معلوم ہوتی ہے۔ دونوں الفاظ کوشش کے معنی و مفہوم ظاہر کرتے ہیں۔ مانا جاتا ہے کہ لفظ "اسائی" یونانی زبان سے فرانسیسی زبان میں آیا ہے۔ مگر گمان غالب ہے کہ عربی لفظ "السعی" ہی اس کی اصل ہے۔ صدیوں تک اندلس اور جنوبی فرانس پر عربوں کا سکہ چلتا رہا ہے۔ اسی وجہ سے فرانسیسی زبان میں لاطینی سے بھی زیادہ عربی الفاظ رائج ہیں۔ ممکن ہے کہ "اسائی" بھی ان میں سے ایک ہو۔"[1]

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کے متذکرہ بالا قیاس کی توثیق محمد ارشاد نے نسبتاً واضح الفاظ میں کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

"فرانسیسی زبان کا لفظ ESSAI درحقیقت فرانسیسی زبان کا لفظ نہیں بلکہ عربی زبان کا لفظ "السعی" ہے۔ عربی زبان میں سعی کے معنی "کوشش" اور "کوشش کرنا" کے ہیں اور "السعی" کے معنی "کوشش کرنا" کے ہیں اور یہی معانی ESSAI کے بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ مونتین جنوبی فرانس کا رہنے والا تھا، جنوبی فرانس میں بولی جانے والی بولی LANGUE D'OC شمالی فرانس میں بولی جانے والی بولی LANGUE D'OIL سے اس بنا پر ممتاز ہے کہ اس میں عربی الفاظ کی بہتات ہے۔ جنوبی فرانس عربوں کی نوآبادی رہ چکا ہے اور محققین نہ صرف وہاں کی زبان پر عربی زبان کے اثرات تسلیم کرتے ہیں بلکہ گستاولیبان وہاں کی آبادی کو بھی عربی النسل بتاتا ہے۔ چونکہ فرانسیسی زبان لاطینی زبان کی بگڑی شاخوں میں سے ایک شمار ہوتی ہے اس لیے مغربی لغت نویسوں کی توجہ اس طرف منتقل ہونا قدرتی بات ہے کہ جن الفاظ کی اصل ان پر واضح نہ ہو ان کا مبدا اور اصل کسی لاطینی لفظ کو خیال کریں۔"[2]

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی لغت نویسوں پر لفظ ESSAI کی اصل واضح نہیں تھی اور انہوں نے اس لفظ کا ماخذ تلاش کرنے کے بجائے اسے لاطینی لفظ قرار دینے میں سہل انگاری سے کام لیا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس لفظ کو عربی زبان کے ساتھ متعلق کرنے میں انہیں اپنی سُبکی کا شائبہ بھی نظر آیا ہو اور

---

[1] ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی۔ "اُردو ایسیز"۔ دیباچہ طبع دوم۔ ص ۹۔ دہلی۔ نومبر ۱۹۸۱ء

[2] محمد ارشاد۔ "مونتین۔ انشائیہ اور انشائیہ نگار"۔ فنون۔ لاہور۔ جولائی اگست ۱۹۸۲۔ ص ۴۲

اپنی خود ساختہ برتری کو برقرار رکھنے کے لیے اس کا ماخذ ہی تبدیل کر دیا ہو۔ تاہم "التسعی" اور ESSAI کی لفظی ساخت، تلفظ میں حیرت انگیز مماثلت اور معانی کی قدرِ مشترک سے ظاہر ہوتا ہے کہ ESSAI لاطینی سے نہیں بلکہ عربی لفظ "التسعی" کی گٹھلی سے پھوٹا ہے۔ اور مونتین (۱۵۹۲–۱۵۳۳) کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ اس نے فرانسیسی ادب میں پہلی دفعہ یہ لفظ اپنی ایسی تحریروں کے لیے استعمال کیا جن میں وہ اپنی شخصیت کے نقوش دوستوں اور قرابت داروں کے لیے چھوڑ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔[1]

مونتین کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس نے ایسے کو نہ صرف ادبی شکل و صورت دی بلکہ اس کے محاسن و مقتضیات کے لیے ایک واضح ڈھانچہ بھی مرتب کر دیا اور اس صنف میں تخلیقی سطح پر مسلسل اظہارِ خیال کر کے "ایسے" کے اولین مثالی نمونے بھی فراہم کر دیے۔ اس کے انشائیوں کا مجموعہ شائع ہوا تو اس نے پڑھنے والوں کے ساتھ دوستی کا رشتہ قائم کرنے کی سعی کی اور بڑے اعتماد سے لکھا کہ

"قارئین کرام: میری یہ کتاب دیانت کی امین ہے۔ اسے لکھنے کا واحد مقصد ذاتی اور داخلی ہے۔ اسے لکھتے ہوئے آپ کی خدمت یا اپنی شہرت کو ملحوظ نہیں رکھا کہ میں اس کام کا اہل نہیں ہوں۔ میرے پیش نظر تو دوستوں اور عزیزوں کی مسرت ہے تاکہ جب میں مر جاؤں — اور ایسا عنقریب ہونے والا ہے — تو وہ میرے کردار اور مزاج کی بازیافت سے مجھے اپنی یادوں میں زندہ رکھ سکیں۔ میرا مقصد دنیاوی ستائش ہوتا تو میں لباسِ فاخرہ زیبِ تن کرتا اور اپنے آپ کو ایک عالم کے روپ میں پیش کرتا۔ میں تو آپ کے سامنے تصنع اور بناوٹ کے بغیر سادہ، فطری اور روزمرہ صورت میں آنا چاہتا ہوں، وجہ یہ کہ میں جس چیز کی تصویر کشی آپ کے سامنے کر رہا ہوں وہ میں خود ہوں۔ میری کمزوریوں کا مطالعہ زندگی کے ساتھ کیجیے کیونکہ میری فطرت زمانے کے تہذیبی معیار کو قبول کرتی ہے۔ اگر میں ان لوگوں میں سے ہوتا جنہیں قدرت کے آزاد قوانین نے بقائے دوام عطا کر دی ہے تو یقین جانیے میں آپ کے سامنے اپنے آپ کو مکمل طور پر بے نقاب کر دیتا اور بے حد خوش ہوتا۔

قارئین کرام، میں خود اپنی کتاب کا موضوع ہوں اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ اپنی فرصت کے اوقات اتنے معمولی اور بے مصرف موضوع کی نذر کر دیں، لہٰذا مونتین آج یکم مارچ ۱۵۸۰ کو آپ کو الوداع کہتا ہے۔"[2]

مونتین کا مندرجہ بالا اعلامیہ بے حد اہم اور معنی خیز ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنے قاری کو الوداع کہنے کے باوصف اس اعلامیہ سے مونتین نے قاری کو نہ صرف اپنی طرف متوجہ کر لیا بلکہ اپنی ذات میں داخل ہونے کے لیے اس کے سامنے انشائیہ کی کھڑکی بھی کھول دی۔ دوسری بات یہ ہے کہ متذکرہ بالا اعلامیہ ایک بے ساختہ، ناتراشیدہ، ہلکی پھلکی لیکن بے حد خیال افروز اور بہجت افزا صنفِ ادب کا نقطۂ آغاز بھی تھا۔ انشائیہ کی اس دل خوش کن ابتدا نے متعدد ادیبوں اور نقادوں کی توجہ اپنی طرف کھینچی ہے۔ چنانچہ ظہیر الدین مدنی نے لکھا ہے کہ

"فرانسیسی ادب میں ایسے کے وجود میں آنے کا واقعہ دلچسپ ہے۔ ایک فرانسیسی ادیب مونتین ۱۵۷۱ء میں جب اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے دنیا کی ہمہ ہمی سے کنارہ کش ہو گیا تو اس نے اپنے لمحاتِ فرصت کا یہ مصرف تجویز کیا کہ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں خود اپنی عقل و فراست اور ذہن کی رسائی کا امتحان لینے کے خیال سے مختلف عنوانوں پر غیر مربوط خیالوں کو قلم برداشتہ صفحۂ قرطاس پر جمع کرنے لگا۔
اس آزمائش کو اس نے ایسائی (ESSAI) کا نام دیا۔"[3]

---

1. J.M. COHEN—"MONTAIGNE - ESSAYS"— INTRODUCTION, P 9 - LONDON, 1958
2. J.M. COHEN — MONTAIGNE - ESSAYS. P. 23
3. ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، اردو ایسیز، ص ۲۰، دہلی نومبر ۱۹۸۱ء۔

اقبال آفاقی نے خیال ظاہر کیا کہ

"انشائیے کا پیکر مونتین نے اپنے بیک یارڈ کے معطر گلاب اور گلابی مٹی سے تراشا تھا۔ اس میں اپنی روح پھونکی تھی، پھر جب اس پری پیکر نے غزالی آنکھیں کھولی تھیں تو بوڑھے مونتین کی آنکھوں میں چمک لہرا گئی تھی، بوڑھے مونتین نے کہا تھا "بہت اچھا ہے"۔ یہ آنا فانا اپنی گرفت میں لینے والی سچائی تھی، مسحور کن ذاتی سچائی۔ اس نے مذہبی رجعت پسندی اور عدم رواداری کو انسانیت نواز حوالے سے دیکھا تھا۔ منظم سوچ کے ایک مخصوص نقطہ کی رسّی سے بندھے رہنے سے گریز کیا تھا بلکہ بہت بڑی بغاوت کی تھی کہ اس نے اپنی سوچ کے بے ترتیب دھاروں اور انسانی تضادات پر مبنی خلا کی دریافت پر پہلا قدم اٹھایا تھا۔"[1]

ہاؤسٹن پیٹرسن نے سوال اٹھایا ہے کہ

"انشائیہ کس نے ایجاد کیا تھا؟ کنفوشیس! سائی سیرو؟ پلوٹارک؟"

اور پھر لکھا ہے کہ

"بلاشبہ ہم اس کے بانی کی تلاش میں تاریخ کے پاتال میں غیر معین حدود تک جا سکتے ہیں، اور ایسی غیر رسمی، شخصی، شگفتہ اور متاثر کرنے والی تحریروں کے نمونے تلاش کر سکتے ہیں جو انشائیہ کی تعریف پر پورے اترتے ہیں لیکن انشائیہ کے باب میں اس فن کے نقوش ایک معین تاریخ اور ایک مخصوص شخص تک ڈھونڈے جا سکتے ہیں اور یہ تاریخ ۱۵۸۰ء ہے جب مونتین نے اپنے تاثرات اور آرا پر مبنی پہلی دو کتابیں شائع کیں اور اس اصطلاح کو پہلی مرتبہ مخصوص معانی میں استعمال کیا۔"[2]

پیٹر ویسٹ لینڈ نے لکھا ہے کہ

"ایسے کا لفظ سب سے پہلے ۱۵۸۰ء میں "ایسے آف مونتین" کے ضمن میں منظر عام پر آیا اور مونتین کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ پہلا مصنف ہے جس نے بطور انسان کسی چیز کو محسوس کیا۔"[3]

مندرجہ بالا آرا سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مغرب میں انشائیہ کا موجد و بانی فرانسیسی ادیب مونتین ہی تھا۔[4] تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ مونتین کی اوّلیت کو من و عن قبول نہیں کیا گیا بلکہ بعض ناقدین نے اس سے اختلاف کا زاویہ بھی ابھارا، آر۔ ڈبلیو۔ جیپسن نے اس صنف کے پدری رشتے ایران اور یونان کے قدیم ادیبوں کے ہاں تلاش کئے ہیں۔[5]

الف، ایچ۔ پریچرڈ کے نزدیک ایسے ادب کی قدیم ترین اصناف میں سے ہے۔ چنانچہ اس نے دنیا کی چھبیس زبانوں کے ادب سے ایسے کے نمونے فراہم کیے ہیں اور بقول نظیر صدیقی ثابت کیا ہے کہ سنجیدہ ایسے کے ابتدائی نمونے افلاطون اور ارسطو کی تحریروں میں اور لائٹ ایسے کے ابتدائی نمونے ارسطو کے معاصر اور مقلد تھیو فراسٹس (THEOFRASTUS) کے خاکوں میں ملتے ہیں۔[6]

---

[1] اقبال آفاقی۔ "اردو انشائیہ کا فکری بیک یارڈ" ۔ "۱۹۷۸ء کے بہترین مقالات" مرتبہ سجاد نقوی۔ ص ۱۳۶۔ سرگودھا۔ ۱۹۸۰ء

[2] HOUSTAN PETERSON : GREAT ESSAYS — P 15 (LONDON — 1965)

[3] پیٹر ویسٹ لینڈ۔ "انشائیہ کیا ہے؟" ۔ "مفاہیم" "ادب نمبر ۱۹۸۰۔ ص ۲۵۹۔ گیا (بھارت)۔ ۱۹۸۰ (ترجمہ مسعود ہاشمی)

[4] مارک پیٹی سن نے لکھا ہے کہ "مونتین کے آباؤ اجداد انگلستان کے رہنے والے تھے" بحوالہ "ماڈرن انگلش ایسیز" جلد اوّل۔ ص ۹

[5] R. W. JEPSON : ESSAYS BY MODERN WRITERS . PAGE 7 . LONDON 1952.

[6] بحوالہ نظیر صدیقی۔ "شہرت کی خاطر" ص ۱۱۔ کراچی بار دوم۔ ۱۹۷۹ء

بیکن نے سینیکا کے مکاتیب کو "ایسے" شمار کیا ہے۔ کیونکہ ان مکاتیب میں دوستانہ ماحول، گفتگو کا غیر رسمی طریق اور خود انکشافی کا انداز موجود تھا۔ چنانچہ سینیکا اپنے دوست لوکیوس کو لکھتا ہے

"میں چاہتا ہوں کہ میرے یہ خطوط پڑھتے وقت تم یہ محسوس کرنے لگو گویا ہم دونوں مل بیٹھے ہیں یا ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اور میں تم سے باتیں کر رہا ہوں۔ میں یہ خطوط کسی اور کے لیے نہیں صرف تمہارے لیے لکھ رہا ہوں۔ ہم دونوں آپس میں ایک دوسرے کے لیے کسی تیسرے کے مقابلے میں بہتر سامع ہیں۔"[1]

سینیکا کے ان مکاتیب کی تعریف ول ڈیورنٹ نے بھی کی ہے اور انہیں نہ صرف ایسے کی غیر رسمی ابتدا قرار دیا ہے بلکہ لکھا ہے کہ

"ان مکاتیب میں افلاطون کے مسحور کن اور اپیقورس کے گداز لہجے میں زینو بول رہا ہے۔"[2]

مندرجہ بالا امراسے اس بات کی طرف راہنمائی ہوتی ہے کہ انشائیہ (ایسے) کے منتشر نقوش مختلف زبانوں کے ادب میں منتشر حالت میں موجود تھے — ہاؤسٹن پیٹرسن نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ "ہر فنِ لطیف کے ابتدائی نقوش ماضی کی دھند میں گم ہو جاتے ہیں۔ تاہم ان نقوش سے اس صنف کے باقاعدہ ارتقا کا سلسلہ مرتب نہیں ہوتا۔ تا آنکہ ایک طلسماتی شخصیت منظرِ عام پر طلوع ہوتی ہے اور وہ ان سب بکھرے ہوئے عناصر کو جمع کرکے ایک مربوط صنف کی صورت دے دیتی ہے۔ انشائیہ (ایسے) کی صنف میں یہ اعزاز مونتین اور صرف مونتین کو حاصل ہے کہ اس نے اس صنف کو باقاعدگی سے اظہار کا وسیلہ بنایا، مسلسل ریاضت سے اس کے نقوشِ فن اجاگر کیے، ان نقوش کو اظہار کی دوسری اصناف میں ضم نہیں ہونے دیا اور اسے مسلسل برت کر ایک علیحدہ صنف کی صورت دے دی۔ مونتین نے اس صنفِ اظہار کے لیے ایک وسیع حلقۂ قرأت پیدا کیا اور نہ صرف اپنے ملک کے ادیبوں کو متاثر کیا بلکہ انشائیہ کا بیج فرانس سے باہر انگریزی ادب کی زرخیز مٹی میں بھی بھر دیا۔ چنانچہ مغربی ادب میں جزوی اختلاف کے باوجود انشائیہ کی اوّلیت کا مسئلہ طے پا چکا ہے اور نہ صرف مونتین کو اس صنف کا بانی قرار دیا جاتا ہے بلکہ تاحال مونتین سے قبل ایسے (انشائیہ) کی ایسی باقاعدہ صورت دریافت نہیں کی جا سکی جیسی مونتین نے پیش کی تھی۔[3]

واضح رہے کہ انشائیہ کی طرف مونتین کی پیش قدمی کسی باضابطہ منصوبے کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ مونتین کے داخل کے اضطراری اور تخلیقی ابال نے ہی اسے اس نئی صنف میں اظہارِ خیال کرنے پر مائل کیا۔ مونتین کو عظیم تر صداقت کی تلاش تھی، اس نے افلاطون، سینیکا، سائی سیرو اور پلوٹارک کا مطالعہ کیا تو اُسے خود شناسی اور خود انضباطی سے صداقت تک پہنچنے کا راستہ نظر آگیا۔ مونتین کا مزاج انشائی تھا۔ وہ اشیا اور مظاہر کو تخلیق کار کی آنکھ سے دیکھ سکتا تھا، وہ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے زمانے کے رسمی مسائل اور افکار پر ایک غیر رسمی نظر ڈالی تو معروضی طرزِ فکر کو یکسر مسترد کر دیا اور استقرائی انداز میں جُز سے کُل کی طرف پیش قدمی کی تو ایسے حقائق دریافت کر لیے جن پر تجربے اور صداقت کی پختہ مہر لگی ہوئی تھی اور جن میں ضرب المثل بننے کی صلاحیت بھی موجود تھی۔ مثال کے طور پر مونتین کے انشائیہ "خوف" سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں "خوف" کی پُر معنی خیز تعبیر کی گئی ہے۔

---

[1] بحوالہ محمد ارشاد۔ فنون لاہور۔ جولائی اگست ۱۹۸۲ء، ص ۴۳

[2] بحوالہ محمد ارشاد۔ فنون لاہور۔ جولائی اگست ۱۹۸۲ء، ص ۴۴

[3] انشائیہ کی مزید بحث: ماہنامہ "اردو زبان"۔ سرگودہا فروری ۱۹۸۳ء، ص ۹

"میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہمارے داخل میں خوف کی لہر کس پُر اسرار راستے سے داخل ہوتی ہے۔ خوف کا محرک کچھ بھی ہو لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ خوف کی کیفیت عجیب نوعیت کی ہے۔ چنانچہ بعض حکماء تو یہ بھی کہتے ہیں کہ خوف جس سُرعت سے ہمارے فیصلوں کو بدل ڈالتا ہے اس تیزی سے دوسرے عوامل اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہ خیال درست ہے۔ وجہ یہ کہ میں خود خوف سے مغلوب ہو کر ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ انتہائی مستقل مزاج لوگ بھی جب خوف سے دوچار ہوتے ہیں تو شدید استعجاب اور ذہنی انتشار سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ میں اس سوقیانہ خوف اور ہیبت کو کوئی اہمیت نہیں دیتا جس کا محرک کوئی بھیانک خواب، قبر سے کفن پوش اجداد کا نکل آنا یا آگ اگلنے والے سانپوں کا نمودار ہونے کا کوئی محیّر العقول واقعہ ہوتا ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ مونتین نے اپنے غیر معروضی رویّے کو روبہ عمل لاتے ہوئے زیادہ اہمیت داخلی موضوعیت کو ہی دی ہے اور معروضیت کو بڑی حد تک اپنی تحریروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ اس نے اپنے موضوعات کو معمولی اور بے فیض قرار دیا ہے تو اس کی بڑی وجہ بھی یہ ہے کہ اس کے پیش نظر کوئی معروضی مقصد مثلاً مالی مفاد، مادی منفعت یا شخصی شہرت وغیرہ نہیں تھا۔ تاہم مونتین نے معروضیت کو منہا کرنے کے باوجود مسائل کو بحث کے دائرے سے پوری طرح نکالنے کی کاوش نہیں کی اور یوں نکتہ آفرینی کا وہ انداز جو بعد کے انشائیہ نگاروں مثلاً چسٹرٹن، ہیزلٹ، رابرٹ لنڈ اور ورجینیا وولف کے ہاں زیادہ نمایاں ہوا پوری طرح ابھر نہ سکا اور بعض اوقات تو یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ مونتین، افلاطون، پلوٹارک اور سینیکا وغیرہ کے نقطۂ نظر کی توضیح و تصریح کر رہا ہے اور یوں بعض اوقات بے مصرف موضوع کے انشائی پہلو یا غیر معمولی زاویے سامنے نہیں آتے۔ مثال کے طور پر مونتین نے انشائیہ THAT OUR ACTIONS SHOULD BE JUDGED BY OUR INTENTIONS میں ہنری منتم اور کاؤنٹ ہارن کی امثال سے عمل کو نیت کے ساتھ باندھنے کی پُر زور سفارش کی ہے۔ مونتین کا یہ انشائیہ موجود کو کسی نئے مدار میں داخل نہیں کرتا بلکہ قاری کو ایک تسلیم شدہ اخلاقی حقیقت کے بارے میں مونتین کے ذاتی نقطۂ نظر سے آگہی عطا کرتا ہے۔ انشائیہ ON LIARS میں مونتین نے فیثا غورث کے مسئلۂ خیر و شر پر بے حد پُر مغز بحث کی ہے اور تاریخی واقعات سے اپنے نقطۂ نظر کا استشہاد کیا ہے۔ مونتین کا انداز بلاشبہ استقرائی ہے لیکن اس میں گہری منطق بھی موجود ہے۔ چنانچہ ہلکا پھلکا اور شخصی ہونے کے باوجود یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ قاری کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ چنانچہ محمد ارشاد کا یہ خیال درست ہے کہ

"مونتین اپنے موضوعات، موقف اور بحث و آرا میں اتنا ہی سنجیدہ ہے جتنے کہ پیشینی فلاسفہ اور مدرّسین تھے ۔۔۔۔۔۔ مونتین کے انشائیوں میں منطقی نظم و ربط موجود ہے ۔۔۔۔۔۔ ان تحریروں سے ایک فیلسوف بول رہا ہے۔"[۱]

چنانچہ مونتین کی یہ مقصدیت بھی خاصی بامعنی نظر آتی ہے۔ مونتین کے بہت سے موضوعات علمی اور فکری ہیں، اس نے اعتراف کیا ہے کہ "اس کی شخصیت اور کتابوں پر سینیکا اور پلوٹارک کا سایہ موجود ہے"[۲] "مونتین نے معروضیت کو منہا کرنے کے باوجود مسائل کو بحث کے سنجیدہ دائرے میں مقیّد کر دیا اور یوں اس نے نکتہ آفرینی کے عمل کو نہ صرف پوری طرح ابھرنے نہیں دیا بلکہ اکثر اوقات معمولی باتوں کے غیر معمولی پہلو بھی دریافت نہیں کیے اور بعض اوقات تو یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ مونتین انشائیہ نہیں لکھ رہا بلکہ منطق ہی بگھار رہا ہے۔ تاہم واضح رہے کہ موضوعات کا انوکھا پن مونتین کے ہاں بھی عنقا نہیں اور اس نے بہت سے علمی موضوعات کے علاوہ ALL THINGS HAVE THEIR REASONS، ON VEHICLES، ON SMELLS، ON IDLENESS، ON THE ART OF CONVERSATION وغیرہ موضوعات پر بھی انشائیے لکھے ہیں جنہیں نوعیت کے لحاظ سے علمی کہنا مناسب نہیں۔ مونتین نے ان

---

[۱] محمد ارشاد "مونتین، انشائیہ اور اردو انشائیہ نگار" فنون۔ لاہور۔ ص ۴۰-۴۲۔ جولائی اگست ۱۹۸۲ء

[۲] محمد ارشاد۔ حوالہ ایضاً

موضوعات کے غیر معمولی اور انوکھے پہلوؤں کے لیے ایک غیر رسمی پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ جہاں جہاں مونتین نے اپنے آپ کو علمی موضوعات کے بارے میں اپنی ذاتی رائے تک محدود کر لیا ہے وہاں اس کی حیثیت ایک عام مفکر سے مختلف نہیں[1]۔ اور انشائیہ نگار دبا دبا سا نظر آتا ہے۔ اور جہاں مونتین نے قیدِ زماں سے ہو کر اپنی ذات کو بے نقاب کیا ہے اور اپنی شخصیت کی گویا تصویریں بنائی ہیں وہاں وہ ایک خالص انشائیہ نگار نظر آتا ہے۔ ان تحریروں میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چار صدیاں بیت جانے اور انشائیے کے ارتقائی سفر میں متعدد نئی منزلیں طے کر لینے کے باوجود مونتین اس صنفِ ادب کی سب سے اہم شخصیت ہے اور اس کے ذکر کے بغیر انشائیہ کی تاریخ کا ابتدائی سرا ہاتھ نہیں آتا۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ انگریزی ادب میں مونتین کے انشائیے تراجم کے ذریعے پہنچے ہیں۔ فلوریو نے مونتین کا پہلا ترجمہ ۱۶۰۳ء میں کیا اور اسے الزبیتھ کے عہد کا عظیم ترین ترجمہ شمار کیا گیا۔ اور اس کا جادو ایک طویل مدت تک اپنا اثر دکھاتا رہا۔ بعض ناقدین کی رائے میں اس ترجمے کو شکسپیئر اور فلپ سڈنی نے بھی سراہا تھا۔ چارلس کاٹن کے ترجمے کو سترھویں صدی میں اور ای۔ جے۔ ٹریچمن کے ترجمے کو بیسویں صدی میں شہرت حاصل ہوئی تازہ ترین ترجمہ جے۔ ایم۔ کوہن نے کیا ہے جو ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ اس اجمال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مونتین کی انشائیہ نگاری کا ستارہ ہر دور میں چمکتا رہا ہے اور اسے ہر زمانے میں پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ میسر آتا رہا ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ انشائیہ میں مونتین کی اوّلیت کے باوصف اسے حتمی، مثالی یا حرفِ آخر قرار نہیں دیا گیا۔ انگریزی زبان و ادب میں انشائیہ کو جنم دینے میں مونتین نے مثال تو فراہم کی ہے لیکن خود اس کے انشائیے اس صنف کے مثالی نمونے شمار نہیں کیے جا سکتے۔ چنانچہ انشائیہ کے ارتقا اور اس کی روایت میں مونتین کی معاونت ابتدائی نوعیت کی ہے۔ انگریزی انشائیہ کے ایک نقاد برکن ہیڈ نے لکھا ہے کہ

"اس آزمائشی ابتداء سے انگریزی انشائیہ کا تمام سلسلہ پھوٹتا ہے[2]۔"

چنانچہ انگریزی انشائیہ میں اوّلیں مقام بیکن (۱۶۲۶ — ۱۵۶۱) کو حاصل ہے جس کے انشائیوں کا مجموعہ مونتین کی وفات کے صرف پانچ سال بعد ۱۵۹۷ء میں شائع ہوا اور اس سے جو دانش کا سرچشمہ پھوٹا اسے نہ صرف عہد آفریں قرار دیا گیا بلکہ اسی کے لیے ایک مخصوص اصطلاح BACONIAN WISDOM بھی وضع کی گئی جو آج تک مستعمل ہے۔ ارل آف برکن ہیڈ نے لکھا ہے کہ

"بیکن کے انشائیے قامت کے اعتبار سے چھوٹے تھے لیکن ان میں دانش کا وسیع ذخیرہ موجود تھا[3]۔"

اس ضمن میں یہ بات بھی ملحوظِ نظر رہے کہ بیکن نے مونتین سے انشائیہ کی ہیئت تو حاصل کر لی تھی لیکن اپنے مضامین پر فرانسیسی مزاج کا سایہ نہیں پڑنے دیا۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے درست لکھا ہے کہ

"انگریز قوم کی اپنی اندرونی زندگی سے زیادہ دنیا سے گوناگوں دلچسپی نے بیکن کے انشائیہ کو زندگی کے ہر پہلو کا آئینہ بنا دیا[4]۔"

چنانچہ مونتین کے انشائیے داخلی تھے لیکن بیکن کے انشائیے اپنا سفر خارج میں بھی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر بیکن کے انشائیے "کچھ باغوں کے بارے میں" (OF GARDENS) سے مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ایک باغ اگایا۔ وجہ یہ کہ باغ انسانی زندگی کو نہ صرف خالص مسرت عطا کرتے ہیں بلکہ انسانی روح کو بھی تازہ کر دیتے

۱۔ مونتین پر مزید تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ فرمائیے مضمون "اردو انشائیہ کی مزید بحث"، ماہنامہ "اردو زبان" سرگودھا، جنوری فروری ۱۹۸۳ء ص ۵-۲۴۔

۲۔ BIRKENHEAD - THE HUNDRED BEST ENGLISH ESSAYS - (INTRODUCTION) - P 6 : LONDON 1947.

۳۔ برکن ہیڈ۔ حوالہ ایضاً۔ ص ۷

۴۔ محمد احسن فاروقی۔ "انشائیہ"۔ "نیا دور" کراچی، شمارہ ۳۵-۳۶۔ ص ۹۰۔

ہیں۔ باغوں کے بغیر محلات اور عمارتیں دستکاری کے محض ادنیٰ نمونے ہیں اور ہمارا مشاہدہ ہے کہ انسان جب تہذیب اور لطافت کی طرف پیش قدمی کرتا ہے تو عمارتوں کو بعد میں پُر شکوہ بناتا ہے لیکن باغات کو نفاستِ طبع سے پہلے آراستہ کرتا ہے۔ وجہ یہ کہ باغ کمالِ فن کے زیادہ متقاضی ہیں۔ کاش، سرکاری طور پر یہ حکم بھی جاری کر دیا جائے کہ سال کے سب مہینوں میں باغ اگانے کا کام جاری رکھا جائے۔ تاکہ حسین اور خوشنما پھول سب موسموں میں ہماری آنکھوں کے سامنے لہلہاتے رہیں۔"[1]

اب ایک اور اقتباس دیکھئے جس میں بیکن نے ایک عام آدمی کو اپنا سطح سے بلند ہونے اور کتابوں کی دنیا میں کھو جانے کی دعوت دی ہے[2]

"مطالعہ ہمیں مسرت، حسن اور قابلیت کے احساس سے معمور کر دیتا ہے۔ مطالعے سے تنہائی اور گوشہ نشینی میں بھی مسرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کا حسن دمِ گفتگو منعکس ہوتا ہے۔ اور اس سے حاصل ہونے والی قابلیت کاروبار کے دوران اپنا جادو دکھاتی ہے۔ ماہر آدمی مخصوص صورتِ واقعہ کی رمز شناسی کر کے اس سے نبرد آزما تو ہو جاتا ہے لیکن اس کے ٹیڑھے معاملات کو تدبر سے حل کرنے کے لیے اہلِ علم ہی مشورہ دے سکتے ہیں۔ مطالعے پر بہت زیادہ وقت صرف کرنا کاہلی کے مترادف ہے۔ اسے بہت زیادہ زیبائش کے لیے استعمال میں لانا تصنع ہے اور صرف مطالعے کی اساس پر فیصلے صادر کرنا ایک عالم فاضل شخص کا مزاج ہے۔ مطالعہ تو فطرت کی تکمیل کرتا ہے۔ وسیع تر تجربے کو پختگی عطا کرتا ہے۔ فطری صلاحیتیں خود رو پودے کی طرح ہیں جو مطالعے کی تراشیدگی کی محتاج ہیں۔ بلاشبہ صلاحیتیں تجربے کے مدار میں بھی جوہر دکھاتی ہیں تاہم مطالعہ ان صلاحیتوں کا کشادہ رُخ متعین کرنے میں معاونت کرتا ہے"[2]۔

مندرجہ بالا اقتباسات میں بیکن نے اپنے ذاتی تجربے کا جوہر ایسے بلیغ اور بامعنی اشاروں میں پیش کیا ہے جو مختلف خیالات کی بازیافت کے لیے لاشعور کے وسیع خزینے میں جمع کر لیے جاتے ہیں، غلام جیلانی اصغر نے لکھا ہے کہ

"بیکن کے اشاروں میں کوئی جذباتی یا منطقی رشتہ موجود نہیں"[3]۔

یہ اشارے سنجیدگی کے دبیز غلاف میں لپٹے ہوئے ہیں اور بیکن معاشرتی اخلاق کی مرصع کاری میں دلچسپی لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ احمد سہیل کا خیال ہے کہ

"بیکن کے انشائیوں میں منطقی تعلق اور علامتی تلازمے باہم نہیں ہیں۔ اس کے یہاں اگر استقرائی منطق کے نمونے دکھائی دیتے ہیں تو بیکن کی ذات قارئین کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے"[4]۔

میرا خیال ہے کہ بیکن نے استقرائی لیک کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی، انکشافِ ذات کے برعکس اس کی انا کی نمود بیکن کے انشائیوں میں زیادہ نمایاں ہے اور وہ ایک ایسا مفکر نظر آتا ہے جسے اپنی علمیت، دانشوری اور فضیلت کا احساس بھی ہے۔ یہ سب چیزیں بیکن کو مونتین سے مختلف مزاج کا انشائیہ نگار ثابت کرتی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے لکھا ہے کہ

"بیکن کی فطرت اور انگریزی قوم کی خصوصیت نے اسے ایک بالکل نئی چیز بنا دیا"[5]۔

---

[1] BACON : OF GARDENS - GREAT ESSAYS : EDITED BY HOUSTON PETER - P 43

[2] BACON : OF STUDIES - "GREAT ESSAYS" EDITED BY PETERSON : P 43

[3] غلام جیلانی اصغر۔ "انشائیہ کیا ہے؟"۔ ادبی دنیا۔ دورِ پنجم۔ شمارہ نہم۔ ص ۲۵۴

[4] احمد سہیل۔ "انشائیہ"۔ اوراق لاہور۔ نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء۔ ص ۳۷۹

[5] ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ "انشائیہ"۔ نیا دور۔ شمارہ ۳۶-۳۵۔ ص ۹۰

اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مونتین کی وفات کے بعد انشائیہ کی جو نشاۃِ ثانیہ عمل میں آئی اس کے لیے قوت (MOTOR FORCE) بیکن نے فراہم کی اور اس کے انشائیوں نے ہی اس صنفِ ادب کو مقبولیت کی راہ پر ڈال دیا۔ لہٰذا اگر بیکن کو انگریزی انشائیہ کا بانی قرار دیا جاتا ہے[۱] تو یہ کچھ غلط نظر نہیں آتا۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ بیکن جس قسم کے انشائیے کا موجد تسلیم کیا گیا ہے اس میں علم اور اس کی زور دار ادا کاری انکشافِ ذات سے زیادہ اہم ہے[۲]۔

متذکرہ بالا طرزِ عمل کے جو انشائیہ نگار اس دور میں ابھرے ان میں بن جانسن (۱۶۳۷ — ۱۵۷۳)، سر تھامس اوربری (۱۶۱۳ — ۱۵۸۱) جان ارل (۱۶۶۵ — ۱۶۰۱) وغیرہ کو اہمیت حاصل ہے۔ ان ادبا کو ایسے افورسٹک (APHORISTIC) انشائیہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے جنہوں نے خرابوں کو دانش کی آنکھ سے دیکھا اور ان کی تعبیر علم و تدبر سے کی۔ تھامس اوربری، بشپ ہال اور جارج ہربرٹ نے مخصوص وضع کے کرداروں سے انگریزی "ریتے" کا ایک نیا روپ نکھارا ان کے ہاں کردار معاشرے اور مصنف کی ذات کا حصہ نظر آتا ہے اور انشائیہ نگار اسی کردار کے حوالے سے ہی اپنی پسند یا ناپسند کا ذاتی اظہار کرتے تو زندگی پر طائرانہ نظر بھی ڈال لیتے۔

انگریزی ادب میں انشائیہ کی مندرجہ بالا ابتدا بظاہر خاصی معقول اور حوصلہ افزا نظر آتی ہے تاہم باور کیا جاتا ہے کہ انشائیہ میں اگر بیکن کی مجوزہ ہیئت اور مزاج کو زیادہ عرصے تک قبول عام حاصل رہتا تو یہ صنف بالآخر مقالے یا مضمون میں ضم ہو جاتی۔ انگریزی ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اسے بہت جلد ابراہم کاؤلے (۱۶۶۷ — ۱۶۱۸) جیسا انشائیہ نگار میسر آ گیا جس نے عالمانہ اسلوب سے انحراف کیا اور انشائیہ کو دوبارہ انکشافِ ذات کی ڈگر پر ڈال کر اس کے اصلی مزاج کی تجدید کر دی۔ چنانچہ ڈاکٹر جانسن نے ابراہم کاؤلے کی شاعری کو تو پسند نہیں کیا لیکن اس کے انشائیوں کے بارے میں لکھا کہ

"اس کے خیالات فطری اور اسلوب رواں ہے[۳]۔"

ابراہم کاؤلے کی اس خصوصیت کی بنا پر ہی پروفیسر غلام جیلانی اصغر نے اسے بیکن پر فوقیت دی ہے اور لکھا ہے کہ

"کوئی انشائیہ جس میں انشائیہ نگار کی ذات موجود نہ ہو ایک تاریخی یا تنقیدی انشائیہ تو کہلا سکتا ہے لیکن وہ انشائیہ کے اصلی مزاج کے قریب نہیں اور اگر اس کلیہ کو تسلیم کر لیا جائے تو انگریزی ادب میں بیکن پہلا انشائیہ نگار نہیں بلکہ ابراہم کاؤلے ہے جس نے انشائیہ کے منفرد مزاج کو سمجھا اور اس کا انشائیہ "کچھ اپنے بارے میں" (ON MYSELF) اس مزاج کی پوری پوری عکاسی کرتا ہے[۴]۔"

ولیم ہیزلٹ نے کاؤلے کو تحسین کی نظر سے دیکھا ہے[۵]۔ چنانچہ کاؤلے کا شاعر ہونا اس کی اضافی خوبی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنی شاعری کو انشائیے کے تخلیقی اسلوب میں سمونے کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ الیگزنڈر پوپ نے اعتراف کیا کہ

"میں اس کے دل سے نکلی ہوئی زبان کا مداح ہوں۔"

ابراہم کاؤلے گرامر کے قواعد و ضوابط کی تشکیل تو کرتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو، وہ ان کتابوں کا متلاشی ہے جن سے

۱۔ "اردو انشائیہ کی مزید بحث" ماہنامہ "اردو زبان" سرگودھا۔ جنوری فروری ۱۹۸۳ء۔ ص ۱۱۔

۲۔ محمد احسن فاروقی۔ حوالہ ایضاً

۳۔ DR. JHONSON : FIFTY GREAT ESSAYS – P 75

۴۔ غلام جیلانی اصغر۔ "انشائیہ کیا ہے؟" "ادبی دنیا" شمارہ نہم (دورِ پنجم)۔ ص ۲۵۴

۵۔ WILLIAM HAZLITT: LECTURES ON THE COMIC WRITERS – P 94.

روشنی پھوٹتی ہے، وہ اس رات کا آرزو مند ہے جس کی آغوش میں وہ موت جیسی میٹھی نیند سو سکے، اس قسم کی غیر اہم خواہشیں، زندگی کی چھوٹی چھوٹی آرزوئیں اور بے نام مسرتیں ابراہم کاؤلے کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتی ہیں اور وہ ان سے نہ صرف خود لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ اپنی ذات کے حوالے سے اس مسرت میں قاری کو بھی شریک کر لیتا ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ اولاً ابراہم کاؤلے نے کچھ زیادہ تعداد میں انشائیے نہیں لکھے۔ ثانیاً اس کے انشائیے میں شاعری کا غالب حصہ بھی شامل ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جے۔ بی۔ پریسٹلے نے کاؤلے کو اپنے عہد کے بڑے انشائیہ نگاروں میں شمار نہیں کیا۔[1]

اٹھارہویں صدی کے اوائل میں انگریزی انشائیہ نگاری کے افق پر رچرڈ سٹیل (۱۷۲۹ - ۱۶۷۲ء) اور جوزف ایڈیسن (۱۷۱۹ - ۱۶۷۲ء) کا طلوع ہوا جنہوں نے انگریزی انشائیہ کو نہ صرف نقطۂ کمال پر پہنچا دیا بلکہ اس میں لذت انگیزی کا زاویہ بھی پیدا کر دیا۔ برکن ہیڈ لکھتا ہے کہ

"یہ چند دماغ جو کمل اور رغبت افزا تھے اپنے موضوع کو کفایت لفظی سے منکشف کرتے اور ہمیشہ ایسے موضوعات پر قلم اٹھاتے جنہیں ان کی نظر نے زندگی کے پورے گھمسان سے اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔"[2]

سترھویں صدی کے صنعتی اور معاشرتی انقلاب نے انگلستان کے درمیانے درجے کے لوگوں میں آگہی اور بیداری کی ایک نئی لہر دوڑا دی تھی۔ دولت کی فراوانی نے اس طبقے کے لوگوں میں علم حاصل کرنے کا شوق بھی پیدا کیا، نئی نئی سائنسی ایجادات نے پریس کے طباعتی نظام میں نئی سہولتیں پیدا کر دیں۔ چنانچہ اس دور میں ادبا نے جو پہلے صرف ایک مخصوص قسم کی اشرافیہ کے لیے ادب تخلیق کرتے تھے اب عام لوگوں کی ذہنی آبیاری کا فریضہ قبول کیا اور ادب کی تخلیق میں جذبہ و خیال کے ایسے منطقوں کی سیاحت پر آمادہ ہو گئے جنہیں پہلے ادیب کی اقلیم اظہار میں بالعموم شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ ہیزلٹ نے لکھا ہے کہ

"اس دور میں پیریڈیکل انشائیہ نگاروں نے سامنے کی اشیا، مظاہر اور واقعات پر بلا جھجک اور آزادہ روی سے اظہارِ خیال کا سلسلہ شروع کر دیا۔۔۔ طنز و مزاح کے لبادے میں زندگی کے ان فلاسفروں نے وقت کے اہم مسائل پر کمندیں ڈالیں اور قاری کے سامنے فکر و خیال کا نیا مواد یوں پیش کر دیا جیسے ایک ماہرِ نباتات نئے پودے اور شاخیں تلاش کر لاتا ہے یا ایک ماہرِ معدنیات پہاڑ کی کوکھ سے نئے ہیرے برآمد کر لیتا ہے تاکہ ان کی مدد سے ایسے نظریات کی توثیق کر سکے جو انسانیت کے لیے مفید ہوں۔"[3]

ان انشائیہ نگاروں میں سٹیل کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اس نے پہلے رسالہ "ٹیٹلر" اور پھر "سپیکٹیٹر" جاری کر کے انشائیہ کو روزمرہ زندگی کا جزوِ لاینفک بنا دیا۔ ڈاکٹر جانسن نے لکھا ہے کہ "ان اخبارات کی اشاعت سے پہلے انگلستان میں عام زندگی کا کوئی ماہر ترجمان موجود نہیں تھا۔" چنانچہ ایڈیسن اور سٹیل نے زندگی کے عام معمولات اور معاشرے کے سادہ موضوعات پر اپنے مخصوص اور انوکھے انداز میں قلم اٹھایا تو یوں محسوس ہوا کہ قاری کے سامنے ایک پھلجھڑی سی کھل اٹھی ہے۔ یوں اخلاق میں خوش طبعی کی جان ڈال دی گئی اور خوش طبعی کو اخلاق کے ساتھ ملا دیا گیا تو یہ خیال کیا جانے لگا کہ ان رسائل نے فلسفہ کو مدرسوں، مکتبوں اور کتب خانوں کی بند کوٹھڑیوں سے نکال کر جلسوں اور قہوہ خانوں کی محفلوں تک پھیلا دیا ہے اور اب اس کی چاشنی عام آدمی کے دل میں بھی رسنے بسنے لگی ہے۔[4] چنانچہ ایڈیسن اور سٹیل اس دور کے ادیب ہی نہیں تہذیب کے دیوتا اور تمدن کے پیغمبر بھی شمار ہوئے اور انہیں سقراط کے

---

[1] J.B. PRIESTLEY: ESSAYISTS PAST AND PRESENT — P 17

[2] BIRKENHEAD: THE HUNDRED BEST ESSAYS — P 8

[3] HAZLITT: LECTURES ON THE COMIC WRITERS — P 95

[4] ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ بحوالہ "مضامین سرسید": ص ۹

قرب و جوار میں جگہ دی گئی جس نے فلسفے کو آسمان سے اتار کر انسانوں کے درمیان لا رکھا تھا۔[1]

سٹیل اور ایڈیسن ایک ہی عہد کے انشائیہ نگار تھے[2] اور یہ دونوں ٹیٹلر، سپیکٹیٹر اور گارڈین وغیرہ اخبارات میں باقاعدگی سے لکھتے تھے۔ تاہم ان کی انشائیہ نگاری کے منفرد نقوش میں حدِ امتیاز بڑی واضح ہے۔ سٹیل ایک لاابالی انسان تھا۔ وہ اپنی معاشرتی بے اعتدالیوں کا خود ہی نکتہ چین تھا، قدرت نے اسے بے پناہ تخلیقی قوتیں عطا کی تھیں اور وہ ان کے موزوں استعمال کا طریقہ جانتا تھا۔ وہ زمانے کے گھمسان میں موجود رہتا اور پھر اچانک اس سے الگ ہو کر انشائیہ کی خلوت میں گم ہو جاتا۔ چنانچہ اس کے ہاں آزادہ روی، متلون مزاجی اور بے باکی کے آثار زیادہ نمایاں ہیں۔ بی۔ پریسٹلے نے لکھا ہے کہ

"ایڈیسن کی انشائیہ نگاری پُر شکوہ ہے جبکہ سٹیل نے یہی عمل زیادہ فطری انداز میں سرانجام دیا ہے۔"

اس کے انشائیہ "بچپن کی یادیں" سے اس کی داخلی معصومیت آشکار ہوتی ہے اور وہ ہمارے سامنے ایک ایسے فطری انسان کے روپ میں آتا ہے جو گزرے زمانے کی یادوں سے دُکھ اور مسرت کے لمحوں کی بازیافت کر سکتا ہے۔ اس کی دوسری صورت ٹیٹلر کلب کے کرداروں میں ابھرتی ہے جن میں اسٹیل نے انگریزی معاشرے اور مزاج کی روح سمونے کی کاوش کی ہے۔ چنانچہ ہیزلٹ نے لکھا ہے کہ

"ان کرداروں میں بے نام شکوہ، اور انگریزی کرداروں کے فطری گوشے موجود ہیں اور انہیں کون بھول سکتا ہے۔"[3]

اور اب ایڈیسن —— جو اس دور کی تہذیب کا دوسرا پیغمبر ہے۔
ڈاکٹر ادوم شیخ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ

"ایڈیسن کی تحریریں قدیم اور جدید کا ایسا سنگم ہیں جہاں قدیم روایتوں کو پامال کئے بغیر جدید نظریات اور رجحانات کی اشاعت کی گئی ہے۔"[4]

تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ایڈیسن نے انشائیے سے اخلاقی نقطۂ نظر کو ابھارنے اور جہالت کو علم سے اور لاعلمی کو دانش سے اُجالنے کی سعی کی ہے۔ اور یہ تمام عمل کچھ ایسی خوش طبعی اور زندہ دلی سے سرانجام دیا گیا ہے کہ ایڈیسن کہیں وعظ و نصیحت کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ ایڈیسن جس موضوع کو بھی مَس کرتا ہے اس سے حقائق کی نئی روشنی پھوٹنے لگتی ہے اور ہم اس کی فطانت کی داد دیئے بغیر رہ نہیں سکتے۔ ایڈیسن کے انشائیوں میں طنز کا عنصر بھی موجود ہے لیکن یہ ایک خوش اخلاق اور شائستہ مزاج ادیب کا طنز ہے، اس لیے جراحت پیدا نہیں ہوتی۔ ہیزلٹ نے لکھا ہے کہ

"ایڈیسن کے مشاہدے کے پس پردہ اس کا وسیع مطالعہ بھی موجود ہے، سٹیل خارج کے مشاہدے کو انشائیہ میں ڈھالنے کے لیے اپنے کمرے میں خود کو مقید کر لیتا ہے، اس کے برعکس ایڈیسن نے زیادہ وقت لائبریری میں صرف کیا ہے۔ اور اس کا مرغوب انداز توضیح و تشریح کا ہے۔"[5]

ہیزلٹ کا یہ موازنہ خاصہ دلچسپ ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ ایڈیسن کو سٹیل کے مقابلے میں نسبتہً زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور اس نے عام آدمی کو زندگی کی غیر معتدل روش سے ہٹ کر توازن و اعتدال اختیار کرنے کی طرف متوجہ کرایا۔ ایڈیسن کے انشائیوں کے موضوعات میں تنوع اور چاشنی زیادہ ہے۔ اس کا طنز شائستہ اور مزاح شگفتہ ہے۔ وہ زخم لگانے کے بجائے زخم پر مرہم رکھنے کی سعی کرتا ہے اور وہ قاری کے ساتھ میز پر بیٹھا ہوا نظر آتا ہے تو اس کے ساتھ خوش فکری سے گپ شپ بھی لگاتا ہے۔ یہ مزاج خالص انشائیہ کا مزاج ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایڈیسن کو نہ صرف تہذیب کا پیغمبر شمار کیا جاتا ہے بلکہ اسے انگریزی

---

[1] REFER - ESSAYS OF JOSEPH ADDISON - INTRODUCTION - P 11

[2] اتفاق دیکھئے کہ ایڈیسن اور سٹیل کی تاریخ ولادت بھی ایک ہی ہے۔

[3] HAZLITT : LECTURES ON THE COMIC WRITERS; PAGE 97

[4] بحوالہ "نیا دور" کراچی۔ شمارہ ۲۵-۲۴۔ ص ۹۵

انشائیہ میں بھی لازوال مقام حاصل ہے۔ ڈاکٹر جانسن کی یہ رائے نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ "سلیس اور نفیس طرز سیکھنے کے لیے ایڈیسن کے مضامین دن رات پڑھنے چاہئیں"۔[۴]

ٹیٹلر اور سپیکٹیٹر نے خبر کی اہمیت کو تو کم نہیں کیا لیکن اس نے زیادہ توجہ تاثر اور تبصرے کو دی۔ چنانچہ اسی زمانے میں ریمبلر، ایڈونچرر، ورلڈ، لاؤنجر، بی، اور مرر وغیرہ متعدد ایسے اخبارات ورسائل جاری ہوگئے جن میں اس عہد کے نامور ادبا مثلاً ڈاکٹر جانسن، سوئفٹ، جوشوا رینالڈز وغیرہ نے معاشرہ اور تہذیب کے ہر موضوع پر آزادانہ اظہار خیال کیا۔ اس دور کو بجا طور پر انگریزی انشائیہ نگاری کا دور زریں قرار دیا گیا ہے۔ اور کوئی ایسا موضوع نظر نہیں آتا جس پر آزادہ روی اور خوش فکری سے طبع آزمائی نہ کی گئی ہو۔

ڈاکٹر جانسن (۱۷۰۹ - ۸۴) اپنے عہد کے ادب کی ایک موثر ترین شخصیت تھا۔ وہ فطری انشائیہ نگار بھی تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ ایک بے رحم نقاد تھا۔ جب ریمبلر شائع ہونا شروع ہوا تو ڈاکٹر جانسن کی نمود بطور انشائیہ نگار ہوئی اور اس کی طرف جن لوگوں نے سب سے زیادہ توجہ دی ان میں ہیزلٹ بھی شامل تھا۔ ڈاکٹر جانسن کی انشائیہ نگاری اگرچہ ایڈیسن اور سٹیل کے سلسلے کی توسیع ہے تاہم وہ زندگی پر ایک منضبط نظر ڈالنے اور ایسے حقائق جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے جس سے بنی نوع انسان کو مناسب راہنمائی مل سکے۔ وہ ادیب سے زیادہ ایک مصلح کا روپ اختیار کرتا ہے۔ اور اپنی بیشتر تحریروں میں معاشرے کے خس و خاشاک کو صاف کرنے میں مصروف نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن کی انشائیہ نگاری پر سب سے کڑی تنقید ہیزلٹ نے کی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ

"ڈاکٹر جانسن کی خامی یہ ہے کہ وہ اشیا کو کھینچ تان کر بڑا کر دیتے ہیں اور ان کا اسلوب مظاہر کو بے معنویت اور سطحیت کے مقام پر لے آتا ہے"۔[۵]

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ہیزلٹ کی یہ رائے ڈاکٹر جانسن کی مقبولیت میں رکاوٹ نہیں بن سکی اور اس کی انشائیہ نگاری کو ہمیشہ تحسین کی نظر سے دیکھا گیا۔

جوناتھن سوئفٹ (۱۶۶۷ - ۱۷۴۵ء) کے انشائیوں میں آزادہ روی کا خطیر عنصر موجود ہے تاہم اکثر اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہدف پر تاک تاک کر تیر پھینک رہا ہے اور اس کے ہدف اس کی زہرناکی کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ کیفیت سوئفٹ کے انشائیہ "سیاسی جھوٹ کا فن" (THE ART OF POLITICAL LYING) میں نمایاں ہے۔ "گرجا گھر میں سونا" بظاہر بے ضرر سا موضوع ہے لیکن اس انشائیے میں بھی سوئفٹ نے خاصی تیز رفتاری سے تیر اندازی کی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر آدم شیخ نے لکھا ہے کہ

"سوئفٹ اودھم مچانے کے لکھنے والوں کے انداز میں دل شکنی کرتا ہے جس سے اس کی تحریریں گراں ہوجاتی ہیں"۔[۶]

آلیور گولڈ سمتھ اخبار "بی" کے صفحات سے نمایاں ہوا تھا۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر جانسن نے لکھا ہے کہ

"گولڈ سمتھ جس موضوع کو بھی مَس کرتا تھا اس کی تزئین ہوجاتی تھی"۔[۷]

اور گیرک نے اعتراف کیا کہ

"گولڈ سمتھ فرشتوں کی طرح لکھتا ہے"۔[۸]

۵۔ HAZALITT : LECTURES ON THE COMIC WRITERS, P-102

۶۔ آدم شیخ۔ "انشائیہ"، ص ۴۵

۷۔ FIFTY GREAT ESSAYS : EDITED BY PETERSON, P-106

۸۔ HUNDRED BEST ESSAYS : EDITED BY BERKENHEAD, P-120

چنانچہ گولڈ سمتھ (۷۴ — ۱۷۲۸ء) کے انشائیوں میں ایک ملکوتی معصومیت ملتی ہے اور وہ زندگی کی گرہوں کو کمال نرم روی سے کھولتا نظر آتا ہے۔ گولڈ سمتھ کے انشائیوں میں "قومی تعصبات" (NATIANAL PREJUDICES)۔ "مسرت" (HAPPINESS)۔ "واکس ہال باغ میں پارٹی" (A PARTY AT VAUXHALL GARDENS) کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ہیزلٹ نے گولڈ سمتھ کو ڈاکٹر جانسن سے بہتر انشائیہ نگار تسلیم کیا ہے اور لکھا ہے کہ

"انشائیہ" دنیا کا شہری" (CITIZEN OF THE WORLD) پر گولڈ سمتھ کی پختہ مُہر لگی ہوتی ہے اور اس سے گولڈ سمتھ کے ذہن تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔"

چنانچہ گولڈ سمتھ کا انشائیہ خارج کی طرف ہی پیش قدمی نہیں کرتا بلکہ اس کی شخصیت کے داخل میں بھی جھانکتا ہے۔

مونتین سے لے کر ایڈیسن تک انشائیہ نے جتنا کچھ تخلیقی سفر طے کیا ہے اس میں چارلس لیمب (۱۸۳۴ — ۱۷۷۵ء) ایک ایسا مینارۂ نور ہے جو دُور سے ہی نظر آجاتا ہے۔ اور جو اس صنف کے راہ نوردوں کی صحیح سمت نمائی کرتا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے لکھا ہے کہ

"انشائیہ کی روح اور جان اپنے کمال پر اس کے ہاں ملتی ہے۔"[1]

لیمب فطری طور پر داخلیت پسند تھا اور وہ اشیا اور مظاہر کو محض دیکھتا ہی نہیں تھا بلکہ انہیں اپنی تہذیبی شخصیت کا لمس بھی عطا کرتا تھا۔ اس کے خیالات میں ندرت اور تصورات کے اظہار میں پختگی ہے۔ وہ موضوع کو اپنی روح کی سرشاری کا وسیلہ بناتا اور قاری کے شعور کو ایک انوکھی روشنی سے مستنیر کرتا چلا جاتا۔ ای. وی. لوکس نے درست لکھا ہے کہ

"لیمب انگریزی نثر نگاروں میں شاید سب سے زیادہ زیرک، شیریں اور انسان دوست ادیب تھا۔"[2]

لیمب کے انشائیوں میں ایسے بے شمار خواب بکھرے ہوئے ہیں جنہیں انسان جاگتی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور پھر عمر بھر جن کی تعبیریں تلاش کرتا رہتا ہے۔ اس قسم کے انشائیوں میں DREAM CHILDERN۔ "بے چارے رشتہ دار" (POOR RELATIONS)۔ "چمنی صاف کرنے والوں کی تعریف میں" (IN PRAISE OF CHIMNEY SWEEPERS) بہت اہم ہیں۔ چارلس لیمب کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے مستقبل کے انشائیہ پر بے حد مثبت اثرات ثبت کیے اور اسے عام "ایسے" سے "پرسنل ایسے" کی امتیازی صورت میں ڈھالنے کے لیے ایک راہنما ادیب کا کردار ادا کیا۔

چارلس لیمب نے انشائیہ کی داخلی دنیا کو منور کیا ہے لیکن انشائیہ کو بہاریہ انداز ولیم ہیزلٹ (۱۸۳۰ — ۱۷۷۸ء) نے عطا کیا۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے لکھا ہے کہ

"بیکن کے مضامین افورسٹک (APHORISTIC)۔ ایڈیسن کے پیروڈیکل (PERIODICAL) اور ہیزلٹ کے پرسنل (PERSONAL) ہیں۔"

احسن فاروقی نے ہیزلٹ کے پرسنل ایسے کو رنگ بہار ایجاد کا عنوان دیا ہے۔ تاہم اس کے انشائیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں انکشافِ ذات کا عنصر اس عہد کے دوسرے انشائیہ نگاروں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ وہ زندگی کی گرہ کو یوں کھولتا ہے کہ قاری اس عمل میں ہیزلٹ کے ذاتی ردِ عمل کو

---

[1] ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ انشائیہ۔ "نیا دور" کراچی ۳۶-۳۵- ص ۸۵۔

[2] E. V. LUCAS : FIFTY GREAT ESSAYS, EDITED BY PETERSON, P 106

اہمیت دیئے بغیر نہیں رہتا۔ وہ مظاہر اور اشیا کو تیسری آنکھ سے دیکھتا ہے اور ہمارے سامنے دنیا کے دوسرے کنارے کا منظر پیش کرتا ہے۔ اور قاری یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ ہزار مرتبہ دیکھنے کے باوجود اس منظر کو پہلی دفعہ دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ ہیزلٹ ایک ایسا مہم جُو قرار دیا گیا ہے جو نہ صرف حقیقت کے نئے منطقوں کی سیاحت کرتا ہے بلکہ اس سیاحت کے ثمرات اپنے دوستوں میں تقسیم بھی کرتا ہے۔ ایک مہم جُو اور ہیزلٹ میں فرق یہ ہے کہ عام لوگ مہم کا آغاز کسی سرائے سے کرتے ہیں جبکہ ہیزلٹ کی مہم آرائی سرائے پر آکر ختم ہو جاتی ہے [۱]

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہیزلٹ بھی انگریزی زبان کے صحافتی کارخانے کا ایک پُرزہ تھا اور تازہ واقعات پر اس کے فوری تاثر کو حاصل کرنے کے لیے اخبارات مضطرب رہتے تھے اور زود نگاری کو ہیزلٹ کے ادب سے خارج نہیں کیا جا سکتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے بڑی حد تک تخلیقی تازگی کو برقرار رکھا اور ایک ایسا پختہ اسلوب وضع کیا کہ اسٹیونسن جیسے نثر نگار کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ

"ہمارا طاقت ور قلم ہیزلٹ کی طرح نہیں لکھ سکتا۔" [۲]

ہیزلٹ کا انشائیہ "سفر پر جانا" محض انشائیہ ہی نہیں بلکہ اس صنفِ ادب کا ایک مثالی نمونہ ہے۔ اس انشائیے میں ہیزلٹ وقت کے کھیت میں تنہا اور ننگے پاؤں سرگرم سفر ہے۔ اور ہمارے سامنے اپنی ذات یوں بے ساختہ انداز میں منکشف کرتا ہے جیسے ایک پھول ہم پر اپنی خوشبو بے ارادہ نچھاور کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ

"جذبات کی روانی، تخیل کا زور اور زبان کا ترنم جو ہیزلٹ کے انشائیہ "آن گوئنگ اے جرنی" میں نظر آتا ہے وہ اسے اعلیٰ ترین شاعری کے ہمدوش کر دیتا ہے۔" [۳]

ہیزلٹ کے دوسرے انشائیوں میں "تصویر بنانے کی مسرت" (ON THE PLEASURE OF PAINTING)۔ "مصنفوں کی گفتگو پر" (ON THE CONVERSATION OF AUTHORS)۔ "پرانی کتابیں پڑھنا" (READING OLD BOOKS)۔ "ہندوستان کے مداری" (THE INDIAN JUGGLERS) وغیرہ شامل ہیں اور ان میں ہیزلٹ کا شعور اس کی داخل کی دنیا کے ساتھ ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ اور وہ لاذات سے ذات کی طرف سفر کرتا ہے۔ اس عمل میں ہیزلٹ نے زبان کی شائستگی اور افکار کی شرافت کا مظاہرہ بڑی رعنائی سے کیا ہے۔ اس نے ہمارے سامنے ایک ایسا جہانِ معنی مرتب کر دیا ہے جس سے زندگی کی ان گنت بے عنوان مسرتیں آشکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہیزلٹ کو ایک عہد ساز انشائیہ نگار شمار کیا گیا ہے اور اس صنف کی تاریخ میں اس کا نام ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

تھامس ڈی کوئنسی (۱۸۵۹ — ۱۷۸۵ء) نے اپنے انشائیوں کو اعترافات میں شمار کیا ہے۔ وجہ یہ کہ اس کے انشائیوں میں ایک ہوشیار دماغ ہی آشکار نہیں ہوتا بلکہ مصنف کے کردار کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ڈی کوئنسی کی خوبی یہ ہے کہ اس نے LITERATURE OF POWER اور LITERATURE OF KNOWLEDGE میں حدِ امتیاز پیدا کر کے انشائیہ کے فطری خطوط کو ابھرنے کا موقعہ دیا۔ اس کے انشائیوں میں صبح طلوع نو کا منظر پیش کرتی ہے۔ اور اس نے دانش کا بارِ گراں فراہم کرنے کے بجائے دانش سے ابھرنے والے اجالے کو فروغ دیا ہے۔ وہ فرد کو بوجھل کرنے کے بجائے

۱۔ CERVANTES; HAZLITT, SELECTED ESSAYS, EDITED BY GEORGE SAMPSON, P35, CAMBRIDGE 1937.

۲۔ بحوالہ جارج سیمپسن۔ حوالہ ایضاً۔ ص ۳۹

۳۔ محمد احسن فاروقی۔ انشائیہ۔ "نیا دور" کراچی۔ شمارہ ۳۴-۳۵۔ ص ۸۷

اسے سبک اور لطیف تر کر دیتا ہے۔ اور وہ زندگی کے ہنگام میں زیادہ فراوانی سے متحرک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ڈی کوئنسی کے نزدیک انشائیہ ایک ایسی پتوار ہے جو زندگی کی روانی میں اضافہ کر دیتی ہے۔ "THE ENGLISH MAIL COACH, CONFESSIONS OF AN ENGLISH OPIUM EATER" اور "ON MURDER CONSIDERED AS ONE OF THE FINE ARTS" وغیرہ انشائیوں کو انگریزی ادب میں دوامِ ابد حاصل ہے۔ اور وہ قاری کو ایک جہانِ دیگر کی سیاحت کا موقعہ عطا کرتے ہیں۔

آر۔ ایل۔ سٹیونسن (۱۸۵۰ء—۱۸۹۴ء) نے ہیزلٹ کو اپنا استاد تسلیم کیا ہے[۱] چنانچہ ان دونوں کی انشائیہ نگاری میں بہت سی قدریں مشترک ملتی ہیں۔ ہیزلٹ کا ON GOING A JOURNEY اور سٹیونسن کا WALKING TOURS پڑھیں تو احساس ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی طرح پر کہی گئی دو مشاق شاعروں کی غزلیں ہیں۔ دونوں کے ہاں تنہائی سے لطف اندوز ہونے اور فطرت کے ساتھ اکیلے گفتگو کرنے کا رجحان نمایاں ہے۔ سٹیونسن کے مزاج میں ایک مخصوص قسم کی آوارگی موجود ہے اور وہ زندگی پر ایک ایسے انسان کی نظر ڈالتا ہے جس کی مسرتیں اس کی دسترس میں ہیں، چنانچہ اس کے انشائیے LANTERN BEARERS، WALKING TOURS، AN APOLOGY FOR IDLERS وغیرہ سٹیونسن کے ایسے خواب ہیں جنہیں حقیقت سے ماورا نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کے انشائیوں میں جذبے کی روانی اسلوب کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور وہ زندگی کا ایک ایسا ناظر دکھائی دیتا ہے جو مواج سمندر سے رنگا رنگ گھونگھے جمع کرتا ہے اور ہمارے سامنے ڈھیر کر دیتا ہے۔

چارلس لیمب، ہیزلٹ اور سٹیونسن کے پرسنل ایسے کے منفرد نقوش جی۔ کے۔ چسٹرٹن (۱۸۷۴ء—۱۹۳۶ء) کے انشائیہ میں باہم مدغم ہو جاتے ہیں — درحقیقت انگریزی پرسنل ایسے کا یہی رُوپ ہے جسے اُردو میں فروغ دینے کی کاوش کی گئی۔ چسٹرٹن کے موضوعات بےحد معمولی اور غیر اہم ہیں، یہ صدہا مرتبہ دیکھی ہوئی اشیا ایسی ہیں جنہیں کسی دوسرے ادیب نے منکشف کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ چسٹرٹن چشمِ نظارہ جُو کو بیدار کرتا ہے اور اپنی آنکھ کو ساکن رکھنے کے بجائے منظر کے داخل میں گہرا اتار دیتا ہے۔ چنانچہ وہ معمولی سے غیر معمولی کی طرف سفر کرتا ہے اور قاری کو حقیقت کے ایک نئے مدار میں داخل کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو جس میں چند ایک بےنام حقیقتوں کو نئی تعبیریں مل گئی ہیں۔

"ایک خوشی جو بڑھاپے سے وابستہ ہے وہ یہ ہے کہ بہت ساری چیزیں پہلے سے نسبتاً کم عمر، زیادہ تر و تازہ اور کچھ زیادہ ہی جاندار سی دکھائی دینے لگتی ہیں۔ یوں گویا ایک طرح سے ہم ان کی اہمیت سے آگاہ ہونے لگتے ہیں یا بہ الفاظ دیگر ہم زندگی کو ان جگہ روایات، اداروں، نظریات اور اخلاقیات کے پیکر میں دیکھنے لگتے ہیں جنہیں ہم نے جوانی کے ایام میں مُردہ تصور کیا تھا۔ ایک جوان مرد ایسی دنیا میں پلتا بڑھتا ہے جو اسے اکثر و بیشتر ناقابلِ برداشت حد تک سال خوردہ نظر آتی ہے، وہ ایسی ضرب الامثال اور افکار کی فضا میں ہوش سنبھالتا ہے جو بڑی حد تک سنگلاخ اور بےحس ہوتے ہیں، نیز وہ خود کو پامال چیزوں کے درمیان کچھ اس طریقے سے حنوط کیا ہوا محسوس کرتا ہے جیسے حیات آفریں دانۂ گندم کے بجائے موت کے سنگریزے اس کی جھولی میں ڈال دیئے گئے ہوں یا پھر اسے مُردہ ماضی کی راکھ سے نواز دیا گیا ہو تاکہ وہ شہرِ خموشاں میں جیون بِتا سکے۔ مانا کہ یہ ایک انتہائی فطری غلطی ہے لیکن بہر حال غلطی تو ہے۔ بڑھتی ہوئی عمرِ رواں کی خوبی اس دریافت میں ہے کہ تمام روایات سچی اور اسی لیے زندہ ہیں کوئی روایت اس وقت تک روایت نہیں بن پاتی جب تک وہ سانس نہ لے رہی ہو۔ اس بات کو جان لینے میں بڑا لطف ہے کہ دنیا محض اس لیے پامال ضرب الامثال کو نہیں دوہراتی کہ وہ مثالی ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ مثالی ہیں"[۲]

---

[۱] REFER FIFTY GREAT ESSAYS, EDITED BY PETERSON; P. 254.

[۲] چسٹرٹن۔ "نوجوان نہ رہنے کے مزے" (ON THE PLEASUSE OF NOT BEING TOO VERY YOUNG)۔ ترجمہ سلیم آغا قزلباش۔

ای۔ وی لوکس (۱۹۳۸ء–۱۸۶۸ء) کے انشائیوں میں حال سے ماضی کی طرف مراجعت کا انداز نمایاں ہے۔ وہ ان خوابوں کو زندہ کرتا ہے جو زمانے کی گرد میں گم ہو چکے ہیں۔ وہ ان قدروں کی تجدید میں دلچسپی لیتا ہے جنہیں وقت نے پامال کر دیا ہے۔ چنانچہ لوکس کے انشائیوں پر ایک حزنیہ لے چھائی ہوئی ہے تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ لوکس نے چارلس لیمب کے انداز میں حقیقت کو کشادہ کرنے کی بھی سعی کی۔ اس کے انشائیے A DOOR PLATE، A FUNERAL، THE WIND MILL اور THE TOWN WEEK ایک حساس ادیب کے متنوع تجربات کی تماشیں ہیں اور وہ زندگی کی بے نغمی کو عہدِ ماضی کی گم شدہ ترتیب سے آراستہ کرنے کا متمنی ہے۔ ای۔ وی۔ لوکس اس دھن میں اتنا گم ہے کہ گرد و پیش اسے اپنی طرف بلائیں بھی تو وہ ہرگز نہیں چونکتا۔ چنانچہ قاری جب اس کی محویت کو دیکھتا ہے تو اسے چونکانے کے بجائے معنی کی گہرائی میں خود بھی محو ہو جاتا ہے۔

رابرٹ لنڈ نے (۱۹۴۹ء–۱۸۷۹ء) انشائیہ سے صرف یہ تقاضا کیا ہے کہ

”انشائیہ اپنے اسلوب سے ہمیں مسرت عطا کرے اور موضوع کو اختصار کے ساتھ کسی قدر نئی روشنی میں پیش کرے۔“[1]

رابرٹ لنڈ کے انشائیے اس تعریف کے عملی نمونے ہیں، وہ زندگی کو محتسب کی آنکھ سے نہیں دیکھتا بلکہ وہ اشیا اور مظاہر کے باطن سے جگنو تلاش کرتا ہے اور ان کی چمک سے اندھیرے کا دامن چاک کر ڈالتا ہے۔ لنڈ کی خوبی یہ ہے کہ اس نے انشائیہ کے مزاج، کردار اور اسلوبِ نگارش کو متعین کرنے کی سعی کی اور یوں اپنی پیاسی روح کو انشائیے کے بوقلموں چھینٹوں سے سیراب کر لیا۔ مثال کے طور پر لنڈ کے انشائیہ ”کچھ غلطیوں کی شان میں“ سے مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

”میرے خیال میں اکثر لوگوں کے لطف اور مسرت کا ذریعہ دوسروں کی غلطیاں ہیں، ہم اکثر اس لیے ہنستے ہیں کہ دوسرا غلطی کرتا ہے۔ اسی طرح کسی شخص کی غلطی ہمارے لیے تفریح اور مسرت کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ اگر غلطیاں نہ کی جائیں تو ظاہر ہے کہ ہنسی بھی ختم ہو جائے گی، اس لیے خوش و خرم اور پُرلطف زندگی گزارنے کے لیے غلطیاں ضروری ہیں، تاریخ میں اکثر لوگوں کی غلطیاں پڑھنے والوں کے لیے مسلسل اور نسل در نسل تفریح کا ذریعہ بنی رہتی ہیں، اور اس کے ساتھ عبرت کا بھی۔ چنانچہ غلطیوں کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ اس میں سامانِ تفریح بہم پہنچتا ہے اور ہنسی بہرحال زندگی کے لیے لازم اور ضروری ہے۔

غلطیاں نہ صرف انسانی غفلت کا نتیجہ ہیں بلکہ عقلمندی کی بھی دلیل ہیں، اس لیے فنکاروں کو غلطیاں کرتے ہوئے گھبرانا نہیں چاہیے۔ یوں بھی ہمارے شاعر اور ادیب جو غلطیاں کرتے ہیں وہ بہت ہی معمولی قسم کی اور بہت کم ہوتی ہیں، وہ اس سے بھی بڑی اور اس سے بھی زیادہ غلطیاں کر سکتے ہیں۔ کوئی فنکار اس وقت تک شیکسپیئر جیسا عظیم فنکار نہیں بن سکتا جب تک وہ اتنی عظیم غلطیاں نہ کرے جتنی شیکسپیئر نے اپنے ڈراموں میں کی ہیں۔“[2]

رابرٹ لنڈ نے اپنے انشائیوں THE DARKNESS، A PLEASING IGNORANCE، WHY WE HATE INSECTS اور ON NOT BEING A PHILOSOPHER میں موجود حقیقت کو نئی روشنی عطا کی ہے۔

جے۔ بی۔ پریسٹلے (۱۹۸۴ء–۱۸۹۴ء) نے اپنے بارے میں کہا تھا کہ

”وہ پیدائشی بڑبڑانے والے لوگوں میں شامل ہے اور اسے ایک غلط منطقے میں پھینکا گیا ہے۔“[3]

1۔ رابرٹ لنڈ۔ بحوالہ غلام جیلانی اصغر، ”انشائیہ کیا ہے؟“ ”ادبی دنیا“ لاہور۔ دورِ پنجم۔ شمارہ نہم۔ ص ۲۵۷

2۔ ”کچھ غلطیوں کی شان میں“۔ رابرٹ لنڈ۔ ترجمہ احمد جمال پاشا

3۔ J.B. PRIESTLEY'S DELIGHT, P 1

کسی ادیب کی یہ افتادِ طبع انشائیہ کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی لیکن جب یہ سوال اٹھایا گیا کہ یہ حضرت کسی چیز سے اکتسابِ مسرت بھی کرتے ہیں! تو پریسٹلے نے اپنے انشائیوں کا مجموعہ DELIGHT پیش کر دیا۔ پریسٹلے جبلی طور پر معاشرے کے حزبِ اختلاف کا دائمی رکن تھا اور وہ ان لوگوں سے ہمیشہ صف آرا رہا ہے جن کی گردن میں اقتدار کا جوا پیرِ تسمہ پا کی طرح پڑا ہوا تھا۔ انشائیہ میں پریسٹلے نے اپنی شخصیت کا ایک نیا رنگ پیش کیا اور پڑھنے والوں کو ایک ان دیکھی دنیا میں شرکت کا موقع دیا۔ اس نے ایسی مسرتوں کی نقاب کشائی کی جن پر معاشرے نے دبیز غلاف ڈال دیا تھا، پریسٹلے نے آئینۂ حیات کو اس طرح چمکایا کہ پوری زندگی لو دینے لگی، اس نے انشائیہ کو شخصیت کے اظہار کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ وہ اس صنف کے ذریعے اپنی ذات کا ابلاغ کرتا ہے، اس کے انشائیوں میں NEW BOX OF MATCHES، SEEING THE NORTH، ESCAPING FROM TIME، ON DOING NOTHING اور BUYING BOOKS وغیرہ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

ورجینیا وولف (۱۸۸۲ء — ۱۹۴۱ء) نے داخلی نشاط کو عالمانہ بصیرت سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ تبلیغ کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کرتی لیکن انبوہ کو مخاطب کرنے کا انداز بھی اس کے ہاں موجود نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ورجینیا وولف نے اپنے داخل میں ایک انجمن سجا رکھی ہے اور وہ خود اپنے خیالات و تصورات کے ساتھ محوِ کلام ہے، اور پھر اس خود کلامی کو صدق دلی اور صاف بیانی سے پڑھنے والوں کے سامنے یوں پیش کر دیتی ہے جیسے اس کے بہت سے دوست بھی شریکِ محفل ہوں۔ ورجینیا وولف انشائیہ میں اپنی ذات کو دریافت کرتی ہے تو اس دریافت کو قاری پر منکشف بھی کرتی ہے اور اس عمل میں وہ اپنے اور قاری کے درمیان کسی پردے کو حائل نہیں ہونے دیتی۔ ورجینیا وولف نے انشائیے میں ڈرامائی کیفیات پیدا کر کے زندگی کے تحیر کو نئی کروٹ دی چنانچہ اس کے انشائیے پڑھنے کے بعد حقیقت اپنی پلکیں نئے انداز میں جھپکنے لگتی ہے۔ اس کے انشائیوں میں THE DEATH OF THE MOTH، ON NOT BEING GREAT، THE SENTIMENTAL JOURNEY اور RAWBLING ROWD EVELYN وغیرہ کو بہت شہرت حاصل ہے۔

ہلیئر بیلاک (۱۸۷۰ء — ۱۹۵۳ء) کے انشائیوں میں قولِ محال کو قطعیت سے پیش کرنے کا رجحان ایک غالب حیثیت رکھتا ہے، اس کی سنجیدگی کی دبیز سطح کے ساتھ شگفتگی ستاروں کی طرح ٹانکی ہوئی نظر آتی ہے۔ چنانچہ جب بیلاک نکتہ آفرینی کرتا ہے تو مزاح نگار ہرگز نظر نہیں آتا۔ وجہ یہ کہ بیلاک حقیقت کا چہرہ مسخ کرنے کے بجائے ایک نئی حقیقت کو آشکار کر دیتا ہے۔ اور اس عمل میں سنجیدگی اس کے چہرے کے خدوخال اور الفاظ کے جزوِ بدن کے ساتھ پیوست ہو جاتی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ قاری اس سے ملاقات کر کے نہ صرف بہجت محسوس کرتا ہے بلکہ وہ بیلاک کی مجلس میں زیادہ سے زیادہ لمحے گزارنے اور اس کی باتیں سننے کا مشتاق بھی نظر آتا ہے۔ ON CONVERSATION IN TRAIN، ON TEA، ON AN UNKNOWN COUNTRY، ON THE DEPARTURE OF A GUEST اور A MOWING OF A FIELD اس کے چند مقبول انشائیوں کے عنوانات ہیں۔

مونتین نے انشائیہ میں انکشافِ ذات کو سب سے زیادہ اہمیت دی تھی، چارلس لیمب کے بعد انشائیے کے اس اہم عنصر سے اغماض برتا جانے لگا تھا۔ میکس بیربوہم (۱۸۷۲ء — ۱۹۵۶ء) کی خوبی یہ ہے کہ اس نے انشائیے میں اس عنصر کی تجدید کی اور انشائیہ کو ایک دفعہ پھر ابلاغِ ذات کا مظہر بنا دیا۔ ورجینیا وولف نے لکھا ہے کہ

"میکس بیربوہم نے ادب میں ذات کو لاشعوری یا ناخالص انداز میں شامل نہیں کیا بلکہ یہ اس کا شعوری، خالص اور بے آمیزش عمل تھا"[1]

---

[1] VIRGINIA WOOLF — THE MODERN ESSAY : COMMON READER, P 275

چنانچہ یہ دریافت کرنا بہت مشکل ہے کہ انشائیہ نگار میکس اور بیر بوہم انسان کے درمیان کوئی علیحدہ رشتہ بھی موجود ہے؟ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بیر بوہم کی شخصیت کا پرتو اس کے ہر لفظ سے عکس فگن ہے۔ اور اس کے انشائیوں سے جو مثبت زاویے سامنے آتے ہیں وہ سب اس کی ذات سے اُگنے والے نرم و نازک شگوفے ہیں۔ HOSTS AND GUESTS اور GOING OUT FOR A WALK اس کے عمدہ ترین نمونے شمار ہوتے ہیں۔

"ایلفا آف دی پلو" جس کا اصل نام اے۔ جی گارڈنر تھا (۱۸۵۶ – ۱۹۴۶ء) وہ تنہا چہرہ ہے جو ایک کھلی کھڑکی سے جہان اور اہلِ جہان پر نظرِ خوش گزرے ڈال رہا ہے۔ محمد خالد اختر نے اس کے انشائیوں کو پڑھ کر اندازہ لگایا ہے کہ "وہ ملنے میں کتنا شفیق، ہنس مکھ اور خوش گفتار رفیق ہوگا"[1] اور اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"ایلفا، پیارے ایلفا — تم نے ہمیں ہماری جوانی میں کیا کچھ نہیں دیا۔ تمہارے جیسے اپنے زندگی کے حزن، اس کی شادمانی اور اس کی خوبصورتی سے دمکتے ہوئے اب کون لکھے گا؟"[2]

ON AN UNPOSTED LETTER ، DREAM JOURNEY ، A DAY WITH BEES ، NAMING THE BABY ، THE GOLDEN AGE اور THOSE PEOPLE NEXT DOOR وغیرہ انشائیوں میں ہمارے سامنے ایک ایسا خوش گفتار شخص آتا ہے جو شائستگی اور محبت سے زندگی کا نیا پینورامہ پیش کر رہا ہے۔ ایلفا ہمیں زندگی کے خارزار میں الجھانے کے بجائے اس گل نودمیدہ سے لطف اندوز ہونے کا مشورہ دیتا ہے جو کانٹوں کے درمیان ایک نئے انداز میں کھل رہا ہے۔

انگریزی ادب میں انشائیہ کا ارتقاء قریباً چار صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس تمام عرصے میں نہ صرف انشائیہ کے داخلی نظام میں متعدد تبدیلیاں لائی گئیں بلکہ اس کے مزاج نے بھی جزر و مد کے کئی مراحل طے کیے۔ چنانچہ مونتین نے اسلوب کی پختہ کاری اور ندرت کو ابلاغِ ذات کا وسیلہ بنایا تھا لیکن بیکن نے اپنے "خیالاتِ پریشان" میں بلند مطالب اور عمیق تصورات سمونے کی کوشش کی، ابراہم کاؤلے نے انشائیہ کو دوبارہ داخل کی سیاحت پر آمادہ کیا لیکن ایڈیسن اور سٹیل کے عہد میں انشائیہ نے روز مرّہ کے معمولی مسائل و مشاہدے کے اظہار پر قدرت حاصل کر لی۔ اس دور میں انگریزی صحافت نے انشائیہ کا خیر مقدم کھلے بازوؤں سے کیا۔ چنانچہ ایڈیسن اور سٹیل کے بعد انگریزی زبان و ادب کے بیشتر انشائیہ نگار اخبارات و رسائل سے نمایاں ہوئے۔ اس دور میں انگریزی انشائیہ کو موضوعات کا تنوع، اسلوب کی تازگی، اظہار کی ندرت اور ابلاغ کی بوقلمونی حاصل ہوئی، شمس الرحمان فاروقی نے لکھا ہے کہ "انگریزی ادب میں انشائیہ نگاری انیسویں صدی کے وسط میں انتہائے کمال کو پہنچی"[3] (لیکن اصل بات یہ ہے کہ انشائیہ بیسویں صدی کے خمسِ اول میں اپنے انتہائی عروج پر آنا شروع ہوا۔ اس دور میں چیسٹرٹن، پریسٹلے، ورجینیا وولف، لیوکس، بیر بوہم، رابرٹ لینڈ نے انشائیے لکھے) اور کمال کا یہ اوج صرف انیسویں صدی تک محدود نہیں بلکہ اس کا سلسلہ بیسویں صدی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور میں لٹن سٹریچے، ورجینیا وولف، ڈی ایچ لارنس، آلڈس ہکسلے، جیمز تھربر، جارج آرویل، گراہم گرین، مارک ٹوین۔ لارڈ لی، گلبرٹ ہائیٹ اور ای بی وائیٹ جیسے انشائیہ نگار منظر پر آئے جنہوں نے انشائیہ کے وسیلے سے غور و فکر پر ایک نیا جہانِ معنی منکشف

---

[1] محمد خالد اختر۔ "ایک خوشگوار سفر"۔ معاصر (۲)۔ لاہور۔ ص ۹۴۲

[2] ایضاً

[3] شمس الرحمان فاروقی۔ فاروقی کے تبصرے۔ ص ۱۲۴۔ الہ باد ۱۹۶۸ء

کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

واضح رہے کہ مغربی ادب میں انشائیہ کا فروغ و ارتقا خطِ مستقیم میں سفر نہیں کرتا۔ گزشتہ چار صدیوں میں یہ صنف کئی آزمائشی ادوار میں سے گزری اور متعدد مرتبہ اس کی موت کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ مس ریپلیئر نے تو اس صنف کے مُردہ ہو جانے کی خبر سٹیونسن اور چیٹر کے زمانے میں ہی مشتہر کر دی تھی[1]۔ اس اعلان کے قریباً چالیس سال کے بعد جولائی ۱۹۳۳ء میں رسالہ "فورم" (FORUM) میں یہ تعزیت نامہ نمایاں طور پر شائع ہوا۔

"انشائیہ ـــ خوشبوے معطر ـــ ادب کی پستہ قد معمر خاتون وفات پا گئیں"

دسمبر ۱۹۳۵ء میں ہارپر میگزین (HARPER MAGZINE) میں ایک دفعہ پھر کسی افسردہ مزاج نے لکھا کہ

"ایسّے اب ایک بیکار اور متروک صنف ہو گئی ہے، اس کی موت خون کی ہلاکت رساں کمی سے واقع ہوئی، قعرِ گمنامی میں ڈوبنے سے قبل اس کا جوہرِ حیات نچڑ چکا تھا۔ میتھو آرنلڈ اور رسکن نے بچانے کی آخری کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔"

اس قسم کی بے بنیاد افواہوں اور منفی آرا کے باوجود انگریزی انشائیہ ادب کے منظر سے کسی دور میں بھی غائب نہیں ہوا بلکہ اس صنفِ ادب نے ہر دفعہ ققنس کی طرح اپنے ہی خاکستر سے دوبارہ جنم لے لیا۔ جمود کے ایک دور میں جب انشائیہ کے احیاء کی ضرورت محسوس کی گئی تو نئے ادیبوں نے اس صنف کو اس طور استعمال کیا کہ نئے اور سابقہ دور کے انشائیوں میں قدرِ مشترک تلاش کرنا مشکل ہو گیا[2]۔ اور جب ورجینیا وولف کا یہ اعلامیہ سامنے آیا کہ

"انشائیہ زندہ ہے اور مایوس ہونے کا کوئی محل نہیں۔ حالات کے تغیر کے ساتھ انشائیہ میں بھی رائے عامہ کے مزاج کے مطابق تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں اور اچھا انشائیہ تغیر کے عمل کو بہتر بناتا ہے، اور اگر انشائیہ اچھا نہیں ہے تو یہ عمل بدترین ثابت ہوگا۔"[3]

تو انشائیہ کو ایک دفعہ پھر استحکام حاصل ہو گیا، اور ہمارے سامنے پال جیننگز، لارنس ڈیورل، برنارڈ ڈی واٹو، جیمز تھربر، ایڈمنڈ بلنڈن، گراہم گرین اور ای۔ بی وائیٹ جیسے انشائیہ نگار آئے جنہوں نے پھول کا نام متعین کرنے کے بجائے خوشبو کو ہر چہار جانب پھیلانے میں مدد دی۔ چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ جب تک یہ خطۂ ارض قائم ہے اور اس پر خوش نظر انسان زندہ ہے انشائیہ فطرت کے چھپے ہوئے عناصر، اشیا کے انوکھے گوشے، اور مناظر کی نئی ترتیب کو منظرِ عام پر لانے کی کاوش کرتا رہے گا۔ مغربی ادب میں انشائیہ کی جو روایت مونتین اور بیکن سے شروع ہوئی تھی وہ مرورِ ایام کے ساتھ مُردہ نہیں ہوئی بلکہ نئی صورت اور صحت مند تبدیلیوں کے ساتھ یہ روایت آئندہ نسلوں کو منتقل ہوتی رہی ہے اور اس صنف کو چونکہ نیا خون مسلسل فراہم ہوتا رہا ہے اس لیے یہ صنف تجدیدِ روایت کے ساتھ نہ صرف زندہ ہے بلکہ اب تیسری دنیا کے ادب میں بھی ثمر پذیر ہے، اور بیسویں صدی کے چھٹے عشرے میں پاکستان کی قومی زبان اُردو میں اس صنف کا تیز تر فروغ اور بطور تحریک اس کی پیش قدمی اس حقیقت کا ہی ایک ثبوت ہے۔

---

[1] REFER AMERICAN ESSAY EDITED BY CHARLES - B - SHAW - P-11

[2] بحوالہ "ذکر اس پری وش کا"۔ ص ۲۳۔ سرگودھا۔ ۱۹۸۷ء

[3] AMERICAN ESSAYS P-12

ایلفا آف دی پلو[1]
انور سدید

دوبارہ زندہ ہونے کی خواہش

چند روز ہوئے میرے ڈرائنگ روم میں کچھ ایسے لوگ جمع تھے جن کی زندگیاں کامیابیوں اور کامرانیوں کا مرقع ہیں۔ ان لوگوں میں ایک ممتاز وکیل تھا، ایک مشہور سیاستدان، ایک معروف نجومی اور ایک دانشور صحافی۔ کھانا ختم ہو چکا تھا اور سب لوگ آتشدان کے گرد بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔ گفتگو مختلف موضوعات کے گرد گھومتی گھامتی بالآخر اس مسئلے پر آگئی کہ "اگر خالقِ کائنات انسان کو موت کے بعد دوبارہ اس دنیا میں آنے کا حق عطا کر دے تو کیا آپ زندگی دوبارہ بسر کرنے پر آمادہ ہوں گے؟" اس سوال کے اٹھتے ہی سب لوگوں نے متفقہ طور پر فلک شگاف آواز میں کہا "نہیں، ہرگز نہیں!" صرف ایک شخص کو اس رائے سے اتفاق نہیں تھا لیکن یہ استثنائی شخصیت نجومی کی نہیں تھی۔ نجومی کا دل تو دوسرے سب لوگوں کی طرح اس بازیچۂ حیات کی ایک ہی سیاحت سے بھر چکا تھا اور وہ اس دنیا میں دوبارہ آنے کا ہرگز متمنی نہیں تھا۔

بارِ دیگر دنیا میں آنے کا خیال نیا نہیں ہے۔ یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود حضرتِ انسان۔ اور اس سوال کا جواب ہر دور میں ہمیشہ وہی دیا گیا ہے جو ہماری شام دوستاں میں دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب جوانی کی دوپہر ڈھلنے لگتی ہے اور زندگی کا سونا صرف ہو جاتا ہے تو اس قسم کا سوال اچانک ذہن میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ جوانی کے تصورات تو سلسلہ در سلسلہ اور لامتناہی ہوتے ہیں۔ جوانی ہمارے سامنے نئے نئے خیالی مناظر، انوکھے اور ان دیکھے خواب اور ان کی خوش رنگ اور دلنواز تعبیریں پیش کرتی رہتی ہے۔ اس ہر لمحہ بدلتے عالم میں پرانی چیزوں کی طرف مُڑ کر دیکھنے کی نہ تو فرصت ہوتی ہے اور نہ خواہش۔ لیکن فرازِ کوہ پر پہنچ کر جب ہم دیکھتے ہیں کہ مناظر سے بھرپور وادی کو تو ہم نشیب میں چھوڑ آئے ہیں اور اب نظر کی دھند میں یہ منظر صاف دکھائی نہیں دیتا اور گرجا گھر کے اونچے کلس پر بھی شام کے سائے پھیلتے نظر آتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آفتابِ حیات بھی اب ڈھلنے والا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جب دوبارہ زندہ ہونے کی خواہش سر ابھارتی ہے اور حیاتِ مکرّر کا سوال دل سے اُبھر کر ہونٹوں سے چپک جاتا ہے۔ اس سوال کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی کا سفر بُرا کٹا بلکہ یہ کہ سفر طویل تھا اور راستہ ناہموار اور اب جیسے ہم آبلہ پا ہو کر سفرِ حیات سے تھک چکے ہیں۔ اس عالم میں آرام کا خیال کتنا شہد آگیں لگتا ہے اور پھر کس طرح فطرت لپک کر ہماری مدد کو آتی ہے، ہمیں پچکارتی ہے، سہلاتی ہے اور آرام بہم پہنچاتی ہے۔

فطرت بھی کتنی عجیب ہے؟ پہلے انسان کو ایک ننھے بالک کی طرح گود میں لے کر اسے زندگی کا رنگا رنگ ناٹک دکھاتی ہے اور جب وہ چلتے چلتے تھک کر بوڑھا ہو جاتا ہے تو تقاضا کرتی ہے کہ وہ احساسِ درماندگی اپنی تحویل میں رکھے اور اپنی آرزوؤں کو میراث کی صورت ایک نئے ڈھانچے میں منتقل کر دے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ ڈھانچہ بھی فطرت خود ہی فراہم کرتی ہے۔ جلال و جمال، قوت و جبروت اور تاب و توانائی کا حصول اس مشتِ استخواں کی معمولی خواہشات ہیں۔ ہڈیوں اور گوشت پوست کا یہ حقیر سا ڈھانچہ دنیا کی تمام سرخوشی اور شان و شکوہ سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ وہ حسن و جمال اور وجاہت و عظمت کی چکا چوند پر ہی نہیں ان مدھم روشنیوں پر بھی جو رات کے وقت کھلے آسمان پر ایک دوسرے کے ساتھ سر جوڑے باہم سرگوشیاں کرتی ہیں قابض ہونے کا آرزومند ہے۔

---

[1] اے۔ جی۔ گارڈنر

اور اس سب کے حصول کے بعد جب یہ استخوانِ شکستہ ڈھول اور مٹی سے گرد آلود ہو جاتا ہے تو اس کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا ہے کہ "بس یہی کافی تھا!"

ہاں! یہی کافی تھا۔ ہم مشیت کا فیصلہ حرفِ اعتراض و شکایت زبان پر لائے بغیر نہ صرف قبول کرتے ہیں بلکہ اگر اس کا استرداد ممکن ہو تب بھی ہم دوبارہ زندہ ہونے کی خواہش نہیں کرتے۔ اور اس دریا میں دوبارہ نہیں اترتے جو ہر لمحہ تبدیل ہو رہا ہے۔ اس حتمی بات کے بعد اب یہ سوال اٹھانا قرینِ دانش نہیں کہ "کیا یہ زندگی رہنے کے قابل ہے؟" اس سوال پر ڈرائنگ روم میں موجود میرے سب دوست ضرور تیوری چڑھائیں گے لیکن جواب یقیناً اثبات میں دیں گے۔ وجہ یہ کہ ان سب لوگوں نے زندگی کو ایک عظیم اور پُرشکوہ مہم کے طور پر قبول کر رکھا ہے۔ انہوں نے اس کے ایک ایک لمحے سے اکتسابِ مسرت کیا اور زندگی بھرپور انداز میں بسر کی۔ اور یہ ناممکن ہے کہ وہ زندگی کے ایک لمحے یا اس کے ہمہ رنگ تجربے کی ایک قاش سے بھی دستبردار ہونے کے لیے تیار ہوں۔ زندہ اور صحت مند لوگوں کا یہی اسلوبِ حیات ہے۔ بلاشبہ مایوسی کے بعض لمحات میں ہم کبھی کبھی اپنے جنم دن کو بھی کوستے ہیں لیکن یہ ایک عارضی اور اضطراری عمل ہے۔ اس قسم کی جھلاہٹ زیادہ دیر تک باقی نہیں رہتی اور اس قسم کی بددعا لبوں کے حصار میں ہی دم توڑ دیتی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ سوفٹ (SWIFT) نے اپنے جنم دن کو "یومِ ماتم" قرار دیا تھا لیکن یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جو شخص زندگی کو نفرت انگیز نظروں سے دیکھتا ہے، زندگی بھی اس بخیل پر اپنا دستِ کرم کشادہ نہیں کرتی۔ وجہ یہ کہ ملائمت تو زندگی سے پیار کرنے سے پیدا ہوتی ہے اور ہمدردی کا پیمانہ ہی زندگی کی حقیقی مسرتوں کا پیمانہ ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ قنوطیت کے فلسفے کے داعی بھی ازرہِ احتیاط مایوسی کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتے۔ میرے ایک دوست کو حال ہی میں قنوطیت کے ایک داعی ادیب کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا اتفاق ہوا۔ اس ادیب نے صبح کے وقت اعتراف کیا کہ اس کی زندگی میں آج تک کوئی ایسا دن نہیں آیا جب اس نے خواہشِ مرگ نہ کی ہو اور یہ نہ کہا ہو کہ ——— "کاش! میں پیدا نہ ہوتا!" — اتفاق دیکھئے کہ اسی شام جب یہ قنوطی ادیب کشتی میں دریا کی سیر کر رہا تھا تو کشتی بھنور میں پھنس کر ڈولنے لگی۔ ادیبِ محترم کو موت سے معانقہ کرنے کا سنہری موقعہ ہاتھ آ گیا لیکن اسی لمحے شدید ترین بے بسی اس پر غالب آ گئی اور اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ نہ صرف خواہشِ مرگ کو پرے جھٹک دیا بلکہ حسینۂ حیات کا دامن بھی کمال وارفتگی سے پکڑ لیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس تجربے کے بعد بھی یہ خیال اس کے دل میں اب تک جاگزیں ہے کہ "کاش! میں پیدا نہ ہوا ہوتا!" میرے خیال میں جھوٹے دعووں کی دنیا میں صرف بچے ہی نہیں ہم جیسے بڑے بھی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

میرے لیے یہ بات بے حد مسرت کا باعث ہے کہ میں رہِ حیات سے صرف ایک مرتبہ گزرا ہوں۔ اس راہ سے دوسری دفعہ گزرنے کا خیال کبھی دل میں آ جائے تو میں خوفزدہ ہو جاتا ہوں۔ بلاشبہ چند ایک لوگ یہ بھی کہتے سنے گئے ہیں کہ اگر موجودہ زندگی کا تجربہ اور حصولِ مسرت کا "شارٹ کٹ" دستیاب ہو تو دوبارہ زندہ ہونا اور ایک اور زندگی بسر کرنا بھی بُرا نہیں۔ مطلب یہ کہ اکتسابِ مسرت کے جو مواقع پہلے ناتجربہ کاری سے ضائع ہو چکے ہیں اگر ان کے حصول کی ضمانت دی جا سکے تو وہ دوبارہ اس دنیا میں آنے کے لیے تیار ہیں۔ غور کیجیے کہ اس شرط سے حیاتِ مکرر کی خواہش کو کتنا عامیانہ رنگ دے دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اس زندگی سے جس کا ہر دن اس محراب کی طرح ہے جس سے ان دیکھی دنیا کی کرنیں مسلسل چھن چھن کر آ رہی ہیں اس کا سارا تحیر اور اسرار خارج کر دیا جائے اور اسے ایک ایسا محفوظ کاروبار سمجھ لیا جائے جس میں تیس فیصد حصہ ڈال کر آپ بقیہ زندگی فراغت اور طمانیتِ قلب سے گزار سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس طرح ناآسودگی اور عدمِ طمانیت کا سایہ تک آپ کے قریب نہ آئے اور مسرتوں کی چمکیلی دھوپ ہر طرف سونا بکھیرتی رہے لیکن اس طرح زندگی کے داخل سے اس کی اصلی روح اُڑ جائے گی اور یوں لگے گا کہ بساطِ حیات پر وارفتہ خیال انسانوں کے بجائے کٹھ پتلیوں کو جلوہ آرا کر دیا گیا ہے۔ زندگی کا سارا جادو تو اس کے تغیّر اور غیر یقینی حالت میں ہے۔ کرکٹ کی مثال لیجیے۔ کیا کبھی کوئی بیٹس مین وکٹ پر اس یقین کے ساتھ گیا ہے کہ وہ

حسبِ مرضی جتنی رنزیں چاہے گا بنا کر آئے گا! یہ خواہش نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ لغو بھی ہے۔ اور اس پیشگی شرط کے ساتھ آج تک کسی نے کرکٹ نہیں کھیلی۔ وجہ یہ کہ آپ پہلے گیند پر ہی آؤٹ ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ سنچری بنانے کے بعد بھی "ناٹ آؤٹ" رہیں۔ مجھ سے اس قسم کا کارنامہ اگرچہ تاحال سرزد نہیں ہوا لیکن یقین جانیے کہ میں نے اس قسم کی ہیجانی کیفیت کو اپنے اوپر اکثر طاری کیا ہے اور اس کے مزے لوٹے ہیں۔ میں ہر روز زرہ بکتر پہن کر کارزارِ حیات میں اترتا ہوں۔ کبھی چوکے چھکے لگانے لگتا ہوں اور کبھی پہلی ہی گیند میرے منصوبے کی بلیئز اڑا دیتی ہے۔ لیکن ایک بات واضح ہے کہ میرے لیے ہر نئی صبح تخلیقِ حیات کے پہلے دن کی طرح ہے اور مجھے پوری زندگی اس خوبصورت کہانی کی طرح نظر آتی ہے جو ابھی بیان ہی نہیں کی گئی۔

دوبارہ زندہ ہونے کے لیے سابقہ تجربے کو اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن غور کیجیے کہ تجربہ ہماری معاونت کہاں تک کر سکتا ہے؛ اصل چیز تو انسان کا کردار ہے۔ اگر سابقہ زندگی میں آپ آنکھیں جھپکنے کے مرض میں مبتلا تھے اور آپ کی ٹھوڑی بھینچی ہوئی تھی اور آپ ان دونوں کے ساتھ دوبارہ زندگی میں آجاتے ہیں تو آپ کا سابقہ عمر بھر کا تجربہ بھی شاید بے کار اور بے اثر نظر آئے اور ناکامی اور مایوسی ہی آپ کا مقدر ٹھہرے۔ لہٰذا بفرضِ محال اگر زندگی کو دوبارہ حاصل کرنا ہی ہے تو اس کے لیے زندگی کا سابقہ طریق ہی درست نظر آتا ہے۔ نئی زندگی کو پرانی شرائط کی رسّی کے ساتھ نہ باندھیے۔ اور اسے حسبِ طریقِ سابق اپنی آگہی سے سجنے کے قابل بنائیے۔ ہم ابد کے سیاح ہیں اور اس مختصر سے دورِ حیات میں یہ سیاحت ایک مشکل پسند مہم جُو کی طرح طے کرنی چاہیے۔ تاکہ اگر دوبارہ زندگی حاصل ہو تو اس میں تحیّر اور رعنائی کا نادر عنصر بھی شامل ہو۔ واضح رہے کہ اس جادوئی عنصر کی شمولیت کے باوجود میں زندگی کو دوبارہ حاصل کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ میرے خیال میں زندگی کو جو چیز عزیز جاں بناتی ہے وہ پرانے چہروں اور قدیم یادوں کے ساتھ وابستگی ہے۔ نئی زندگی میں یہ چہرے اور یہ یادیں معدوم ہوں گی۔ زندگی کی سابقہ یاترا میں ہم نے جو تعلقات استوار کیے تھے وہ سب ختم ہو چکے ہوں گے اور میرے نزدیک نئے روابط پیدا کرنے اور نئے راستوں پر چلنے کا تصور ہی احمقانہ ہے۔ پس دوبارہ زندگی حاصل کرنے کا فائدہ؟

شاعر ہومر نے ایک دفعہ ایک ایسی نظم لکھی تھی جس میں جنت میں اُداس ہو جانے کا ذکر تھا۔ مجھے یہ نظم پڑھ کر بڑی ہنسی آئی۔ جنت کی میکانکی زندگی میں اُداسی تو ایک لابدی امر ہے۔ میرے نزدیک مشکل کام یہ ہے کہ آپ اس دھرتی پر اُداس ہو جائیں اور پھر اسی پر نظم لکھیں۔ زندگی کی دوسری یاترا میں آپ پرانی یادوں کو تازہ اور دیکھی ہوئی دنیا کی تجدید کریں گے۔ آپ نئے دوست بنانے کی کوشش کریں گے اور ممکن ہے کہ یہ اچھے دوست ہوں لیکن اچھے دوستوں کی تلاش ایک بے حد مشکل عمل ہے۔ زندگی کی اصل ضرورت تو آزمودہ دوستوں کی بازیافت ہے۔ کیا دوبارہ زندگی مل جانے پر یہ سب کچھ بھی ہمیں مل سکتا ہے؟ اور کیا عدم حصول کی صورت میں نتیجہ ایک مستقل احساسِ محرومی نہیں ہوگا؟

اس وقت مجھے ایک نثر نگار ژیدورے (GUIDO REY) کی کتاب میٹرہارن (MATTERHORN) کا ایک پارۂ لطیف یاد آ رہا ہے جو میرے احساسات کی پوری عکاسی کرتا ہے۔ ایک دفعہ جب یہ ادیب کوہ پیمائی کر رہا تھا تو ایلپس کے دامن میں ایک سطح مرتفع کے پاس شام کے ڈھلتے ہوئے سایوں میں اس نے ایک بوڑھے سفید ریش بزرگ کو تنہا کھڑے دیکھا۔ ذرا آگے بڑھا تو اس نے بوڑھے کو پہچان لیا۔ یہ کوہ ایلپس کی مشہور چوٹی میٹرہارن کا فاتح وہمپر (WHYMPER) تھا۔ لیکن اب وہمپر بوڑھا ہو چکا تھا اور شام کی روشنی بجھ رہی تھی۔ وہ اس ڈوبتی ہوئی مدھم مٹیالی روشنی میں اس فلک آشنا چوٹی کو دیکھ رہا تھا جسے وہ اپنے عنفوانِ شباب میں زیرِ پا لا چکا تھا۔ لیکن اب اس کی کوہ پیمائی کا زمانہ

گزر چکا تھا اور وہ مزید چوٹیوں کو سَر کرنے کا خواہشمند نہیں تھا۔ وہ اپنا عہدِ زریں گزار چکا تھا اور ایک بہت پتلی پہاڑی پر اپنی فتوحات کی خوشگوار یادوں کا سرمایہ سمیٹے پوری طمانیتِ قلب کے ساتھ کھڑا تھا۔ مشکل اور صعوبت آزما مہم جوئی سے مسرت حاصل کرنے کا یہ میدان اس نے سرگرم اور پُرجوش جوانوں کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اس کی یادوں کی متاعِ گرانمایہ وہ خوفناک تجربہ تھا جب اس نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں اور میٹرہارن کی چوٹی کو فتح کر کے موت کو شکست دے دی تھی۔ لیکن آج جب اس سے دریافت کیا گیا کہ کیا وہ اب بھی اس پہاڑ کی ہیبت ناک بلندیوں اور جگمگاتی رفعتوں کو سَر کرنے کا آرزومند ہے تو ایک ملکوتی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اُبھری اور اس نے ایک لمحہ توقف کیے بغیر کہا

"بس! یہی کافی ہے!"

کربِ آگہی مجموعۂ کلام

بدلتے چہرے مجموعۂ مضامین

اور

مکرر ہے کہے بغیر مجموعۂ مضامین

کے بعد

منظر علی خاں منظر کے کلام کا نیا مجموعہ

یہ بات چلی مجھ سے

افسر پبلی کیشنز

کے زیرِ اہتمام

عنقریب شائع ہو رہا ہے

سر فرانسس بیکن
انور سدید

کتابیں پڑھنا

کتابیں پڑھنا اکتسابِ مسرت کا وسیلہ ہے۔ اس سے لیاقت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسے زیبائش ذات کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ گوشۂ خلوت میں کتاب کا مطالعہ داخلی سرخوشی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ شامِ دوستاں یا مجلسِ مباحثہ میں کتابوں کا ذکر نمائشِ ذات کے لیے ہوتا ہے۔ فرائضِ منصبی کی ادائیگی اور عقلِ سلیم کو بروئے عمل لانے کا مطالعہ فرد کی علمی قابلیت کا آئینہ بن جاتا ہے۔ ماہرین بعض امورِ خاص کو اپنی عقلِ سلیم سے سلجھا کر بتدریج وجود میں لا سکتے ہیں لیکن امورِ عامہ، معاملاتِ حیات اور تفکر و تدبّر کے لیے اہلِ علم ہی موزوں ثابت ہوئے ہیں۔

مطالعے میں غیر معمولی طور پر زیادہ وقت صرف کرنا تساہل کے مترادف ہے۔ اسے نمائشِ ذات کے لیے استعمال کرنا تصنّع ہے۔ عقلِ سلیم کو کلیۃً کتابی ضوابط کا تابعِ فرمان بنا دینا ایک عالم کا وطیرہ ہے۔ مطالعہ انسانی فطرت کی تکمیل کرتا ہے لیکن مطالعے کی تکمیل تجربے کی معاونت کے بغیر ممکن نہیں۔ انسان کی صلاحیت اس نخلِ خود رَو کی طرح ہے جس کی شاخ تراشی دقتِ نظر سے کی جاتی ہے اور مطالعہ چونکہ فکر و خیال کی سب حدوں کو پاٹتا چلا جاتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ اسے تجربے کے ساتھ وابستہ رکھا جائے۔

چالاک آدمی مطالعے کی تحقیر کرتا ہے۔ سادہ انسان کتاب بینی کو تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اہلِ خرد مطالعے سے استفادہ کرتے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ مطالعہ فی نفسہٖ استعمال کی چیز نہیں بلکہ اس سے بالاتر وہ دانش ہے جو تجربے اور مشاہدے سے حاصل ہوتی ہے۔ کتاب کو اس خیال سے نہ پڑھیے کہ اس کے مطالعے سے آپ کسی مسئلہ کی تردید یا ابطال کر سکیں گے۔ کسی چیز پر مُہرِ تسلیم و رضا ثبت کرنے یا اپنے ایقان کو اثبات فراہم کرنے کے لیے بھی مطالعہ نہیں کرنا چاہیئے۔ مطالعے کا مقصد معاملہ بندی یا چرب زبانی بھی نہیں ہے بلکہ مطالعہ تو صرف اس لیے کیا جاتا ہے کہ آپ کا فکر بیدار ہو اور آپ تقابل و موازنہ کر سکیں۔

کتابوں کی کئی قسمیں ہیں، کچھ کتابیں صرف چکھنے کے لیے ہوتی ہیں۔ بعض کو یونہی نگل جانا مناسب ہوتا ہے۔ معدودے چند کتابیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں آہستہ آہستہ چبانا اور پھر ہضم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بعض کتابیں صرف جزوی طور پر پڑھی جاتی ہیں، کچھ کتابیں پڑھی تو جاتی ہیں لیکن ان کے مطالعے میں عمیق یا گہری نظر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف چند کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن کا مطالعہ پوری توجہ سے کیا جاتا ہے۔ بعض کتابیں آپ کے ماتحت پڑھتے ہیں اور آپ کے مطالعے کے لیے ضروری حصّوں کی تلخیص تیار کر دیتے ہیں، اس قسم کا حربہ ادنیٰ کتابوں اور غیر اہم مباحثوں میں آزمایا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ درجے کی کتاب تو اس عطر کی طرح ہے جو تقطیر و کشید کے صبر آزما عمل سے حاصل ہوتا ہے اور جس کی خوشبو دیوارِ چمن تک محدود نہیں رہتی۔ اس قسم کی کتاب خیال افروز بھی ہوتی ہے اور اس کی روشنی دُور دُور تک جاتی ہے۔

مطالعہ انسان کی تکمیل کرتا ہے۔ گفتگو چالاک بناتی ہے اور تحریر سے انسان کو قطعیت حاصل ہوتی ہے۔ تھوڑا سا لکھنے کے لیے بھی ذہنی قوت کو تیزی

سے بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ گفتگو میں ذہن مستعد رکھنا ضروری ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص مطالعے کی عادت سے محروم ہے اور وہ آج تک کسی کتاب کے پاس نہیں پھٹکا تو وہ زندگی کے معاملات میں مکاری اور عیاری سے کام لینے پر مجبور ہوگا۔ اس قسم کے انسان کے سامنے ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ وہ دوسروں پر یہ ظاہر کر سکے کہ اسے ہر علم پر عبور حاصل ہے اور اسے وہ سب کچھ معلوم ہے جو در حقیقت وہ خود بھی نہیں جانتا۔

تاریخ کا مطالعہ انسان کو باشعور بناتا ہے جب کہ شاعری اُسے نکتہ سنج بناتی ہے۔ ریاضی باریک بینی پیدا کرتی ہے اور فلسفہ اُسے تعمق اور گہرائی عطا کرتا ہے۔ علوم عمرانیات حلیم و بردبار بناتے ہیں۔ منطق نکتہ شناسی کا اور انشا قناعت کا راستہ دکھاتی ہے۔ عقل کی قوت بظاہر خود رواں ہے اور اس کے سامنے کوئی مزاحمت نہیں ہے تاہم جس طرح مختلف ورزشوں سے جسمانی آزار درست کیے جاتے ہیں اسی طرح مناسب اور موزوں مطالعے سے عقل کی تربیت ممکن ہے۔ مثال کے طور پر گیند اندازی پتھری کے لیے۔ نشانہ بازی چھاتی اور پھیپھڑے کے لیے، چہل قدمی پیٹ کے لیے اور گھوڑ سواری دماغ کے لیے مفید ہے، اسی طرح اگر کوئی آدمی ذہنی انتشار میں مبتلا ہے تو اسے ریاضی کے مسئلے حل کرنے پر مائل کیجئے اور اس کی عقل اگر پھر بھی مرکز گریز ہو تو ریاضی کی یہ مشق جاری رکھیے اگر کوئی شخص مختلف اشیا میں امتیاز کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اسے اساتذہ کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیجئے۔ اگر وہ مسائل کو پوری طرح کھنگالنے کے قابل نہیں اور ایک مسئلہ کو حل کرنے کے بجائے دوسرے مسئلے میں الجھ جاتا ہے تو اسے وکلا کے مقدمات کا مطالعہ کرنے دیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ دماغ کے ہر نقص کے لیے ایک نہ ایک تیر بہدف نسخہ موجود ہے۔

رام لعل نابھوی کی دو گراں قدر تصنیفات

"تبسم"

بیس طنزیہ مزاحیہ خاکے معہ بھرپور مقالہ
دوسرا ایڈیشن
اضافہ کے ساتھ
قیمت بیس روپے

"آم کے آم"

سولہ انشائیے معہ بھرپور مقالہ
آفسٹ چھپائی
قیمت تیس روپے

موضوعین
انور سدید

کچھ بے کاری کے بارے میں

آپ نے دیکھا ہوگا کہ زرخیز اور بار آور دھرتی کو بھی طویل عرصے کے لیے غیر مزروعہ اور بے کار چھوڑ دیا جائے تو اس پر ہمہ اقسام کے خودرَو پودے، جنگلی بوٹیاں اور جھاڑیاں اُگ آتی ہیں اور اس زمین کو دوبارہ کارآمد بنانے کے لیے نہ صرف کڑی محنت اور نگہداشت کرنی پڑتی ہے بلکہ اس پر قسم بدل کر نئی نئی فصلیں بھی کاشت کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عورت کی مناسب نگہداشت نہ ہو تو یہ زیرک اور باشعور بچہ تخلیق کرنے کے بجائے بے جان اور بے شباہت لوتھڑے پیدا کرنے لگتی ہے۔ تخلیق کے صحت مند اور فطری عمل کے لیے بعض معاشروں میں خاندان سے باہر شادیاں کرنے کا رواج پایا جاتا ہے۔ انسانی ذہن بھی دھرتی اور عورت کی طرح ہے۔ اسے یونہی بے مصرف اور بے کار چھوڑ دیا جائے تو یہ کاہل، غیر تخلیقی اور گُند ہو جاتا ہے اور راہوارِ فکر کسی خاص سمت میں سفر پیما ہونے کے بجائے میدانِ تخیل میں وحشیانہ انداز میں غیر معیّن سمتوں کی جانب دوڑنے لگتا ہے۔ لیکن ذہن اگر کسی مخصوص موضوع پر غور و فکر کرنے لگے تو اس کی بے ہنگم ترکتازی رُک جاتی ہے۔

جس طرح پیتل کے پیالے میں آبِ لرزاں سورج کی شعاعوں یا چاند کے چہرے کو منعکس کرتا ہے اسی طرح دماغ کی روشن کرنیں ہر جانب روشنی بکھیرتی ہیں اور بعض اوقات تو یہ روشنی سقفِ منقّش کو بھی عبور کر جاتی ہے۔ بے کار آدمی جس کے سامنے کوئی نصب العین نہیں درحقیقت زیاں کار ہے۔ وہ اپنے آپ کو ہر جگہ موجود سمجھتا ہے لیکن درحقیقت وہ کہیں بھی موجود نہیں ہوتا۔ اور اگر موجود بھی ہو تو باشعور لوگوں کی محفل میں اس کا وجود کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور وہ غیر حاضر ہی شمار ہوتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل جب طویل اور ہنگامہ خیز مصروف عملی زندگی گزارنے کے بعد میں ریٹائر ہو کر گھر کی پناہ گاہ میں گُھس آیا تو میں نے سوچا کہ بہت ہو چکا۔ اور فیصلہ کیا کہ اب میں شورِ حیات سے کنارہ کشی اختیار کر لوں گا۔ امورِ جہاں سے حتی الامکان بے تعلق رہوں گا۔ اور کسی نئے منصوبے کو زیرِ عمل لانے کے بجائے اپنی خلوت میں گوشہ نشین ہو کر زندگی کے باقی ایّام، امن، چین، سکون اور آشتی کے ساتھ بسر کروں گا۔ میں زندگی کے جان لیوا ہنگاموں سے نجات حاصل کرنے کا آرزومند تھا، میرے قوائے جسمانی تھک چکے تھے اور اب ماسوا اس کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ صحنِ چمن میں کُرسی پر دراز ہو کر خود اپنے ساتھ باتیں کروں، آتشدان کے سامنے بیٹھ کر کوئی کتاب پڑھوں اور اس کتاب کے مصنف کے ساتھ آزادہ خیالی سے تبادلۂ افکار کروں۔ شام اُترے تو حدِ نظر تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں نکل جاؤں اور گھر جاتے ہوئے پرندوں کی مسرت میں شریک ہو جاؤں یا شام کے پہلے تارے کو ٹمٹماتا ہوا دیکھتا رہوں۔ یہ سب ایک بے کار اور بے عمل آدمی کے مشغلے تھے لیکن میں تو خلوت میں اپنے ساتھ ہم کلام ہو کر تحصیلِ مسرت اور اکتسابِ سکون کرنے کا آرزومند تھا۔ اور اس سے زیادہ پُرلطف کام کیا ہو سکتا ہے!

میرا خیال تھا کہ میری طویل زندگی نے مجھے بالغ نظر بنا دیا ہے۔ رزم گہِ حیات سے میں نے جو تجربات سمیٹے تھے ان کے گہرے نقوش میرے ذہن پر مرتسم تھے اور اقتضائے وقت نے اب مجھے بے حد پختہ کر دیا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ بے کاری تو ذہن کو منتشر کر دیتی ہے۔ اسے اضمحلال اور مایوسی کی آماجگاہ بنا دیتی ہے۔

حالانکہ ذہن تو مفرور گھوڑے کی مثال ہے جو اپنے مالک کے اصطبل سے آزاد ہونے کے بعد زیادہ مستعد اور پھرتیلا ہو جاتا ہے۔ اور جتنا کام پہلے وہ دوسروں کے لیے حالتِ جبر میں کرتا تھا اب اس سے سوگنا زیادہ اپنے لیے کر سکتا ہے۔

اس تصور کے پیدا ہوتے ہی میرے ذہن نے بھی مفرور گھوڑے کی طرح دوڑنا شروع کر دیا۔ اب سینکڑوں عجیب الخلقت باتیں، دیو ہیکل افکار اور اُلجھے ہوئے تصورات، کسی نظم و ضبط کے بغیر یکے بعد دیگرے مجھ پر یلغار کر رہے تھے۔ مَیں ان کی مہملیت پر غور کر رہا تھا۔ ان کے انوکھے زاویوں پر اطمینان اور سکون سے سوچ رہا تھا۔

مَیں اپنے ہجوم افکار میں گھرا ہوا ہوں لیکن میرے پاس لمحاتِ فراغت کی بڑی فراوانی ہے۔ یہ میری فرصت کا بہترین مصرف ہے اور اب تو مَیں نے اپنی بے کاری کا حل بھی تلاش کر لیا ہے۔ اور وہ یہ کہ قلم اٹھا کر مَیں ان افکارِ پریشاں کو ضابطۂ تحریر میں لا رہا ہوں۔ میرا مقصد کسی کو مرعوب یا متاثر کرنا نہیں۔ لاریب! مَیں اپنے تجربے اور دانش کو فروغِ عام دینے اور بنی نوعِ انسان کے لیے فلاح کی راہ ہموار کرنے کا خواہشمند بھی نہیں ہوں، مَیں تو انہیں محض اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اپنی بے کاری کے ان لمحوں کو یاد رکھ سکوں اور بعد میں جب کبھی موقعہ ملے تو ان نوشتوں کے مطالعۂ مکرر سے میرا ذہن "آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر" سکے۔

ڈاکٹر انور سدید کے اظہار کی ایک اور
شوخ کرن

انشائیہ

"ذکر اس پری وش کا"

دس انشائیے، تیکھے، میٹھے اور لذیذ

(چھپ گئی ہے)

ناشر: مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا۔

موت ایک پتنگے کی

ورجینیا وولف
انور سدید

ان دنوں مختلف اقسام کے موسمی بھونرے فضا میں ہر طرف اڑتے دکھائی دیتے ہیں لیکن انہیں صحیح معنوں میں پتنگا شمار کرنا مناسب نہیں۔ وجہ یہ کہ اس قسم کے بھونرے خزاں کی اندھیری راتوں اور رنگینی ہوئی عشق پیچاں کی شاخوں کا وہ خوشگوار اور طرب افزا تاثر پیدا نہیں کرتے جو کیڑوں کی پھولوں بھری اوٹ میں چھپا ہوا بسنتی پروں والا ایک عام سا پتنگا پیدا کر دیتا ہے۔ بھونرا تو موسمی مخلوق ہے جو نہ تو پتنگے کی طرح اداس ہے اور نہ تتلی کی طرح مسرور! بایں ہمہ میں جس پتنگے کی بات اب کر رہا ہوں اس کا رنگ گھسیا لا تھا۔ اس کے جسم کے ساتھ چھوٹے چھوٹے خوبصورت پر بھنچے ہوئے تھے اور ان پروں کے ساتھ گھاس رنگ کی سبز خوش وضع جھالریں بھی آویزاں تھیں۔ یہ پتنگا میرے سامنے والی کھڑکی کے ایک شیشے کے ساتھ لگا ہوا تھا اور موجوداتِ حیات پر مطمئن نظر آتا تھا۔

وسط ستمبر کی اس شفیق، حلیم اور خوشگوار صبح کو میں اپنی میز پر بیٹھا کام کر رہا تھا۔ موسم گرما کی حدت اب ختم ہو چکی تھی اور فضا میں معطر خنکی سی پھیل گئی تھی۔ سامنے کھیت میں ایک کسان ہل چلا رہا تھا۔ ہل کا پھالا زمین میں اترتا تو مٹی دب جاتی اور اس کے اندر کا نم سورج کی کرنوں میں چمکنے لگتا۔ زمین کتنی جگ پال تھی۔ کسان کی محنت کو سرفراز کرنے کے لیے اس نے اپنا سینہ ہل کی انی کے سامنے رکھ دیا تھا۔ خیال کی اس پرواز نے میرے تن بدن میں ایک عجیب سا تحرک پیدا کر دیا۔ کتاب میرے سامنے کھلی پڑی تھی۔ لیکن میں اس پر توجہ مرکوز کرنے سے قاصر تھا۔ میں نے زمین سے نظر ہٹا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان کی بسیط فضاؤں میں ہزاروں سیاہ رنگ پرند محو پرواز تھے۔ ارے! یہ تو کائیں کائیں کرنے اور بچوں کی روٹی اڑا لے جانے والے ندیدے کوّے تھے۔ لیکن آج ان پر سرشاری کی ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی اور وہ سب ہم آواز ہو کر موسیقی کا ایک لمبا لہرا اُٹھا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے جشن عید منا رہے ہوں۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ کوّے نہیں تھے بلکہ درختوں کی پھننگوں پر پھیلا ہوا ایک طویل و عریض جال تھا جس میں ہزاروں سیاہ گرہیں پڑی ہوئی تھیں اور گرہوں سمیت یہ جال فضا میں مسلسل گردش کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد یہ جال کسی بڑے درخت کو اوڑھ لیتا تو یوں لگتا جیسے درخت کی ہر شاخ میں ایک کالی سی گانٹھ پڑ گئی ہو۔ پھر اچانک غول کا غول چیختا، چلاتا اور شور مچاتا ہوا آسمان کی طرف اڑ جاتا اور آہستہ آہستہ ایک بڑے خوش شکل دائرے کی صورت اختیار کر لیتا۔ کوّوں کے اس جال کا فضا میں پھیلنا اور پھر اچانک درخت میں سمٹنا —— قبض و بسط کا ایک ایسا پُر لطف نظارہ تھا جس کی مسرت کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ یہ منظر تو آنکھوں کے راستے خود بخود دل میں اتر جانے والا منظر تھا۔

اس دل کش کیفیت میں میری نظر کھڑکی کے شیشے کے ساتھ اٹکے ہوئے گھس رنگے پتنگے میں اٹک گئی۔ اخاہ! آفت کا یہ پرکالہ اب شیشے کی شفاف اور چمکدار سطح کے ساتھ محو خرام تھا۔ اور ایک کونے سے دوسرے کونے کی طرف وتری سمت میں چکر لگا رہا تھا۔ پتنگا اپنی تمام تر داخلی قوت سے سرشار تھا اور اس قوت کو بروئے کار لا کر ایک بڑی مہم کو سر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ طاقت جو کوّوں کو اڑنے، گھوڑوں کو دوڑنے اور کسان کو ہل چلانے کے لیے

فعّال اور متحرک رکھتی ہے وہی طاقت اب اس حقیر سے پتنگے کے جسم میں بھی سرایت کر گئی تھی اور وہ شیشے کو پار کرنے کے لیے ایک ایسی مہم پر نکل کھڑا ہوا تھا جسے سر کرنا ممکن نہ تھا۔ لیکن پتنگے نے اپنی ناتوانی کا احساس کیے بغیر اس بڑے چیلنج کو قبول کر لیا تھا۔

میرے دل میں ہمدردی کا مُنفرد جذبہ بیدار ہوا۔ مَیں اسے مہم آرائی سے تو نہ روک سکا لیکن اپنے جذبۂ تجسس کو آسودگی فراہم کرنے کے لیے اسے مزید انہماک سے دیکھنے لگا۔

اس روز اکتسابِ مسرّت کے ممکنات اتنے فراواں اور متنوّع تھے کہ مجھے زندگی کے عمل میں اس پتنگے کی موجودگی بھی بامعنی نظر آنے لگی۔ پتنگے کی مشقت آزما جدّوجہد اس کی پوری زندگی کا مشکل ترین عمل نظر آتا تھا لیکن جس والہانہ سرخوشی، استقلال اور ولولے سے وہ محدود امکانات سے مسرّت کا آخری قطرہ تک نچوڑنے میں مصروف تھا وہ بذاتِ خود جذبات انگیز اور روح پرور منظر تھا۔ پتنگا جوش اور سرگرمی سے شیشے کے ایک کونے کی طرف لپکتا، وہاں ایک لمحے کے لیے رُکتا، پھر پہلے سے بھی زیادہ وارفتگی کے ساتھ دوسرے کونے میں جا بیٹھتا۔ اس نے شیشے کے دو کھونٹوں کا سفر نپٹا ڈالا تھا اور ان کا مشاہدہ بچشمِ خود کر لیا تھا۔ اب تیسرا یا چوتھا کھونٹ ہی دیکھنا باقی رہ گیا تھا۔ اور وہ اس میں ہمہ تن مصروف تھا۔ اسے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں تھی، حالانکہ سامنے طویل و عریض پہنائیاں، آسمان کی بے کراں وسعتیں، حدِّ نظر تک پھیلے ہوئے مکانات اور ان سے اُٹھتا ہوا ایک دار دھواں اور سمندر کی جانب سے جہازوں کی اِکّا دُکّا سیٹیاں، سب فضا کی میکانکی یکسانیت کو توڑنے میں معاونت کر رہی تھیں اور ان میں ایک خاص نوع کی جاذبیت بھی تھی۔ لیکن پتنگے کو تو تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ اسے ان میں سے کسی کے ساتھ بھی کچھ واسطہ نہیں تھا، اس کا تو ایک ہی مقصد تھا کہ کسی طرح شیشے سے پار ہو جائے، مقصد میں اس کی والہانہ شیفتگی کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ زندگی نے پتنگے کو عزم و عمل کے ایک بے حد باریک تار کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ اور اس وقت دنیا کی تمام قوت، حوصلہ اور استقلال اس کے جسمِ ناتواں میں مجتمع کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس نے جتنی مرتبہ بھی شیشے کا میدان عبور کیا اتنی مرتبہ ہی وہ مجھے حقیقی زندگی کا سرچشمہ نظر آیا۔

بلاشبہ وہ جسمانی اعتبار سے بہت حقیر اور ناتواں تھا، کائنات میں اس کا وجود لغوی طور پر عنقا کے برابر تھا۔ لیکن فی الوقت تو وہ ہمہ تن زندگی تھا، قوّت کا یہ وجودِ حقیقی بظاہر چکیلے شیشے پر رینگتا جا رہا تھا لیکن درحقیقت وہ میرے اور میرے جیسے اَن گنت دوسرے لوگوں کے ذہنوں کی تنگ اور اُلجھی ہوئی گلیوں میں سے اپنا راستہ بنا رہا تھا۔ اس پتنگے میں ضرور کوئی نادر اور انوکھی بات تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے خالص زندگی کی چھوٹی سی مالا میں لطافت اور فنکاری سے نرم نرم بال اور چھوٹے چھوٹے پر ٹانک دیئے ہوں۔ اور اسے ہم جیسے دنیادار انسانوں پر رازِ حیات منکشف کرنے کے لیے آڑے ترچھے راستوں پر رقص کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہو۔

پتنگا سرِ پُرغرور اُٹھائے باوقار انداز میں محوِ سفر تھا۔ وہ کھڑکی کے شیشے کو عزیب بے غیور انسان کی طرح زیرِ پا لاتا اور جب زندگی افروز افتخار کے ساتھ سطح سے بلند ہو کر فاتحانہ انداز میں اپنے چاروں کھونٹے دیکھتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے یہ تمام عالمِ رنگ و بُو اس کی جدّوجہد کے سامنے حقیر تھا لیکن اسی لمحے مجھے یہ خیال آتا کہ زندگی کا یہ پرکالہ اگر کسی اور صورت میں پیدا ہوتا تو کیا ہوتا؟ اور اس خیال کے آتے ہی دل میں ایک مُبہم سی اُداسی ایک موہوم سی افسردگی پھیلنے لگتی۔

چند ثانیے بعد مجھے محسوس ہوا کہ پتنگا اس مسلسل رقصِ درویش سے تھک سا گیا ہے۔ اور آرام کے لیے شیشے کے کنارے کے ساتھ لگی ہوئی چوکھٹ کے ساتھ چمٹ کر دھوپ سینک رہا ہے۔ زندگی کے خارجی منظر پر اب قدرے جمود طاری ہو گیا تھا۔ گردو پیش کا تحرک رکا ہوا تھا۔ مَیں نے پتنگے سے اپنی توجہ ہٹالی اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ لیکن چند لمحے بعد جب اچانک اُوپر دیکھا تو نگہہ پھر پتنگے پر جا پڑی۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے پر پھیلا کر دوبارہ ناچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اب اس کا بدن تھکن سے چور چور تھا اور اس کے جسم میں پہلے جیسی والہانہ سرگرمی نظر نہیں آتی تھی۔ چنانچہ جب ایک دفعہ زور لگا کر اُس نے

شیشے کے دوسرے کھونٹ میں جانے کی کوشش کی تو وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ میں نے اس کی سعی رائیگاں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا بلکہ لاشعوری طور پہ انتظار کرنے لگا کہ پتنگا ابھی اپنی جدوجہد کا آغاز خودکار انداز میں کر دے گا۔ وہ مجھے اس مشین کی مثال لگا جو چلتے چلتے رُک جاتی ہے تو نقص کا ازالہ کرنے یا اس کی وجہ دریافت کیے بغیر ہم یہ توقع کرتے ہیں کہ مشین ابھی چل پڑے گی۔

پتنگے نے کم و بیش سات مرتبہ حرکت کرنے کی کوشش کی لیکن پھر اچانک اپنے پَر پھڑپھڑا کر وہ کھڑکی کی دہلیز پر پُشت کے بل گر پڑا۔ اب اس کی بے چارگی اور بے بسی نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرلی۔ مجھے احساس ہوا کہ پتنگا کسی بڑی مشکل سے دوچار ہے اور حرکت تک نہیں کر سکتا۔ اس کی پشت زمین کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور آسمان کی طرف اٹھی ہوئی ٹانگیں بے ثمر جدوجہد کر رہی تھیں۔ میں نے انگیخت دینے کے لیے اس کی طرف پنسل بڑھائی لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کی ناکامی اور ناکارگی درحقیقت موت کا پیش خیمہ تھی۔ میں نے پنسل میز پر رکھ دی اور پتنگے کو مزید توجہ سے دیکھنے لگا۔ اس کی ٹانگوں میں ایک دفعہ پھر ہیجانی تحرّک پیدا ہوا۔ شاید وہ اپنے کسی دشمن سے نبرد آزما تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر اس دشمن کو تلاش کرنے کے لیے دیکھا لیکن وہاں تو بس اوندھا پڑا ہوا پتنگا ہی موجود تھا۔

میں نے ایک نظر باہر دیکھا۔ وہاں کیا ہو رہا تھا؟ شاید اب دوپہر ہو گئی تھی۔ کھیتوں میں کام رُکا پڑا تھا۔ جہاں پہلے زندگی کا تحرّک اور ہماہمی تھی وہاں اب سکوت اور خاموشی نے ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ کوّے پیاس بجھانے کے لیے چشمے کی طرف اڑ گئے تھے۔ گھوڑے خاموشی سے سر نیہوڑے کھڑے تھے کھیت کے عین وسط میں کسان کا ہل اوندھا پڑا تھا۔ اور بیل درخت کے نیچے بیٹھے ہانپ رہے تھے۔ لیکن ان سب کی کیفیت گھس رنگے پتنگے سے مختلف تھی۔ ان سب میں حیات کی داخلی قوت موجود تھی۔ بس اس کا اثر و عمل چند لمحوں کے لیے رُک گیا تھا اور اس کا اخراج کسی مخصوص جہت میں نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن پتنگا تو اپنی زندگی جیسے صَرف کر چکا تھا۔ وہ جبرِ مشیت کا شکار تھا اور میں اس المناک لمحے میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا ماسوا اس کے کہ اس کی ننھی منّی ٹانگوں کی غیر معمولی نوعیت کی حرکت کا مشاہدہ کرتا رہوں اور سوچوں کہ مشیت نے پورے شہر کو اسی طرح اپنے پنجوں میں لے رکھا ہے۔ صرف ایک شہر ہی نہیں یہ پنجہ تو پورے عالمِ انسانیت پر محیط ہے اور اس سے کسی کو مفر نہیں۔

قنوطیت اور پژمردگی کے اس غلبے میں میں نے دیکھا کہ پتنگے نے اپنی تھکن اتار دی تھی۔ اس کی ٹانگیں ایک بار پھر پھڑپھڑا اٹھی تھیں اور یہ ہلّہ اتنا شوریدہ اور مضطربانہ تھا کہ پتنگا اسی میں اپنی ٹانگوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ بلاشبہ میری تمام ہمدردی زندگی کے ساتھ تھی اور مجھے قطعاً اُمید نہیں تھی کہ جہد للبقا کی اس کوشش میں پتنگا کامیاب بھی ہو سکے گا۔ لیکن جب وہ اکڑ کر سیدھا کھڑا ہو گیا تو میں واقعی انگشت بدنداں رہ گیا اور میرے منہ سے بے اختیار صدائے تحسین نکل گئی۔

ایک دفعہ پھر میرے سامنے زندگی نے ایک زمرّدیں مالا کی متحرک صورت اختیار کرلی تھی۔ میں نے پتنگے کو شاباش دینے کے لیے پنسل آگے بڑھائی لیکن میری یہ کاوش بے کار گئی۔ پتنگے نے پنسل کے لمس کو محسوس تک نہ کیا۔ اور اب جیسے مرحلۂ شوق طے ہو گیا تھا۔ اب سب کچھ بیکار تھا۔ زندگی اپنی بازی ہار چکی تھی۔ پتنگے کا جسدِ خاکی زندگی کے سمندر میں تیرتے تیرتے آسودۂ ساحل ہو چکا تھا۔ جہد للبقا ختم ہو چکی تھی۔ پتنگے نے موت کو چھو لیا تھا۔

میں نے جب مرے ہوئے پتنگے کو دیکھا تو ایک عجیب سی حیرت نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ موت کی عظیم قوت نے کتنی حقیر سی مخلوق کو اپنا حریف سمجھ لیا تھا؟ اسے اپنے پنجۂ آہنیں میں دلوچ کر کیا موت فتحیاب ہو گئی تھی؟ کیا اس کی یہ یلغار بہت بڑی کامیابی سے ہمکنار ہو چکی تھی؟ چند لمحے پہلے زندگی میرے لیے ایک پُراسرار قوت تھی لیکن اب موت مجھے ایک اجنبی طاقت نظر آنے لگی۔

پتنگا میرے سامنے سکون اور شائستگی کے ساتھ زمین پر پڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بھی حرفِ شکایت نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں مُندی ہوئی تھیں۔ لیکن اس کا جسم شانت تھا۔ شاید وہ کہہ رہا تھا کہ

"میں قوی ہوں لیکن موت مجھ سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔"

رابرٹ لنڈ
سلیم آغا قزلباش

چاکلیٹ بس

میں لندن کے گلی کوچوں میں چاکلیٹ بس کے نمودار ہونے پر تاسف کیے بغیر نہیں رہ سکتا، اس بنا پر نہیں کہ مجھے ایک نئے رنگ والی بس کی آمد پر اعتراض ہے بلکہ اس کے برعکس میں تو ہمیشہ سے موٹر بس کو پرانی گھوڑا گاڑی کا ایک کم حیثیت جانشین سمجھتا آیا ہوں، خصوصاً اس وجہ سے کہ گھوڑا گاڑیاں پکاڈلی میں کتنے ہی رنگوں میں مل جایا کرتی تھیں جتنے رنگ آپ "رنگوں والے ڈبے" میں پاتے ہیں۔ جبکہ موٹر گاڑیاں ایک مقررہ رفتار سے سُرخ رنگ کی تھکا دینے والی یکسانیت سے ہم آہنگ یکے بعد دیگرے گزرتی رہتی ہیں تو یوں لگتا ہے کہ یہ شخصیت سے ویسے ہی تہی ہیں جیسے کہ جھینگا مچھلیوں کے ایک ہی طرح کے ڈھیر (اور وہ بھی اُبلے ہوئے)۔ لیکن اگر گلی کوچوں میں کسی ایک نئے رنگ کی رونمائی ناگزیر تھی تو پھر میں سارے رنگوں میں سے کم از کم چاکلیٹ براؤن کو وہاں دیکھنے کا متمنی نہیں ہوں گا۔ چاکلیٹ کی ایک خامی اس کا اپنا رنگ ہے۔ یہ چکھنے میں جس قدر لاجواب ہے دیکھنے میں اتنا ہی تھس۔ کوئی بھی شخص اسے کھانے کی زحمت نہیں کرے گا، اگر اُسے اپنے ذاتی تجربے سے یہ معلوم نہ ہو کہ یہ اپنے چہرے مُہرے سے زیادہ چکھنے میں خوش ذائقہ ہے۔ اس بات میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ تلافی کے بڑے بڑے اُصولوں کے مطابق جو زندگی میں جاری وساری ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پرندے جو نسبتاً کم خوشنما رنگ والے ہیں، نہایت ہی دلکش گیت گاتے ہیں اور وہ مٹھائیاں جو بدمزہ ہوتی ہیں اپنی مہک میں اتنی ہی بھرپور معلوم ہوتی ہیں۔ مگر بس نہ تو ایک پرندہ ہے نہ مٹھائی اور نہ ہی اسے سرخ، سبز، نیلی، پیلی، آسمانی حنائی اور بنفشی رنگوں میں رنگا گیا ہے۔ تاہم مجھے زیادہ تر محض رنگ کی وجہ سے چاکلیٹ بس کو دیکھ کر ملال کا احساس نہیں ہوا تھا، جب مَیں نے اُسے اگلے ہی روز پہلی مرتبہ اس مخصوص راستے پر آہستہ آہستہ جاتے ہوئے دیکھا جو میرے غریب خانہ سے بمشکل سوگز کی دُوری پر ہے۔ بہر طور مجھے اُن حالات میں کسی دوسرے رنگ والی بس پر بھی برابر کا معترض ہونا چاہیئے تھا۔ کچھ مدّت سے میری حتیٰ المقدور یہی کوشش رہی ہے کہ بسوں میں سفر کرنے سے اجتناب برتوں اور مَیں اس معاملے میں اکثر و بیشتر نہایت آسان طریقے سے ان میں ٹھنسی ہوئی زائد بھیڑ اور اُس کے منہ کے بھبھکوں کے کارن "بس بدر" ہونے میں کامیاب رہا ہوں۔ میں لندن کے کم از کم ایک مضافاتی قصبے کے باسیوں سے ہمنوا ہو کر یہ کہہ چکا ہوں کہ "یہ سب کچھ نہایت غیر شریفانہ ہے" اور عمر بھر کے لیے بس میں سوار نہ ہونے کی قسم کھا چکا ہوں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ جیسے ہی مَیں کسی ایسی بس کو آتے ہوئے دیکھتا ہوں، جس میں ایک آدھ نشست خالی ہو یا کم سے کم کھڑا ہونے کی جگہ ہو تو میرا ہاتھ اس کی جانب کسی عادی شرابی کے ممنوعہ بوتل کی طرف لپکتے ہوئے ہاتھ کی طرح خود بخود بڑھ جاتا ہے اور اگلے ہی لمحے میں اپنے آپ کو ہمیشہ کی طرح اس سواری کے "بلیک ہول" میں مقید پاتا ہوں جو کہ ایک غیر فطری طریق سے بازاروں میں جھٹکے کھاتی پھرتی ہے اور اس کے وہ جھٹکے جو ناقابلِ برداشت ہیں میری ایڑی میں گھس کر اور میری ہڈی پسلی میں سے گزرگاہ بنا کر جھنجھناتے ہوئے اُوپر کی سمت بڑھتے چلے آتے ہیں۔ تا آنکہ یہ میری کھوپڑی تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں جسے فقط میرے ہیٹ نے اُس چھت سے محفوظ و مامون کر رکھا ہے جو ہر ہچکولے پر دونوں اطراف سے اس پر کاری ضرب لگاتی ہے۔ "یہی زندگی ہے" مَیں خود سے کہتا ہوں جب کہ میرے خالی ہاتھ میں تھاما ہوا بیگ اُس اخبار سے اٹھکیلیاں شروع کرتا ہے جسے ایک بدمزاج بوڑھا آدمی پڑھنے کی کوشش میں ہے

میں سوچتا ہوں کیا یہی وہ تہذیب ہے جسے ہم اہلِ یورپ ساری دنیا میں ترویج دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا یہی اہلِ یونان و روما اور دوسری تمام بڑی بڑی تہذیب یافتہ نسلوں کے خوابوں کی تعبیر ہے!

بحرِ جنوبی کے جزیرے میں بسنے والا کس قدر بدنصیب ہے کہ ساحلی جھیل کے کنارے کاہلی سے پاؤں پسارے پڑا رہتا ہے اور یوں خود کو بس میں جھٹکے کھانے کے "ارفع" تجربے سے محروم کر رکھتا ہے! فیجی جزائر میں رہنے والے کے لیے یہ بات کتنی مایوس کن ہے کہ وہ آدمی کی طرح کسی خودکار مینوٹار کے شکم میں سوار ہونے کے بجائے کسی جنگلی جانور کی طرح پیادہ جگہ جگہ گھومتا ہے! میں اس ڈگر پر بغیر کسی تاسف کے سوچتا جاتا ہوں اور اسی دوران میں کنڈکٹر کو محض اسی بات کے لیے کرایہ بھی ادا کر دیتا ہوں کہ وہ مجھے سمٹ سمٹا کر اس جگہ گھسنے کی اجازت دے دے جہاں اگر کسی قاتل یا دو بیویوں والے شوہر کو بھی مقید کر دیا جاتا تو وہ دُہائی دیتا کہ اُس کے لیے قید و بند کی یہ زندگی ناقابلِ برداشت بنائی جا رہی ہے۔ اگر جیل خانہ "اندرونِ بس" سے کچھ ملتا جلتا ہوتا جہاں "کھڑا ہونے کی جگہ صرف پانچ حضرات کے لیے ہے" کا بورڈ آویزاں ہوتا تو کوئی بھی شخص اگر وہ پاگل یا پیدائشی مجرم نہیں ہے، کسی ایسے جرم کا ارتکاب نہ کرتا جس کی پاداش میں اُسے کسی ایسی جگہ پہنچا دیئے جانے کا خدشہ لاحق ہوتا۔ میرے خیال میں اس سے بہتر اور کوئی دوسری "اصلاحِ حوالات" موثر ثابت نہیں ہو سکتی کہ جیل خانوں کا وجود یکسر ختم کر دیا جائے اور مجرموں کو جیل بھیجنے کے بجائے موٹر بسوں کے اندر محبوس کر دیا جائے۔ تصور کیجئے کہ ایسی صورت میں ایک ماہ کی قید با مشقت کا کیا مطلب ہو سکتا ہے!۔ ہر روز ہمہ وقت کٹہرے کے ساتھ لٹکے رہنا، ٹکرانا، آگے پیچھے ہچکولے کھانا، ایک گلی میں سے جھٹکے کھاتے ہوئے دوسری گلی میں پہنچنا جو پہلی گلی سے زیادہ اداس ہو اور پھر تیسری گلی میں پہنچنا جو اُس سے بھی زیادہ بے کیف ہو۔ اور کچھ پڑھنے کے قابل نہ رہنا بجز صابن، گیس کی چمنیوں اور بوٹ پالش کے اشتہارات کے۔ کبھی جنت الفردوس کی ہوا کے جھونکے کو محسوس نہ کرنا بجز اُس خشک سانس کی صورت میں جو نصف گرد اور نصف دوسروں کے سانسوں سے مرتب ہوتی ہے۔ اور ایک ایسی جگہ پر لوگوں کے انبوہ میں گھرے رہنا جہاں کوئی اپنے عزیز ترین دوستوں کے ہجوم میں بھی کھڑا رہنا گوارا نہیں کر سکتا — دانتے اگر چاہتا تو جہنم کی سزاؤں میں اس سزا کو بھی شامل کر سکتا تھا۔ میرے نزدیک اس کو اور تو کوئی فائدہ نظر نہیں آتا سوائے اس کے کہ یہ آپ کو اس جگہ تک نسبتاً سبک رفتاری سے جاتی ہے جہاں کہ آپ جانا چاہتے ہوں یا جس جگہ کو آپ اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہاں جایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بسوں کے اندرون کا استعمال مجرموں تک محدود کر دینے کے حق میں ہوں۔ کیا قدیم زمانے کے لوگ مجرموں کو بالکل اسی انداز سے سزا نہیں دیا کرتے تھے جب وہ انہیں میخوں سے اٹے مشکوں میں بند کر کے پہاڑی سے نیچے لڑھکا دیتے تھے!

بسوں سے میرے تنازعہ کے اس نقطہ پر میرا رویّہ شاید غیر منطقی نظر آئے کہ میں بسوں کی نئی کھیپ کا (جو ظاہر ہے کہ سفر کی گھٹن کو دُور کرنے کے لیے لائی گئی ہے) اس ناروا انداز میں خیر مقدم کر رہا ہوں، تاہم اگر میں نے ایسا کیا ہے تو میرے پاس اس کا ایک معقول جواز بھی ہے۔ اُس لمحے جب پہلی چاکلیٹ بس میرے گھر والے روٹ پر نمودار ہوئی، میں تمام موٹر بسوں سے کچھ اتنا دل برداشتہ ہو چکا تھا کہ میں نے از سرِ نو چہل قدمی کا فن سیکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ ایک ایسا فن جسے میں تقریباً فراموش کر بیٹھا تھا۔ ایک روز میں سچ مچ پیدل چل نکلا۔ میں نے اسے حرکت کی ایک انتہائی پُرکیف کیفیت محسوس کیا۔ اس میں ایک قسم کا قدرتی آہنگ تھا۔ اب مجھے یہ ہرگز محسوس نہ ہوا کہ لندن کے ایک علاقے سے دوسرے میں جاتے ہوئے مجھ سے کہیں بڑی کوئی طاقت مجھے ادھر اُدھر پھینک رہی ہے۔ مجھے لگا کہ میں اس شکتی کی ہمراہی میں ایک بوڑھے سگ کی سی آہستگی کے ساتھ چل سکتا تھا یا اُس مرغی کی طرح چہل قدمی کر سکتا تھا جو مزے مزے سے دانہ دُنکا چگ رہی ہو۔ اب میں جہاں چاہتا رُک کر دکان کی کھڑکی میں سے دکان کے اندر جھانکتا اور اٹھارہویں صدی کے بنے پھولوں کو یا ڈنڈی کیکوں کی خوش سلیقہ ترتیب کو یا پھر اُس سفری بیگ کو دیکھتا جسے میں خرید لیتا اگر میرے پاس اسے خریدنے کی استطاعت ہوتی یا پھر میں ایتھل ڈل کے تازہ ناول کے سرورق پر چھپی تصویر کا دیدار کرتا یا موتیوں کے اس ہار پر نگاہ دوڑاتا جسے میں فروخت کر ڈالتا اگر کوئی مجھے یہ مفت عنایت کرتا یا سبزی فروش کے ہاں

آلوچے یا اجوائن خراسانی پر چسپاں قیمتوں والی پرچیوں کو پڑھتا ـــــــ مگر یہ تو پیدل چلنے کی بے پایاں مسرّت کا محض ایک ادنیٰ سا جزو ہے۔ سب سے بڑی مسرّت تو اس احساس میں ہے کہ ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے نیز اس احساس میں کہ ایک مقام سے سرپٹ دوڑ کر کسی دوسرے اسی جیسے مقام تک پہنچنا ایک عالمگیر حماقت کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ قانونِ فطرت ہے کہ ہم ہر حال میں رواں دواں رہیں۔ یہ کام بھیڑ چراگاہ میں، مکھی کھڑکی کے شیشے پر اور چڑیا مینڈک پر انجام دیتی ہے۔ ہر جگہ جاندار مجبور ہیں کہ زندہ رہنے کے لیے چھلانگ لگائیں، ناچیں یا ویسے ہی چہل قدمی کریں۔ لیکن وہ تحرک جو زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہے محض ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جانے کا نام نہیں ہے۔ یہ تو فقط اعضا یا پروں کی پُر آہنگ مشق ہے جس میں کسی خاص جگہ پر پہنچنے کا گھٹیا مقصد مضمر نہیں ہے۔ وہ ننھے منے پتنگے یا مچھر جو ایک بلبلے بادل کے ساتھ اوپر نیچے اڑتے ہیں کسی خاص جگہ جانے پر بضد نہیں ہوتے، مجھے تو اس بات میں بھی شک ہے کہ وہ کچھ کھانے پینے کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں۔ بات محض اتنی سی ہے کہ وہ جبلی طور پر جانتے ہیں کہ کنکروں کے ڈھیر کی طرح کسی ایک جگہ ساکت و صامت پڑے رہنے کے بجائے سیاروں کی طرح مدام رواں دواں رہنے میں زیادہ لطف ہے۔ آدمی وہ واحد جاندار ہے جس نے تحرک کے اس ابدی حصار کو توڑ کر فرار حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور خود کو ٹھہراؤ کے عالم میں گویا مقید کر لیا ہے۔ حالانکہ وہ نہ تو لنگڑا لولا ہے اور نہ ہی مردہ! وہ اس جگہ سے جہاں کہ وہ اب ہے، کسی دوسری جگہ جانے کا تو آرزومند ہے، مگر وہ نہیں چاہتا کہ اس کے لیے حرکت بھی کرے۔ چنانچہ اپنی عیاری سے اس نے متحرک رہنے کے یکے بعد دیگرے کئی ذرائع ایجاد کر لیے ہیں۔ اس نے فعالیت کو انفعالیت کے لیے خیرباد کہہ دیا ہے، حتیٰ کہ اس نے بجری کے اس انبار کی طرح جو ٹرک انجن کی دھمک سے جاگ اٹھنے کے بعد کھڑکھڑانے لگتا ہے، اپنی کسی غیر اہم منزلِ مقصود پر جلد از جلد لے جانے کی آرزو کو تقریباً حاصل کر لیا ہے۔

وہ انفعالیت کی اس انتہا تک سُست رفتار مرحلوں میں پہنچا ہے۔ اس نے اس بات کا آغاز بآسانی سدھ جانے والے جانوروں پر قابو پا کر اور انہیں اس بات پر مجبور کرکے کیا کہ وہ اسے اٹھا کر لے جانے کی خدمت سرانجام دیں۔ گھوڑے کی پیٹھ پر سواری کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ایک حرکت کو ترک کرکے ایک متبادل حرکت اختیار کر لی ہے۔ سوار ہنوز اپنی حرکات کے سلسلے میں فعال ہے، اس کے پٹھے ویسے ہی نغماتی زیر و بم کے ساتھ کھلتے اور بند ہوتے ہیں جیسے پیدل چلنے کی صورت میں۔ وہ ایک بندۂ بشر بننے کے بجائے ایک سنتور (ایسا عفریت جس کا سر آدمی کا اور دھڑ گھوڑے کا ہوتا ہے) بن گیا ہے۔ بالکل اسی طرح کشتی ایجاد کرکے آدمی نے بہ آسانی اپنے اس آہنگ کے دائرہ کار کو وسعت بخش دی۔ وہ پہیوں اور بادبانوں کو ایجاد کرکے از خود متحرک ہونے کے بجائے متحرک کیے جانے کی آرزو کے نزدیک تر ہوتا چلا گیا۔ اس نے جشن منانے کا اظہار کچھ یوں کیا کہ اپنے جوڑوں اور پٹھوں کو کاوش کی لذت سے آزاد کرنے میں اس نے لطف محسوس کیا مگر اس صورت میں بھی اس نے باگوں کو ڈھیلا چھوڑنے اور پھر کھینچنے، نیز بادبانی کشتی کو کھینے اور اس کا رُخ متعین کرنے کے مشاقانہ فعل میں لطیف اور ارفع لذتوں کا تجربہ کر لیا۔ اس کی سہل پسندی میں یوں اضافہ ہوا جیسے موٹر گاڑیوں اور دخانی جہازوں کے قد و قامت میں اضافہ ہوا اور یوں اس کی سہل پسندی بڑھتی ہی چلی گئی۔ اب وہ گاڑی چلانے یا کشتی کھینے کا کچھ زیادہ متمنی نہیں رہا۔ وہ اب ایسے گھوڑے کی سواری پر مطمئن تھا جسے چلانا تک اسے نہ آتا تھا۔ اور تو اور کشتی کو یوں استعمال کرنا چاہتا تھا کہ جیسے وہ کوئی سفری خواب گاہ ہو۔ اس کی اس بے توجہی نے میکانکی ذہن رکھنے والوں کے لیے ایک سنہری موقع مہیا کر دیا۔ یہ جان کر کہ آدمی کیسی کاہل مخلوق ہے! انہوں نے ریلوے اسٹیشن اور بحری بجرے ایجاد کیے نیز موٹر بسیں اور زیرِ زمین ٹیوبز بنائیں تاکہ ان میں اس لاچار مخلوق کو ہاتھ پاؤں ہلانے کی زحمت دیئے بغیر جوق در جوق قریہ قریہ لے جایا جا سکے، ماسوائے اس ادنیٰ سی تکلیف کے کہ وہ بس اپنا ایک ہاتھ جیب میں ڈال کر ٹکٹ کے لیے پیسے نکال لے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں نسلِ انسانی پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ مسافروں کی ایک نسل بنتی جا رہی ہے۔ کیا انسانوں کا وہ جمِ غفیر جسے ہم آج کل زیرِ زمین ریل کے اندر باہم گتھم گتھا حالت میں دیکھتے ہیں،

کالے پرندوں کے جھنڈ یا چیونٹیوں کے ایک والہانہ رقص سے کسی طور کم مسرور نظر آتا ہے! یہ لوگ جیب میں پڑے سکوں کی طرح کھنکتے تو ہیں لیکن اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتے۔ وہ عجلت میں تو ہوتے ہیں لیکن تیز رفتاری کا حسن ان کے سراپا میں سرایت نہیں کرتا۔ سیاروں میں سب سے حسین سیارے پر بہتے ہوئے جہاں ندیاں بہتی ہیں، جہاں ایک تابدار چندرما اُجلے فلک پر لڑھکتا ہے اور جہاں طیور اشجار پر نغمہ سنج اور بچے اُن کے نیچے بے طرح کھیل کود میں مصروف ہوتے ہیں، وہ اس سارے پُرجلال منظر سے جو محض ان کے لیے تھا بے توجہی برتتے ہیں تاکہ پہیوں کے اُوپر ایستادہ ایک فروزاں کیے گئے ڈبے کے اندر خود کو محبوس کر لیں اور زمین کے نیچے بے منظری کی یکسانیت میں سے پوری رفتار کے ساتھ بہا لیے جائیں۔ موٹر بس چاہے وہ بالائے زمین کیوں نہ ہو، پہیوں کے اوپر بنا ہوا ایک ڈبہ ہی تو ہے جو اپنے اندر ٹھنسے ہوئے مسافروں کو ایک ایسی ہی بے کیف دنیا سے گزارتا ہے۔ جب کوئی اس میں بیٹھتا ہے تو اُس کی حیثیت ڈاک میں سپرد کیے گئے خطوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ تب اُس کے لیے منزلِ مقصود ہی سب کچھ قرار پاتی ہے اور منزلِ مقصود تک کا سفر بے معنی ہو جاتا ہے۔ بے معنی لیکن بہر حال ایک ناگزیر شر! یہ اُس ساری دانائی کی ضد ہے جو ہمیں سفر سے اتنا ہی لطف اندوز ہونے پر آمادہ کرتی ہے جتنا منزل سے — جو ہمیں ہر دم رواں دواں رکھتی ہے چاہے ہم کسی خاص سمت میں نہ بھی "آجا" رہے ہوں۔

اگر نسلِ انسانی جسمانی تحرک کی لذت کو ترک کرنے میں بطور ازالہ ذہن یا روح کے تحرک کی نئی لذتوں کی تحصیل کر رہی ہوتی تو موٹر بسوں کے حق میں مزید موشگافی ممکن تھی۔ لیکن ذرا دنیا کے نقشے پر ایک نظر ڈالیے، آپ اس میں کسی ایک گاؤں کی بھی نشاندہی نہیں کر سکیں گے کہ جس میں ذہنی یا روحانی نوع کی کسی ویسی ہلچل کا شائبہ بھی موجود ہو جیسی مثلاً وہ ہلچل جس نے لندن سے گزرنے اور انسان کا کچومر بنانے والی پہلی بس سے چار سو برس قبل سلے اٹلی کو سُندرتا سے لبریز کر دیا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں میری تمنا ہے کہ نئی چاکلیٹ بس ہر اعتبار سے کامیاب ہو۔ میں اسے ضرور استعمال میں لاؤں گا، لیکن میں اُن تمام پا پیادہ آوارہ خرامیوں کو حسرت سے یاد کرتے ہوئے ایسا کروں گا کہ جیب میں تر و تازہ ہرے بھرے گول مٹول پھلوں والے سادہ درختوں کتب فروشوں، صرافوں، پھل فروشوں، تمباکو فروشوں اور گروی والوں کی دکانوں اور اُن کے پُر افتخار اور قدیم سائن بورڈوں کے پاس سے بااطمینان گزر جایا کرتا تھا، مگر جس سے میں اب محروم کر دیا گیا ہوں۔

جی۔ کے۔ چسٹرٹن
سلیم آغا قزلباش

نوجوان نہ رہنے کے مزے

اُدھیڑ عمر سے بڑھاپے کے مدار میں داخل ہونے کے گوناں گوں فوائد ہیں جن کا شاذ ہی سوجھ بوجھ سے ذکر ہوتا ہے۔ عام طور پر اُن کا ذکر ذرا جذباتی سا ہو کر کیا جاتا ہے۔ ایک عمومی ردِ عمل اس ضمن میں یہ ہے کہ تمام بوڑھے مرد حضرات کرسمس فادر کی طرح ایک عدد برف ایسی سفید براق ریش مبارک سے لیس ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ NESTOR کی طرح دانائی کے بے محابا اظہار میں مسرت محسوس کرتے ہیں۔ ان تمام باتوں نے نوجوان نسل کو پیرانہ سالی کے کمر سے اور بچے فوائد کے بارے میں بدظن کر دیا ہے اور انہیں بڑھاپے کے فوائد کا سچا بیان ناقابلِ فہم نظر آنے لگ گیا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ بوڑھے حضرات بالآخر دانا ہو جاتے ہیں کیونکہ آدمی کو عقل مشکل ہی سے آتی ہے۔ اس لیے بھی کہ بیشتر بوڑھے حضرات ایک نہایت پُرکشش طفولیت اور ایک پُرمسرت معصومیت کو قائم دائم رکھتے ہیں۔ بوڑھے لوگ اکثر و بیشتر نسبتاً کم عمر حضرات سے کہیں زیادہ رومینٹک ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو نسبتاً زیادہ مہم جو بھی اور پھر انہیں اس بات کو تسلیم کرنے میں بھی قطعاً کوئی باک محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کتنی ڈھیر ساری چیزوں کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔ لہٰذا اس ضرب المثل میں رتی بھر کھوٹ شامل نہیں کہ "ایک بوڑھے احمق سے بڑھ کر کوئی احمق نہیں ہے" شاید کہیں بھی کسی ایسے بیوقوف کا وجود نہیں ہے جو اپنی نجی "احمقوں کی جنت" میں آدمی خوشی سے بھی رہ رہا ہو۔ بایں ہمہ یہ بالکل بجا ہے کہ پختہ سالی کی تعریف میں جن دلائل کی عام طور پر تشہیر کی جاتی ہے فی الحقیقت وہ ایسے نہیں ہیں جیسے کہ بظاہر سچائی پر مبنی نظر آتے ہیں اور بالفرض اگر انہیں واقعی آشکار کر بھی دیا جائے تو یہ ہمیں بالکل ایک مضحک تضاد کے مانند معلوم ہوں گے۔

مثال کے طور پر ایک خوشی جو بڑھاپے سے وابستہ ہے وہ یہ ہے کہ بہت ساری چیزیں پہلے سے نسبتاً کم عمر زیادہ تر و تازہ اور کچھ زیادہ ہی جاندار سی دکھائی دینے لگتی ہے۔ یوں گویا ایک طرح سے ہم ان کی اہمیت سے آگاہ ہونے لگتے ہیں یا بہ الفاظِ دیگر ہم زندگی کو اُن مجلہ روایات، اداروں، نظریات اور اخلاقیات کے پیکروں میں دیکھنے لگتے ہیں جنہیں ہم نے جوانی کے ایام میں مُردہ تصور کیا تھا۔ ایک نوجوان مرد ایسی دنیا میں پلتا بڑھتا ہے جو اُسے اکثر و بیشتر ناقابلِ برداشت حد تک سال خوردہ نظر آتی ہے۔ وہ ایسی ضرب الامثال اور افکار کی فضا میں ہوش سنبھالتا ہے جو بڑی حد تک سنگلاخ اور بے حس ہوتے ہیں نیز وہ خود کو پامال چیزوں کے درمیان کچھ اس طریقے سے حنوط کیا ہوا محسوس کرتا ہے جیسے حیات آفریں دانۂ گندم کے بجائے موت کے سنگریزے اس کی جھولی میں ڈال دیئے گئے ہوں یا پھر اُسے مُردہ ماضی کی راکھ سے نواز دیا گیا ہو تاکہ وہ شہرِ خموشاں میں جیون بِتا سکے۔ حالانکہ یہ ایک انتہائی فطری غلطی ہے لیکن بہر حال غلطی تو ہے۔ بڑھتی ہوئی عمرِ رواں کی خوبی اس دریافت میں ہے کہ تمام روایات سچی اور اسی لیے زندہ ہیں اور واقعی کوئی روایت اس وقت تک روایت نہیں بن پاتی جب تک وہ سانس نہ لے رہی ہو۔ اس بات کو جان لینے میں بڑا لطف ہے کہ دنیا محض اس لیے پامال ضرب الامثال کو نہیں دہراتی کہ وہ مثالی ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ عملی ہیں۔ مثلاً جب تک مَیں نے ایک عدد کُتا نہیں پالا تھا مجھے اس ضرب المثل کا معنی معلوم نہیں تھا کہ "سگِ خفتہ" کو سویا ہی رہنے دینا چاہیئے" نہ ہی اُس کہاوت کا مفہوم معلوم تھا کہ "نہ کریں گے نہ کرنے دیں گے" یہ تمام مُردہ ضرب الامثال مجھے اب کافی جاندار لگنے لگی ہیں کیونکہ اب یہ میرے خیال میں

عملی نفسیات کا مجزو بن گئی ہیں۔ اس سے قبل میں مضافات میں جتنا عرصہ قیام کرتا تھا مجھے اس مقولہ یعنی "یہ ایک ایسی ضرر رساں آندھی ہے جس سے کسی کا بھلا نہیں ہوتا" کے مطلب کو جاننے کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اب یہ معقول بلکہ تیکھا سا مقولہ مجھے ایک ایسا چلبلا فقرہ معلوم ہوتا ہے جو باغ کے صدر دروازے پر میرے کسی دیرینہ دوست نے مجھ پر کسا ہو۔ یہ سب کچھ ایسا ہے جیسے ہنستی بستی دنیا میں نمایاں اشیاء کے درمیان جیا جائے نہ کہ مُردہ اور پیش پا افتادہ چیزوں کے بیچ زندگی بسر کی جائے۔ در اصل یہ تو نوجوانی کی بغاوت ہے (کچھ بغاوت بھی ہو سکتی ہے) جو گرد و پیش کے ماحول کو مُردہ اور بے معنی تصور کرتی ہے۔ یہ تو عہد پیری ہے اسے دوسرا بچپن بھی کہا جا سکتا ہے) جس پر اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ ہر شے کی اپنی معنویت ہے نیز یہ کہ خود زندگی کبھی موت سے ہم کنار نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ہم نے ابھی ابھی قسمت کے پہیئے کی ایک ایسی حیرت انگیز کروٹ دیکھی ہے جس نے تمام تر جدید مادی تفاخر اور خوشحالی کو معطل کر دیا ہے۔ امریکہ جو ایک یا دو برس قبل طلائی شہروں سے مزین ایک وسیع ایلڈوراڈو (ELDORADO) تھا اب تقریباً اتنا ہی گڈمڈ ہو گیا ہے جتنا کہ برطانیہ بلکہ سچ پوچھئے تو آئرلینڈ سے بھی کہیں زیادہ مشکل میں پڑ گیا ہے۔ صنعتی ممالک در حقیقت صنعتی ہونے کو مشکل تصور کر رہے ہیں جبکہ قدیم زرعی ممالک ہنوز یہ کہتے ہیں کہ وہ سخت جان ہو سکتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ میری پیش گوئی ہے یا مجھے ایسا ہونے کی توقع ہے۔ کیونکہ اکثر ایک شخص کسی چیز کو بخوشی گھٹیا کہہ دیتا ہے بغیر یہ سوچ کر کہ وہ واقعی گھٹیا ہے بھی کہ نہیں۔ بے شک ایسی بات کی کسی نوجوان، ترقی پسند، خوشحال اور مبہم مجوسے توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ تاہم ساری تاریخ اور ثقافت، ضرب الامثال اور پیش گوئیوں سے پٹی پڑی ہے جو مجبور کرتی ہیں کہ انہیں تسلیم کیا جائے۔ مصیبت یہ ہے کہ لوگ باگ یہ سمجھتے ہیں کہ ضرب الامثال اور تاریخ حد سے زیادہ ثقیل ہے اور پھر خود مجھے اور میرے نوجوان دوستوں کو بھی اوائل عمری ہی سے بار بار اور ایک جیسے تسلسل سے یہی باور کرایا گیا تھا کہ "قسمت متلون مزاج ہے" دولت کے بال و پر ہوتے ہیں اور وہ اڑتی ہے، طاقت پلک جھپکنے میں طاقت ور سے چھن جاتی ہے، غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے اور گستاخی دیوتاؤں کے عتاب کا موجب بنتی ہے۔ لیکن ہمارے لیے یہ سب کچھ اس وقت بے معنی تھا اور تمام ضرب الامثال ہمیں پرانی دقیانوسی اشیاء کے لیبلز پر جمی دھول کی طرح کھُردری اور باسی معلوم ہوتی تھیں۔ ہم نے ولندیزی کے زوال کے بارے میں سُن رکھا تھا جو ایسے ہی تھا جیسے کوئی عظیم الشان محل دھماکے کے ساتھ زمین بوس ہو جائے اور جس کے گرنے کی آواز اب بھی عہد بہ عہد سنائی دے رہی ہے۔ ہم نے یہ کہانی شیکسپیئر کے لفظوں میں پڑھی تھی جو اغلباً شیکسپیئر کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نہیں تھے۔ ہم نے انہیں پڑھا تھا مگر خود ان سے کچھ سیکھا نہیں تھا۔ ہم نے دس ہزار مرتبہ یہ باعث کوفت بات پڑھی تھی کہ نپولین آف مارینگو اور نپولین آف ماسکو میں کیا فرق ہے۔ لیکن اگر ہم واقعی مارینگو کی جانب دیکھ رہے ہوتے تو کبھی ماسکو کی آرزو نہ کرتے۔ ہم جانتے تھے کہ چارلس پنجم اپنے تخت و تاج سے مستعفی ہو گیا تھا اور چارلس اوّل اپنے سر سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، سو ہمیں ہر واقعہ کے SIC TRANSIT-GLORIA-MUNDI کا اعلان کرنا چاہیے تھا۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ رومن سلطنت زوال پذیر ہو گئی تھی اور یہ بھی کہ اسپینی سلطنت طوائف الملوکی کی زد میں آ گئی تھی لیکن اس گُر کو نہ تو کسی جرمن نے کبھی جرمن سلطنت پر اور نہ کسی برطانوی نے برطانیہ کی سلطنت پر آزمایا تھا۔ لہٰذا اب ان سچائیوں کی بار بار کی تکرار مسلمہ حقیقت کی پرانی اور غیر مختتم تکرار کی طرح ہی محسوس ہوگی تاہم آج میرے لیے یہ ایک طرح سے حیران کن اور چونکا دینے والی دریافتیں ہیں کیونکہ میں نے مُردہ ضرب الامثال کو دوبارہ زندہ ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔

یہ سب کچھ پچھلی عمر کے ان بہت سارے تصورات کے مانند ہے جن کا الفاظ کی صورت میں ہر اُس شخص کو بتانا تقریباً ناممکن ہے جو بذاتِ خود اس قسم کی صورتِ حال سے نہیں گزرا ہے۔ یہ تو بُعد اور ہمواری کے اس فرق کے مانند ہے جس کو تا دیر بیزاری سے دیکھتے ہوئے نوجوان آدمی کو معاً پتہ چلتا ہے کہ جسے وہ ڈائیاگرام سمجھ رہا تھا وہ تو شیشت کا حامل ہے۔ یہ تو غیر نامیاتی سے نامیاتی کی جانب ایک ناقابلِ بیان قسم کی تبدیلی ہے یوں جیسے کسی قدیم مصری لوح پر کندہ پتھر کے افعی اور پرندے دوبارہ زندہ چیزوں کی طرح متحرک ہو گئے ہوں۔ جب ہم جوان تھے تو ضرب المثل مُردہ تھی مگر اب کہ ہم موت کے دروازے

پروسنگ دے رہے ہیں تو یہ ایک جیتا جاگتا حکیمانہ قول بن گئی ہے۔ گویا جب ہم مر رہے ہوتے ہیں تو ساری دنیا از سرِ نو زندہ ہو رہی ہوتی ہے۔

ایک اور تضاد یہ ہے کہ فقط نوجوان ہی نئی دنیا کو پورے طور پر نہیں سمجھتے بلکہ جدید زمانے کے لوگ بھی جدیدیت کو سمجھ نہیں پاتے۔ اس کے سوا وہ اور کچھ بھی نہیں چاہتے، حتیٰ کہ وہ جب ایک متحرک پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہیں تو یہ بھی بمشکل جان پاتے ہیں کہ وہ حرکت کر رہا ہے، بعینہٖ جیسے ایک عام آدمی زمین کی معمول کی گردش کو محسوس نہیں کر پاتا، لیکن جیسے وہ اس لمحے کافی شدت سے محسوس کرے گا جب زمین اپنی گردش اچانک اُلٹی طرف سے شروع کرے گی۔ نسبتاً پرانی نسل ان لوگوں پر مشتمل ہے جنہیں وہ وقت یقینی طور پر یاد ہے جب زمین ایک دوسرے انداز سے گردش کرتی تھی۔ وہ واضح طور پر اور شدت سے اس عہد کو محسوس کرتے ہیں جو شروع ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ وہ اس کے آغاز سے قبل وہاں موجود تھے۔ بوڑھوں کی فنکارانہ خوبیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ نئی چیزوں کو ایک چمکتے ہوئے پس منظر میں دیکھ سکتے ہیں، یوں وہ واضح اور صاف نظر آتی ہیں۔ نوجوانوں کے لیے یہ تمام اشیاء بجائے خود ایک عقبی دیار کا درجہ رکھتی ہیں اور بمشکل دکھائی دیتی ہیں۔ لہٰذا ذہین ترین تخلیق کار بھی عموماً اپنی اختراع کی ماہیئت کے بارے میں حیرت ناک حد تک غلط فہمی کا شکار رہتا ہے اور ان چیزوں کے بارے میں بھی جو واقعی نئی ہیں۔ سو جب ایک سب سے سال خوردہ باشندہ گاؤں کے معترز کو اس بات کا اعلان کرتے ہوئے سنے گا کہ گاؤں کا گرجا گھر بہت جلد منہدم کر دیا جائے گا اور اس کی جگہ ایک معدنیاتی فیکٹری قائم کر دی جائے گی تو وہ بالعموم ایک سٹھیائی ہنسی ہنس دے گا، اس لیے کہ سب سے جہاندیدہ یہ باسی بخوبی جانتا ہے کہ اس کے بچپن کے زمانے میں کوئی بھی گرجے میں نہیں جاتا تھا، ماسوائے امارت پرستانہ جذبہ رکھنے والے لوگوں کے ـــــ اور اب خود اس کے بڑھاپے کے زمانے میں گرجا گھر ایک بار پھر سے معتقدوں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ اپنی اس حیثیت میں کہ میں سب سے پرانا باسی ہوں (بشمول ایک سٹھیائی ہنسی) میں صرف ایک طفلانہ قسم کی مثال کا اضافہ کرنا پسند کروں گا اور وہ یہ کہ آدمی کو کم از کم مجھ اتنا بوڑھا ضرور ہونا چاہیے تاکہ اُسے یاد آئے کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب کسی تعلیم یافتہ یا باشعور آدمی کا بھوت پریت میں یقین رکھنا احمقانہ، ناقابلِ فہم اور ناقابلِ یقین متصور ہوتا تھا۔ آپ کو کم از کم سب سے پرانے باسی جتنا بوڑھا ضرور ہونا چاہیے تاکہ آپ کو یاد آئے کہ کس تیقن اور نفرت کے ساتھ گاؤں کے مکھیا اور پادری نے گاؤں کے بھوت کی موجودگی کے امکانات سے انکار کیا تھا، بالخصوص پادری نے مکھیا کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی شد و مد کا مظاہرہ کیا تھا۔ حالانکہ دیہات کے اس بھوت کو گاؤں کے شرابی یا دروغ گو کی ہستی میں پلک جھپکنے میں ڈھونڈ لیا گیا تھا۔ تعلیم یافتہ لوگ جانتے تھے کہ مرے ہوئے دوبارہ اس جہانِ رنگ و بُو میں نہیں آتے لیکن وہ جو پرانے وقتوں کو یاد کرتے ہیں اور جنہوں نے سر اولیور لاج ایسے سائنس کے مردِ میدان کو ایک مقبولِ عام مذہب کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے دیکھا ہے وہ جب کسی نوجوان کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ دنیا مافوق الفطرت عناصر سے نجات حاصل کر رہی ہے تو محظوظ ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ اس دنیا نے حقیقتاً کس سمت میں پیش قدمی کی ہے!

نصیر احمد ناصر کی تازہ نظموں اور غزلوں کا مجموعہ

"بے چہرہ خواب"

(زیرِ طبع)

الوداع کہنا

میکس بیر بوھم
ممتاز احمد خان

جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے صحیح طور سے کسی کو الوداع کہنا نہیں آتا کیونکہ یہ مجھے دنیا میں سب سے مشکل کام نظر آتا ہے۔ شاید آپ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو۔

کوئی شخص اگر کسی قریب کی جگہ جا رہا ہو تو اسے خدا حافظ کہنا آسان ہے۔ لیکن یہ مسئلہ اس وقت بنے گا جب کوئی دوست بہت دور اور بہت لمبے عرصے کے لیے جا رہا ہو اور اگر یہ دوست ہمارا لنگوٹیا یار ہو تو الوداع کہنے میں ہم زیادہ ناکام ہوتے ہیں اس لیے کہ ہم اپنے اصل جذبات کو پوری شدت کے ساتھ آشکار کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

جب ہم کسی دوست کو گھر کی دہلیز یا اپنے کمرے ہی سے الوداع کہتے ہیں تو یہ کام آسان ہوتا ہے۔ نہ ہم جذباتی ہوتے ہیں اور نہ وہ جذباتی ہوتا ہے۔ ہمارے الفاظ بھی ہمارا ساتھ دیتے ہیں اور کسی بدمزگی کا بھی امکان نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک یہ آئیڈیل الوداع ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ ہم سے یہ درخواست کرے کہ ہم اسٹیشن پر آنے کی زحمت نہ کریں اور ہم اس کے الفاظ کو نظر انداز کر دیں اور اسٹیشن پہنچ کر ہی دم لیں تو سمجھ لیجیے کہ یہیں سے گڑبڑ شروع ہو گئی اس لیے کہ ہم اپنے دوست سے جی بھر کر باتیں کر ہی چکے ہیں لیکن اپنی محبت میں اسٹیشن پر بھی وارد ہو چکے ہیں اور کبھی تو ہم دونوں کچھ باتیں کر لیتے ہیں اور کبھی بڑی دیر تک محض ایک دوسرے کو تکتے رہتے ہیں جیسے کہ گونگے ہوں! اور اس دوران ہم بے چینی سے اِدھر اُدھر بھی دیکھتے رہتے ہیں کہ خدایا سگنل کیوں نہیں ڈاؤن ہوتا اور گارڈ وہسل کیوں نہیں بجاتا؟

ابھی پچھلے ہفتے ہی میں ہمیں یوسٹن ایک دوست کو الوداع کہنے کی غرض سے پہنچنا پڑا۔ موصوف کو ایک دن قبل ہم ڈنر پر مدعو کر چکے تھے۔ اس ڈنر میں جہاں رنگینی تھی وہیں ان سے جدا ہونے کا غم بھی شامل تھا۔ یہ صاحب امریکہ جا رہے تھے۔ ہمیں علم تھا کہ وہ لمبے عرصے بعد واپس آئیں گے اور ہم ان پر یہ باور کرا چکے تھے کہ ان کی جدائی سے جو خلا پیدا ہو گا وہ آسانی سے پُر ہونا مشکل ہو گا۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم انہیں ایک شاندار الوداع دے چکے تھے مگر صاحبو! اس امر کا کیا کیا جائے کہ ہمیں ان کو چھوڑنے اسٹیشن پر بھی جانا پڑا جہاں کہ ہمارے ذہن سے الوداع کے موقع پر ادا کرنے والے الفاظ ختم ہو چکے تھے۔ ہمارے ساتھ اب یہ مصیبت تھی کہ ان سے مزید کیا باتیں کی جائیں؟ بہر صورت ہم نے ان سے پوچھا۔

"آپ نے سب سامان رکھ لیا ہے نا!"

"جی ہاں" انہوں نے ایسے جواب دیا جیسے خالی الذہن ہوں۔

"دوپہر کا کھانا تو آپ ٹرین ہی پر کھائیں گے" ہم نے رٹا رٹایا سوال کیا۔

"جی بالکل"

چند لمحوں تک ہم ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ پھر میں نے پوچھا
"یہ ٹرین کرائیے پر تو رکے گی ؟"
"جی نہیں" ہمارے دوست نے زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔
پھر ایک وقفہ ہوا۔ ہم دونوں میں سے کوئی کھانسنے لگا۔ یہ بھی کچھ نہ بولنے کا بہانہ تھا۔ اور ہم دل میں جز بز ہو رہے تھے کہ یہ کم بخت ٹرین آخر کھسکتی کیوں نہیں ؟ تاکہ ہم دونوں کو اس خواہ مخواہ کی الوداعی کارروائی سے نجات ملے۔
مزید نہ بولنے کے لیے ہم نے برابر والے کمپارٹمنٹ کی طرف نگاہ اٹھائی۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر شخص ایک نوجوان امریکی لیڈی سے باتیں کر رہا تھا۔ ہم نے اندازہ لگا لیا کہ یہ اس عورت کو الوداع کہنے آیا ہے اور شاید اس کا باپ ہے۔ ہم اس شخص کو کچھ کچھ پہچانتے بھی لگے تھے مگر ہمارے کانوں تک اس کے الفاظ نہیں پہنچ پا رہے تھے۔ اور پھر اچانک ہم اسے پہچان گئے۔ یہ ہیوبرٹ لے راس تھا۔ لیکن وہ سات آٹھ سال میں اس قدر بدل گیا تھا کہ ہمیں حیرت ہوئی۔ مجھے یاد آیا کہ ماضی میں جبکہ وہ بے روزگار تھا مجھ سے اس نے آدھے کراؤن کا قرضہ لیا تھا۔ اسے قرضہ دے کر ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔ وہ بہت ہی با اصول اور مستعد تھا لیکن وہ لندن کے اسٹیج پر کیوں کامیاب نہ ہو سکا ایک معمہ ہے۔
مگر اب وہ خوش حال نظر آ رہا تھا اور پہلے کے مقابلے میں اس کا جسم بھی دبیز ہو گیا تھا جس کی وجہ سے مجھے اس کو فوراً پہچاننے میں دقت ہوئی تھی۔ مجھے محسوس ہوا گویا وہ کوئی بینکار ہو اور وہ شخص جسے وہ خدا حافظ کہنے آیا ہوا ہے فخر کا ضرور احساس ہوتا ہوگا۔
"مہربانی فرما کر ذرا پیچھے ہٹ جائیے" امریکی لیڈی نے آہستہ سے کہا اس لیے کہ ٹرین کھسکنے لگی تھی۔ میرا دوست ہیوبرٹ لے راس پیچھے ہٹ گیا۔ مگر وہ پھر ذرا سا آگے کو بڑھا اور چند ایسے الفاظ کہے جو میں نہ سن سکا۔ البتہ ہم نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ جب تک ٹرین نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی وہ ہاتھ ہلاتا رہا۔ بعد میں وہ ہماری جانب متوجہ ہوا اور پرانی والی گرم جوشی سے ملا اور ہماری خیریت وغیرہ دریافت کرتا رہا۔ اس نے مجھے یاد دلایا کہ وہ میرے اخباری تبصرے پڑھتا رہتا تھا جو میں اس کی اداکاری سے متعلق لکھا کرتا تھا۔ میں نے اسے احساس دلایا کہ اب جبکہ وہ اسٹیج پر نہیں ہے تو میں گزشتہ سالوں سے اس کو کتنا یاد کرتا ہوں۔ اس پر وہ کہنے لگا۔
"میں اب اسٹیج کے بجائے پلیٹ فارم پر کام کرتا ہوں۔"
"پلیٹ فارم پر !" میں نے چونکتے ہوئے کہا "شاید آپ کنسرٹ وغیرہ میں حصّہ لیتے ہیں !"
"جی نہیں۔ میں اسی پلیٹ فارم پر کام کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی چھڑی پلیٹ فارم پر زور سے ماری۔ اور میں سوالیہ نشان بنا اسے دیکھنے لگا۔
پھر وہ گویا ہوا۔ "بات یہ ہے کہ وہ ہزاروں امریکی حضرات و خواتین جو انگلینڈ آتے تھے تو اپنے ساتھ تعارفی خطوط لاتے تھے تاکہ یہاں مقامی لوگوں کے ساتھ رہیں اور چلتے وقت وہ انہیں خدا حافظ بھی کہیں۔ لیکن چونکہ انگریز اتنے میزبان اور مہذب بلکہ عجز و انکساری کے پیکر نہیں رہے تو یہاں سے گزرنے والے یا یہاں کا دورہ کرنے والے امریکیوں کے لیے مسئلہ پیدا ہو گیا۔ لہٰذا ہمارے یہاں اینگلو امریکن سوشل بیورو (A A S B) وجود میں آ گیا جو امریکیوں کو انگلستانی میزبان فراہم کرتا ہے تاکہ انہیں دیارِ غیر میں اجنبیت کا احساس نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے پچاس فیصد رقم انگلستانی میزبان کو ادا کر دی جاتی ہے۔ لیکن میں اینگلو امریکن سوشل بیورو کا ڈائرکٹر نہیں ورنہ بڑا امیر شخص ہوتا۔"
میں نے پوچھا۔ "تو آپ کیا ہیں ؟"

وہ بولا۔ "میں الوداع کہنے پر مامور ہوں یعنی بیورو کی طرف سے امریکیوں کو خدا حافظ کہنے کا فریضہ انجام دیتا ہوں تاکہ وہ رنجیدہ نہ ہوں کہ ان کو کوئی بھی الوداع کہنے والا نہیں ـــــ برادر آپ سمجھ گئے نا کہ میں سیئر آف SEER-OFF ہوں۔"

میں نے کہا۔ "لیکن ہماری آنکھوں میں جو آنسو تھے وہ حقیقی تھے مگر تم تو مصنوعی جذبات رکھتے ہو۔ تمہاری آنکھوں میں جو آنسو تھے وہ؟؟؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں بھی ایکٹنگ نہیں کرتا۔ الوداع کہتے وقت جذبات موجزن ہوتے ہیں اور میں آبدیدہ ہو جاتا ہوں۔ مگر تم ایک غیر غیر شخص کے لیے رونے کی اداکاری نہیں کر سکتے ـــ بالکل نہیں کر سکتے۔"

میں نے چیختے ہوئے گزارش کی ـــ "خدا کے لیے یہ ایکٹنگ مجھے بھی سکھا دو۔"

اس نے فوراً ایک ڈائری نکالی اور بولا۔ "اس وقت میرے پاس سیئر آف کی ٹریننگ کے لیے کئی شاگرد ہیں۔ میں تمہیں منگل اور جمعہ کو الوداع کہنے کی تربیت کے لیے ایک گھنٹہ دے سکتا ہوں۔"

میں نے اس کی تربیت کی شرائط غور سے سنیں اور دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ الوداع کہنے کی تربیت لینا میرے لیے بہت سود مند ہوگا۔ اور دیکھئے نا میں نے شروع ہی میں کہا تھا کہ مجھے صحیح طور سے کسی کو الوداع کہنا نہیں آتا مگر ہیوبرٹ لے راس سے تربیت لے کر مجھے یہ مشکل کام انجام دینے میں آسانی ہو جائے گی۔

ڈاکٹر انور سدید کی تازہ کتاب

اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش

- اس موضوع پر اُردو کی اوّلین تصنیف
- اُردو تنقید میں کھرے پن کی ایک نمایاں مثال
- جدید افسانہ میں دیہات کے مختلف زاویے
- مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو میں بسی ہوئی تحریر
- پریم چند، کرشن چندر، بلونت سنگھ، احمد ندیم قاسمی غلام الثقلین نقوی، جمیلہ ہاشمی، صادق حسین اور دیگر دیہات نگاروں پر پہلی مرتبہ ایک بھرپور تجزیاتی نظر

قیمت: ۱۸ روپے

ناشر:- اُردو رائٹرز گلڈ۔ الٰہ آباد، ۳

اظہارِ تشکّر کرنا

اے۔ جی۔ گارڈنر
ممتاز احمد خان

اگر ایک نوجوان لفٹ میں کسی کو "پلیز" نہ کہنے پر لفٹ سے اُٹھا کر باہر پھینک دے تو یقیناً آپ اسے بہت بڑی حرکت قرار دیں گے۔ یہ کچھ یوں ہوا کہ ایک صاحب نے لفٹ مین سے کہا۔

آخری منزل ـــــ لفٹ مین کے نقطۂ نظر سے اسے کہنا چاہیے تھا ـــــ آخری منزل پلیز۔ بس پھر کیا تھا۔ موصوف اتنے غصّے میں آئے کہ ان صاحب کو نیچے دھکا دیا!

ناشائستگی اور بد تہذیبی کوئی قانونی جرم نہیں ہے کہ آپ کسی کو پلیز یا مہربانی کرکے ـــ یا نوازش ہوگی جناب عالی ـــ یا معاف کیجئے گا حضور ـــ نہ کہیں تو بد مقابل ہاتھا پائی پر اُتر آئے۔ اگر اس طرح ہوتا رہا تو میرا خیال ہے کہ ہمارے گلے تو ہر وقت مصروفِ پیکار رہیں گے اور لوگوں کے دانت ٹوٹتے رہیں گے۔

دراصل میں بد تہذیب یا بد تمیز ہونے کا حق محفوظ رکھتا ہوں اور دنیا کا کوئی قانون مجھے اعلیٰ ترین مہذب نہیں بنا سکتا۔ میں ترشی سے گفتگو کرسکتا ہوں۔ اس سے کسی کو کیا؟ میں بے تحاشا مونچھیں بڑھا کر اِدھر اُدھر مٹرگشت کرتا رہوں یا زبردستی اپنے بالوں پر مختلف رنگ چڑھالوں یا سونے یا پیتل کے بُندوں کو کانوں میں لٹکا لوں اور یوں ـــــ لوگوں کے جذبات مجروح کردوں تو اس سے میری صحت پر کیا فرق پڑتا ہے! اس بارے میں کوئی اخلاقی اور عقلی قانون تو ہے نہیں جو مجھ سے ہرجانہ بھروائے محض اس لیے کہ میں نے کسی کے جذبات اپنے اُلٹے سیدھے حُلیے سے مجروح کیے ہیں۔

لیکن جناب اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم بالکل ہی بے پروا ہو جائیں اور لوگوں کے جذبات مجروح کرتے پھریں۔ ہو سکتا کہ وہ بے چارہ لفٹ مین زود حس ہو اسی لیے "پلیز" نہ کہنے کے جرم میں اس نے اس بے چارے شخص کو اُٹھا کر پھینک دینے کے جرم کا ارتکاب کیا۔ ہو سکتا ہے اسے کوئی پیٹ پاٹ دیتا تو وہ عدالت سے اپنے لیے انصاف حاصل کرکے اپنے مجروح جذبات کی تسکین حاصل کرلیتا لیکن "پلیز" کے لفظ کی غیر موجودگی نے اسے ناقابلِ تلافی چرکہ لگایا ہو اور اس طرح اس کی عزتِ نفس مجروح ہوئی ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ لفٹ مین اس شخص کو اٹھا کر نہ پھینکتا اور گھر جا کر اپنی اہلیہ پر غصّہ اتارتا اور وہ بے چاری خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ اور یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ جس شخص سے لفٹ مین نے زیادتی کی تھی خود اس شخص کے باس BOSS نے اسے حقیر سمجھ کر سلام نہ کیا ہو اسی لیے اس نے لفٹ مین سے انتقاماً "پلیز" نہ کہا ہو۔

دراصل خراب رویّے زندگی میں زہر گھول دیتے ہیں اور وہ سال بھر میں ہونے والے جرائم سے زیادہ مہلک ہوتے ہیں۔ مگر کوئی قانون ہمارے رویّوں، ہماری گفتگو، ہمارے غصّے اور ہمارے مخصوص آداب پر قدغن نہیں لگا سکتا۔ اب اگر ایک طرف ہم لفٹ مین کے خلاف فیصلہ دیتے ہیں تو دوسری طرف ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہمیں کسی بھی خدمت کے عوض اظہارِ تشکّر ضرور کرنا چاہیے۔ آپ کا شکریہ۔ نوازش۔ مہربانی جناب۔ معاف کیجئے۔ معذرت خواہ ہوں۔ چند ایسے الفاظ ہیں جن سے ہر شخص کے دل میں اچھے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور جو خدمت یا زحمت اس نے انجام دی ہے اس کا

وہ بولا۔ "میں الوداع کہنے پر مامور ہوں یعنی ہیوررڈ کی طرف سے امریکیوں کو خدا حافظ کہنے کا فریضہ انجام دیتا ہوں تاکہ وہ رنجیدہ نہ ہوں کہ ان کو کوئی بھی الوداع کہنے والا نہیں ــــــ برادر آپ سمجھ گئے ناکہ میں سیئر آف SEER-OFF ہوں۔"

میں نے کہا۔ "لیکن ہماری آنکھوں میں جو آنسو تھے وہ حقیقی تھے مگر تم تو مصنوعی جذبات رکھتے ہو۔ تمہاری آنکھوں میں جو آنسو تھے وہ ؟؟؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں بھی ایکٹنگ نہیں کرتا۔ الوداع کہتے وقت جذبات موجزن ہوتے ہیں اور میں آبدیدہ ہوجاتا ہوں۔ مگر تم ایک غیر غیر شخص کے لیے رونے کی اداکاری نہیں کرسکتے۔ بالکل نہیں کرسکتے۔"

میں نے چیختے ہوئے گزارش کی ــــ "خدا کے لیے یہ ایکٹنگ مجھے بھی سکھا دو۔"

اس نے فوراً ایک ڈائری نکالی اور بولا۔ "اس وقت میرے پاس سیئر آف کی ٹریننگ کے لیے کئی شاگرد ہیں۔ میں تمہیں منگل اور جمعہ کو الوداع کہنے کی تربیت کے لیے ایک گھنٹہ دے سکتا ہوں۔"

میں نے اس کی تربیت کی شرائط غور سے سنیں اور دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ الوداع کہنے کی تربیت لینا میرے لیے بہت سودمند ہوگا۔ اور دیکھئے نا میں نے شروع ہی میں کہا تھا کہ مجھے صحیح طور سے کسی کو الوداع کہنا نہیں آتا مگر ہیوبرٹ لے راس سے تربیت لے کر مجھے یہ مشکل کام انجام دینے میں آسانی ہوجائے گی۔

ڈاکٹر انور سدید کی تازہ کتاب

اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش

- اس موضوع پر اُردو کی اوّلین تصنیف
- اُردو تنقید میں کھرے پن کی ایک نمایاں مثال
- جدید افسانہ میں دیہات کے مختلف زاویے
- مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو میں بسی ہوئی تحریر
- پریم چند، کرشن چندر، بلونت سنگھ، احمد ندیم قاسمی غلام الثقلین نقوی، جیلانی ہاشمی، صادق حسین اور دیگر دیہات نگاروں پر پہلی مرتبہ ایک بھرپور تجزیاتی نظر

قیمت: ۱۸ روپے

ناشر:- اُردو رائٹرز گلڈ۔ الہ آباد، ۳

اظہارِ تشکّر کرنا

اے۔جی۔گارڈنر
ممتاز احمد خان

اگر ایک نوجوان لفٹ مین کسی کو "پلیز" نہ کہنے پر لفٹ سے اٹھا کر باہر پھینک دے تو یقیناً آپ اسے بہت بُری حرکت قرار دیں گے۔ یہ کچھ یوں ہوا کہ ایک صاحب نے لفٹ مین سے کہا ـــ

آخری منزل ـــ لفٹ مین کے نقطۂ نظر سے اسے کہنا چاہیئے تھا ـــ آخری منزل پلیز۔ بس پھر کیا تھا۔ موصوف اتنے غصے میں آئے کہ ان صاحب کو نیچے لڑھکا دیا!

ناشائستگی اور بد تہذیبی کوئی قانونی جرم نہیں ہے کہ آپ کسی کو پلیز یا مہربانی کر کے ـــ یا نوازش ہوگی جناب عالی ـــ یا معاف کیجئے گا حضور ـــ نہ کہیں تو بدمقابل ہاتھا پائی پر اُتر آئے۔ اگر اس طرح ہوتا رہا تو میرا خیال ہے کہ ہمارے گلے تو ہر وقت مصروفِ پیکار رہیں گے اور لوگوں کے دانت ٹوٹتے رہیں گے۔

دراصل میں بد تہذیب یا بدتمیز ہونے کا حق محفوظ رکھتا ہوں اور دنیا کا کوئی قانون مجھے اعلیٰ ترین مہذب نہیں بنا سکتا۔ میں رُکھائی سے گفتگو کر سکتا ہوں۔ اس سے کسی کو کیا؟ میں بے تحاشا مونچھیں بڑھا کر ادھر اُدھر مٹرگشت کرتا رہوں یا زبردستی اپنے بالوں پر مختلف رنگ چڑھا لوں یا سونے یا پیتل کے بُندوں کو کانوں میں لٹکا لوں اور یوں ـــ لوگوں کے جذبات مجروح کروں تو اس سے میری صحت پر کیا فرق پڑتا ہے! اس بارے میں کوئی اخلاقی اور عقلی قانون تو ہے نہیں جو مجھ سے ہرجانہ بھروائے محض اس لیے کہ میں نے کسی کے جذبات اپنے اُلٹے سیدھے حلیے سے مجروح کیے ہیں۔

لیکن جناب اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم بالکل ہی بے پروا ہو جائیں اور لوگوں کے جذبات مجروح کرتے پھریں۔ ہو سکتا کہ وہ بے چارہ لفٹ مین زود حس ہو اسی لیے "پلیز نہ کہنے کے جرم میں اس نے اس بے چارے شخص کو اٹھا کر پھینک دینے کے جرم کا ارتکاب کیا۔ ہو سکتا ہے اسے کوئی پیٹ یا تھپڑ دیتا تو وہ عدالت سے اپنے لیے انصاف حاصل کر کے اپنے مجروح جذبات کی تسکین حاصل کر لیتا لیکن "پلیز" کے لفظ کی غیر موجودگی نے اسے ناقابلِ تلافی چرکہ لگایا ہو اور اس طرح اس کی عزتِ نفس مجروح ہوئی ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ لفٹ مین اس شخص کو اٹھا کر نہ پھینکتا اور گھر آکر اپنی اہلیہ پر غصہ اتارتا اور وہ بے چاری خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ اور یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ جس شخص سے لفٹ مین نے زیادتی کی تھی خود اس شخص کے باس BOSS نے اسے حقیر سمجھ کر سلام نہ کیا ہو اسی لیے اس نے لفٹ مین سے انتقاماً پلیز نہ کہا ہو۔

دراصل خراب رویے زندگی میں زہر گھول دیتے ہیں اور وہ سال بھر میں ہونے والے جرائم سے زیادہ مہلک ہوتے ہیں۔ مگر کوئی قانون ہمارے رویوں، ہماری گفتگو، ہمارے غصے اور ہمارے مخصوص آداب پر قدغن نہیں لگا سکتا۔ اب اگر ایک طرف ہم لفٹ مین کے خلاف فیصلہ دیتے ہیں تو دوسری طرف ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہمیں کسی بھی خدمت کے عوض اظہارِ تشکر ضرور کرنا چاہیئے۔ آپ کا شکریہ۔ نوازش۔ مہربانی جناب۔ معاف کیجئے۔ معذرت خواہ ہوں۔ چند ایسے الفاظ ہیں جن سے ہر شخص کے دل میں اچھے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور جو خدمت یا زحمت اس نے انجام دی ہے اس کا

مداوا ہو جاتا ہے۔ یہ وہ چکنا تیل ہیں جس سے زندگی کی مشین اٹکے بغیر رواں رہتی ہے۔ اور ہم ایک دوسرے کے کام آتے رہتے ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ زیر دوز ریلوے اسٹیشنوں کی انتظامیہ اپنے ملازمین کو باادب اور مہذب رہنے کی تربیت دیتی ہے جس کی وجہ سے مسافروں کے سفر میں حُسن پیدا ہو جاتا ہے اور ایک سماجی خدمت کا تقاضا بھی پورا ہو جاتا ہے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں جلدی میں ایک بس میں چڑھ گیا اور پتہ چلا کہ پیسے تو میں گھر میں بھول آیا ہوں۔ میری حالت کا اندازہ ہر صاحبِ دل اور صاحبِ احساس کر سکتا ہے۔ اب اگر کنڈکٹر بہت مہربانی کرے تو آپ کو نیچے اتار دے گا تاکہ آپ گھر واپس جائیں لیکن آپ جس کام سے جا رہے تھے یا جن صاحب سے ملنے جا رہے تھے اس کا کیا ہوگا؟ خیر میں نے بڑی ہمت سے کنڈکٹر سے کہا۔

"بھیا — میں پیسے گھر بھول آیا ہوں۔ مجھے آپ یہیں اتار دیں"

"بالکل نہیں۔" کنڈکٹر نے کہا۔ "میں آپ کو ٹکٹ دوں گا۔"

میں نے مزید کہا۔ "مگر میں بعد میں آپ کو ٹکٹ کے پیسے کہاں پہنچاؤں گا؟"

وہ بولا۔ "ابھی کسی دن آپ کو میں بس ہی میں مل جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ اس خوش دلی سے ٹکٹ دینے لگا گویا وہ انگلستان سے ہانگ کانگ تک کا ٹکٹ دینے کو تیار رہو! لیکن لطیفہ یہ ہوا کہ میں نے تمام جیبوں کو ٹٹولنا شروع کیا تو ایک شلنگ مل گیا اور حساب اسی وقت بے باک ہو گیا۔ لیکن اس کنڈکٹر کے لیے میرے دل میں احترام قائم ہو گیا اور میں مزید بتاؤں کہ بس ہی کے ایک سفر کے دوران انہی موصوف کنڈکٹر کے بھاری بوٹوں سے میرا پیر کچلا گیا۔ انہوں نے فوراً ہی مڑ کر مجھ سے کہا۔ "جناب میں معذرت خواہ ہوں۔ دراصل یہ بوٹ ہی کچھ بھاری ہیں۔ میرا خیال ہے آپ کو زیادہ چوٹ نہیں آئی ہے۔"

ادھر میں اپنی تمام اذیت بھول گیا۔ میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ وہ کنڈکٹر اپنے رویے سے ہر مسافر کے سفر کا لطف دوبالا کرنے میں مصروف رہتا۔ اگر بارش ہو رہی ہوتی تو وہ دروازے پر جا کر پیدل چلنے والوں سے کہتا — "بس میں جگہ ہے — اندر آ جائیے جناب" بوڑھے مسافروں کے ساتھ تو وہ بیٹوں جیسا سلوک کرتا اور بچوں کے لیے مشفق باپ کا رول ادا کرتا اور نوجوان طبقے پر وہ کچھ زیادہ ہی مہربان ہوتا یعنی ادھر ادھر گزرتے ہوئے ان سے کسی مزاحیہ جملے کا تبادلہ کرتا یا انہیں کسی جملے یا حرکت سے محظوظ کرتا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر خراب رویے انسانی زندگی میں زہر گھولتے ہیں تو اسی طرح اچھے رویے بھی انسانی زندگی کو خوش گوار بناتے ہیں۔ اچھے رویے بھی موسم کی طرح ہوتے ہیں جو ہم پر خوش گوار انداز سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی لیے مشہور رومانی شاعر کیٹس (KEATS) نے ایک بار کہا تھا۔ "خوشگوار موسم میرے احساس کو تر و تازہ اور شگفتہ کر دیتا ہے۔" اور جس طرح ایک دوسرے مشہور رومانی شاعر ولیم ورڈز ورتھ (WORDSWORTH) نے جونکیں جمع کرنے والے (LEECH GATHERER) سے ذہانت اور عقل کا سبق لینے کا مشورہ دیا تھا اسی طرح میں بھی اس عظیم بس کنڈکٹر سے زندگی کے اصل حُسن کا ادراک حاصل کرنے کا مشورہ دوں گا۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ ہمیں خوشگوار زندگی کی خاطر تمام اچھے اخلاقی رویّوں اور آداب کو اہمیت دینا ہوگی۔ ہمیں یہ تمام رویّے اور آداب کسی قانون کے تحت نہیں پیدا کرنا ہیں کیونکہ قانون تو ہمیں صرف جسمانی حملوں کے خلاف انصاف دے سکتا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر لنٹ میں اس شخص کو اٹھا کر پھینکنے کے بجائے اس سے مہذب طریقے سے پیش آتا۔ یہ اس کا زیادہ اچھا انتقام ہوتا۔ حقیقت میں ایک بااخلاق انسان مادی طور سے کچھ کھو سکتا ہے لیکن روحانی فتح تو اسی کے حصے میں آتی ہے۔

خاموشی

رابرٹ لینڈ
ممتاز احمد خان

خاموشی انسان کے لیے غیر فطری ہے۔ وہ اپنی زندگی ہلکی سی چیخ سے شروع کرتا ہے اور موت پر اسے ابدی سکوت سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ پیدائش اور موت کا جو درمیانی وقفہ ہے اس دوران وہ شور و غل میں مصروف رہتا ہے۔ اس کی گفتگو کو بھی آپ خاموشی کے خلاف جدوجہد تصور کر سکتے ہیں۔ اور کبھی کبھار گفتگو کے دوران وہ اپنی خاموشی کو اپنی ناکامی گردانتا ہے یا اپنے آپ کو اس وقفے کے دوران ایک بے کار انسان تصور کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ انسانوں کی نوّے فی صد گفتگو مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی لیکن پھر بھی وہ گفتگو کی بھنبھناہٹ میں اپنے آپ کو ملوث رکھتا ہے تاکہ یہ ثابت کر سکے کہ وہ انسان ہے کوئی موم کا گڈا نہیں۔ اس طرح گفتگو کا مقصد تبادلۂ خیالات کے بجائے بھنبھناہٹ کو قائم رکھنے کا عمل ہوا۔ بھنبھناہٹ پر مجھے یاد آیا کہ مچھر کی بھنبھناہٹ انسانی کوفت کو جنم دیتی ہے لیکن انسانی بھنبھناہٹ کانوں کو بھلی لگتی ہے۔ حتیٰ کہ ڈنر کے موقعہ پر بھی انسان گنگنانے کے بجائے بھنبھناتے رہنے کو ترجیح دیتا ہے خواہ وہ مچھر کی بھنبھناہٹ کے مماثل ہو۔ دنیا میں بہت کم انسان ایسے ہوں گے جو نالج حاصل کرنے کی غرض سے گفتگو میں شریک ہوتے ہوں یا نئی قسم کی معلومات جاننے کی طلب رکھتے ہوں۔ کچھ لوگ آپ کو یہ بتا کر ہی خوش ہو جاتے ہوں گے کہ انہوں نے دو یا تین ڈرامے دیکھے ہیں۔ ایک بار ایک نوجوان شخص ہماری محفل میں ایک شہزادے کے مکالمے ہمیں سنا کر بہت خوش ہوا حالانکہ ان تیس منٹوں میں ہم بہت بور ہوئے۔

ہم میں سے بیشتر لوگ اس گفتگو کو پسند کرتے ہیں جو وہ خود کرتے ہیں اور دوسروں کو سامعین بنائے رکھتے ہیں۔ شاید یہ سب کچھ خاموشی سے نفرت کے اظہار کے طور پر ہوتا ہے جو کہ میرے نزدیک ایک برائی ہے۔ جب کہ مذکورہ نوجوان کچھ اس طرح شہزادے کے مکالموں کی نقل کر رہا تھا گویا خوفزدہ ہو کہ کہیں دنیا پر ابدی سکوت نہ چھا جائے۔ اس نوجوان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ بور کرنے والی بھنبھناہٹ کے مقابلے میں دل خوش کن گفتگو زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ موسم کا موضوع گفتگو کے لیے خوشگوار ہوتا ہے۔ اس موضوع میں ہر کوئی ملوث ہوتا ہے۔ پھر یہ گفتگو دوسرے خوشگوار موضوعات تک دراز ہو جاتی ہے اور شرکاء ایک دوسرے کے لیے بذاتِ خود 'دلچسپ' اور 'ہمدرد' بن جاتے ہیں۔ کبھی کبھی دو اشخاص جو کہ ماضی میں کسی کالج یا یونیورسٹی کے ہم جماعت تھے پرانی یادیں کچھ اس طرح تازہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں کہ انہیں یہ یاد نہیں رہتا کہ ایک تیسرا شخص بھی ان کی گفتگو میں اپنی بھنبھناہٹ شامل کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ درحقیقت یادیں انسان کا بڑا سرمایہ ہوتی ہیں۔ ان کا موضوع گفتگو کے لیے ایک بہترین موضوع ہوتا ہے۔ وہ ہمارے دلوں کو گرماتی اور ذہن میں ایک عجب لطف کا طوفان اٹھاتی ہیں۔ ایسے مواقع پر وہ تیسرا آدمی جس کا ان یادوں سے کوئی تعلق نہیں بڑا بور ہوتا ہے۔ اس کے لیے پہلے دو اشخاص کے ماضی کے افراد اور واقعات میں اتنی دلکشی نہیں ہوتی اور اگر وہ ہنستا بھی ہے تو محسوس ہوتا ہے گویا وہ میکانکی طور پر ایسا کر رہا ہے جبکہ پہلے دو افراد کی ہنسی خراب والی ہنسی ہوتی ہے کہ جس کے لطف سے وہ ہی مستفید ہو سکتے ہیں۔ پر میرا خیال ہے کہ یہ گفتگو بھی خراب ہے اس لیے کہ تیسرا شخص اس بات پر مجبور ہے کہ وہ یا تو خاموش بیٹھا رہے یا کبھی کبھار ہنس دے۔ ایک اچھی گفتگو میں تیسرے شخص کا بھی حصہ ہونا چاہیئے۔

یہ صرف سماجی زندگی ہی میں نہیں کہ ہم خاموشی سے خوفزدہ رہتے ہیں، ہم تو تنہائی میں بھی خاموشی سے نفرت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ادھر اُدھر کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ جب ہم شہر کی مصروف زندگی سے اکتا کر کسی دیہات میں جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ قطعی نہیں ہوتا کہ ہم شور و غل سے اکتا کر خاموشی کی طرف پلٹ رہے ہیں بلکہ ہم ایک دوسرے قسم کے دلفریب شور و غل کا لطف اٹھانے جاتے ہیں جیسے کہ حسین پرندوں کی چہچہاہٹ، مُرغ کی بانگ مُرغی کی کٹ کٹ کٹ کٹ، کتّوں کی بھونکار، بیل گاڑی کے پہیّوں کی چرچراہٹ۔ اور اسی طرح اگر ہم خاموشی کے پجاری بن جائیں تو ہماری زندگی میں خلجان واقع ہو جائے۔

جب رات پڑتی ہے تو تاریکی کے ساتھ ساتھ سکوت بھی قائم ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے ہم تاریکی سے نہیں بلکہ سکوت یا خاموشی سے ڈرتے ہیں۔ اور ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ سکوت میں کسی ان دیکھے خوف کا گمان ہوتا ہے۔ شور حقیقتاً ہمارا ساتھی ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں رات کو بستر میں دبک جانے کے بعد مجھے ٹیبل کلاک کی ٹِک ٹِک سن کر بڑا مزہ آتا تھا۔ ذرا آپ اندازہ تو لگائیں کہ علی الصبح کھڑکی کھلنے پر اطراف کے مرغزاروں سے بلند ہوتی ہوئی حسین آوازیں روح کو کس قدر معطّر کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ایک خاموش شاہراہ پر جا رہے ہوں اور اچانک گائے کی زور دار آواز سن کر آپ ایک دم اچھل جائیں تو یہ اس آواز کا قصور نہ ہوگا بلکہ آپ صرف ماحول کی خاموشی کی وجہ سے ڈرے تھے۔

ذرا آپ خیال تو کریں کہ اگر آپ اس دنیا میں آخری شخص ہوں اور آپ کو یقین ہو کہ آپ لافانی ہیں اور یہ کہ اس دنیا میں ایک آواز محض آپ کے قدموں کی آواز ہے تو آپ کی دہشت کا کیا عالم ہوگا؟ ہاں اگر آپ کے اطراف میں پرندے، کتّے، گائیں اور بھیڑیں ہوں تو شاید آپ اپنی تنہائی اور اکیلے پن کو برداشت کر لیں۔

ہم اکثر قبر کی خاموشی کا تذکرہ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ شور کے بغیر یہ دنیا قبرستان کی مانند ہو جائے۔ اسی طرح اگر ہم سے ایک خاموش دنیا میں رہنے کو کہا جائے تو ہم یقیناً خودکشی کو ترجیح دیں گے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم خاموشی سے قطعاً کوئی لطف نہیں اٹھاتے۔ برف پوش پہاڑوں کی سیر کرنے والے اور آثارِ قدیمہ کو دریافت کرنے والے جس وقت اس خاص خاموشی یا سکوت کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں تو وہ کس قدر لطف دیتا ہے۔ اس قسم کی خاموشی میں ہم ایک پُر اسرار حقیقت کا سراغ لگاتے ہیں جو ہم سے بچھڑ گئی تھی۔ جب ہم گرجا گھر میں جاتے ہیں تو اس کے اندر کا سکوت ہمیں روحانی سکون بخشتا ہے۔ وہاں ہم زور سے بولنے کے بجائے ایک دوسرے کے کان میں مدھم آواز میں کچھ کہنا پسند کرتے ہیں۔

صوفی لوگ اکثر ہمیں بتاتے ہیں کہ زندگی کے راز کو خاموشی میں حاصل کیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ شور و غل کے دوران ہم اپنی ذہانت میں کوئی اضافہ نہیں کرتے۔ تاہم کچھ منفی سوچ کے حامل تو شور کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ کسی خاص واقعے کی یاد میں "دو منٹ کی خاموشی" کو فضول گردانتے ہیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ آرمسٹائیس ڈے (التوائے جنگ کا دن) کے موقع پر لندن پر گہرا سکوت چھا جاتا ہے۔ ہر شخص دو منٹ کے لیے بے حس و حرکت ہو جاتا ہے اور تمام ٹریفک جام ہو جاتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے پورے شہر کو پُر اسراریت نے گھیرے میں لے لیا ہے۔ ایسے ہی ایک موقع پر ایک بوڑھا آدمی بُت بنے کھڑے انسانوں کے درمیان سے چاپ چاپ بیتا ہوا گزر گیا تھا شاید اس نے آرمسٹائیس ڈے یا جنگ کے بارے میں کچھ سنا نہ تھا۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اس کے بوٹوں کی آواز سے خاموشی ٹوٹی نہیں تھی بلکہ اس میں شدت پیدا ہو گئی تھی! دراصل ہم سب اس خاموشی سے لطف اٹھا رہے تھے لیکن اسے کیا کہیے کہ جیسے ہی دو منٹ کی خاموشی کے خاتمے کا سائرن ہوا تو لوگ خوشی خوشی روزمرہ کے شور و غل میں گم ہو گئے۔

رابرٹ لنڈ
خالد صدیقی

کچھ عادت کے بارے میں

شہر کے ایک دُور افتادہ ہوٹل کے کمرے میں جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا ایک بیرا سگریٹ کا آدھا پیکٹ لیے میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا، جناب یہ سگریٹ آپ کے ہیں؟ میں نے کہا نہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ اُس نے یہ پیکٹ کہاں سے حاصل کیا۔ اُس نے بہت ہی مؤدبانہ لہجہ میں جواب دیا کہ یہ نیچے کونے کی میز پر پڑا ہوا تھا، مجھے گمان گزرا کہیں آپ کا نہ ہو، کیونکہ یہ اوپر کی طرف سے کھولا گیا ہے۔ میں نے استعجاباً پوچھا کیوں؟ سگریٹ کا پیکٹ کھولنے کا کوئی اور بھی طریقہ ہے۔ جی ہاں! اُس نے جواب دیا۔ آپ نے دیکھا ہوگا زیادہ تر لوگ پیکٹ کھولنے سے پہلے اُوپر کا تمام ریپر پھاڑ ڈالتے ہیں۔ لیکن میں نے آپ کا بغور مطالعہ کیا ہے کہ آپ بغیر ریپر پھاڑے پیکٹ کو اُوپر سے کھولتے ہیں۔ اُس نے استفسار کیا۔ کیا آپ کو اپنی اس عادت کے بارے میں کوئی علم نہیں؟ یہ سُن کر میں تو انگشت بدنداں رہ گیا کہ اتنے دُور اُفتادہ علاقے میں بھی شرلاک ہومز موجود ہے جو تین دن سے بغور میرا جائزہ لے رہا ہے اور میری اُن عادات کے بارے میں بخوبی بتا سکتا ہے جن سے میں خود بھی آگاہ نہیں۔ میں نے اس سے پہلے کبھی یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ میں عادتاً سگریٹ کا پیکٹ ایک مخصوص انداز سے کھولتا ہوں اور اسی مخصوص انداز کی وجہ سے میں مہذب لوگوں کے قبیلے سے الگ تھلگ ہو کر رہ گیا ہوں۔

میں اپنے بارے میں ہمیشہ یہ سوچتا تھا کہ میں چند عادات پر مشتمل ایک مخلوق ہوں جن میں سے بیشتر خراب ہیں۔ لیکن آج مجھ پر عیاں ہوا کہ میں نئے پیکٹ کا پہلا سگریٹ نکالنے کے اس معمولی سے کام میں بھی عادات کا غلام بن کر رہ گیا ہوں۔ ویسے میں اُصولی طور پر عادات کا دشمن نہیں ہوں۔ میری رائے میں آج تک کسی نے اتنی فضول بات نہیں کہی جتنا کہ پیٹر کا مشاہدہ ہے۔ پیٹر کا کہنا ہے۔ "عام طور پر یہ کہا جا سکتا کہ ہماری ناکامی اس وجہ سے ہے کہ ہم عادات کو اپنا نہیں سکے۔" اس بات میں آدھی سچائی کے جراثیم تو موجود ہو سکتے ہیں لیکن کوئی بھی آدمی جو بدقسمتی سے عادات کو اپنانے کے قابل نہ ہو وہ اس کہاوت کو ظاہری طور پر تسلیم کرے گا۔

میں چونکہ معمولی چیزوں مثلاً ٹکٹ، روپے پیسے یا اس قسم کی کسی اور چیز کو کسی مخصوص جیب میں رکھنے کی عادت اپنا نہیں سکا لہٰذا اس کا خمیازہ مجھے روزانہ بھگتنا پڑتا ہے۔

یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ جن لوگوں کے پاس کافی پیسے ہوتے ہیں وہ جب پیسے تلاش کرنے کے لیے اپنی جیبوں میں بار بار اِدھر اُدھر ہاتھ ڈالتے ہیں تو ایک ہیجانی سی کیفیت پیدا کر لیتے ہیں، جیسے اُن کے جسم میں کوئی کیڑا گھس آیا ہو۔

اگر کوئی حساس آدمی ایسے حالات میں اس قسم کا مظاہرہ کسی دُکان، ریستوران یا کہیں بھی کرے تو اُسے محسوس ہوتا ہے کہ دکاندار، بیرا یا کیشیئر اُس کو شک و شبہ کی نگاہ سے گھور رہا ہے اور دبی مسکراہٹ کے ساتھ حیران ہو رہا ہے کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ اس قسم کا ڈرامہ خاص طور پر ریستوران میں ضرور ہوتا ہے، حالانکہ ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا جاتا۔

کئی سال پہلے مجھے ایک خفت آمیز تجربے سے دوچار ہونا پڑا۔ ہوا یوں کہ جب کھانا کھا چکنے کے بعد مجھے ایک عظیم الشان ریستوران میں بل دینا پڑا تو میری جیب سے ایک پیسہ بھی برآمد نہ ہوا حالانکہ مجھے پورا یقین تھا کہ میرے کوٹ کی کسی نہ کسی جیب میں پیسے موجود ہیں۔

ایک مرتبہ میرا ایک دوست مجھے بغیر کسی مقصد اور ارادے کے مختلف جیبوں میں روپے ٹھونستے ہوئے دیکھ رہا تھا، جن میں سے زیادہ تر میں نے سینے والی جیب میں مختلف قسم کے خطوط اور دوسرے کاغذات کے درمیان ٹھونس دیئے۔ وہ بے اختیار ہو کر کہنے لگا تمہیں پیسوں کا کوئی شعور نہیں اور نہ ہی تم ان کی حفاظت کرنا جانتے ہو، پھر اُس نے نہایت شان استغنائی کے ساتھ مجھے ایک بٹوا تحفتہً دیا۔

مَیں جب ایک غیر ملکی دورے پر جانے لگا تو مَیں نے سارے پیسے اُس بٹوے میں رکھ لیے اور اپنے آپ کو ایک بااصول آدمی محسوس کرنے لگا۔ بدقسمتی سے ایک ہفتے کے اندر ایک بااصول غیر ملکی جیب کترے نے میرا وہ بٹوا نہایت چابکدستی کے ساتھ اُڑا لیا اور مجھے اس شاندار طریقے سے لوٹا کہ اُس سے پہلے بغیر بٹوے کے دنوں میں کسی جیب کترے نے ایسی کامیابی حاصل نہیں کی تھی۔ آپ شاید یہ سوچیں کہ اس حادثہ کی وجہ سے عادات کی پاکیزگی اور باقاعدگی کے متعلق میرا ایمان کمزور ہو جانا چاہیئے؟ جی نہیں، اگر آپ یہ سوچتے ہیں تو غلطی پر ہیں۔ میرے اندر یقینی طور پر جو تبدیلی پیدا ہوئی وہ یہ کہ اس سوال کے دونوں پہلوؤں پر کچھ نہ کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مَیں تسلیم کرتا ہوں کہ زندگی کے عام حالات میں ایک شخص جو یہ جانتا ہے کہ اُس کی کس جیب میں پیسے ہیں اس شخص کے مقابلے میں ارفع و اعلیٰ ہے جو یہ نہیں جانتا کہ اُس کی کس جیب میں پیسے ہیں۔ لیکن یہ آدمی اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ جیب کترے بھی اُس کی جیب کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ ایک آدمی کو جب اپنی پیسوں والی جیب کا اندازہ ہی نہ ہو تو جیب کترا کس طرح شناخت کر سکتا ہے۔

ایک مرتبہ میں کشتی کے ذریعے سیاحت کے لیے نکلا تو کشتی کے "سموکنگ روم" میں ایک نورانی صورت والا اجنبی کافی دیر تک میرے ہمراہ بیٹھا رہا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ جیب کترا تھا کیونکہ وہ میری جیب کی صفائی کر چکا تھا۔ ویسے بھی میری جیب کاٹنے کا مؤثر طریقہ تو یہ ہے کہ مجھے چوٹ مار کر بے ہوش کر دیا جائے مگر اس طرح پیسے تلاش کرنے میں کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔

روپے پیسے سے قطع نظر عادات کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اُس آدمی کے لیے یہ کتنی احمقانہ سی بات ہے جو ہمیشہ بس یا ریل سے سفر کرے لیکن اپنا ٹکٹ کبھی بھی ایک ہی جیب میں نہ رکھے۔ لیکن جو شخص ہمیشہ ایک ہی جیب میں ٹکٹ رکھنے کا عادی ہوتا ہے وہ بہت جرأت اور سکون کے ساتھ ٹکٹ انسپکٹر کے بالمقابل ہو سکتا ہے۔ اُس کے لیے ٹکٹ مہیا کرنا ایک عام سا دستورِ عمل ہے اور یہ سب کچھ اس طرح ہو رہا ہوتا ہے جیسے جادو ہو رہا ہو۔ جو آدمی اپنا ٹکٹ تلاش نہیں کر سکتا وہ خود بھی تنگ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی تنگ کرتا ہے۔

مَیں ہمیشہ یہ سوچتا ہوں کہ اگر وہ میری جگہ ہوتا پھر تو بالکل ہی احمق دکھائی دیتا۔ مجھے بعض دفعہ ایسے آدمی پہ رحم آتا ہے جو عالم بیچارگی میں پریشان ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ مایوسی کی حالت میں بار بار جیبوں میں ہاتھ ڈالتا ہے اور اپنے مرتبے سے گر کر قیمتی لمحات کو اپنے بھُلکڑ پن اور نالائقی کی وجہ سے ضائع کرتا ہے تو مجھے سخت اذیت پہنچتی ہے۔ اُس وقت وہ نسلِ انسانی کا عجیب و غریب نمونہ دکھائی دیتا ہے اور یہ سب کچھ نظم و ضبط کے فقدان کی وجہ سے ہوتا ہے۔

مَیں اُس سے یہ پوچھنا پسند کروں گا کہ کیا اُس کے پاس ٹکٹ والی جیب نہیں اور اگر اُس کے پاس ٹکٹ والی جیب ہے تو پھر اُسے سوچنا چاہیئے کہ درزی نے آخر ٹکٹ والی جیب کیوں لگائی۔ ایسے موقعوں پر مَیں کمزور عادات والے بھائی کو لس طعن کرتے ہوئے عادات پر پابند آدمی کا ساتھ دیتا ہوں۔ ٹکٹ والی جیب کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے یاد آیا کہ مَیں نے حال ہی میں درزی سے جو سوٹ سلوایا ہے اُس میں وہ ایک جیب لگانا بھول گیا۔ پہلے تو مَیں اُس کی اس غفلت پر سخت برہم ہوا، لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ درزی نے جیب نہ لگا کر مجھ پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ کیونکہ میرے سوٹ میں ایک جیب کم ہو گئی

جس کی وجہ سے ٹکٹ غائب ہونے کی اُمید کافی کم ہوگی۔

وہ آدمی کتنا قابلِ رشک ہے جو ایک لمحے کے نوٹس پر اپنے پڑھنے کی عینک پیش کر سکتا ہے۔ کیونکہ اُس نے عینک کو ایک مخصوص جیب میں رکھنے کی عادت اپنائی ہوئی ہے۔ اُسے اتنا یقین ہے کہ جب وہ گھر سے روانہ ہوتا ہے تو عینک ایک خاص جیب میں ضرور موجود ہوتی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو مَیں یہ پسند نہیں کروں گا کہ کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ ایک سال کے عرصہ میں مَیں نے اپنا چشمہ تلاش کرنے میں کتنے لمحات ضائع کیے ہیں۔ ان ضائع شدہ لمحات کی تعداد بنی نوعِ انسان کو شاید متزلزل نہ کر سکے مگر مجھے ضرور متزلزل کر دے گی۔ عینک کے بارے میں میری یادداشت اتنی غیر یقینی ہے کہ مَیں مجبور ہوں کہ ہنگامی حالات کے لیے متبادل عینک اپنے پاس رکھوں۔

عادات کی غلامی کے بارے میں بات کریں تو پُرانے زمانے میں صحیح غلام وہ تھے جو بحری جہازوں یا کشتیوں کو کھیتے تھے، لیکن اس سبب سے وہ عادات کے غلام نہیں تھے۔ اُنہوں نے تو ایک چیز گُم کر دی تھی جس کے تعاقب میں وہ عرصے سے سرگرداں تھے۔

مَیں جب کسی کتاب سے استفادہ کرتا ہوں تو اس قسم کی معلومات سے ضرور واقفیت حاصل کرتا ہوں۔ میری لائبریری میں لاتعداد کتابیں موجود ہیں اور مجھے اُن سے بہت ہی پیار ہے۔ مجھے کتاب کی ہر جلد کو سلیقے سے اُس کی مقرّر کی ہوئی جگہ پر دیکھ کر دلی مسرت ہوتی ہے، لیکن جب مَیں کسی کتاب کا مطالعہ کر لیتا ہوں تو ایک فرمانبردار شاگرد کی طرح کتاب کو واپس شیلف میں تو رکھ دیتا ہوں لیکن اُس کو اس کی جگہ ترتیب سے نہیں رکھتا۔ نتیجۃً مَیں جتنا وقت کتابیں پڑھنے میں صرف کرتا ہوں اُس سے زیادہ وقت اُن کو تلاش کرنے میں گزار دیتا ہوں۔

چنانچہ جب مجھے براؤننگ کے ایک حوالہ کی تصدیق کرنا پڑتی ہے تو جس کتاب کی جلد میں وہ اقتباس موجود ہے وہ کبھی نہیں ملتی۔ اگر مجھے مسٹر ای۔ وی لوکاس کی کتاب "چارلس لیمب کی زندگی" کی پہلی جلد چاہیئے تو بجائے پہلی جلد کے دوسری جلد میرے ہاتھ میں آجاتی ہے۔

جب مَیں کوئی چیز تلاش کر رہا ہوتا ہوں تو گھر میں پڑی ہوئی تمام ڈکشنریاں ایک ایک کر کے سامنے آجاتی ہیں لیکن جب کسی نازک صورتِ حال میں ڈکشنری کی ضرورت پڑ جائے تو تمام ڈکشنریاں بخارات بن کر ہوا میں اُڑ جاتی ہیں اور کوئی ڈکشنری ہاتھ نہیں آتی۔ درحقیقت اُس وقت کتابوں کو شرارت کی تحریک ہوتی ہے اور وہ میری لاپرواہی کا انتقام لینے کے لیے ختم نہ ہونے والے آنکھ مچولی کے کھیل کے ذریعے میرا وقت ضائع کرتی ہیں۔

اس لیے میں تمام چیزوں کے مقابلے میں زندگی میں عادات کی باقاعدگی اور نظم و ضبط کو پسند کرتا ہوں اور مَیں مونتین سے شدید اختلاف رکھتا ہوں۔ وہ کہتا ہے "نوجوان آدمی کو اپنی توانائی کو حرکت میں رکھنے، اُسے زنگ اور سُستی سے بچانے کے لیے اپنے اُصول توڑ لینے چاہئیں" زندگی کا کوئی لمحہ اتنا بیوقوف اور کمزور نہیں ہے کہ اُس کی اصول اور نظم و ضبط کے مطابق تعمیل کی جائے۔

یہ بات سولہویں صدی کے اُن شرفاء کے لیے کافی حد تک نصیحت کا کام کرتی تھی جن کے خاص ذرائع تھے۔ لیکن یہ نصیحت اُس نسل کے لیے بالکل بے فائدہ ہے جس نے مشین کو بنایا۔ اُس کی خوبصورتی اور استعمال کے طریقہ کو باقاعدگی کا ڈھنگ دیا۔ مثال کے طور پر ٹرین ہی کو لیجیے جو وقت پر روانہ ہوتی ہے۔ گھڑی عادتاً صحیح وقت بتاتی ہے۔ آدمی جو ہر صبح آٹھ بجے ناشتہ کرتا ہے اور ہمیشہ اپنا ٹکٹ ایک ہی جیب میں رکھتا ہے۔ ان تمام معاملات میں مشین کی طرح رہنا کوئی بڑی بات نہیں بلکہ یہ تو کامیاب زندگی گزارنے کی دلیل ہے۔

میکانکی طور پر زندگی بسر کرنا تو روح آزاد کی طرح زندگی بسر کرنا ہے جو آپ کو زندگی کے ہنگاموں سے انحراف کر کے کتابوں یا چشے کی تلاش میں فضول وقت ضائع نہیں کرنے دیتی۔ مَیں انتہائی خوش قسمت ہوں کہ کم از کم میری ایک عادت تو ہے کہ مَیں سگریٹ کا پیکٹ ایک خاص طریقے سے کھولتا ہوں۔ یہ معمولی سی چیز ہے، لیکن کیا یہ چیز وقت کی پابندی، باقاعدگی اور نظم و ضبط کا بیج نہیں ہو سکتی؟ جو میرے سارے وجود میں پروان چڑھ جائے۔ مَیں اُس بیرے کا انتہائی مرہونِ منت ہوں جس نے مجھے اُمید کی کرن دکھا دی۔

چاک کا ٹکڑا

جی۔ کے چیسٹرٹن
وقارالنساء آغا

مجھے گرمیوں کی چھٹیوں کی وہ نیلی، چمکتی ہوئی سہانی صبح خوب یاد ہے جب میں نے بادل نخواستہ خود کو "کچھ نہ کرنے" کے عالم سے گھسیٹ کر الگ کیا، ٹوپی قسم کی کوئی شے سر پر رکھی، چھڑی ہاتھ میں لی اور نصف درجن چمکتے ہوئے چاک اپنی جیب میں ٹھونس لئے۔ اس کے بعد میں باورچی خانے میں داخل ہوا (جس کی مالکن سسکس گاؤں کی ایک ہوشمند بوڑھی خاتون تھی) اور اس خاتون سے پوچھا کہ کیا اس کے پاس بھورے رنگ کا کوئی کاغذ ہے! ــــ کاغذ اس کے پاس کافی مقدار میں تھا بلکہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تھا لیکن اس کے صحیح استعمال کے بارے میں اس کا ذہن صاف نہیں تھا۔ اس کا غالباً یہ خیال تھا کہ اگر کسی کو بھورے رنگ کا کاغذ مانگے تو اس کی ضرورت پارسل بنانا ہی ہو سکتی ہے۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ فی الواقع مجھے یہ کام ہمیشہ اپنی ذہنی صلاحیت سے ماورا نظر آیا ہے۔ چنانچہ وہ تفصیل کے ساتھ اس شے (کاغذ) کی مضبوطی اور دیرپائی ایسے متنوع اوصاف پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگی۔ میں نے وضاحت کی کہ میں تو اس پر صرف تصویریں بنانا چاہتا ہوں اور مجھے اس بات کی قطعاً آرزو نہیں کہ وہ دیرپا بھی ثابت ہوں۔ نیز میرے نقطۂ نظر سے سوال مضبوطی اور دیرپائی کا نہیں بلکہ جاذب سطح کا ہے جو پارسل بنانے کے معاملے میں ایک نسبتاً مہمل بات ہے۔ جب اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ میں مصوری کرنا چاہتا ہوں تو اس نے اس مفروضہ کی بنا پر کہ میں کفایت شعاری کے تحت اپنی خط و کتابت بھی پرانے بھورے رنگ کے کاغذی ریپر پر کرنے کا عادی ہوں، مجھے لکھنے کے کاغذ کی پیش کش کر دی۔

تب میں نے بات کے لطیف منطقی پہلو کی وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ میں نہ صرف بھورے رنگ کے کاغذ کو پسند کرتا ہوں بلکہ کاغذ میں بھورے پن کے وصف کا بھی مداح ہوں بعینہٖ جیسے مجھے اکتوبر کے جنگل میں، جو کی شراب میں یا شمالی علاقے کی ندیوں میں بھورے رنگ کا وصف اچھا لگتا ہے۔ بھورا کاغذ تخلیق کی پہلی ضرب سے پھوٹنے والی ابتدائی شفقی روشنی کا مظہر ہے اور ایک یا دو تیز رنگ کے چاکوں سے آپ اس میں آگ کی اُس تمازت کو بھی نمایاں کر سکتے ہیں جس میں سونے ایسی چنگاریاں لہو کی طرح سرخ اور سمندر کی طرح سبز ہوتی ہیں جیسے ان کی حیثیت ان تند ستاروں کی سی ہو جو دفعتاً ازلی تاریکی سے لپک کر باہر آگئے تھے۔ میں نے بوڑھی خاتون سے یہ سب کچھ بڑے سرسری انداز میں کہا اور پھر بھورے کاغذ کو اپنی جیب میں ٹھونس لیا جہاں چاک اور دوسری اشیاء پہلے ہی سے موجود تھیں۔ میرا اندازہ ہے کہ ہر کسی نے اس بات پر ضرور غور کیا ہوگا کہ اس کی جیب میں کیسی کیسی نادر اور شعریت سے لبریز اشیاء موجود ہوتی ہیں، جیسے مثلاً جیبی چاقو جو تمام انسانی اوزاروں کا باوا آدم اور تلوار کا شیر خوار بچہ ہے۔ ایک بار میں نے ارادہ کیا تھا کہ اپنی جیب

کی اشیا پر ایک پوری نظم قلم بند کردوں مگر مجھے محسوس ہوا کہ نظم بہت طویل ہو جائے گی اور بڑی بڑی زمینی تکلوں کا زمانہ بیت چکا ہے۔

چھتری، چاقو، چاک اور بھورے کاغذ سے لیس ہو کر میں نے ایک کشادہ خطۂ زمین کا رُخ کیا اور زمین کے اُن اونچے نیچے حصّوں پر سے رینگتا چلا گیا جو انگلستان کے سب سے اچھے وصف کے مظہر ہیں کیونکہ وہ بیک وقت نرم بھی ہیں اور مضبوط بھی! ان کی نرمی گاڑی میں جتے ہوئے گھوڑوں یا بیچ کے درختوں کی نرمی سے مشابہ ہے۔ جیسے جیسے میری نظریں زمین پر پھیلتی چلی گئیں مجھے محسوس ہوا کہ یہ زمین ویسی ہی مہربان تھی جیسی اس کی جھونپڑیاں لیکن قوت کے اعتبار سے یہ زمین کسی زلزلے سے کم نہیں تھی۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ وسیع دریے کنار، وادی کے دیہات صدیوں سے بالکل محفوظ کھڑے ہیں۔ پھر بھی یوں لگتا تھا جیسے ساری دھرتی ایک بہت بڑی لہر کی طرح اوپر کو اٹھ آئی ہو تاکہ انہیں بہالے جائے۔

میں نے گھاس کی کئی سوتوں کو یکے بعد دیگرے عبور کیا تاکہ بیٹھنے اور تصویریں کھینچنے کے لئے کوئی مناسب جگہ مل جائے۔ خدا کے لئے یہ نہ سوچیے کہ میں مناظرِ فطرت کو ماڈل کے طور پر استعمال کرنے کا متمنی تھا۔ میں تو شیطانوں اور چھ پَروں والی ہستیوں کی تصویریں کھینچنا چاہتا تھا اور اُن اندھے پرانے دیوتاؤں کی جنہیں لوگ "روشنی" طلوع ہونے سے قبل پوجتے تھے اور سُرخ چغوں میں ملبوس اولیاؤں کی عجیب سے رنگ والے سمندروں کی اور ان تمام مقدس یا شیطانی علامتوں کی جو بھورے کاغذ پر تیز رنگوں سے کھنچی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔ مصوری کے لئے یہ علامتیں فطری مناظر سے کہیں بہتر ہیں۔ پھر انہیں کھینچنا بھی نسبتاً آسان ہے۔ جب قریبی کھیت میں ایک گائے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ آگئی تو ایک معمولی مصور بھی اس کی تصویر کھینچ سکتا تھا لیکن میرے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ چوپائے کی پچھلی ٹانگوں کی تصویر کھینچتے ہوئے میں گڑبڑا جاتا ہوں۔ اس لئے میں نے گائے کی اس "روح" کی تصویر کھینچ ڈالی جسے میں نے سورج کی روشنی میں بالکل اپنے سامنے چلتے پھرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور میں نے دیکھا تھا کہ یہ "روح" یکسر جامنی رنگ کی تھی۔ اس کے سات سینگ تھے اور اس کے گرد وہ ساری پُراسراریت بھی تھی جو ہر جانور کے ساتھ ہمیشہ سے وابستہ رہی ہے۔ لیکن گو میں ایک رنگین چاک کی مدد سے لینڈ سکیپ سے سب کچھ اخذ کر سکنے سے محروم رہا تاہم اس کا مطلب یہ بالکل نہیں کہ خود لینڈ سکیپ بھی مجھ سے سب کچھ کشید کرنے میں ناکام ہو گئی۔ اور میرے خیال میں یہی وہ غلط فہمی ہے جو ورڈزورتھ سے پہلے کے پُرانے شاعروں کے بارے میں عام ہے کہ وہ فطرت سے بے نیاز تھے کیونکہ انہوں نے فطرت کو بیان کرنے کی کچھ زیادہ کوشش نہیں کی۔

انہوں نے عظیم پہاڑیوں پر قلم اٹھانے کے بجائے عظیم انسانوں پر قلم اٹھانے کو ترجیح دی لیکن انہوں نے عظیم پہاڑیوں پر بیٹھ کر یہ کام سرانجام دیا۔ ان لوگوں نے فطرت کے بارے میں تو بہت کم لکھا لیکن شاید فطرت کے جوہر سے زیادہ متمتع ہوئے۔ انہوں نے مقدس کنواریوں کے ان سفید چغوں کی مصوری کی جنہیں بے شمار دن ..... تکتے رہے تھے اور بہت سے ڈوبتے ہوئے سورجوں کے سونے سے اپنے سورماؤں کی ڈھالوں پر نقش و نگار بنائے۔ (چنانچہ) ہزاروں سبز پتوں کی ہریالی رابن ہڈ کی تڑپتی ہوئی سبز شخصیت میں سمٹ آئی اور بیسیوں فراموش شدہ آسمانوں کی نیلاہٹ کنواری مریم کے نیلے چغے میں ڈھل گئی۔ الہامی جذبہ سورج کی کرن کی طرح ایک طرف سے داخل ہوا اور دیوتا اپالو کی طرح دوسری طرف سے برآمد ہو گیا۔

لیکن بھورے کاغذ پر ان بے ہودہ تصویروں کو بناتے ہوئے مجھ پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ میں ایک اہم اور ضروری چاک تو پیچھے ہی چھوڑ آیا ہوں۔ میں نے اپنی تمام جیبوں کی تلاشی لی لیکن مجھے کوئی سفید چاک نہ ملا۔ اب وہ تمام لوگ جو بھورے کاغذ پر

تصویر کھینچنے کے فلسفہ (بلکہ مذہب) سے آشنا ہیں، اس بات کو اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ اس سلسلے میں سفید چاک کس قدر ضروری ہے
یہاں میں ایک اخلاقی پہلو کا حوالہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بھورے کاغذ کا یہ آرٹ جن المناک سچائیوں کا انکشاف کرتا ہے ان میں سے
ایک یہ ہے کہ سفیدی بھی ایک رنگ ہے۔ یہ محض رنگ کا فقدان نہیں بلکہ ایک چمکدار اور مثبت شے ہے — سرخ کی طرح
خونخوار اور سیاہ کی طرح واقعی! جب پنسل گرم سرخ ہو تو یہ گلاب کے پھول بناتی ہے اور جب گرم سفید ہو جائے تو ستارے! اور بہترین
مذہب کی دو یا تین بے پناہ سچائیوں میں سے ایک بالکل یہی ہے یعنی یہ کہ مذہبی اخلاقیات کے مطابق سفیدی بھی ایک رنگ ہے۔ نیکی، گناہ
کے فقدان کو یا اخلاق کو درپیش خطرات سے محفوظ رہنے کا نام نہیں۔ نیکی تو ایک واضح اور الگ شے ہے جیسے درد یا کوئی خاص خوشبو! رحم دلی
سے مراد یہ نہیں کہ انسان ظالم نہ ہو یا سزا اور انتقام سے اجتناب کرے۔ اس سے مراد ایک صاف اور مثبت شے ہے جیسے سورج جسے آپ
نے یا تو دیکھا ہوا ہے یا دیکھا ہی نہیں۔ اس طرح کنوارپن سے مراد محض بے راہروی سے اجتناب نہیں۔ بلکہ اس سے مراد کوئی شعلہ وش شے ہے
جیسے جون آف آرک! مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ بہت سے رنگوں میں مصوری کرتا ہے لیکن جس خوبصورتی اور شان سے وہ سفید رنگ میں تصویریں
بناتا ہے اس کی بات ہی الگ ہے۔ ایک طرح سے ہمارے زمانے نے اس حقیقت کا ادراک کر لیا ہے اور یہ ادراک ہمارے بدمزاج لباس
میں ظاہر ہونے لگا ہے۔ کیونکہ اگر یہ بات سچ ہوتی کہ سفید ایک بے رنگ اور منفی شے ہے تو پھر اس قنوطی دور کے ماتمی لباس میں بھی
سیاہ کی جگہ سفید ہی استعمال ہوتا اور ہم معزز شہریوں کو بے داغ سیمگوں ریشم میں ملبوس دیکھتے مگر ایسا نہیں ہے۔

اس اثنا میں مجھے (سفید) چاک نہیں مل رہا تھا!

میں مایوس ہو کر وہیں پہاڑی پر بیٹھ گیا۔ چائی چیسٹر کے علاوہ اور کوئی قصبہ قریب نہیں تھا اور وہاں بھی اس بات کا قطعاً کوئی امکان نہیں
تھا کہ مصوری کے سامان ایسی کوئی شے میسر آ سکے گی۔ ادھر سفید رنگ کے بغیر میری ننھی منی مہمل تصویریں اسی طرح بے معنی تھیں جیسے وہ دنیا
جس میں شریف لوگ موجود نہ ہوں۔ میں نے احمقوں کی طرح ادھر ادھر نظر دوڑائی اور اپنے دماغ پہ زور دیا کہ کوئی متبادل راستہ سوجھ جائے۔ اور تب
میں اچانک اچھل کر کھڑا ہو گیا اور میں نے اتنے زور سے بار بار قہقہے لگائے کہ گائیں (چرنا چھوڑ کر) مجھے گھورنے لگیں اور پھر انہوں نے غور و
فکر کے لئے ایک سبھا سی جما لی۔ ایک ایسے شخص کا تصور کیجئے جو صحرائے اعظم میں کھڑا اس بات پر کفِ افسوس مل رہا ہو کہ اس کے پاس اپنے
ساعت پیما کے لئے ریت نہیں ہے یا ایک ایسے شریف آدمی کا تصور کیجئے جو سمندر کے عین درمیان یہ سوچ رہا ہو کہ کاش وہ کیمیائی تجربات
کے لئے اپنے ساتھ نمکین پانی بھی لایا ہوتا — میں تو سفید چاک کے ایک عظیم الشان انبار پہ دھرنا مارے بیٹھا تھا۔ ساری لینڈ سکیپ
سفید چاک کی بنی ہوئی تھی۔ سفید چاک کے انبار میلوں تک جمع ہوتے چلے گئے تھے حتیٰ کہ وہ آسمان کو چھونے لگے تھے۔ میں رک گیا اور میں نے
اسی چٹان سے ایک ٹکڑا توڑ لیا جس پر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اتنا عمدہ نشان تو نہ بنایا جتنا دکان کا چاک بناتا ہے لیکن اس نے تاثر ضرور پیدا
کر دیا۔ اور اب میں مسرت کی نیم مدہوش کیفیت میں اسیر کھڑا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ سارے کا سارا جنوبی انگلستان ایک بہت بڑا
جزیرہ نما روایت اور تہذیب ہی نہیں، چاک کا ایک ٹکڑا بھی ہے اور یہ چیز اس کے باقی جملہ اوصاف سے کہیں زیادہ دل فریب ہے!!

سہیل بخاری

انشائیہ — اُردو ادب میں

پیشِ نظر کتاب اُردو ادب کی نئی صنف "انشائیہ" کی مستند اور مکمل تاریخ اور بھرپور تنقید ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کی تصنیف میں جس دیدہ ریزی اور ریزہ چینی سے کام لیا ہے اور تلاش و تحقیق میں جس دقتِ نظر کا ثبوت دیا ہے وہ لائقِ ستائش ہے اور وہ خود اس کے لئے آفرین و مبارکباد کے مستحق ہیں۔

انشائیہ ہمارے یہاں مغرب سے آیا ہے جہاں اسے "ایسے" کہتے ہیں اور جس طرح مغرب میں اس کا تشخص نزاعی رہا ہے اسی طرح ہمارے یہاں بھی ابھی اس کا مزاج ادیبوں کی گرفت میں اچھی طرح نہیں آیا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ادب میں ریاضی کی سی قطعیت بھی نہیں ہوتی۔ اسی لئے انشائیہ کی کوئی جامع و مانع تعریف بھی قطعی اور حتمی الفاظ میں متعین نہیں ہو پائی ہے۔ البتہ ادیبوں اور نقادوں کی آرا سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ انشائیے کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اس کا موضوع، دوسرا موضوع کے متعلق انشائیہ نگار کے ذاتی تاثرات اور تیسرا پہلو ان تاثرات کا ہلکے پھلکے انداز میں اظہار یعنی شگفتہ اسلوبِ بیان۔

دنیا میں موضوعات کی کوئی کمی نہیں ہے اور انشائیے کے لئے کسی موضوع کی تخصیص نہیں ہے۔ علماء اور ماہرینِ فن اپنے اپنے مخصوص شعبوں میں قید اور اپنے طبعی رجحانات کے اسیر ہوتے ہیں لیکن انشائیہ نگار کسی خاص قسم کے موضوع کا اسیر نہیں ہوتا بلکہ ہر موضوع اس کا گرفتار ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے کوئی موضوع اہم یا غیر اہم، سنجیدہ یا غیر سنجیدہ اور وقیع یا سبک نہیں ہوتا۔

عالموں اور ماہروں کا کام اپنے علم و فن کا اظہار نہیں بلکہ دوسروں کو اپنے علوم کی معلومات فراہم کرنا اور انہیں دانا و بینا بنانا ہے لیکن انشائیہ نگار کا کام قاری کو اپنے انفرادی اور خصوصی تجربات اور انوکھے اور اچھوتے تاثرات میں شریک کرنا ہے۔ مقالات و مضامین میں نئی معلومات کی فراہمی پر زور ہوتا ہے لیکن انشائیے میں انشائیہ نگار کے ذاتی تاثرات کی جدت و ندرت توجہ کا مرکز ہوتی ہے۔

تحریروں کا انداز سنجیدہ اور متین بھی ہوتا ہے اور مزاحیہ اور طنزیہ بھی لیکن یہ انداز اپنے بھاری بھرکم پن یا شدت کے باعث پڑھنے والے کے لئے بارِ خاطر بھی ہو سکتا ہے۔ انشائیے میں بھی متانت اور طنز و مزاح دونوں سے کام لیا جا سکتا ہے لیکن اظہارِ تاثرات میں ہلکا پھلکا پن اور شگفتگی قائم رکھنا از بس ضروری ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ اس میں متانت یا مزاح وغیرہ کا رنگ گہرا نہیں ہوتا۔

پیشِ نظر کتاب میں انشائیے کے ان تمام پہلوؤں کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کی ولادت، تسمیہ، مزاج و منہاج

قد و قامت، نقلِ مکانی، پس منظر اور پیش منظر، ماضی کی روایت، حال کی استقامت اور مستقبل کے امکانات۔ غرض اس موضوع کے جملہ سوابق و لواحق پر بایت مفصل اور وقیع و معتبر بیانات نے اس کتاب کو انشائیہ نگاری پر ایک اہم اور بنیادی دستاویز کی حیثیت عطا کر دی ہے۔ مستقبل میں انشائیہ کا کوئی مورخ اور نقاد اس میں پیش کئے ہوئے خیالات اور بیانات سے صرفِ نظر نہیں کر سکے گا اور اس کا حوالہ دیئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکے گا۔

مصنف کے تبصروں کی بے لوثی اور دقیقہ سنجی، موافق و مخالف آرا پر منصفانہ محاکمہ، غیر جذباتی اور محکم استدلال، محتاط و متوازن اندازِ بیان اور ہمدردانہ و مشفقانہ نقطۂ نظر اس عالمانہ کتاب کی چند خوبیاں ہیں اور ایسی خوبیوں کی کتابیں بہت کم لکھی جاتی ہیں اور کبھی کبھی دیکھنے میں آتی ہیں۔

"ناصر شہزاد کا اسلوب اتنا منفرد ہے کہ غزل پر ناصر شہزاد کا نام نہ بھی ہو تو لوگ فوراً پہچان جائیں گے کہ یہ غزل ناصر شہزاد کی ہے۔ یہ بات کئی برسوں کی ریاضت کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے ناصر شہزاد کی غزلیں اُس مرہم کی طرح ہیں جو آنِ واحد میں زخموں کی ساری چبھن کو دور کر دیتی ہے۔"

وزیر آغا

بَن بَاس

ناصر شہزاد کی غزلوں اور گیتوں کا دوسرا مجموعہ

سیپ پبلی کیشنز۔ کراچی

رشید امجد

انشائیہ — اُردو ادب میں

جب کوئی صنف تشخص کے عمل سے گزر رہی ہوتی ہے تو سنجیدہ بحث کے ساتھ ساتھ بہت سی ایسی بحثیں بھی شروع ہو جاتی ہیں جن کی بنیاد ٹی ہاؤس، گپ شپ یا غیر سنجیدہ ادبی محفلوں کے سلوگن ہوتے ہیں، کچھ ایسی ہی صورت انشائیہ کے ساتھ بھی پیش آئی کہ انشائیہ کی ساری بحث کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں بہت سا حصہ بے معنی اور قیاسی ہے۔ اور محض شخصی مخالفت اس کی بنیاد ہے جہاں تک انشائیہ کا تعلق ہے میرے خیال میں اب اس کے جواز اور تکنیک و ہیئت کی بحث بے معنی ہے کہ پچھلے دس پندرہ سالوں میں انشائیہ نے بطور صنف نہ صرف اپنا وجود منوا لیا ہے بلکہ معیار اور رفتار کا تعین بھی کر لیا ہے، اس لئے اب اس کی تکنیک و ہیئت کی بحث OUT OF DATE ہو چکی ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اُردو انشائیہ کا بانی کون ہے اور انشائیہ کب سے لکھا جا رہا ہے تو اس کے لئے اسی اصول کو سامنے رکھنا چاہیے جو جدید اُردو نثر کے بانی ہونے کے لئے غالب اور سرسید کے سلسلہ میں استعمال ہوا ہے۔ غالب نے جدید اُردو نثر کا امکان دریافت کیا لیکن انہیں جدید اُردو نثر کا بانی نہیں کہا جاتا بلکہ یہ سہرا سرسید کے سر باندھا جاتا ہے کہ غالب نے غیر شعوری اور سرسید نے شعوری طور پر اُردو نثر کو جدید آہنگ و رنگ سے آشنا کیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چیزیں اور خیال تو موجود ہوتے ہیں لیکن جو شخص انہیں ایک خاص نقطۂ نظر اور ایک خاص ترتیب میں لاتا ہے وہی ان کا بانی کہلاتا ہے۔ اسی طرح لفظ بھی لغت میں موجود ہوتے ہیں لیکن جب کوئی خاص شخص کسی لفظ کو کسی خاص معنوں میں استعمال کرتا ہے تو وہی اس نقطۂ نظر کا بانی کہلاتا ہے۔ انشائیہ یقیناً اُردو میں بکھری صورتوں میں موجود تھا، بلکہ پرانی داستانوں میں بھی کئی ٹکڑے ایسے مل جاتے ہیں، جنہیں انشائیہ نما کہا جا سکتا ہے، سرسید کے کئی مضامین میں بھی انشائی رنگ ہے اور ان کے بعد بھی بہت سے لکھنے والوں کے یہاں انشائیوں کے نقوش ملتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی نے بھی انشائیہ کو ان معنوں میں استعمال نہیں کیا، جن معنوں میں آج ہم اسے استعمال کرتے ہیں۔

انشائیہ کے وجود کی بہت سی ایسی متنازعہ بحثوں سے قطع نظر انشائیہ نے عملی پیش قدمی کی ہے اور ایک طاقتور اور صاحب حیثیت صنف کے طور پر اپنی پہچان کرائی ہے، چنانچہ اب بحث انشائیہ کی تکنیک کی نہیں بلکہ اس کے معیار کی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی کتاب "انشائیہ۔ اُردو ادب میں" اس سلسلے میں پہلی اہم کوشش ہے جس میں انشائیہ کے آغاز و رفتار کے ساتھ ساتھ معیار کی بات بھی کی گئی ہے انہوں نے انشائیہ کے سلسلے میں ہونے والی اب تک کی ساری منفی اور مثبت بحث کو سمیٹ لیا ہے۔ انشائیہ پر یوں تو بے شمار مضامین لکھے گئے ہیں لیکن یہ ساری تنقید و تعارف کسی تسلسل میں نہیں۔ انور سدید نے اسے مربوط کر کے ایک نئی معنویت دریافت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"یہ کتاب انشائیہ کی تنقید میں حرفِ اوّل کی حیثیت نہیں رکھتی کہ اس سے قبل اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے

میں اسے حرفِ آخر بھی تصور نہیں کرتا کہ یہ ایک زندہ موضوع ہے اور اس پر آئندہ بھی بہت کچھ لکھا جاتا رہے گا۔ میں نے تو ایک چھوٹی سی قندیل روشن کی ہے اور اس قندیل کی کرنوں میں اس موضوع کو اپنی دانش کے مطابق اجالنے کی سعی کی ہے۔"

(انشائیہ اُردو ادب میں۔ دیباچہ)

یہ دراصل انور سدید کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ انہوں نے اپنے اس اہم کام کو ایک چھوٹی سی قندیل کہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کتاب انشائیہ کے سلسلے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور انور سدید نے جس طرح منطقی اور استدلالی طور پر ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو اب تک ہو رہے ہیں، وہ ان کے صاحبِ مطالعہ ہونے کی دلیل ہی نہیں بلکہ انشائیہ کی صنف پر مکمل گرفت کا اظہار بھی ہے۔ وہ خود بھی اہم انشائیہ نگار ہیں۔ ان کی تنقیدی بصیرت کسی رسمی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کی تنقیدی کتابوں اور مضامین نے اہم سوال اٹھائے اور بحث کے نئے دروازے وا کئے ہیں۔

"انشائیہ۔ اُردو ادب میں" دس ابواب پر مشتمل ہے اور انشائیہ کے فن، اس کی تعریف، انشائیہ کی یورپی روایت اور پس منظر، عہدِ سر سید سے بیسویں صدی، انشائیہ کے جدید دَور کے ساتھ ساتھ اُردو کے گم شدہ انشائیہ نگاروں، اور پھر نئی نسل کے انشائیہ نگاروں کے کام کے تفصیلی جائزہ کا احاطہ کرتی ہے۔ انشائیہ کے فن کے سلسلہ میں انور سدید نے نہ صرف لفظ انشائیہ کو اس کے تاریخی اور تدریجی وارتقائی پس منظر میں دیکھا ہے بلکہ انشائیہ کی تعریف بھی متعین کی ہے اور ان فنی نکات کا جائزہ لیا ہے جو اس صنف کی تکنیک میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انشائیہ کے مزاج کو بھی دریافت کیا ہے۔ انشائیہ بنیادی طور پر یورپ سے آیا ہے اس لئے انشائیہ کی بحث میں اس سرمایہ تکنیک اور مزاج کا ذکر بھی ضروری ہے جو مختلف یورپی زبانوں میں موجود رہا ہے۔ چنانچہ انور سدید نے تفصیل کے ساتھ مونتین سے نئے یورپی انشائیہ نگاروں تک تمام اہم انشائیہ نگاروں کا جائزہ لیا ہے۔ تیسرے باب میں اُردو انشائیہ کے ابتدائی خدوخال کا تذکرہ ہے جس کی ابتدا انہوں نے ملا وجہی سے کی ہے۔ اس کے بعد عہدِ سر سید ہے اور پھر بیسویں صدی کے آغاز میں انشائیہ کی صورتِ حال، یہ سارا حصّہ ۱۹۴۷ء تک کے عرصہ کا احاطہ کرتا ہے۔ آزادی کے بعد کے عہد کو وہ انشائیہ نگاری کا زریں دَور کہتے ہیں۔ اس دَور کا آغاز وزیر آغا سے ہوتا ہے۔ وزیر آغا سے پہلے اگرچہ انشائیہ کے خدوخال موجود تھے لیکن کسی نے بھی اسے ایک خاص مزاج اور تکنیک کے حوالہ سے دیکھنے کی سعی نہیں کی بلکہ ہلکے پھلکے مضامین کو انشائے لطیف کہا جاتا رہا۔ وزیر آغا سے پہلے انشائیہ کی وہی صورت ہے جو سر سید سے پہلے اُردو نثر کی تھی۔ اس میں دکنی عہد فورٹ ولیم کالج اور غالب کی نثر تین اہم موڑ موجود تھے لیکن سر سید نے اردو نثر کو نئے مزاج سے آشنا کیا، اسی طرح وزیر آغا نے اُردو انشائیہ کی اس روایت کو نئے معنی عطا کئے اور اس کا مزاج بنایا، چنانچہ وہی جدید انشائیہ کے بانی ہیں۔ انور سدید کے لفظوں میں:

"انشائیہ اُردو ادب کی ایک ایسی صنفِ اظہار ہے جس کے ٹکڑے بے ترتیب صورت میں متعدد قدیم اور جدید نثر نگاروں کے مضامین میں بکھرے پڑے ہیں۔ بعض محققین نے اس صنفِ ادب کے آثار اٹھارہویں صدی کی ادبی نثر میں بھی دریافت کئے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ اس صنف کی طرف باقاعدہ توجہ بیسویں صدی کے چھٹے عشرے میں مبذول کرائی گئی اور ۱۹۶۱ء میں "خیال پارے" کی اشاعت ہوئی تو اس کتاب کو انشائیہ کا باضابطہ اعلامیہ قرار دیا گیا۔ میری رائے میں انشائیہ کے فروغ و ارتقاء میں "خیال پارے" کو وہی حیثیت حاصل ہے جو ترقی پسند تحریک میں افسانوں

کے مجموعے 'انگارے' کو تفویض کی جاتی ہے۔ 'خیال پارے' نے انشائیہ کو وسیع پیمانے پر متعارف کرانے اور اس صنف کی فنی بوطیقا مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔" (انشائیہ اُردو ادب میں۔ دیباچہ)

'خیال پارے' کی اہمیت محض اس لئے نہیں کہ اس کے انشائیے پہلی بار انشائیہ کا معیار مقرر کرتے ہیں بلکہ انور سدید کے لفظوں میں:

"اس کتاب کی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں مصنف نے انشائیہ کیا ہے؟ کے عنوان سے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی لکھا اور اس فن کے لئے مناسب جواز بھی مہیا کیا۔" (انشائیہ اُردو ادب میں۔ دیباچہ)

مَیں ان کی اس رائے سے متفق ہوں کہ اس کتاب (خیال پارے) کی اہمیت اس کے عمدہ انشائیوں کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ اس لئے بھی ہے کہ اس کے مقدمہ نے پہلی بار اُردو انشائیہ پر نظر ڈالی اور لفظ انشائیہ کو نئے معنوں میں اس طرح استعمال کیا کہ یہ ایک علیحدہ صنف کے طور پر اپنی پہچان کرا سکے۔

'خیال پارے' کی اشاعت کے بعد انشائیہ کا نیا عہد شروع ہوتا ہے جس میں انشائیہ ایک علیحدہ صنف اور مخصوص مزاج کے ساتھ اپنی پہچان کراتا ہے اور ایک تحریک اور رجحان کی صورت اختیار کرتا ہے۔ یہ بات اس لئے اہم ہے کہ 'خیال پارے' سے پہلے اتنی بڑی تعداد اتنے ذوق و شوق کے ساتھ کبھی انشائیہ نہیں لکھا گیا بلکہ اس سے پہلے کی صورت یہ ہے کہ مختلف لوگوں نے جو کچھ لکھا اس کے بارے میں وہ خود بھی واضح نہ تھے کہ یہ کیا ہے۔ چنانچہ اس کے لئے انہوں نے کبھی انشائے لطیف، کبھی نثر لطیف اور کبھی انشائیہ کی اصطلاح استعمال کی۔ یہ اصطلاح چونکہ واضح فنی تصور نہ رکھتی تھی اس لئے نہ تو تحریک کی شکل اختیار کر سکی اور نہ رجحان بن پائی۔ خیال پارے نے فنی وضاحتوں کے ساتھ ساتھ فنی جواز بھی فراہم کیا۔ چنانچہ لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد اس طرح متوجہ ہوئی اور جمیل آذر، مشتاق قمر، غلام جیلانی اصغر اور خود انور سدید نے انشائیہ کو تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا، دیکھتے ہی دیکھتے نئے لوگ اس قافلہ میں شامل ہو گئے[1]۔ اور یوں اب انشائیہ ایک متوازی صنف کے طور پر اپنی حیثیت منوا چکا ہے۔ اس دوران کچھ ایسے لوگ بھی انشائیہ لکھنے کی کوشش کرتے رہے جو اس کے فنی تصور اور فنی بصیرت سے عاری تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے یہاں انشائیہ کا اُردوئی مزاج پیدا ہی نہیں ہو سکا۔ انشائیہ اور بہت سی دوسری اصناف کا بنیادی تصور اگرچہ یورپ ہی سے آیا ہے لیکن ان تمام اصناف کو مشرقی مزاج اپنانا پڑا۔ چنانچہ جن لوگوں نے مشرقی مزاج کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا وہ بنیادی لہر سے علیحدہ رہے۔ کچھ یہی صورت جدید افسانے کی بھی ہے کہ جن افسانہ نگاروں نے مشرقی اندازِ فکر اور مزاج کا اندازہ نہیں کیا، ان کے یہاں جدیدیت کے تمام رموز کے باوجود ایک اکھڑ پن نمایاں محسوس ہوتا ہے۔ انشائیہ کی بھی یہی صورت ہے کہ انشائیہ اگر اپنی زمین، ثقافتی مزاج اور زبان سے آشنا نہ ہو تو اس کا طرز اور طور یورپی ہو گا۔ وزیر آغا نے اُردو انشائیہ کو اپنے ثقافتی مزاج اور مشرقی آہنگ سے آشنا کیا۔ ان سے پہلے جو انشائیہ ڈانوا ڈول پھر رہا تھا اسے ایک متعین راستہ پر ڈال دیا۔ یہی ان کی سب سے بڑی عطا ہے۔

انشائیہ انکشافِ ذات ہے بلکہ ذات کے حوالے سے انکشافِ کائنات کہ انشائیہ نگار اپنی ذات کو آئینہ بنا کر اس میں پوری کائنات کا عکس پیش کرتا ہے۔ اس لحاظ سے انشائیہ کا عمل صوفیانہ عمل ہے جس کے نتیجہ میں خود انشائیہ نگار بھی اندرونی مسرت سے ہمکنار ہوتا ہے اور پڑھنے والے کو بھی مادے کی سطح سے بلند کر کے ماورائے زماں ایک نئی خوشبو اور مسرت سے آشنا کرتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن کے لفظوں میں:

---

[1] سلیم آغا قزلباش، رام لعل نابھوی، ارشد میر، طارق جامی، اکبر حمیدی، بشیر سیفی، سلمان بٹ، شعیب خالق، جان کاشمیری، محمد اقبال انجم، یونس بٹ وغیرہ

"ایک انشائیہ فن کار کی انفرادیت اور شخصیت کا پرتو ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار فرد کو جماعت اور جز کو کل پر ترجیح دیتا ہے۔"

ڈاکٹر جانسن کی اس رائے میں انشائیہ لکھنے والے کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کا اظہار بھی ہے۔ شخصیت کے اظہار پہ بار بار زور دینے سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ شاید انشائیہ شخصی اظہار تک ہی محدود ہے اور اس طرح اپنے عصر سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انشائیہ براہ راست اظہار کی بجائے چیز اور مشاہدے کی خوشبو کو پیش کرتا ہے لیکن دراصل انشائیہ اپنے عصر کی وہ خوشبو ہے جو پورے باغ کے دکھ سکھ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ چنانچہ انشائیہ اپنے عہد کی سیاسی سماجی کیفیات کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ ٹھوس اظہار کی بجائے احساسات و کیفیات کو پیش کرتا ہے۔ بقول انور سدید:

"انشائیہ میں عصری آگہی اپنے تصور کو جامد صورت میں پیش نہیں کرتی بلکہ اس کا مدار بھی ہمہ وقت گردش میں رہتا ہے۔ کبھی انشائیہ اپنی ذات کے ایک بلکتے سے انکشاف سے زمانے کو گرفت میں لے لیتا ہے اور کبھی زمانہ کائنات کے زینے سے ذات کے دروازے پر دستک دینے لگتا ہے۔ دونوں صورتوں میں انشائیہ نگار کسی تیز یا ترش ردِ عمل کا اظہار نہیں کرتا بلکہ وہ زمانے کی خلوت میں داخل ہونے کے لئے ہمارے سامنے اپنی شخصیت کا دریچہ کھول دیتا ہے۔ بالفاظِ دیگر انشائیہ معاشرے کے اعمال و افعال کی ہر حرکت کو دیکھتا ہے اور اس کی ہر لرزش کو بکھتے ہوئے پھول کی طرح اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے اور یوں انشائیہ نگار کی لوح دل سے جو نقش بھی ابھرتا ہے اس میں زمانے کی روح موجود ہوتی ہے۔"

(انشائیہ اُردو ادب میں۔ ص ۱۱۲)

عصری آگہی کے اس تصور میں انشائیہ کا اسلوب بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ نفاست اسلوب کی اعلیٰ سطح کے بغیر ممکن نہیں۔ وزیر آغا انشا کی تازہ کاری اور زبان کے تخلیقی استعمال کے ساتھ ساتھ انشائیہ سے یہ تقاضا بھی کرتے ہیں کہ وہ شے یا مظہر کے چھپے ہوئے ایک نئے معنی کو سطح پر لائے[1] ۔۔۔۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی کے لفظوں میں "انشائیہ کی امتیازی خصوصیت حسنِ انشا ہے" اور ڈاکٹر محمد حسنین کے لفظوں میں "انشائیہ نثری ادب کا ایک خاص اسلوب ہے۔"

ڈاکٹر جے براؤن کا کہنا ہے کہ اگر خیال کی مثال سونے کی ہے تو اسلوب وہ مہر ہے جو اسے عصری سچائی دیتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ یہ کس ٹکسال سے جاری کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جے براؤن نے اسلوب کو اپنے عہد کی پہچان قرار دیا ہے۔ میری رائے میں اسلوب خیال کی زمانی اور عصری حیثیت کا تعین کرتا ہے۔ انور سدید کی رائے میں "اسلوب ہیئت اور خیال کے باہمی اشتراک سے ترتیب پاتا ہے۔ یہی دو چیزیں ادب کا ظاہر اور باطن ہیں۔ لفظ ان دونوں کے اشتراک باہم کا وسیلہ ہے۔" (ص ۵۷)

انشائیہ میں اظہار چونکہ خارجی یا واقعاتی نہیں ہوتا اس لئے اسلوب کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ انور سدید کہتے ہیں:

"انشائیہ میں چونکہ تخاطب کی بجائے خود کلامی کا زاویہ نمایاں ہے اور انشائیہ نگار کائنات میں بکھرے ہوئے عناصر اور ان کے بارے میں اپنے ذاتی تاثر کو ایک نئے آہنگ اور ایک نئی تنظیم سے پیش کرتا ہے اس لئے اسلوب اس قسم کے

---

[1] ۔ دوسرا کنارہ

فن پارے میں زیادہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انشائیہ میں کہا گیا ہے کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن اس سے بھی ضروری امر یہ کہ کیسے کہا گیا ہے۔" (انشائیہ اُردو ادب میں ص ۵۷)

اسلوب کے ساتھ ساتھ دوسری اہم چیز شخصیت کی نفاست و شرافت ہے۔ اچھے انشائیہ کے لئے بڑی شخصیت یا شخصیت کی نفاست اور شرافت کا ایک خاص معیار ہونا ضروری ہے ورنہ موضوع جو بھی ہو، اسلوب جیسا بھی ہو انشائیہ میں فلسفیانہ عظمت، روحانی شگفتگی اور ارفع مسرت پیدا نہیں ہو سکتی۔

اسلوب اور شخصیت کی اس اہم آہنگی سے انشائیہ وجود میں آتا ہے اور اس کے لئے موضوع کی قید باقی نہیں رہتی۔ بنیادی چیز یہ ہے کہ اشیاء اور مظاہر شخصیت کے آئینہ میں منعکس ہو کر دوبارہ تخلیق ہوں۔ انور سدید نے اس بات کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے:

"جس طرح انشائیہ کے لئے موضوع کی قید نہیں اور زندگی کے معمولی سے معمولی موضوع پر بھی ایک غیر معمولی انشائیہ تخلیق کیا جا سکتا ہے اسی طرح انشائیہ میں خیال کی رو کے آگے بند باندھنے کی ضرورت بھی نہیں اور یہ جس سمت میں چاہے، بے تکان اڑان کر سکتی ہے۔" (انشائیہ اُردو ادب میں ص ۸۷)

یہ سارا عمل غیر رسمی ہوتا ہے۔ انور سدید اس غیر رسمی عمل کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ "غیر رسمی طریقہ کار سے مراد صرف یہ ہے کہ انشائیہ نگار آپ کے سامنے بھاری بھر کم دلیلوں اور بوجھل مسائل کے انبار لگانے سے گریز کرتا ہے" (ص ۹۳)

انشائیہ نگاری ایک بلند تخلیقی صلاحیت کی متقاضی ہے بلکہ صوفیانہ مزاج اور کشف کی ایک خاص کیفیت سے آشنائی چاہتی ہے فنی طور پر کئی اصناف اس میں مدغم ہوتی دکھائی دیتی ہیں کہ اس میں کہانی کا سا مزہ، مضمون جیسی وسعت اور مطالعہ، نظم جیسا تسلسل اور غزل جیسا ایجاز و اختصار موجود ہے۔ یوں انشائیہ لکھنے کا عمل ایک بڑا تخلیقی عمل ہے جس میں انکشافِ ذات بھی ہے اور انکشافِ عہد بھی۔

ڈاکٹر انور سدید نے انشائیہ کے فنی ہیئت، اسلوب اور موضوع کی بحث کو سمیٹتے ہوئے بڑا اہم نتیجہ یہ نکالا ہے کہ

"انشائیہ نگار اپنے عہد کے اعمال و افعال، سیاسی سماجی تموّج، فکر و نظر کے طغیان اور تہذیبی و معاشرتی کروٹوں پر ایک حساس اور تجربہ کار ادیب کی نظر ڈالتا ہے اور عصری حقیقتوں کو نئے نئے زاویوں سے اجاگر کرتا چلا جاتا ہے اور یہ تمام عمل کچھ اس طرح سے ظہور پذیر ہوتا ہے کہ انشائیہ نگار زمانے کے مزاج سمندر میں گہرا غوطہ لگانے کے لئے ہر وقت بے تاب رہتا ہے اور جب زمانہ اس پر اپنے اسرار چھوٹے چھوٹے جگنوؤں کی صورت میں کھولنے لگتا ہے تو انشائیہ نگار انہیں صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا بلکہ انہیں انشائیہ کی تخلیقی صورت دے کر دوستوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ چنانچہ میری نظر میں انشائیہ لکھنا محض اظہارِ ذات ہی نہیں بلکہ یہ ایک کریمانہ عمل بھی ہے۔"

(انشائیہ اُردو ادب میں ص ۸۴)

انشائیہ کی فنی ہیئتی اور موضوعاتی بحث کے ساتھ ساتھ انور سدید نے بڑی تحقیق اور محنت سے انشائیہ کے سلسلے میں ہونے والی تمام بحثوں کو سمیٹ لیا ہے اور انشائیہ پر کئے جانے والے اعتراضات کو استدلال سے رد کیا ہے۔ اس حوالے سے یہ کتاب اُردو انشائیہ کی ایک مربوط تاریخ بھی بن گئی ہے جس میں عہد بہ عہد انشائیہ کے ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے۔ رشید نثار نے بہت عمدہ بات کہی ہے۔

"اُردو ادب میں انشائیہ کی تنقید پر یہ پہلی سنجیدہ کتاب ہے جس کا انداز علمی اور محاکمہ متوازن ہے۔" (انشائیہ، انور سدید کی قلمرو

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ انور سدید نے بڑے متوازن اور استدلالی طریق سے اپنا مؤقف پیش کیا ہے۔ ان کے رواں مترنم اسلوب نے اس استدلالی رویّہ میں نیا ذائقہ اور لذت پیدا کر دی ہے۔ انور سدید خود بھی منفرد انشائیہ نگار ہیں۔ اس لئے انشائیہ کے مزاج کی تخلیقی سطح سمجھتے ہیں، وہ ان تخلیقی مراحل سے بھی آگاہ ہیں جن کے نتیجہ میں انشائیہ نگار اندر کی کائنات کی غواصی کر کے مسرت کے موتی نکال کر لاتا ہے۔ انشائیہ نگار ہونے کے باوجود انہوں نے انشائیہ کا جذباتی دفاع نہیں کیا بلکہ اپنی بات کو دلیل سے ثابت کیا ہے۔

انشائیہ آج کے عہد کی ایک اہم صنف ہے۔ مَیں اسے ایک معصوم اور غیر ریاکار صنف کہتا ہوں کہ یہ وہ صنف ہے جسے محض تکنیکی مہارت کے زور پر نہیں لکھا جاسکتا اور اس میں لکھنے والے کا علم، مطالعہ اور مشاہدہ بھی چھپا ہوا نہیں رہ سکتا۔ انشائیہ جھوٹی اور مصنوعی علمیت کا بھانڈا فوراً پھوڑ دیتا ہے۔ انور سدید نے اپنی کتاب کا اختتام اسی رائے پر کیا ہے۔

"اہم بات یہ ہے کہ اظہارِ ذات اور انکشافِ فطرت کے جو وسائل انشائیہ میں اس کی فطری لچک اور غیر رسمی طریقۂ کار کی بدولت میسّر ہیں وہ نثر کی کسی دوسری صنف میں دستیاب نہیں۔ زندگی کے بہت سے تجربے صرف انشائیہ کے توسط ہی سے آشکار کئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ بیسویں صدی کے حالیہ دور میں جب زندگی کی رفتار تیز تر ہو گئی ہے اور سائنس کے جدید انکشافات کائنات کا نیا وژن سامنے لا رہے ہیں انشائیہ کی ضرورت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کائنات کو انسان سے متعارف کرانے میں انشائیہ بہت اہم خدمات سرانجام دے رہا ہے۔"

(انشائیہ اُردو ادب میں ص ۳۰۷)

یہ بات بالکل سچ ہے کہ اس کائنات کو انسان سے متعارف کرانے میں انشائیہ بہت اہم خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ انسان کی اندرونی کائنات کو بھی، باہر کی کائنات کو بھی، مَیں اس پر اتنا اضافہ اور کرتا ہوں کہ جوں جوں کائنات کے اسرار انسان پر منکشف ہوتے جائیں گے انشائیہ کی اہمیت اور ضرورت بھی بڑھتی چلی جائے گی۔

منتخب انشائیے

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

موجودہ دور میں دیکھتے ہی دیکھتے اُردو میں انشائیہ کی صنف کو جو استحکام حاصل ہوا ہے وہ ہر لحاظ سے لائقِ ستائش ہے۔ اُردو کا دامن رنگارنگ پھولوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہماری بعض اصناف عرب و ایران سے ماخوذ ہیں تو بعض مغربی اقوام سے۔ ناول و افسانہ کی طرح انشائیہ بھی مغرب سے درآمدہ ہے۔ انگریزی ادب کی شاید ہی کوئی ایسی انتھالوجی ہو جو انشائیوں سے خالی ہو کیونکہ انشائیہ وہ صنف ہے جو شاعری اور نثر کی سرحد پر جنم لیتی ہے۔ یہ ایک طرح سے عطر مجموعہ ہے جس میں نہ صرف کئی اصناف بلکہ معاشرے کی روح بھی کھنچ کر آجاتی ہے۔ نشاۃ الثانیہ کے فوراً بعد تو ہمارے یہاں اس کا کچھ چرچا ہوا، پھر بیچ میں یہ کڑی ٹوٹ سی گئی۔ جدید عہد میں انشائیہ نگاری کو ایک "تحریک" کی شکل دینے اور پاکستان اور ہندوستان کے بہت سے لکھنے والوں کو انشائیہ کی طرف راغب کرنے میں اگر کسی واحد شخصیت کا ہاتھ ہے تو وہ ڈاکٹر وزیر آغا ہیں۔ ان کے رسالہ "اوراق" نے اس باب میں نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ حال ہی میں مکتبہ اُردو زبان سرگودھا کی جانب سے سلیم آغا قزلباش نے "منتخب انشائیے" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا ہے۔ سلیم آغا قزلباش "سرگوشیاں" کے مصنف کی حیثیت سے اُردو انشائیے کی دنیا میں اپنی تخلیقی پہچان کرا چکے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ ان کی پہلی تالیفی کاوش ہے۔ اس میں تیئیس مصنفین کے تیس بہترین انشائیے شامل ہیں۔ کتاب میں وہ تمام اہم نام شریک ہیں جو انشائیہ نگاری کی وجہ سے بھی شہرت رکھتے ہیں اور "اوراق" میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، مشتاق قمر، انور سدید، جمیل آذر، کامل القادری، احمد جمال پاشا، رام لعل نابھوی اور خود سلیم آغا قزلباش قابلِ ذکر ہیں۔ پیش لفظ میں لائق مرتب نے صنفِ انشائیہ پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے تخلیقی تقاضوں سے بحث کی ہے۔ انہوں نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ زیرِ نظر کتاب درحقیقت اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کا آغاز چند برس قبل جمیل آذر نے "بہترین انشائیے" کی اشاعت سے کیا تھا اور جس میں اُردو کے کئی خیال انگیز انشائیے شامل کیے گئے تھے لہٰذا ایک تازہ انتخاب کی بہت ضرورت تھی۔ زیرِ نظر مجموعہ بلاشبہ اس ضرورت کو بطریقِ احسن پورا کرتا ہے اور انشائیے کے نئے منظر نامے سے روشناس کراتا ہے۔ سلیم آغا قزلباش اس کے لیے ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں۔

منتخب انشائیے

ممتاز احمد خان

معروف افسانہ و انشائیہ نگار سلیم آغا قزلباش کی کتاب "منتخب انشائیے" ایک ایسے موقع پر سامنے آئی ہے جبکہ ایک طرف انشائیہ کی حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور دوسری طرف شکوک و شبہات کی وہ گرد بھی بیٹھ گئی ہے جسے اس کے مخالفین نے اڑایا تھا۔ اس کتاب میں سلیم آغا قزلباش نے اہم انشائیہ نگاروں کے انشائیے بطور اینتھولوجی یکجا کر دیئے ہیں۔ بہت سے لوگ افسانوں وغیرہ کی اینتھولوجی مرتب کر دیتے ہیں لیکن اس کے پیچھے مقصد کی وہ اہمیت نظر نہیں آتی جو ہونا چاہیئے — مگر سلیم آغا نے ایک طرف تو ایک سے ایک انشائیے یکجا کیے اور دوسری طرف اپنا پیش لفظ تحریر کر کے قاری کی انشائیہ کے سلسلے میں رہنمائی بھی کر دی۔ میرے خیال میں ان کا پیش لفظ ایک تنقیدی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔

اپنے پیش لفظ میں انہوں نے انشائیہ کے معترضین کے بہت سے اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہا گیا تھا کہ انشائیہ اردو ادب کی وہ واحد صنف نثر ہے جس کی تاحال کوئی جامع تعریف پیش نہیں کی جا سکی تو اس کے جواب میں انہوں نے بتایا ہے کہ چونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر صنف کے متعدد نئے گوشے نمایاں ہوتے رہتے ہیں اس لیے اس کی حتمی تعریف پیش کرنا ممکن نہیں البتہ اس کی پہچان کے لیے ایک ایسی تعریف ضرور متعین کر دی جاتی ہے جو اس کے خدوخال کو صحیح طور پر واضح کر سکے۔ اس سلسلے میں انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ سارا ادب مخفی حقیقت یا سچائی کی بازیابی اور باز آفرینی میں سرگرداں ہے جو نظروں سے اوجھل ہے اور جس کو ہم تلاش کرنے میں ہمہ وقت سرگرداں ہیں اور ایسا کرتے وقت جب حسن اتفاق سے "مخفی رشتے" کے تار کو مس کرتے ہیں تو لمحے بھر کے لیے روشنی کا ایک جھماکہ ہوتا ہے جس سے اس بنیادی حقیقت یا سچائی کے چند ٹوٹے ہوئے سرے ہمارے ہاتھ لگ جاتے ہیں اور اسی عمل میں انشائیہ کے سارے فن کا کمال پنہاں ہے۔

اس بات کے جواب میں کہ انشائیہ خوش حال افراد کی ذہنی عیاشی ہے انہوں نے بتایا ہے کہ ایڈیسن، اسٹیل، گولڈ اسمتھ، ولیم ہیزلٹ، ورجینیا وولف، چیسٹرٹن، لی ہنٹ وغیرہ کوئی خوش حال، جاگیردار یا مالدار نہ تھے۔ ان کے ادبی کیریئرز کی طرف توجہ کی جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ لوگ پیدائشی تخلیقی فنکار تھے۔ ایک اعتراض اٹھایا گیا کہ انشائیہ فرد کی شخصی زندگی سے متعلق ہے اور اس کو اجتماعیت سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ پیش لفظ اس کے جواب میں بتاتا ہے کہ فرد کی شخصی زندگی اور اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی اجتماعی زندگی کو الگ الگ خانوں میں بانٹنا ہی نامناسب ہے۔ کوئی فرد ایسا نہیں کہ جو باہر کی اجتماعی زندگی سے منقطع ہو کر زندہ رہ سکے۔ فرد کی ذات کے آئینے میں باہر کی پوری دنیا منعکس ہو رہی ہوتی ہے۔ درحقیقت انشائیہ نگار بھی اپنی ذات کے حوالے سے سارے عالم کو دیکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بڑی گڑبڑ کو سلیم آغا نے رفع کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر بہت سے مزاح یا طنز نگار اپنے آپ کو انشائیہ نگار کہلوانے پر مُصر ہیں۔ اس سلسلے میں یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

"بعض حضرات اپنی طنزیہ، مزاحیہ تحریروں کو انشائیہ تسلیم کروانے اور خود کو انشائیہ نگار کہلوانے پر بضد نظر آتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

آخر وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ اس کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان حضرات کے اذہان میں مزاحیہ مضمون اور انشائیہ کا فرق واضح نہیں ہے۔ ایسی باتیں کرنے والے صاحبان طنزیہ، مزاحیہ مضمون اور انشائیہ کو اس طرح گڈمڈ کرنا چاہتے ہیں کہ تینوں اصناف کی اپنی کوئی علیحدہ شناخت ہی باقی نہ رہے۔ دوسری وجہ نفسیاتی ہے وہ یہ کہ بعض طنز و مزاح لکھنے والے قلم کار غیر شعوری طور پر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ انشائیہ طنزیہ، مزاحیہ مضمون کے مقابلے میں ایک برتر اور ارفع چیز ہے لہٰذا ان کی شب و روز یہی کوشش ہے کہ وہ کسی نہ کسی طور خود کو انشائیہ نگار کی حیثیت سے منوا سکیں۔ ان اصحاب کو یہ احساس دلانے کی ضرورت ہے کہ ادب میں طنز و مزاح کا اپنا ایک مقام ہے۔"

آگے چل کر سلیم آغا نے غالب، سرشار، سجاد حیدر یلدرم، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، رشید احمد صدیقی، شفیق الرحمن، عطاء الحق قاسمی، مشکور حسین یاد اور دیگر کئی ادبا کے نام گنوانے کے بعد ایسے لوگوں کو مشورہ دیا ہے کہ اگر وہ بھی ان لوگوں کی روایت کے ساتھ منسلک ہو جائیں تو یہ ان کے لیے فخر کی بات ہوگی۔ جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا تھا کہ اس "پیش لفظ" کی ایک اہمیت ہے تو وہ مندرجہ بالا بحث اور اقتباس سے واضح ہو گئی ہوگی۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ تحریر اپنی پہچان خود ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو پڑھواتی ہے لیکن اس حقیقت کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ تنقیدی تحریریں بھی تخلیقی تحریروں کو پڑھواتی ہیں۔ جب انشائیہ نے زور باندھا تو اس کے بڑے بڑے مخالفین و معترضین پیدا ہوئے اس موقع پر وزیر آغا صاحب اور دوسرے چند لوگوں نے انشائیہ کے سلسلے میں مضامین تحریر کر کے اس کے حق میں راہ ہموار کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب اس کا وسیع حلقہ پیدا ہوا ہے جو اسے شوق سے پڑھتا ہے۔ اور دوسرا فرق یہ بھی پیدا ہوا کہ افسانہ نگاروں اور ناقدین نے انشائیے تحریر کیے جن میں انور سدید، جمیل آذر، مشتاق قمر، تقی حسین خسرو، سلیم آغا قزلباش، مشرف احمد وغیرہ شامل ہیں۔ اور یہ قافلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

اس کتاب میں چوبیس انشائیہ نگاروں کے انشائیے شامل ہیں جن میں نمایاں نام وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، انور سدید، مشتاق قمر، کامل القادری، جمیل آذر، احمد جمال پاشا، اکبر حمیدی، مشرف احمد، بشیر سیفی، رام لعل نابھوی کے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دیگر نام غیر اہم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مجموعے میں ہر نام اپنی جگہ اہم ہے اور ان کے جو انشائیے پیش کیے گئے ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ خود سلیم آغا قزلباش نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ہر وہ انشائیہ اس کتاب میں دیا جائے جو پڑھنے والوں پر اثر کرے اور تخلیقی سطح پر بھی وہ اہم ہو۔ در اصل انشائیہ نے جو اپنے قدم جمائے ہیں اس میں اس کے تخلیقی ہونے کے وصف کو بڑا دخل ہے۔ ورنہ یہ صنف شروع ہی میں مر گئی ہوتی۔ تخلیقیت اور اپنے آپ کو پڑھوانے اور اشیا اور مظاہر میں سے معنی کی تہہ اور تہہ میں سے مزید تہوں کا برآمد ہونا کہ جن میں تمام عمرانی، نفسیاتی، معاشی، سائنسی اور فلسفیانہ حکمت کے گوشے چھپے ہوتے ہوں انشائیہ کے فروغ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جب یہ گوشے سامنے آتے ہیں تو زیر لب مسکراہٹ جنم لیتی ہے۔ انسانی کمزوریوں کو پڑھ کر اس سے اور بھی محبت کرنے کو طبیعت راغب ہوتی ہے اور زندگی بحیثیت مجموعی اور کائنات بھی ہمارے لیے قوت بخش اور جمالیاتی حظ کا وسیلہ دکھائی دینے لگتی ہیں۔ کسی بھی صنف ادب سے یہ توقع کہ وہ زندگی کو حسین بنا کر پیش کرے، مایوسی، جہالت اور بے معنویت پر ایسا پردہ ڈالے کہ اشیا اور انسان کو ہم اس 'حیرت' سے دیکھیں جو کہ بچے کی 'معصوم حیرت' کہلاتی ہے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ وہ صنف انسانی فطرت سے انتہائی قریب ہے اور اس کا فروغ اس پُر مصائب دنیا میں زندگی کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں چند انشائیوں کا تذکرہ کرنا از بس ضروری ہو جاتا ہے۔

"بارہواں کھلاڑی" وزیر آغا صاحب کا مشہور انشائیہ ہے۔ ایک عام آدمی کے ذہن میں بارہویں کھلاڑی کی محض اتنی اہمیت ہے کہ وہ اپنے باقی گیارہ کھلاڑیوں کی خدمت کرتا ہے۔ اور جب کوئی کھلاڑی میدان سے چلا جاتا ہے تو اس کی جگہ متبادل کھلاڑی کی حیثیت سے فیلڈنگ کرتا ہے۔ مگر آغا صاحب نے اپنے تخیل کی مدد سے اسے ایک قسم کا صوفی تک بنا دیا ہے۔

"بارہواں کھلاڑی ایک صوفی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ دنیائے رنگ و بو، یہ ہر لحظہ بدلتا ہوا جیون، یہ شادیانے، پٹاخے، چیخیں اور قہقہے یہ سب کچھ بے معنی ہے یہ کرکٹ کے میدان میں بنائی جانے والی اور بعد ازاں نامۂ اعمال میں لکھی جانے والی وکٹیں، کیچ اور سنچریاں محض ایک فریبِ نظر ہے۔"

ایک دوسری جگہ بارہواں کھلاڑی ایک مردِ آزاد ہے!

"دوسری طرف بارہواں کھلاڑی ایک مردِ آزاد ہے۔ اس کی بلا سے اگر ٹیم ہارے یا جیت سے سرفراز ہو۔ اگر خدانخواستہ ٹیم جیت گئی تو اس کے گلے میں کوئی ہار پہنانے نہیں آئے گا اور اگر ٹیم ہار گئی تو اس سے کوئی باز پرس نہیں کرے گا۔"

انور سدید کا انشائیہ "چھینک" پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ انہوں نے چھینک کو جبری چھینک اور فی البدیہہ چھینک میں تقسیم کیا ہے۔

"اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ فی البدیہہ چھینک جو مقام رکھتی ہے وہ ناک میں مصنوعی سرسراہٹ پیدا کر کے جبری طور پر بیدار ہونے والی چھینک کو حاصل نہیں۔ اوّل الذکر تخلیقی آمد کا نتیجہ ہے اور موخر الذکر آورد کا جبری شاخسانہ۔"

پروفیسر جمیل آذر کا انشائیہ "اخبار پڑھنا" اپنے موضوع سے متعلق قاری کو نئی نئی دنیا کی سیر کراتا ہے۔ ذرا یہ اقتباس دیکھئے۔

"اخبار تمام قیود و حدود کو پھلانگ کر متنوع موضوعات و مضامین کے پھول آپ کے قدموں میں ڈال دیتا ہے۔ آپ چاہیں تو سیاسی خبریں اور تبصرے پڑھ کر محلے کے سب سے بڑے سیاست دان بن جائیں یا فکاہیہ نگارشات پڑھ کر خواہ مخواہ مرعوب دھار لیں یا ادبی ثقافتی مضامین پڑھ کر دانشورانہ لہجہ اختیار کریں۔"

غلام جیلانی اصغر بہت خوبصورت انشائیے لکھتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے اپنے موضوع میں ڈوب جاتے ہیں۔ ان کے انشائیہ "سوال اٹھانا" سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

"ادب میں سوال اٹھانے کا رواج خاصا پرانا ہے۔ ایک دفعہ چنگیز خان یعنی خانِ اعظم کے دربار میں ایک شعر پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ اس میں شتر گربہ کا احتمال پایا جاتا ہے۔ خانِ اعظم عملی تنقید کے مکتب سے تعلق رکھتا تھا اس نے فوراً اپنی تیغ آبدار سے شاعر کو دو ٹکڑے کر کے شتر اور گربہ کو الگ کر دیا اور فرمایا کوئی اور سوال؟"

مشرف احمد کا "قرض" اس موضوع کی تہہ میں سے اتنی تہیں برآمد کرتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ فقرے دیکھئے۔

"میں قرض حاصل کرنے کو فنونِ لطیفہ میں شمار کرتا ہوں۔"

"قرض دینے اور قرض لینے والا دونوں ہی ایسے زور آور حریف ہوتے ہیں جو اپنا اپنا جوہر دکھانے کے لیے ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوتے ہیں۔"

"قرض لینے کی کوشش میں مجھے ڈرامے کے اداکار کی مانند بننا پڑتا ہے۔"

احمد جمال پاشا "بے ترتیبی" کو ترتیب کے شعور کا وسیلہ مانتے ہیں۔

"بے ترتیبی زندگی میں ترتیب کا شعور عطا کرتی ہے میں کتنے لوگوں کو روزانہ حواس باختہ دیکھتا ہوں۔ ان کی چول بھی سیدھی نظر نہیں آتی لیکن جب ان کے گھر جائیے تو حیرت میں پڑ جائیے کہ وہ کتنی باقاعدہ سجی سجائی، دھلی دھلائی اور ڈرائی کلین زندگی گزار رہے ہیں۔"

اسی طرح سلیم آغا قزلباش "بھول جانا" میں عجیب نکات ڈھونڈ کر لائے ہیں۔

"بھول جانا ایک فطری عمل ہے یہ ایک ایسی کیفیت ہے جس میں بڑے بڑے صوفی اور گیانی دھیانی تمام عمر سرتا پا ڈوبے رہے۔"

"داستانِ آدم خاکی کو ذرا یاد کیجیے کہ اس تمثیل کا پہلا ایکٹ ہی آدم و حوّا کی رومان پرور بھول سے شروع ہوتا ہے۔"

"آپ نے دیکھا ہوگا کہ پروفیسر صاحبان اکثر غیر حاضری کا ثبوت دیتے ہیں جو اصل میں بھول جانے کی طرف پہلے قدم کے مترادف ہے۔"

دراصل سلیم آغا قزلباش کا یہ انتخاب دوسرا انتخاب ہے۔ اس سے قبل پروفیسر جمیل آذر صاحب بھی ایک مجموعہ ترتیب دے چکے تھے۔ میرا خیال ہے اس قسم کے "انتخاب" آتے رہنا چاہیئے تاکہ لوگ انشائیہ کی رفتار سے واقف ہوسکیں

مغرب میں ایک بار یہ شور اٹھا تھا کہ انشائیہ نہیں چلے گا لیکن لوگوں نے دیکھا کہ وہاں آج تک انشائیے لکھے جا رہے ہیں اور اشیا، مظاہر اور انسانی فطرت کے مخفی گوشوں کو موضوع بنایا جا رہا ہے اسی لیے اُمید کی جا سکتی ہے کہ اُردو زبان میں بھی انشائیہ روز بروز ترقی کرے گا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انشائیہ کے خدوخال یہی رہیں گے؟ کیا مختلف انشائیہ نگاروں کی تحریریں آنے والے دنوں میں اسلوبی اور تیکنیکی تبدیلیاں پیش نہیں کریں گی؟ میرا خیال ہے کہ انشائیہ میں موثر اور قابلِ قبول تبدیلیاں ضرور پیدا ہوں گی۔ ہم آنے والے دَور میں ایک بڑے سائنسی مدار میں داخل ہوں گے، ہماری سوچ تبدیل ہوگی۔ ہمارا معاشرہ نئی ڈگر پر چلے گا اور ہوسکتا ہے کہ خود انشائیہ پر بیرونی ادب کے اثرات نمایاں ہوں اور اس میں تبدیلی پیدا ہوتی چلی جائے۔ بہر صورت بہت سے سوالوں کے جواب وقت دے گا۔ فی الحال اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ وقت انشائیہ کے فروغ کا دَور ہے اسے خوب مقبولیت حاصل ہو رہی ہے اور اس فروغ میں سلیم آغا قزلباش کی کتاب "منتخب انشائیے" کا بھی حصّہ تسلیم کیا جائے گا۔

غلام جیلانی اصغر

مَیں اور مَیں

(بانکی غزلوں اور سجیلی نظموں کا پہلا مجموعہ)

قیمت ڈی لکس: ۴۵ روپے

عام: ۳۵ روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ اُردو زبان سرگودھا

آم کے آم

انور سدید

ادب کی طرف رام لعل نابھوی کی پیش قدمی کا قصہ بھی عجیب ہے، وہ جب نوجوان تھے تو زندگی کا مشاہدہ اور سرکار کی ملازمت کرتے رہے لیکن جب ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو انہوں نے ادب کو اپنی زندگی کی سب سے با معنی سرگرمی بنا لیا، اسی دور میں انہوں نے زندگی بھر کے مشاہدات پر نظر ڈالی تو کئی بوالعجبیاں ان پر آشکار ہوتی چلی گئیں اور وہ ان پر بے اختیار قہقہہ زن ہو گئے، یہ ان کا کرم ہے کہ انہوں نے جو قہقہے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں لگائے تھے ان کو خود اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان تبسم پاروں کو الفاظ کا جامہ بھی پہنا دیا اور پھر انہیں "تبسم" کے عنوان سے کتابی صورت بھی دے دی۔

مزاح کی تخلیق رام لعل نابھوی کی زندگی کا موڑ نہیں بلکہ یہ وہ لمبی سڑک ہے جس پر نابھوی صاحب عمر بھر سفر کرتے رہے، پہلے وہ مضحکہ واقعات و حادثات کو دیکھ کر بس خاموش ہو جاتے تھے، اب وہ ان واقعات کو ضبطِ تحریر میں بھی لانے لگے اور ان مزاحیہ تصویروں کو دیکھنے کا موقعہ عوام کو بھی دینے لگے۔ ہمارے ہاں مزاحیہ نگاری بذاتِ خود فن کی ایک منزل ہے، اور بیشتر ادیب اسی میں طمانیت محسوس کرنے لگتے ہیں لیکن رام لعل نابھوی کا مقصد قہقہہ بیدار کرنا اور عوام کی ہنسی کو برانگیختہ کرنا نہیں تھا، وہ تو انسان کو اپنے مشاہدات کی حسین لطافتوں اور لذت انگیز حیرتوں میں شریک کرنے کے آرزومند تھے، چنانچہ ان کے داخل میں جو آسودہ فکر انشائیہ نگار سو رہا تھا وہ ایک روز اچانک بیدار ہو گیا۔ اور ہم نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک "پوسٹ کارڈ" تھا جو بظاہر دبیز سے مٹیالے رنگ کے کاغذ کا ایک مستطیل سا ٹکڑا تھا لیکن وہ اس کے داخل سے ایک زندہ شخصیت کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اور وہ کہہ رہے تھے کہ

> "پوسٹ کارڈ بہت مسکین طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اسے شرارت سوجھ جاتی ہے، پھر وہ سفر کرنے کی سوچتا ہے اور میز پر سے کھسک کر دوسرے تھیلے میں چلا جاتا ہے۔ ملکوں ملکوں نہ سہی شہروں شہروں گھومتا ہے، مختلف ڈاکخانوں کی سیر کرتا ہے۔ اِدھر وہ کھسکا، اُدھر انکوائری شروع ہو جاتی ہے۔ شرارت تو پوسٹ کارڈ کی ہوتی ہے، پھنس جاتے ہیں ڈاکخانے کے ملازم۔ پوسٹ کارڈ سب دیکھ رہا ہوتا ہے، اسے کوئی سزا نہیں ملتی۔ وہ تو چُپ چاپ تماشا دیکھتا ہے۔ یہ اس کی توانائی ہے!"

میں رام لعل نابھوی کے انشائیوں کا شاید سب سے پرانا قاری ہوں۔ وہ جب ملازمت سے ریٹائر ہو کر اپنے گھر چلے گئے تو یونہی ایک بے نام سی خواہش پیدا ہوئی کہ اب رام لعل نابھوی کو بھی مونتین ہی کی طرح لمحہ فراغت حاصل ہے اور وہ اپنے ڈرائنگ روم کے صوفے پر دھوتی باندھ کر اور حقہ سلگا کر اپنے حاصلِ حیات پر طائرانہ اور غائرانہ نظر ڈال سکتے ہیں، اپنے ساتھ خود کلامی بھی کر سکتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ اپنی اس ڈھیلی ڈھالی، آزاد فکر اور آوارہ خرام خود خیالی کو لکھنے پر آمادہ ہو جائیں اور ہمیں بھارت سے ایک انشائیہ نگار مل جائے، اب میں یہ نہیں سمجھتا کہ یہ لمحہ دعا کے مستجاب ہونے کا لمحہ تھا یا رام لعل نابھوی کے داخل سے انشائیہ نگار بوتل کے جن کی طرح نکلنے کے لیے بے تاب ہو گیا تھا کہ مجھے ان کا پہلا انشائیہ ملا۔ میں نے پڑھا تو سب سے پہلے سجاد نقوی کو اطلاع دی، انہوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کو بتایا اور پھر آپس میں ہم نے مسرت کا باہم اظہار کیا کہ نابھہ جیسے دور افتادہ مقام پر ایک شخص ڈاکٹر جانسن کی متعین کردہ حدود کو نہ صرف قبول کر رہا ہے بلکہ ایسے انشائیے لکھ رہا ہے جن میں خیال کو کروٹ مل جاتی ہے۔ حقیقت ایک نئے مدار میں سفر کرنے لگتی ہے اور قاری حیرت سے دیکھنے لگتا ہے کہ حقیقت کی تصویر کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

"آم کے آم" رام لعل نابھوی کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ ہے، اس میں سولہ متنوع انشائیے اور ایک ابتدائیہ شامل ہے۔ میں ان میں سے بیشتر انشائیوں کو مختلف رسائل میں پڑھ چکا ہوں، لیکن اب یہ انشائیے کتابی صورت میں سامنے آئے ہیں تو انہیں دوبارہ پڑھ کر لطف مکرر کے مزے سے

گزرا ہوں۔ رام لعل نابھوی کی خوبی یہ ہے کہ وہ دوستوں کو اپنی خلوت میں داخل ہونے کا موقعہ دیتے ہیں تو محض قہقہوں کو ہی نہیں نکھارتے بلکہ ان کے ساتھ برابر کی سطح پر تبادلۂ خیالات بھی کرتے ہیں۔ باہمی گفتگو کے اس مرحلہ پر ہی ان کے ہاں انشائیہ تخلیق ہوا ہے۔ "مسکرانا" "انتظار" "پوسٹ کارڈ" اور "حیرت" وغیرہ انشائیے رام لعل نابھوی کے فن کی نمائندہ مثالیں ہیں۔ وہ ایک اچھے مزاح نگار کی طرح حقیقت کا معروضی زاویہ پیشِ نظر رکھتے ہیں تو اپنی تازہ کاری سے پڑھنے والوں کو حقیقت کی موضوعیت سے بھی آشنا کرا دیتے ہیں۔ چنانچہ جمیل آذر نے ان کے انشائیہ "انتظار" کو خیال کا غنائیہ قرار دیا ہے۔ یہ غنائیہ چھوٹے چھوٹے متوازن جملوں سے مرتب ہوا ہے۔ اور کومل لہروں کے متوازن بہاؤ سے ایک فرحت انگیز اور لذت افزا کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

"انتظار شعلے کی طرح لپک کر ختم ہو جاتے تو آپ مسکرا اٹھتے ہیں۔ انتظار گیلی لکڑی کی طرح سلگنے لگے تو آپ کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں، آپ اپنی مٹھیاں بھینچ لیتے ہیں، رنج اور غم میں ڈوبے ہوئے اور غصہ میں بھرے آپ کے کانوں کی لویں سرخ ہو جاتی ہیں، آپ ٹیلی فون کا چونگا بار بار اٹھاتے ہیں، سگرٹوں کے مرغولے ہوا میں چھوڑتے ہیں، کمرے میں بے چینی سے گھومتے ہیں اور پیر پٹختے ہیں، کبھی کرسی سے صوفے پر اور کبھی صوفے سے موڑھے پر جا بیٹھتے ہیں۔ انتظار کونے میں کھڑا مسکراتا رہتا ہے، آپ انتظار کرتے جائیں، انتظار یہی تو چاہتا ہے۔"

(انشائیہ "انتظار")

رام لعل نابھوی کے انشائیوں میں عدم کو حقیقت سے ثابت کرنے کا رجحان نمایاں ہے، وہ ان گوشوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں جہاں نان جویں کے غلاموں کی نظر نہیں جاتی، وہ سچ کے پردے سے ایک اور سچ کو اجاگر کرتے ہیں اور پھر اس پر قاری کو انکشاف مسرت سے آشنا بھی کرتے ہیں چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

"دنیا میں دو حقیقتیں ہیں، روشنی اور تاریکی۔ خیر و شر۔ سایہ تاریکی کا ایجنٹ ہے، جب تاریکی میں جاتا ہے تو اس میں ضم ہو جاتا ہے اور نظر نہیں آتا، روشنی ہو تو نظر آتا ہے، مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ روشنی میں کوئی چیز بھی ہو۔ در اصل سایہ شے کے بطن میں ہے۔ شے تاریکی میں رہے تو یہ باہر نہیں آتا، روشنی میں آئے تو باہر آجاتا ہے۔"

(سایہ)

"حیرت کا حملہ تین قسم کا ہوتا ہے۔ معمولی، سخت، بھرپور —— پہلی حالت میں آنکھ نصف کھلتی ہے۔ منہ نصف کھلتا ہے۔ ہاتھ اوپر اٹھ جاتے ہیں، کچھ لمحوں کے بعد انسان اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے، دوسری صورت میں آنکھیں پوری کھل جاتی ہیں، منہ ایک غار بن جاتا ہے، چہرے کی جلد میں تناؤ آجاتا ہے، مگر لمحہ بعد انسان اپنی اصل حالت پر آجاتا ہے، تیسری حالت میں آنکھیں جب ایک بار کھلتی ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب بند نہیں ہوں گی، دہن مبارک کھلتا ہے تو لگتا ہے کہ کچھ بھی ہو یہ اسی طرح کھلا رہے گا۔ پورا جسم ایک لمحہ کی نوک پر آکر ٹھہر جاتا ہے۔ یہ جارحانہ حیرت ہے۔ اگر اس حیرت کی زد میں آیا ہوا شخص پڑنگ کے نیچے سے اٹھنے میں کامیاب نہ ہو تو جسمانی سطح پر نروان حاصل کر لیتا ہے۔"

(حیرت)

"گالی جب آنا چاہتی ہے بلا روک ٹوک آجاتی ہے، جب جانا چاہتی ہے بلا کسی سے پوچھے چلی جاتی ہے، جتنی دیر ٹھہرنا چاہے ٹھہر جاتی ہے چاہے معمولی لڑائی کرادے، چاہے سر پھڑوا دے ..... گالی محبت اور نفرت دونوں سے پیدا ہوتی ہے، محبت کی گالی میں دعا، تعریف ہوتی ہے، خلوص ہوتا ہے، ہلکی سی سرزنش ہوتی ہے۔ نفرت میں بد دعا اور مذمت ہوتی ہے۔"

آپ نے دیکھا کہ یہ سب ٹکڑے حقیقی زندگی کی قاشیں ہیں لیکن یہ غیر ہضم مواد نہیں۔ رام لعل نابھوی نے جیسا ایک کنارے پر کھڑے ہو کر دوسرے کنارے کا منظر دکھایا ہے اور یوں زندگی کے خواب کو ایک نئی تعبیر دے دی ہے۔ یہی اس کا فن ہے اور اس فن کو رام لعل نابھوی نے اپنی فطری حیرت سے کچھ اور بھی لطف انگیز بنا دیا ہے۔ انشائیوں کی یہ کتاب ڈاکٹر وزیر آغا کے نام معنون ہے، ابتدا میں انشائیہ کے فن پر بحث کی گئی ہے جو نفسِ خیال افروز ہے اور انشائیہ کی بحث کو معنی خیز انداز میں قاری کے سامنے لاتی ہے۔

ذکر اُس پری وش کا

جوگندر پال

مَیں نے انور سدید کے انشائیوں کی کتاب "ذکر اُس پری وش کا" پڑھ لی ہے۔ مَیں نے یہ دو روز انور سدید کی رفاقت میں ہی بتائے ہیں اور بڑی سبک روشنیوں میں سے گزرنے کے احساس سے معمور ہوں۔ بعض نہایت باریک باتیں وہ ہنستے کھیلتے کیے جاتے ہیں اور ان کی اس ذہنی رو کے پُر پیچ راستوں میں ان کا قاری بھی سیٹیاں بجاتے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ چلا جاتا ہے۔ ہاتھ خوب پکا نہ ہو تو انشائیے کی کج کلاہی میں وہ زاویے ظہور میں نہیں آتے جن سے اس کا بانکپن عبارت ہے۔ میرا خیال ہے کہ انور سدید نے اپنے مشاہدہ، مطالعہ اور ریاض سے انشائیے کے غیر رسمی پیرائے پر بڑی عمدگی سے قابو پا لیا ہے۔ بعض اچھا لکھنے والے ـــــ اپنی دیگر خوبیوں کے باعث اچھا ـــــ ترجیحاً باقاعدہ ـــــ اور بھاری بھر کم ہوتے ہیں اور اس طرح انشائیے کی مقامی لطافت سے تقریباً عاری۔ ایڈیسن کو ہی لیجیے، حالانکہ وہ بہت پتے کی باتیں کہہ جاتا ہے۔ تاہم انشائیے کو اتنا جواب دہ اور کار آمد بنا لیا جائے تو انشائیہ نگار میں وہ کھلنڈری سی اُپچ پیدا ہونے سے رہ جاتی ہے جس کی بدولت قاری بڑے مزے سے اس کے ساتھ بیٹھا رہے اور بظاہر کچھ نہ سیکھتے ہوئے بھی اس کی نظر کھلتی چلی جائے۔ انشائیہ "اونگھنا" کے اس ٹکڑے میں ایڈیسن کی "جواب دہی" کو قبول نہ کر کے انور سدید نے انسانی کی سنجیدگی میں کتنا پیارا رنگ گھول دیا ہے۔

"سفر ہی کو لیجیے، اس سے زیادہ متحرک اور کون سا فعل ہے۔ بیل گاڑی، اونٹ گاڑی، گدھا گاڑی، ریل، تانگے یا بس کے ساتھ ہی انسان ہمہ تن متحرک ہو جاتا ہے۔ بظاہر ایسی حالت میں اونگھنا ممکن فعل نہیں رہتا۔ لیکن باور کیجیے کہ اونگھ اور سفر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب تھکا ہارا مسافر اپنے سامان کی گٹھڑی کلینر کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنے آپ کو بس کی بھدّی اور بدبودار سیٹ کے حوالے کر دیتا ہے اور بس ایک لمبی کراہ کے ساتھ اطراف و جوانب کے خوردہ فروشوں پر اپنی نفرت کا کثیف دھواں چھوڑ کر چل پڑتی ہے تو واماندہ جسم کے تمام خفتہ اوسان مائل بہ سکون ہونے لگتے ہیں، بس چھوٹے موٹے گڑھوں کو عبور کرتی، ہچکولے کھاتی آگے بڑھتی ہے اور مسافر کا ذہن وقت کی گردش کو روک کر پیچھے کی طرف بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ تمام بھولی بسری باتیں، پھوہڑ بیوی پر چلائے ہوئے حکم اور جابر افسر کی گھرکیاں بچوں کی چنچل شرارتیں اور دوستوں کی عداوتیں، دفتر کی فائیلیں اور گھر کی ٹائیلیں سب ایک ایک کر کے یاد آنے لگتی ہیں، آنکھوں کے پپوٹے بھاری اور سر بوجھل ہونے لگتا ہے۔ یہی وہ وقت ہے جب انسان پر عرفان کی دولت نچھاور ہونے لگتی ہے۔ پھر وہ زرّیں لمحہ آ جاتا ہے جب

بس ایک روح فرسا جھٹکے کے ساتھ رک جاتی ہے۔ سواریوں کی آنکھیں مُند جاتی ہیں، سامنے ایک تناور درخت عجز و انکسار سے سرنگوں ہوکر بس کی کھڑکی سے اندر گھس آتا ہے۔ اور گیان کا وہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے جس کے حصول کے لیے گوتم بدھ نے ساری زندگی صرف کر ڈالی تھی۔

اُونگھ اک ماندگی کا وقفہ ہے　　　یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

انور سدید کا انشائیہ "دسمبر" مجھے بے حد پسند آیا۔ اس انشائیہ کا یہ ٹکڑا پڑھیئے

"دسمبر آتا ہے تو کسی مہمان کی طرح کال بیل CALL BELL کو دبا کر اپنی آمد کا اعلان نہیں کرتا بلکہ ایک شریر بچے کی طرح پائیں باغ کی دیوار پھاند کر پہلے گھر کے صحن میں آتا ہے۔ پھر برآمدے میں پلاسٹک کی بُنی ہوئی کرسی پر آکر بیٹھ جاتا ہے۔ میری بیوی اس کے مخصوص قدموں کی چاپ پہچانتی ہے۔ وہ جلدی سے آتشدان میں آگ جلا کر کرسیوں کو اس کے گرد نصف دائرے میں ڈال دیتی ہے۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی میز رکھ دیتی ہے۔ اس میز پر جاپ اگلتی نوبیا ہتا۔۔۔ لیڈی لپٹن ٹی کوزی کا گھونگھٹ اوڑھے ہمہ تن اشتیاق بنی منتظر ہوتی ہے۔ سامنے چاندی کی چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں پستہ، بادام اور کشمش آجاتے ہیں۔ ہم سب افرادِ خانہ جو گزشتہ گرمیوں میں جزواً جزواً اکائیوں میں بٹ گئے تھے اب ایک دوسرے کے اتنے قریب آجاتے ہیں جیسے کٹی ہوئی پھانکیں دوبارہ تربوز میں سما گئی ہوں۔ دروازہ آہستگی سے کھلتا ہے۔ دسمبر کمرے میں آجاتا ہے۔ بیوی آتشدان کے کوئلوں کو انگیخت دینے لگتی ہے، بچے سمٹ کر میرے اور قریب آجاتے ہیں اور دسمبر ہمارے وسط میں کسی بے تکلف دوست کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ اسے ذرا سی اجنبیت بھی محسوس نہیں ہوتی، وہ ہمارے ساتھ یوں گھل مل جاتا ہے جیسے ہمارا اٹوٹ انگ ہو اور تین سو دنوں کی غیر حاضری اور موسموں کی کانا پھوسی نے اس رشتے میں مغائرت اور غلط فہمی کی کوئی خلیج حائل نہ کی ہو!"

اس سارے پیراگراف میں دسمبر کا مہینہ مثالی انشائیہ کے "کھلنے کار" کے انداز میں ایک شعری شاخ پر جھولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

"تاروں بھری رات" میں بعض لمحات کی پرواز کی دید پر سوچیں جگنو ہو گئی ہیں۔ میرے خیال میں افسانے کی مانند انشائیے میں بھی کوئی سچوایشن (SITUATION) اس وقت تک نمود رو نہیں ہوتی جب تک کہ لوکل تناظر کی پیش کش کا اسباب نہ ہو۔ مثال کے طور انشائیہ "جھوٹ سچ" کا آخری حصہ ملاحظہ کیجئے۔

"کل صبح جب میں اپنے منجھلے بیٹے کی انگلی تھامے پائیں باغ میں سیر کے لیے گیا تو دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی بوسیدہ لباس پہنے، دبیز چشمہ لگائے موٹی سی سفید چھڑی ہاتھ میں لیے دسلی روش پر ٹہل رہا تھا۔ اس کی راہ میں بے شمار کانٹے پڑے تھے لیکن اس کے قدم لغزیدہ نہیں تھے میں اسے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا اور سامنا ہوتے ہی خوشی سے بے دم ہو گیا۔

"ارے! یہ تو میرا محسنِ دیرینہ ۔۔۔ بوڑھا سچ ہے!"

میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور میں لپک کر اس سے بغلگیر ہو گیا۔ اسی لمحے میرے بیٹے نے اپنی انگلی چھڑائی اور یہ کہتے ہوئے گھر بھاگ گیا۔ "ابو! یہ تو ہمارا ہیڈ ماسٹر ہے!"

انہیں SPECIFICS کے تانے بانے کا اعجاز ہے کہ "فائیل" کا اشاراتی بیان تصوراتی گورکھ دھندے میں اُلجھنے کی بجائے "یہ ہے ہی لوں کے مانند راست اور تیکھا ہے۔

اس کتاب میں انور سدید کے انشائیے ایک ساتھ پڑھ کر جی خوش ہو گیا ہے۔

ف　انشائیہ - ذکر اس پری وش کا "کا موضوع فائیل" ہے۔

آپس کی باتیں

جوگندر پال

میں نے نئے "اوراق" میں نظم "اندر کے رونے کی آواز" پڑھی، واقعی جی خوش ہوگیا۔ دھرتی کی باطنی آگ کے باوصف ــــ نہیں آگ کے باعث دھرتی کے خارج کی ریل پیل کا سماں باندھ کر شا : سائینسی حقائق کی واردات کو بڑی کھری، بڑی متحیر کن شعری اسراریت سے برتا ہے اور اس طرح شخصی افسردگی کی نشاط آفریں روحانی توجیں پالی ہیں۔

فضا ابنِ فیضی

اس بار آپ نے اپنے اداریہ میں عالمی ادب کی بنیادی جہت اور مزاج کی نشاندہی سے متعلق سوالنامہ مرتب کرتے ہوئے اس کا جو جواب متعین کیا ہے یعنی "تیز تبدیلیوں کا ادراک" وہ اپنی جگہ بڑا معنی خیز ہے اور اپنے محرکات و ترجیحات کا احاطہ کرنے میں کامیاب ہے۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری نے "اقبال کی نظموں کے ساختیاتی پہلو" پر بحث کی ہے۔ ہرچند کہ ان کے دلائل منطقیانہ قوت رکھتے ہیں لیکن اخذِ نتائج کا جہاں تک سوال ہے ان کے مرتب کردہ ثمرات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ترجمہ کے باب میں بعض تصریحات پر مبنی، مرزا حامد بیگ کا مضمون (یلدرم، منٹو اور فیض) بڑا دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ بعض ادبی و تاریخی حقائق و واقعات کی نقاب کشائی کے سیاق میں یہ مضمون، بہتوں کے لیے سامانِ عبرت بھی ثابت ہوگا ــــ ریاض صدیقی نے اسلوبیات کے دقیق موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور بڑے انہماک اور چابکدستی سے اپنے موضوع کی پیچیدہ پرتیں کھولی ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ "معنوی اور تکنیکی اعتبار سے مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا شبلی کو نقاد تسلیم کرنا زیادتی ہے۔" میرے خیال میں یہ ادعائیت ان بزرگ پیشرو نقادوں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ ادب اور تنقید کی ہر جہت، کروٹ اور اس کی معنویت کو اس کے اپنے عہد کے تناظر میں دیکھنا چاہیئے۔ اس کا اعتراف نہ کرنا غیر منصفانہ بات ہوگی کہ شبلی، حالی اور مولانا محمد حسین آزاد نے اردو تنقید کا ایک معیار قائم کیا جس سے اردو ادب میں زندگی کو فروغ ملا، اور فکری و فنی تجربات کے لیے بہتر فضا میسر آئی۔ اور اس ساز گار ماحول میں اردو نظم و نثر نے اپنے سفرِ ارتقاء کے اگلے مراحل طے کیے ــــ رشید قیصرانی کی نعت (تو رنگ، تو نمو کہ ترا نام روشنی) نے روح کے تمام گوشے منور کر دیئے۔ انور سدید کی نعت (یہ چاند، چہرۂ اقدس کا جھول ہو جیسے) پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ دُور کہیں حرا کا دریچہ کھل گیا ہو اور کائنات پر رنگ و نکہت کی بارش ہو رہی ہو۔ شہباز نقوی کی حمد بھی بڑی پاکیزہ ہے۔ صلاح الدین پرویز کی نظم (ایک التجا بصرا خط اللہ تعالیٰ کے نام) اپنے موضوع کی نزاکت و طہارت کے سیاق میں اپنے طرز کی انوکھی چیز ہے۔ محمد امین، نصیر احمد ناصر، بشیر سیفی اور اظہر ادیب کے "ہائیکو" نے لطف دیا۔ جاپانی ادب کی اس صنف

پر اُردو شعراء نے کم توجہ دی ہے، حالانکہ اس میں بھی شعری اظہارات کے خاصے امکانات موجود ہیں۔ علی محمد فرشی کے "ضمیمہ" نے براہِ راست دل کے تاروں کو چھیڑا۔ وزیر آغا کی نظم "اندر کے رونے کی آواز" خارجی انسلاکات کے وسیلے سے، داخلی تجربے کے بامعنی اور فنکارانہ اظہار کا بیش بہا نمونہ ہے۔ اور اس نظم کا یہ ٹکڑا تو بے حد خوبصورت اور معنی خیز ہے!

مگر ریل

ندی میں بہتے ہوئے ایک تنکے کی صورت

بس اِک پل رُکی

اور پھر چل پڑی تھی

دھواں، محوِ قلم تھا

بیاضِ فلک پر

پُرانی حکایت نئی طرز میں لکھ رہا تھا

سعید احمد اختر کی نظم (صبا گلوں میں نہا رہی ہے) شاعر کی داخلی و خارجی شخصیت کا فنی و جمالیاتی منظر نامہ کہی جا سکتی ہے۔ اس میں شاعر نے "کرن ستارے کی چوٹ کھا کر کلی میں شبنم پگھل گئی ہے" "سے لے کر" فراتِ اقبال موجزن ہے" اور پھر "کھلا سمندر خیال کا میرے سامنے ہے" تک، کئی پیارے اور خوبصورت زاویے ابھارے ہیں۔

ناصر شہزاد

اب کے اوراق کے افسانوں میں سلیم آغا کا افسانہ "بردگن" دیگر تمام افسانوی حصّہ پر حاوی ہے۔ اس لیے نہیں کہ سلیم آغا کا "اوراق" یا آپ سے کوئی تعلق ہے بلکہ اس لیے کہ اس افسانہ میں موضوع منفرد، آرائے آراستہ اور پیرائے پیراستہ ہیں۔ انتظار حسین کے بعد سلیم آغا وہ پہلا افسانہ نگار ہے جس نے دیو مالائی واقعات کے تانے بانے بڑی نفاست اور بڑی فراست کے ساتھ بُنے ہیں۔ علامت افسانے کی استقامت اور استعارہ دستارہ ہوتا ہے۔ مگر ان دونوں کو برتنے کا وقوف چاہیئے۔ یہاں وہ سبھی کچھ ہے جو ایک اچھوتے نثریہ کی عبارت اور طہارت کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ نوک پلک درست اور در و بست چُست۔ قصّہ کانت اور جھتّے شانت۔ درپن داسیاں اور اوپن اُداسیاں ـــــ سانپ عہدِ آفرینش سے ہمارے ہم رکاب ہے۔ کہیں یہ ہمیں شہوانی شہادتوں کے وجود میں ملا ہے اور کہیں روحانی عبادتوں کی حدود میں۔ دش کنیا وشواشی بھری، سانپ سمان مہان بھری، یہاں عناصر کے دونوں درپن میں شہادت بھی اور عبادت بھی۔ سانپ، گندم اور انجیر کی وجہ ہی سے ہمیں باغِ بہشت سے بھاگنا اور اسے تیاگنا پڑا۔ سلیم آغا نے سانپ کو اس کے دیو مالائی رُوپ میں سُروپ کیا ہے۔ علامتیں ضخیم ہو کر بھی حلیم ہیں۔ تجرید.... جدید ہو کر بھی وحید ہے اور ماجرے مجبور ہو کر بھی مسرور۔ یہی دماغ ہے اور یہی ابلاغ اور اسے کچھ عرصہ سے میرے محترم دوست رشید امجد اور اُن کے دوسرے پیرو کار بھی محسوس کر چکے ہیں، تبھی تو "اسان مار اُڈاری اُڈ جانا" جیسے افسانے تخلیق ہو رہے ہیں۔ بردگن کے بعد جوگندر پال کا افسانہ رستے اور رشتے اپنی کہانی اور روانی کی بنا پر بڑا جاندار اور ایماندار افسانہ ہے۔ اسے پڑھ کر گزشتہ زمانوں کی ضیا اور نئے جہانوں کی جِلا ملتی ہے۔ حمیدہ معین رضوی اگرچہ ابھی تک کلی طور پر قرۃ العین حیدر کے اثر سے نہیں نکلیں، لیکن اس کے باوجود اُن کے افسانہ "شیشوں کا مسیحا" کی داد دیئے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ اس افسانے میں انہوں نے برطانیہ کے ثقافتی اور روداتی پہلوؤں کو بڑی مہارت اور تازہ سفارت کے ساتھ واگزار کیا ہے۔ اس افسانہ نے پہروں تک مجھے اپنے پنڈال میں رکھا۔ رفعت نواز کی "بھیں وال" کو دھن عطا کرتی ہے۔

رشید امجد کا "سمندر مجھے بلاتا ہے" ــــــ بے کراں بھی ہے اور معجز بیاں بھی۔ محمد منشا یاد بھی اسی رابطے میں رواں ہیں۔ دیانتداری نہ ہوگی اگر نگہت سیما کے "سیکنڈ ہینڈ" اور ایوب جوہر کے "پل" کے بارے میں بات نہ کروں تو، یہ دونوں افسانے بھی رخشندہ اور تابندہ ہیں۔ اور یہ سبھی افسانہ نگار زندہ ــــــ ہائیکو اگرچہ ایک نئی صنفِ سخن ہے، مگر محمد امین اسے بڑی تابندگی اور خوش آئندگی سونپ رہے ہیں۔ شاہد صدیقی کے گیت نے اس بار مجھے جیت لیا، ورنہ اکثر احباب اس صنف سے ناانصافی کر رہے ہیں۔ گیت نام ہے روحانی سگندھ اور جسمانی سمبندھ کا اور جب یہ دونوں چیزیں اس سے غائب ہو جائیں تو نہ اسے جگتی ملتی ہے اور نہ شکتی!

ب

تقی حسین خسرو

اس بار طویل نظم "اندر کے رونے کی آواز" بہت عمدہ ہے۔ غمِ ہستی! ازلی تنہائی، بے تعلق وقت کی بے رحم گریز پائی! ــــــ یہ رونے کی آواز میں خود بھی اپنے اندر ایک مدت سے سن رہا ہوں۔ اسی کے زیرِ اثر اب یہ آنکھیں بھی بار بار بھیگ جاتی ہیں۔ یہ انسان کا بنیادی غم ہے۔ جن علامتوں کے حوالوں سے بات کی گئی ہے وہ نظم کے تاثر میں بہت اضافہ کرتی ہیں۔ وداع کا منظر، اندھیرے کی زنجیر، ریل، ندی میں بہتے تنکے کی صورت، دھواں ہوتا قلم وغیرہ۔ نظم کے تاثر میں وہاں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے جہاں شاعر کو اپنا یہ غم ازل سے ابد تک پھیلے تسلسل کا ایک حصہ محسوس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

"اوراق" کے تازہ شمارے میں "رابطے" (غلام الثقلین نقوی) کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ میرے نزدیک یہ اس مجلے کی دلچسپ ترین تحریر ہوتی ہے۔ میں سب سے پہلے اسی کا مطالعہ کرتا ہوں۔ اس شمارے میں کسی "ناہید سلطانہ" کے حوالے سے نقوی صاحب نے اپنی یادنگاری کا "جواز" مہیا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نقوی صاحب حد درجہ وضعدار واقع ہوئے ہیں۔ ناہید سلطانہ کی ناپسندیدگی نے لاشعوری طور پر انہیں "رابطے" کی نئی قسط لکھنے سے باز رکھا اور ان کا یہ بیان کہ "رابطے کی قسط اس لیے نہیں آ رہی کہ میں بوجوہ نہیں لکھ سکا" محض ایک عذرِ لنگ ہے ــــــ ان سے التماس ہے کہ اس بار "رابطے" کی عدم موجودگی سے اُس قاری، بلکہ قاریہ کی تسکین تو ہو گئی جسے کسی کے ذاتی واقعات سے کوئی دلچسپی نہیں، اب مجھ جیسے اُن سے بہت سے قارئین کے لیے رابطے کا سلسلہ مستقلاً جاری رکھیے، جو اس لذیذ و پُرلطف آپ بیتی کو حکایتِ دراز تر کی صورت دیکھنے کے متمنی ہیں ــــــ مجھے خدشہ ہے کہ "اوراق" کے آئندہ شمارے میں انشائیہ نمبر کے عذر کی بنا پر نقوی صاحب کی قسط گول کر دی جائے گی ــــــ حالیہ برسوں میں اقبال کے شعری فن کی تفہیم و تعبیر کی طرف جو توجہ مبذول ہوئی ہے، ڈاکٹر حامدی کاشمیری کا مضمون اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ بھارت میں اقبال پر لکھنے والوں میں یہ رجحان خاص طور پر نمایاں ہے۔ چنانچہ پچھلے دو برس میں اس موضوع پر وہاں سے ایک مستقل کتاب (اقبال کا نظامِ فن از عبد المغنی) اور ایک مجموعۂ مقالات (اقبال کا فن مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ) چھپا ہے۔ اقبال کے ہاں روایتی شعری ہیئتوں سے بیک وقت وابستگی اور انحراف کی جو متضاد صورت ملتی ہے، حامدی کاشمیری نے اس حوالے سے زیرِ نظر مضمون میں اقبال کے ساختیاتی نظام کی انفرادیت کی نشاندہی کی ہے۔

ناہید سلطانہ

"اوراق" کا خاص نمبر پڑھ کر جی باغ باغ ہو گیا۔ میں نے یہ بات محاورتاً نہیں کہی بلکہ اوراق کی پھلواری میں رنگ برنگ شگوفے اور پتے نظر آتے ہیں جن سے دماغ

معطر ہو جاتا ہے۔ اوراق میں اب افسانہ انشائیے سے پیچھے رہتا ہوا نظر آرہا ہے۔ وہ اس لیے کہ افسانے تو اپنی اُسی منزل پر ہیں لیکن انشائیے ہر شمارے میں تازہ بتازہ پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ اس شمارے میں جمیل آذر، ارشد میر، سلیم آغا، یونس بٹ، محمد اقبال انجم، بشیر سیفی، راجہ محمد ریاض الرحمان، اظہر ادیب اور امجد طفیل ان سب کے انشائیے بہت خوب ہیں۔ خاص طور سے جمیل آذر، سلیم آغا، ارشد میر، یونس بٹ کے انشائیے تو دل میں پھلجھڑیاں سی چھوڑتے ہیں۔ یونس بٹ کے انشائیے نے تو شروع سے اپنی گرفت میں لے لیا۔ رشید نثار اور اکبر حمیدی صاحبان کے تجزیے بھی قابلِ توجہ ہیں اور سارے انشائیوں کی خوبیوں سے آگاہ کرتے ہیں۔
اوراق کا ایک مقبول اور اہم حصہ کتابوں پر مضامین کا ہے۔ ان مضامین میں ڈاکٹر سعداللہ کلیم کا تنقیدی مضمون پڑھ کر ڈاکٹر صاحب کے علم اور نظر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ یہ لاجواب مضمون ہے۔ انور سدید صاحب نے بھی اپنے طور پر خوب لکھا ہے۔ اس کے علاوہ حیدر قریشی نے شاعری کی کتاب پر پُر مغز اور بھرپور مضمون لکھا ہے۔ حیدر قریشی ادب میں چار سُو اپنے جوہر دکھا رہے ہیں۔ اب دیکھئے وہ افسانہ، شاعری اور تنقید میں سے کس جانب آگے نکلتے ہیں۔ لیکن ایے خیام صاحب نے نہایت سرسری اور فرض ادا کرنے والا مضمون لکھا ہے۔ یہ شبہ ہوتا ہے کہ موصوف نے "مضمون برائے درست" کے تحت لکھا ہے۔ — غلام الثقلین نقوی صاحب نے اپنے خط میں مجھ نو وارد ادیب کا خصوصی ذکر کیا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی ہے۔ شاید میری بات کا مفہوم یہ نہیں تھا۔ میرا کہنا یہ تھا کہ آپ بیتی صرف ایک آئے تو مناسب ہوگا۔ مَیں نے یہ نہیں کہا تھا کہ مَیں نقوی صاحب کا مضمون نہیں پڑھنا چاہتی بلکہ نقوی صاحب کی آپ بیتی تو دلچسپ ہوتی ہے۔

رشید نثار

اوراق' کا پہلا ورق میرے لیے نئی جہتیں، نئے امکانات اور نئی وسعتیں لے کر آتا ہے۔ جس سے بہت سے زاویے اور بہت سے دریچے وا ہوتے ہیں۔
کیا ہی اچھا ہو "اوراق" کے اداریوں پر مبنی ادارۂ اوراق ایک کتاب شائع کردے تاکہ ایک مستقل کتاب ادب کے قاری کے لیے ہمہ وقت موجود رہے —— اس مرتبہ آپ نے رفتار سے پیدا ہونے والے تناسب اور تغیرات کا احاطہ کیا ہے۔ اور اُن تبدیلیوں کی مدلل نشاندہی بھی کی ہے جو تہذیب، تاریخ اور ادب میں رونما ہوئی ہیں۔ رفتار کا احاطہ کرنا ایک سائنسی طریقِ کار ہے۔ لیکن آپ نے ادب کے تناظر میں اس کا تجزیہ کیا ہے۔ تو یہ بات کھُل کر سامنے آتی ہے کہ انسان ازل سے تنہا ہے وہ اپنی تنہائی کا علاج کبھی نظریے، کبھی تحقیق، کبھی سفر، کبھی محفل آرائی کے ذریعے کرتا ہے لیکن اُس کی تنہائی کا علاج نہیں ہو پاتا۔ لہٰذا وہ اپنے وجدان میں چھُپ کر اسی لیے پناہ لیتا ہے کہ شاید وہ حقیقتِ مُطلق کا ادراک اور اپنی تنہائیوں کا علاج کر سکے —— آپ نے غالب کے پیشگی ادراک اور اقبالؔ کی تغیراتی حسیات کی مثالیں دے کر "انقلابی تبدیلیوں" کے رجحان کو واضح کیا ہے —— اس وضاحت کی اشد ضرورت تھی وہ اس لیے کہ اب بھی بعض اذہان تغیر پذیری کو حقیقی ماننے سے انکاری ہیں۔ حالانکہ دنیا میں کوئی شے ناقابلِ تغیر نہیں۔ کیونکہ حواسِ خمسہ یا قوائے ارضی اپنا وجود الگ رکھتے ہیں اور مادی تجربات کے لیے اُن کی امداد کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ تاہم ہمارے گزشتہ عہد میں علامہ اقبال نے طبعی سائنس اور کائنات کے متعلق تحقیق کو روحانیت کا درجہ دیا تھا۔ یہ ایک نئی روحانیت تھی جسے سرسلمان نے طبیعات میں دیکھا اور علامہ مشرقی نے قرآن میں تلاش کیا۔ جبکہ موجودہ عہد غزل کے پیٹرن میں نعت لکھ کر اور انشائیہ انوکھے مشاہدے کے ذریعے نئی روحانیت کو وجود میں لا رہا ہے۔ "انشائیے" کی "نئی روحانیت" ایک دلچسپ جہت ہے جس پر ابھی بہت سے انکشافات ہونے ہیں مثلاً انشائیے کی "مَیں" بعض اوقات انائے مُطلق کے قریب رہ کر مشاہدے اور تجسس کو مہمیز لگاتی ہے۔ لامحدود کو محدود نہیں کرتی بلکہ پابند کرتی ہے۔ ذہنی مسائل اور مذہبی نفسیات سے ہٹ کر تہذیب کے نئے زمان و مکان کو دریافت کرتی ہے۔ اس ضمن میں میرے ذہن میں کبھی کبھار یہ سوچ از خود در آتی ہے کہ انسان پر موسم، فضا، معاشرے، حالات اور ماحول کا کڑا تسلط ہے۔ اس تسلط سے نجات حاصل کرنے یا تحفظ اختیار کرنے میں جہاں غزل اور افسانے نے ادب میں بھرپور کردار ادا کیا ہے وہاں انشائیے نے ہیئت کے اعتبار سے جدید تخیل کی ابتدا کی ہے۔ ذہنی صلاحیتوں میں جہاں اپنی ذات پر

اعتماد پیدا کیا ہے وہاں تشنج کے خلاف ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ زندگی میں شانتی پیدا کرنا، امن دشمنی کے خلاف ایک خوبصورت غیر جذباتی ردِ عمل پیدا کرنا، بنیادی اہم مسائل کو ایک تصور بنا کر انسانی ذہن کو جلا بخشنا بلکہ مسرتوں کے ذریعے زنگ اُتارنا، انشائیے کی نئی روحانیت ہے۔ اس اعتبار سے انشائیہ فرد کی "تکمیلِ شخصیت" کا ضامن بنتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انشائیے کو انکشافِ ذات کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ واقعی انشائیہ انکشافِ ذات اور حُسن و صداقت کے اتحاد کا سرچشمہ ہے۔ وہ اس لیے کہ انشائیہ خارجی دباؤ سے آزاد ہو کر اخلاق اور سیاست سے بہت حد تک بے نیاز رہ کر اپنی ذات میں مقصد اور ایک محفل بن جاتا ہے۔ چنانچہ انشائیہ رفتار ہی کا ایک نیا تناسب ہے۔ جس کا تجربہ درست ہے لیکن اس پر بہت سے لوگوں کے فیصلے غلط ثابت ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اعتماد اور خود شناسی جتنی انشائیے نے پیدا کی ہے اتنی کسی اور "صنفِ ادب" کے نصیب میں نہیں ہے (یہ ایک الگ موضوع ہے) میں یہاں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ "ادب" کے بہانے انسان کو اپنی کھال سے باہر لانے والے ادیب افسانے، غزل اور نظموں میں زندگی کا نیا محور پیدا نہیں کر سکے کیونکہ انسان کے دکھوں میں کمی کی بجائے "زیادتی" کا رجحان پایا جاتا ہے۔ انسان کے دکھوں کو مزاح، کی لوری اور طنز کی مرچوں سے کم یا تیز کیا جا سکتا ہے۔ بالکل ختم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن انشائیہ خود آگاہی کے ذریعے "قانونِ اتحاد" کو پیدا کر رہا ہے اور اس عظیم ذمہ داری سے قانونِ تخالف کے رسیا ابھی تک آگاہ نہیں ہیں ——— اس مرتبہ آپ نے "تخت سنگھ" کو بھرپور انداز سے اوراق کے قارئین سے روشناس کرایا ہے تخت سنگھ غالباً بھارت کے واحد ادیب ہیں جنہوں نے صرف اوراق کو اپنی نگارشات کے لیے منتخب کیا ہے۔ لہٰذا تخت سنگھ کا تعارف اوراق پر فرض تھا۔ میں نے "تخت سنگھ" کی منظومات کو ہمیشہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان میں ملائمت، ٹھہراؤ اور "لاہور" کی خوشبو رچی بسی محسوس ہوتی ہے ———

گزشتہ شمارے میں، میں نے اقبالؔ اور جوشؔ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ایک جملہ لکھا تھا۔ یہ جملہ یوں تھا۔ "آزادؔ صاحب نے جس مسدس کو تقابلی مطالعے کے لیے پیش کیا ہے اس کا لہجہ انیسؔ کا ہے دروبست بھی انیسؔ کا ——— اور اندازِ بیان جوشؔ کا ہے۔" لیکن جملہ کچھ یوں شائع ہو گیا ہے۔ "اس میں لہجہ انہیں کا ہے، دروبست بھی انہیں کا۔" براہ کرم اسے درست فرما کر شائع کر دیجئے گا۔

سیّد ضیا شبنمی

اس بار محمد علی فرشی کے ماہیے بہت خوبصورت ہیں، ہائیکو کے سلسلے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اس کو جاپانی قواعد کے تحت نظم کرنے میں اگر سہولت ہو تو ٹھیک ہے بصورت دیگر اسے پاکستانی طریق فکر میں بھی نظم کیا جا سکتا ہے اور یہ اعتراض کہ بحر طویل نہ ہو، محض اعتراض ہی ہے۔ کسی بھی صنفِ سخن کو لکیر کے فقیر کی طرح تسلیم نہیں کرنا چاہیئے ——— ریاض صدیقی کا مقالہ مجھے بطورِ خاص پسند آیا ہے۔ طویل نظم "اندر کے رونے کی آواز" متاثر کُن ہے ——— نظمیں اور غزلیں خوب ہیں۔ گوشۂ تخت سنگھ نہ جانے کیوں تشنہ تشنہ سا لگا۔ تخت سنگھ کی شاعری کا جائزہ اُن کی داخلی و خارجی زندگی کے پس منظر اور پیش نظر میں لیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔ یہی المیہ اس عہد کے بڑے شاعر مجید امجد کے ساتھ ہوا ہے۔ فکر تونسوی اور منظر علی خان کے طنزیہ اور مزاحیہ اچھے لگے ——— افسانوں میں "سیکنڈ ہینڈ"، "بردگی"، "پہچان"، "سینچ کہانی"، "دو لمحوں کے درمیان" اور "اتھاہ اور بے کنار" بہت پسند آئے۔

حیدر قریشی

"عقیدت" کے تحت بڑی خوبصورت حمدیہ اور نعتیہ تخلیقات پڑھنے کو ملیں ——— ہائیکو کے ساتھ ماہیئے پڑھ کر احساس ہوا کہ دھرتی کا اپنا ایک

جادو ہوتا ہے۔ جاپان کے زمینی حوالے سے ہائیکو مناظر و مظاہر فطرت کی دلآویز عکاسی کرتی ہے جبکہ برصغیر بالخصوص پاک پنجاب اور بھارتی پنجاب کے زمینی حوالے سے ماہیے دل کے تاروں کو چھو کر ان میں نغمگی گھول دیتے ہیں۔ ہائیکو اور ماہیے میں تین مصرعوں کی مطابقت بھی ہے اور قافیہ ردیف کی پابندی اور بحر کا اختلاف بھی۔ ہائیکو کے کامیاب اردو تجربے کی اہمیت مسلّم ہے۔ تاہم ماہیے کی نغمگی اور مٹھاس کے پیشِ نظر ہمارے اچھے شعرا کو اس طرف بھی متوجہ ہونا چاہیے ——— شعری تخلیقات کے حصے میں وزیر آغا، ساقی فاروقی، ابرار احمد، سیما شکیب، نصیر احمد ناصر اور شاذ تمکنت کی نظمیں اور غالب احمد، اکبر حمیدی، محمد خالد، فرحت نواز، حامد برگی، سیما شکیب، پروین عزیز، رام ریاض، خادم رزمی، تسلیم الٰہی زلفی، حفیظ شاہد اور انور سدید کی غزلیں زیادہ اچھی لگیں۔ ضیا شبنمی کے قطعہ بند اشعار پڑھ کر ان کے ساتھ ہونے والی کسی ٹریجڈی کا اندازہ ہوتا ہے۔ آسی خانپوری کی غزل کی اٹھان اچھی تھی۔ غزلوں کی ترتیب کے سلسلے میں بعض اوقات بڑا فاش قسم کا سہو نظر آنے لگتا ہے۔ محمد خالد نئی نسل اور نئی غزل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ انہیں شروع کے آٹھ دس شاعروں میں شامل کرنا چاہیے تھا مگر وہ بالکل آخر پر نظر آ رہے ہیں ——— افسانوں میں جوگندر پال کا "رستے" اور رشید امجد کا "پہچان" ایوب جوہر کا "پُل" اور سلیم آغا قزلباش کا "بروگن" عمدہ افسانے ہیں۔ لیکن محمد منشا یاد کے "وقت سمندر" اور اکبر حمیدی کے "آخری خوبصورت آدمی" دونوں افسانوں نے بے پناہ متاثر کیا۔ نگہت سیما کی کہانی "سیکنڈ ہینڈ" بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ "مراجعت" اور "سیکنڈ ہینڈ" دونوں کی ہیروئنوں کا نام روبی ہے خدا کرے نگہت سیما اپنی آئندہ کہانی میں اس نام سے قارئین کو محفوظ رکھیں ——— انشائیوں میں اس دفعہ ارشد میر کا "دھوتی" بے حد پسند آیا۔ علاوہ ازیں جمیل آذر کا "غیر معروف شہری" سلیم آغا کا "انگلیاں" بشیر سیفی کا "کتابیں" اور اظہر ادیب کا "سوچنا" بھی اچھے لگے۔ اکبر حمیدی اور رشید نثار نے گزشتہ "اوراق" کے انشائیوں کا اپنے خاص انداز میں جائزہ لیا ہے ——— ہرچرن چاولہ کی "البم" میں اس دفعہ بعض تصویروں کا فوکس صحیح نہیں ہے۔ لگتا ہے انہوں نے یہ قسط عجلت میں لکھ کر بھجوائی ہے۔ "گوشۂ تخت سنگھ" کے مندرجات نے بڑا لطف دیا۔ مجید امجد کا پرانا مضمون بھی میرے لیے نیا ہے۔ راز سنتوکھ سری اور آزاد گلاٹی نے بڑے عمدہ مضامین تحریر کیے ہیں ——— "اپنی کی باتیں" میں غلام الثقلین نقوی صاحب نے ناہید سلطانہ کے ریمارکس کا خواہ مخواہ اتنا سیریس نوٹس لیا۔ جب ناہید سلطانہ نے "البم" اور "رابطے" کے خلاف ریمارکس دیئے تھے تب میں نے صرف "البم" کی تعریف کی تھی۔ "رابطے" کی تعریف سے صرف اس لیے گریز کیا تھا کہ پھر ناہید سلطانہ کے "اوراق" نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء میں شائع شدہ خط کا یہ حوالہ بھی دینا پڑتا ——— "افسانوں کے حصے میں "رابطے" کے زیرِ عنوان غلام الثقلین نقوی صاحب کی آپ بیتی کی پہلی قسط ہی دلچسپ سے شروع ہوتی ہے اور اس کے زبان و بیان میں چاشنی اور سادگی ہے" ——— موصوفہ کے اعتراض کے جواب میں ان کے اپنے لفظوں سے زیادہ کیا چیز زیادہ مستند ہو سکتی تھی ——— عباس رضوی نے نصیر احمد ناصر کی نظم "سمندر راز دار میرا اگر ہوتا" پر جو اعتراض کیا ہے وہ نامناسب ہے۔ نصیر احمد ناصر نظم کے بڑے خوبصورت شاعر ہیں۔ وہ اپنی مذکورہ نظم میں بالغرض "سمندر اگر میرے اندر گرے" سے متاثر بھی ہیں تو متاثر ہونے کے باوجود مغلوب نظر نہیں آتے اور کسی شاعر کا کسی سے یوں متاثر ہونا ہرگز قابلِ اعتراض نہیں ——— گوپال متل نے جگن ناتھ آزاد کے مضمون میں سر اکبر حیدری کے نام والی غلطی کی بجا طور پر تصحیح کی ہے۔ علامہ اقبال مہاراجہ کرشن پرشاد سے گہرا قلبی تعلق رکھتے تھے سو یقیناً انہوں نے جوش کے لیے سفارش کی ہوگی۔ اقبال کے مہاراجہ کرشن پرشاد سے قلبی تعلق کا اندازہ ذیل کے ان چند اشعار سے بھی ہو جاتا ہے جو اقبال نے مہاراجہ صاحب سے ملاقات کے بعد کہے تھے۔ جوش اور اقبال کے تقابلی مطالعہ میں ان اشعار کا حوالہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

آستانے پر وزارت کے ہوا میرا گزر ۔۔۔ بڑھ گیا جس سے مرا ملکِ سخن میں اعتبار

س قدر حق نے بنایا اس کو عالی مرتبت ۔۔۔ آسماں اس آستانے کی ہے اک موجِ غبار

کی وزیر شاہ نے وہ عزتِ افزائی مری ۔۔۔ چرخ کے انجم مری رفعت پر ہوتے تھے نثار

مسند آرائے وزارت راجۂ کیواں حشم — روشن اس کی رائے روشن سے نگاہِ روزگار
شکریہ احسان کا اقبالؔ لازم تھا مجھے — مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

(بحوالہ "مکاتیبِ اقبال بنام گرامی" شائع کردہ اقبال اکادمی پاکستان ۔ کراچی)

ممتاز احمد خان

اس بار بھی انشائیے اچھے تھے لیکن جمیل آذر صاحب کا انشائیہ "غیر معروف شہری" ان کے اپنے دیگر انشائیوں کے مقابلے میں ایک نیا پن رکھتا ہے۔ انہوں نے بڑے شہر کی مخصوص زندگی کو انشائیے میں سمونے کی کوشش کی ہے نتیجہ یہ ہے کہ ایک خاموش قسم کا احتجاج بھی اس میں دَر آیا ہے۔ بہت سے افسانہ نگاروں نے بھی اس مخصوص زندگی بلکہ سسٹم پر فرد کی چیخ اور بے زاری کو اپنے افسانوں میں نمایاں کیا ہے۔ خاموش احتجاج کی یہ لہر انشائیے میں نئی چیز ہے اور اس صنفِ ادب کے لیے اچھا شگون! مثال کے طور پر اس انشائیے سے یہ سطریں دیکھیں "زر پرست شہری معاشرہ ہمیں ہر لمحہ انسانی رفعت سے گرا کر، سکّوں میں، کھاتہ نمبروں میں، افرادی قوّت میں اور زرِ مبادلہ میں تبدیل کر رہا ہے" ——— "ماڈرن دَور کا یہی سب سے بڑا المیہ ہے کہ وہ آپ کو پیہم یہ احساس دلاتا ہے کہ آپ بے نام بے چہرہ، غیر معروف شہری ہیں" ——— لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی زمانے میں انشائیہ اور افسانہ ایک ہو جائیں گے۔ انشائیہ کو مزید ارتقا حاصل کرنا ہے تو اسے اپنے ہی مدار میں گردش کرنا ہوگا ——— کیونکہ اس کا اسلوب اور تکنیک اپنے خدوخال واضح کر چکا ہے ——— شہزاد منظر کا مضمون "علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ" پسند آیا۔ انہوں نے ہر زاویے سے اپنے تھیسس کو پرکھ کر لکھا ہے اور وہ جس نتیجے پر آخیر میں پہنچے ہیں اس سے بہتوں کو اتفاق ہوگا۔

سید علی اعظم بخاری

نصیر احمد ناصر کی ہائیکو

"دُوریوں کا گمان رہتا ہے
کوئی کتنا قریب آجائے

فاصلہ درمیان رہتا ہے"

دل میں اُتر جانے والا اثر رکھتی ہے۔ علامتی افسانے کے ابلاغ کے مسئلے کو شہزاد منظر نے بڑی کامیابی سے نبھایا ہے ——— کہا جاتا ہے کہ علامتی افسانے نے کہانی کو ختم کر کے اپنے اندر ایک ایسی خشک، بوجھل اور مسموم فضا قائم کر دی ہے جس میں قاری کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ فوراً اس سے فرار حاصل کرنے کی تگ و تاز میں لگ جاتا ہے۔ مگر منشا یاد کے افسانے "موقت سمندر" نے علامت اور کہانی کے حسین امتزاج سے ایک ایسی کشادہ اور روح پرور فضا کو جنم دیا ہے، جس میں قاری کھل اُٹھتا ہے اور اس کے چہرے پر علامتی افسانے کے مستقبل کے بارے میں مثبت اندازِ فکر کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے ——— انشائیے تمام اچھے تھے لیکن "سوچنا" ——— میں انجم ادیب نے سوچ کے حوالے سے انسانی شخصیت پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ بڑے لطیف پیرائے میں لیا ہے۔ (جس سوچ کا انہوں نے ذکر کیا ہے وہ منفی سوچ ہے) ملاحظہ فرمائیے ——— "سوچنا انسان کو بزدل بنا دیتا ہے، اور انسان جب بزدل ہو جائے تو اس کے ذہن میں سازشیں پنپنے لگتی ہیں۔ وہ بلندیوں سے پستیوں کی طرف چلا جاتا ہے اور وہ خاک چاٹنے والے سانپ کی طرح چھپ کر وار کرنے کے موقعے

تلاش کرنے لگتا ہے ، روشنی سے گھبراتا ہے اور اندھیروں سے محبت کرنے لگتا ہے "۔۔۔۔ اس تناظر میں اگر موجودہ عالمی معاشرہ کو دیکھا جائے تو یہی کچھ نظر آتا ہے ۔۔۔۔ اوراق میرے دل کی پکار ہے ، جس سے میرے ذوقِ قلب و نظر کو تسکین ملتی ہے ۔

سعید شباب

اس بار جمیل آذر نے "غیر معروف شہری" میں جدید شہری تہذیب اور دیہاتی کلچر کو متعدد خوبصورت زاویوں سے دکھایا ہے ۔ ان کے انشائیے میں جدید تہذیب کا پہچان کی گمشدگی کا المیہ اور اس کا کرب بے حد نمایاں ہے ۔۔۔۔ ارشد میر کا انشائیہ "دھوتی" کلچر اور انگریزی کلچر کے مابین گہرے تعلق کو شگفتہ انداز میں بیان کرتا ہے ۔ دھوتی کے حوالے سے انسانی زندگی کی ابتدا تک جانے کے باوجود اور بعض ادق فلسفیانہ اشاروں کے باوجود ارشد میر کا انشائیہ شگفتگی اور تروتازگی کا احساس دلاتا ہے ۔۔۔۔ سلیم آغا نے اپنے انشائیے "انگلیاں" میں بڑے عمدہ نکتے پیدا کیے ہیں ۔ آخر میں ان کے ہاں ایٹمی جنگ کا جو خوف ابھرا ہے اور انہوں نے اس کو جس لطیف اور انشائی پیرائے میں سمیٹا ہے وہ اس لحاظ سے بھی خوش آئند ہے کہ انشائیہ خارجی مقصدیت کو خود پر طاری کیے بغیر نہ صرف لمحۂ حال کے مسائل کی خبر رکھتا ہے بلکہ آنے والے دنوں میں عالمِ انسانیت کو درپیش خطرات سے بھی آگاہ ہے ۔ مجھے ایٹمی جنگ کے حوالے سے نظم "پوسٹ مارٹم" اور افسانہ "حوا کی تلاش" کے بعد سلیم آغا کے انشائیہ "انگلیاں" میں ایٹمی جنگ کا مسئلہ پورے تناظر کے ساتھ ابھرتا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ "برسوں کی فصل" محمد اقبال انجم کا انشائیہ ہے ۔ انہوں نے اچھی کاوش کی ہے لیکن کہیں کہیں ان کا اسلوب بوجھل پن کا شکار ہونے لگتا ہے ۔۔۔۔ محمد یونس بٹ نوجوان انشائیہ نگار ہیں اور بڑی تیزی سے نمایاں ہو رہے ہیں ان کا انشائیہ "جیل" اتنا عمدہ انشائیہ ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد جیل جانے کو جی کرتا ہے ۔

ارم کاظمی

'اوراق' میں انور سدید صاحب کی غزل مجھے اس قدر پسند آئی کہ میں نے اس کے آخری شعر کو کئی دفعہ بلند آواز میں گنگنایا ۔ جان کاشمیری کی غزل مجموعی طور پر بے حد پسند آئی ۔ حیدر قریشی کی غزل کا دوسرا شعر میں نے زبانی یاد کر لیا ہے ۔ نظم کے حصے میں سے فی الحال پرویز بزمی کی نظم "میں حاضر ہوں" پڑھی ہے بے حد تاثراتی نظم ہے ۔۔۔۔ سلیم آغا قزلباش صاحب کا انشائیہ "انگلیاں" بے حد پسند آیا ۔ اختصار ، جامعیت اور شگفتگی کے علاوہ موزوں محاورں کے مناسب استعمال نے اس کو چار چاند لگا دیئے ہیں ۔ مطالعہ کے دوران کئی دفعہ مسکراتی رہی ۔ سلیم صاحب ایک سلجھے ہوئے انشائیہ نگار ہیں ۔۔۔۔ اس دفعہ کا ٹائیٹل بے حد پسند آیا ۔ اس کے سرورق پر جو شمعیں روشن ہیں وہ یوں ہیں ۔۔۔۔ افسانہ ، انشائیہ ، غزل ، ہائیکو ان شمعوں کی روشنی پورے صفحے پر پھیلی ہوئی ہے ۔

محمد یامین

'اوراق' کا تازہ شمارہ پڑھا ۔ اداریہ گویا اس گلشنِ ادب میں داخل ہونے کے لیے ایک خوبصورت دروازہ ہے ۔ پہلے کی طرح اس بار بھی اس دروازے سے گزرتے ہوئے مجھ پر علم و عرفان کے کئی بند در کھلے ہیں ۔ اوراق کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر نئی اور معیاری صنف کو پروان چڑھانے میں اوراق کا ہاتھ ہوتا ہے ۔ انشائیے کے بعد ہائیکو کو عام کرنے میں آپ کی ذاتی دلچسپی قابلِ رشک ہے ۔۔۔۔ تازہ شمارے میں جو ہائیکو شائع ہوئی ہیں ان میں محمد امین کی تمام ہائیکو عمدہ ہیں لیکن دوسری اور چوتھی ہائیکو نے زیادہ متاثر کیا ۔ خصوصاً چوتھی ہائیکو میں دنیائے محبت کے سب سے بڑے دکھ "جدائی" کو "لکیر" کے حوالے سے بہت عمدہ طور پر

بیان کیا گیا ہے۔ اُردو ہائیکو کے لیے پروفیسر محمد امین کی کاوشیں رائیگاں نہیں۔ بڑی مسرت کی بات ہے کہ اب ہائیکو لکھنے والوں کی خاصی بڑی تعداد ہے۔ نوجوان قلمکار خصوصی طور پر ہائیکو سے متاثر ہو رہے ہیں ـــــــ اس قافلے میں ایک اہم نام علی محمد فرشی ہے۔ یہ باشعور شاعر ہائیکو نگاری میں خوبصورت اضافے کر رہا ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں اُس کی چاروں ہائیکو فنّی زیبائش اور ہائیکو کی مخصوص فضا سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں خصوصاً تیسری ہائیکو فنّی چابکدستی کی خوبصورت مثال ہے جس میں شاعر نے انتظار کی ذاتی کیفیت میں فطرت کے ایک منظر کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ شامل کیا ہے ؎

جب منڈیروں پہ دھوپ اُترے گی
اور نرگس کھِلے گی آنگن میں
تب ترا انتظار مہکے گا

نصیر احمد ناصر معمولی بات بھی نہایت خوبصورت طریقے سے بیان کر دیتے ہیں۔ اُن کی پہلی ہائیکو ناقابلِ بیان خوبصورتی اور کیفیت کی حامل ہے جبکہ چوتھی ہائیکو آخری مصرعے کی وجہ سے بہت اچھی لگی۔ بشیر سیفی کی دوسری ہائیکو بہت متاثر کرنے والی ہائیکو ہے۔ کٹیا میں دیپ کا جلنا نہایت سحر انگیز اور خوش عمل ہے۔ ایک خوبصورت اور فطری منظر میں خاموشی کو بڑے پُرکشش انداز سے پینٹ کیا گیا ہے۔ باقی تین ہائیکو میں پہلی اور چوتھی ہائیکو خوبصورت لگیں۔ اظہر ادیب کی پہلی اور تیسری ہائیکو نہایت عمدہ ہیں ـــــــ حصّہ ہائیکو کے علاوہ اسحاق فرزی کی نعت، شہزاد منظر کا مقالہ (علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ) اور جوگندر پال کا افسانہ "رستے اور رشتے" اوراق کی خوبصورت تحریریں ہیں۔

راز سنتوکھ سری

"پہلا ورق" میں ہر بار کسی علمی مسئلہ کی موشگافی یا ادبی کلید پر بھرپور بحث کے بعد اس کی گویا "دریافت" (DISCOVERY) ہوتی ہے۔ اس مرتبہ عالمی ادب کی جو جہتیں آپ نے بیان کی ہیں اور اُردو ادب کی اُن سے ہم آہنگی کا تذکرہ کیا ہے میں اس سے متفق ہوں۔ بلاشبہ "اوراق" ان ادبی جہتوں یا اصناف کی ترویج کے لیے ٹھوس اور مفید کام کر رہا ہے اور فی الحقیقت "اوراق" کی یہی منفرد خصوصیت ہے جس کے باعث یہ جریدہ مجھے پسند ہے ـــــ اس بار مجھے انور سدید کی نعت سادگیٔ بیان اور اظہارِ خلوص کی بنا پر بطور خاص پسند آئی۔ اسی طرح شاعر صدیقی کا گیت بہت ہی پیارا لگا۔ لوک درد کے اظہار اور شعری خوبیوں کے علاوہ شاعر کا جذبہ جس طرح اس گیت میں مجسّم ہوا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ علی محمد فرشی کے "ماہیئے" بھی بہت اچھے لگے لیکن "ماہیا" کی جمع "ماہیئے" کچھ اچھی نہیں لگی۔ جیسے غزل پانچ سات اشعار پر مشتمل ہو کر غزل ہی رہتی ہے، اُسے غزلیں نہیں کہا جاتا، اسی طرح بہت سی بولیوں پر مشتمل "ماہیا" اسی منفرد انداز میں ہی بولا جائے گا، اسے "ماہیئے" نہیں کہا جائے گا ـــــ اس بار دونوں طویل نظمیں "صبا گلوں میں نہا رہی ہے" (سعید احمد اختر) اور "اندر کے رونے کی آواز" (وزیر آغا) بہت اعلیٰ درجے کی ہیں۔ دونوں کا لہجہ آفاقی ہے۔ دونوں انسان کے ازلی و ابدی "درد" کی حامل ہونے کے باعث آفاقی قدروں کی نقیب ہیں ـــــ مقالات میں مرزا حامد بیگ کا "یلدرم، منٹو اور فیض" دلچسپ تحقیق کا نتیجہ اور نمونہ ہے ـــــ "خاتج اور مفتوح" کنار لوگ کا نہایت کامیاب خاکہ ہے اور اس صنعت میں اُن کے مخصوص و منفرد رنگ و آہنگ کا مظہر ہے۔ فکر تونسوی کا مضمون "میری بیوی" بھی خوب ہے۔ فکر تونسوی اُردو کے صحافتی مزاح میں بے مثال ہیں۔ اس ضمن میں ایک اور نام میرے ذہن میں آتا ہے چراغ حسن حسرت کا۔ مرحوم بہت ہی ذہین اور طبّاع صحافتی مزاح نویس تھے۔ "گوشۂ تخت سنگھ" نہایت دلکش رہا۔ "اوراق" کی یہ بے حد قابلِ تعریف خصوصیت ہے کہ وہ اس انداز میں معاصر اور گزشتہ لکھنے والوں کی ادبی خدمات کو سراہتا ہے۔ اس اقدام کی جتنی تحسین کی جائے کم ہے ـــــ اس شمارہ کے افسانوں میں "رستے اور رشتے" جوگندر پال کا نئے ڈھب کا بہت کامیاب

افسانہ ہے۔ مصنف کی مشاہدے کی گہرائی قابلِ دید ہے اور نفسیات کی گرفت قابلِ داد! — سلیم آغا قزلباش نے ہمارے ہاں کی ایک بد روایت کے تناظر میں ایک بے حد خوبصورت علامتی افسانہ "برو گن" تخلیق کیا ہے لیکن اس کی علامات بھول بھلیاں یا پیستان نہیں بلکہ بالکل سامنے کی اور فوراً سمجھ میں آجانے والی ہیں — نجہت سیمانی نے "سیکنڈ ہینڈ" میں ادنچے طبقے کی پستی کو خوب بے نقاب کیا ہے۔ رشید امجد، عذرا سید، اکبر حمیدی اور ایم اشرف کے افسانے ہیئت اور مواد کے اعتبار سے اچھے ہیں۔ سلیم آغا قزلباش کا انشائیہ "انگلیاں" اس کے رواں اور بے ساختہ اسلوب میں بے حد کامیاب ہے۔ اُنگلیوں کی مختلف جہتوں ہیئتوں اور صورتوں کی قابلِ داد انداز میں عکاسی کی گئی ہے اور اُن کے جا و بے جا استعمال کی دلچسپ نشاندہی پسندیدہ اور خوبصورت ہے۔ جمیل آذر، ارشد میر ہمارے جانے پہچانے اور منجھے ہوئے انشائیہ نگار ہیں۔ ان کے علاوہ بشیر سیفی، امجد طفیل، اظہر ادیب، محمد یونس بٹ کے انشائیے بھی فکر انگیز ہیں — انتظاریہ میں کشور ناہید کی تخلیق "تابوت" ادبِ لطیف یا آزاد نظم کا نادر نمونہ ہے۔ سجاد نقوی کا مضمون "اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش" جو انور سدید کی اسی عنوان کی کتاب کا کامیاب محاکمہ ہے اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ اس میں مذکورہ کتاب پر بہت ہی دیانتداری کے ساتھ بے لاگ تبصرہ کیا گیا ہے — اس شمارہ کی سب سے قابلِ ذکر چیز وہ نذرانۂ عقیدت ہے جو وزیر آغا نے برِصغیر ہند و پاک کے قد آور اور شہرہ آفاق محبوب شاعر فیض احمد فیض کی اچانک وفات پر اُن کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ وزیر آغا کا یہ خراجِ عقیدت باوجود چند جملہ ہائے معترضہ کے بہر کیف فیض صاحب مرحوم کے شایانِ شان ہے۔

"محمد فیروز شاہ کسی ہمعصر شاعر سے متاثر نہیں ہے"

(وزیر آغا)

وہاں بھی چھا گئے بے مہر شب کے سناٹے
دریچہ ایک ہی اس شخص کے مکان کا تھا

"دریچہ"

محمد فیروز شاہ کا شعری مجموعہ
چھپ گیا ہے

آج ہی آزمائیے!